فقه السيرة النبوية

ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی



دروسِ سیرت

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

نشریات

دُروس سیرت

اُردو ترجمہ فقہ السیرۃ النبویۃ

ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی

مترجم

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

نشریات

۴۰ اُردو بازار، لاہور۔ فون: ۰۳۲۱۔۴۵۸۹۴۱۹

۲۹۷۔۶۳۱ البوطی، محمد سعید رمضان، ڈاکٹر
ال ب۔د ندوی، محمد رضی الاسلام، ڈاکٹر (مترجم)
دروس سیرت
لاہور: نشریات
۲۰۰۷ء ص: ۲۱۳
ا۔ سیرت، سوانح، پیغمبر اسلام
ISBN 978-969-8983-14-7

کتاب : دُروس سیرت، اُردو ترجمہ فقه السيرة النبوية
مصنف : ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی
مترجم : ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
اہتمام : نشریات، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
قیمت : ۴۰۰ روپے

ڈسٹری بیوٹرز



کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، تاجران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

نشریات
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

فہرست

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ مترجم

سیرتِ نبوی کے ہر پہلو پر دنیا کی بیش تر زبانوں میں قابل قدر لٹریچر موجود ہے۔ اس موضوع پر مختصر کتابیں بھی ہیں، متوسط بھی اور ضخیم مجلدات بھی۔ بعض اہل قلم نے ٹھوس علمی تحقیقات پیش کی ہیں، بعض کی سرسری اور تاثراتی تحریریں منظر عام پر آئی ہیں۔ بعض نے ناول کے طرز پر گل کاریاں کی ہیں اور بعض نے بچوں کے لیے ہلکے پھلکے انداز میں سیرتِ طیبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر بھی عاشقانِ رسول کی طبیعتیں سیر نہیں ہوئی ہیں اور حیاتِ نبوی کے ایک ایک لمحے کی تفصیل جاننے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے کی کوشش کرنے والوں کی جانب سے ھل من مزید کا تقاضا رہتا ہے۔

عصر حاضر میں بعض اہلِ قلم نے ایک نئے اور منفرد انداز سے سیرت نگاری کی کوشش کی ہے۔ اور وہ یہ کہ مختصر الفاظ میں سیرت کا ایک ایک واقعہ بیان کر کے اس سے دروس واحکام کا استنباط کیا جائے۔ اس انداز سے عربی زبان میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں محمد الغزالی کی فقه السيرة اور ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی السیرة النبوية - دروس و عبر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ زیرِ نظر کتاب فقه السيرة النبوية بھی اسی اندازِ تالیف کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اردو زبان میں سیرت نگاری کا یہ اسلوب ابھی رائج نہیں ہوا ہے۔

اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی شام کے مشہور عالم دین ہیں۔ فکرِ اسلامی، دعوت اور تربیت کے موضوعات پر ان کی متعدد وقیع تصانیف ہیں۔ ان میں کبری اليقينيات الكونية، ضوابط المصلحة فى الشريعة الاسلامية، تجربة التربية الاسلامية فى ميزان البحث، منهج تربوى فريد فى القرآن، الاسلام ومشكلات

الشباب اہم ہیں۔ اُن کی اس کتاب کو علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی اور مختصر عرصے میں اس کے دسیوں ایڈیشن نکلے۔

اس کتاب کی چند خصوصیات ہیں جو اسے سیرت کی دیگر کتابوں سے ممتاز کرتی ہیں :

۱۔ مختصر الفاظ میں سیرت کا ایک ایک واقعہ بیان کر کے اس سے دروس، نصائح، نتائج اور احکام مستنبط کیے گئے ہیں۔ سیرت کا کوئی واقعہ پڑھنے کے بعد قاری کو یہ بھی رہنمائی ملتی ہے کہ اس واقعے سے اسے کیا نصیحت ملتی ہے۔ یہ انداز قاری کے لیے بڑا اپیل کرنے والا ہے۔ اس طرح وہ خود کو سیرتِ نبوی کا براہِ راست مخاطب سمجھنے لگتا ہے۔

۲۔ اس میں سیرتِ نبوی سے بعض فقہی مسائل بھی مستنبط کیے گئے ہیں۔ مصنف نے کسی مخصوص مسلک کی ترجمانی کرنے کے بجائے مختلف مسالک کی آراء ذکر کر دی ہیں۔ البتہ کہیں کہیں اس مسلک کو راجح قرار دیا ہے جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

۳۔ مغربی دانش وروں اور ان کے مشرقی ہم نواؤں نے ذاتِ نبوی کو نبوت اور وحی کے مظہر سے مجرد کر کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ رسولِ کریم ﷺ کو ایک عبقری انسان کی حیثیت سے نمایاں کرتے ہیں جس نے اپنی مہارت و عبقریت کے ذریعے معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ لیکن آپؐ کی جو دوسری حیثیتیں تھیں مثلاً آپ اللہ کے نبی تھے، آپ پر وحی نازل ہوتی تھی، آپ کو معجزات عطا کیے گئے تھے، ان کی طرف وہ مطلق اشارہ نہیں کرتے۔ اس کتاب میں سیرت نگاری کے اس رجحان پر تنقید کرتے ہوئے آں حضرت ﷺ کی شخصیت کے نبوی پہلو کو بھی نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر راقم سطور نے اس کو اردو کا جامہ پہنانے کا ارادہ کیا۔ اس کی سعادت اور اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس نے اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی۔ اس موقعے پر محترمی جناب محمد جاوید اقبال صاحب —————— نئی دہلی کا شکریہ ادا کرنا اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ موصوف نے اس کتاب کے ترجمے کی پیش کش کی، وقتاً فوقتاً اس کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کرتے رہے اور درمیان میں جب کبھی ناگزیر مصروفیات کی بنا پر ترجمے کے کام میں رکاوٹ آئی تو اسے جلد از جلد مکمل کرنے کی جانب متوجہ فرماتے رہے۔

اس کتاب کے ترجمے کے دوران رفیقۂ حیات روحی انجم بنت سلیمان نے رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اس نے اندرون خانہ اور بیرون خانہ دونوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر میرے لیے ترجمے کے کام میں مکمل یکسوئی فراہم کی۔ تشکر و امتنان کے رسمی کلمات اس کے خلوص اور ایثار کا بدل نہیں بن سکتے۔ اللہ تعالیٰ اسے جزائے خیر دے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس خدمت کو قبول فرمائے، لغزشوں سے درگذر فرمائے، اس کا فائدہ عام کرے اور مصنف، مترجم اور ناشر کو اجر سے نوازے۔ وما توفیقی الا باللّٰہ.

محمد رضی الاسلام

علی گڑھ
۷؍اگست ۱۹۹۹ء

مقدمہ طبع جدید (عربی)

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے جو کتابیں تصنیف اور شائع کی ہیں ان میں جتنی شہرت اور مقبولیت اس کتاب کو حاصل ہوئی اتنی اور کسی کتاب کے حصے میں نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کا سبب سیرت نگاری کا وہ انداز ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ اس طرح میں نے ان غلطیوں بلکہ انحرافات کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے جن کا بہت سے معاصر اہلِ قلم شکار ہو گئے تھے۔ خاص طور سے وہ حضرات جو نام نہاد عصری اسلوب میں لکھنے کے دعویدار ہیں۔ میں نے اس کتاب کے شروع میں جو اہم تمہیدی مباحث درج کئے ہیں ان میں کسی مابعد ایڈیشن میں ایک فصل کا اضافہ کر دیا ہے جس کا عنوان ہے "مطالعہ سیرت کے ارتقائی ادوار اور اس کا صحیح طریقہ" اس میں میں نے ان غلطیوں اور ان کے مخفی اور مصنوعی عوامل سے بحث کی ہے نیز دیگر نقطہائے نظر اور مناہج کا موازنہ کرتے ہوئے اس علمی طریقۂ کار کی وضاحت کی ہے جسے سیرت نگاری میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

بہت سے اصحاب قلم نے اپنی تحریروں میں حیات رسول ﷺ کا تجزیہ اس طرح کیا ہے کہ بس وہ ایک انسانی عظمت معلوم ہوتی ہے۔ ویسی ہی جس سے بہت سے رہنما اور شخصیتیں آپ سے پہلے متصف تھیں اور آپ کے بعد بھی ہوئیں۔ بہت سوں نے لوگوں کو بتاکید یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم کی قیادت میں اسلام کو جو غلبہ نصیب ہوا وہ محض اقتصادی میدان میں انتہاپسند دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت تھی۔ بہت سے نام نہاد محققین نے لوگوں کو یہ باور کرایا یا کرانے کی کوشش کی کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے جو کارنامہ انجام دیا اس کے پسِ پردہ محض یہ محرک کار فرما تھا کہ قیادت سیادت عجمیوں کے ہاتھوں سے نکل کر عربوں کے ہاتھوں میں آجائے... اس مقصد کی برآوری کے

لئے قلموں کو خریدا گیا اور ان پر دولت نچھاور کی گئی۔ ایک زمانے میں خود اس کتاب کے مصنف کو پیش کش کی گئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت ایسے انداز سے لکھے کہ مذکورہ مقصد پورا ہو سکے۔ اس کا مطالبہ اس سے براہ راست اور علانیہ کیا گیا۔

لیکن تجربات نے ثابت کر دیا کہ اسلوب، طریقۂ کار یا خود ساختہ تصورات کے تانے بانے، کوئی بھی چیز صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنا دینے پر قادر نہیں ہے۔ چنانچہ اس قسم کی تحریروں کے کثیف بادل چھٹ گئے اور ان کے پیچھے پوشیدہ حقیقت کا سورج پھر چمکنے لگا۔ اور لوگوں کو عموماً اور تعلیم یافتہ طبقے کو خصوصاً یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت آپ کی انسانیت کا نتیجہ ہونے سے قبل آپ کی نبوت کا ثمرہ تھی۔ آپ کے ہاتھوں اسلام کو جو غلبہ نصیب ہوا وہ اللہ کی جانب سے مقدر تھا۔ اس کے پسِ پردہ مال و دولت کا کوئی محرک نہ تھا۔ اور اس روئے زمین پر انسان کو جو سیادت حاصل ہے وہ — جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے — بحیثیت انسان کے ہے۔ وہ یہاں اللہ کا خلیفہ ہے، اسے اس کی نیابت کا شرف بخشا گیا ہے۔ یہاں انسانوں کے درجات میں اگر تفاوت ہے تو صرف تقویٰ اور عمل صالح کی بنیاد پر، نہ کہ ان دوسرے امتیازات پر جنھیں بعض لوگ قابل فخر و مباہات سمجھتے ہیں۔

ان غلطیوں یا بالفاظ دیگر انحرافات کی تصحیح کے سلسلے میں اس کتاب کی صورت میں لوگوں کے سامنے میں نے جو کچھ پیش کیا تھا اس کی بے پایاں مقبولیت کا واحد سبب یہ تھا کہ انسان کی فطرتِ سلیم حق کی طرف لپکتی ہے خواہ کہیں بھی نظر آجائے اور اس کا اظہار کرنے والا کوئی بھی ہو۔ اور باطل اسے گراں گزرتا ہے اور اس سے اسے ناگواری ہوتی ہے خواہ اس کے ارد گرد کتنی ہی دلفریب چیزیں ہوں اور اسے کتنا ہی خوش نما بنا کر پیش کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ، وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ.

(الصف: ٨)

(یہ لوگ اپنے منہ کی پھونک سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا پھیلا کر رہے گا خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔)

ساتھ ہی یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ آج لوگوں کی اکثریت حقیقت کی متلاشی ہے ... ایسی حقیقت جو آمیزشوں سے پاک اور مفادات اور ترجیحات کے تسلط سے آزاد ہو۔ خاص

طور سے اس صورت حال میں جب کھلی آنکھوں سے نظر آنے لگا ہے کہ حقائق کے ساتھ کھلواڑ کرنے اور انھیں مزعومات، مفادات اور خواہشات کے تابع کرنے کی کوشش کے نتیجے میں انسان کتنے عظیم مصائب سے دوچار ہے... آج ہم دنیا میں ہر سطح پر اور ہر گروہ میں اسلامی بیداری کی جو لہر دیکھ رہے ہیں شاید اس کے پس پردہ عوامل میں سے ایک یہ بھی ہے۔

اس طرح یہ کتاب رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک جامع اور معتبر ماخذ بن گئی ہے۔

اس میں واقعات کا جس انداز سے تجزیہ کیا گیا ہے اس سے قاری بآسانی دروس مستنبط کرنے اور اصول و معانی کا فہم حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہی اس مطالعے کا حاصل اور اصل مقصد ہے۔ اس کی تالیف کے ہر مرحلے میں اللہ عزوجل کا فضل شاملِ حال رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اس نے مجھے اس کی توفیق عطا فرمائی اسی طرح اپنے انعام واکرام میں بھی اضافہ کرے گا، مجھے اخلاص کی دولت سے مالا مال کرے گا اور میرے دل کو دیگر محرکات واغراض سے پاک کردے گا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ تمام اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور اس سے بڑھ کر طاقت وقوت کا کوئی مالک نہیں۔

دمشق — سعید رمضان

۱۵ ررمضان ۱۴۱۱ھ / یکم اپریل ۱۹۹۱ء

مقدمہ طبع دوم (عربی)

۱۔ یہ فقہ السیرۃ کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسے میں ان حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جو سیرت المصطفیٰ ﷺ کا مطالعہ کرنا اور اس کے دروس ونصائح سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس ایڈیشن میں میں نے بہت سی بحثوں کا اضافہ کیا ہے اور بعض فصلوں کو مزید منقح کر کے پیش کیا ہے۔ اس طرح امید ہے کہ اب یہ کتاب مزید پایۂ تکمیل سے قریب ہو جائے گی، کیونکہ کسی چیز کو ہر اعتبار سے مکمل قرار دینا ممکن نہیں ہے اور لغزشوں سے کوئی شخص محفوظ نہیں، سوائے اللہ کے ان مقرب بندوں کے جنھیں اس نے مرتبۂ نبوت سے سرفراز کیا ہے۔ یہ امتیاز ان کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ شرف اس لئے بخشا ہے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ کون مسائل پر غور وخوض کے لئے اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہے اور کس کو اللہ تعالیٰ حق تک رہنمائی کے لئے کامل عقل اور روشن بصیرت کے ساتھ وحی والہام سے بھی نوازتا ہے۔

۲۔ جب اس کتاب کا پہلا ایڈیشن منظر عام پر آیا تھا تو مجھے امید نہیں تھی کہ اس کے نسخے اتنی قلیل مدت میں ختم ہو جائیں گے اور اسے مختلف عربی اور اسلامی ممالک میں زبردست پذیرائی حاصل ہو گی۔ میں تو بس یہ جانتا تھا کہ میں نے سیرت نگاری کا جو طریقہ اپنایا ہے اس سے بہت سے ان لوگوں کی غلطیوں کی تصحیح ہو جائے گی جنھوں نے عصر حاضر میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس کے ذریعے ان مغالطوں کا پردہ چاک ہو جائے گا جو بہت سے دانشوروں، مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں کی تحریروں سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک مخصوص مکتبِ فکر وجود میں آیا جس کا کام ہی ان غلطیوں اور مغالطوں کو ہوا دینا اور انھیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنا تھا۔ اس کے اثرات آج تک دکھائی دیتے ہیں۔

۳۔ میرے اس مخصوص طریقۂ تصنیف کو قارئین نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اس سے مجھ پر واضح ہوا کہ اس مکتبِ فکر کے دامِ فریب میں نہایت مختصر تعداد ہی آسکی ہے اور وہی لوگ اس کا شکار ہوئے ہیں جنھوں نے اس کے اور اس کے بانیوں کے نام سے دھوکہ کھایا ہے۔ ورنہ حیاتِ مصطفوی کے تابناک حقائق آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہیں۔ آزاد ذہن ان کی طرف لپکتا اور ان پر ایمان لاتا ہے، اور انھیں اصل سے پھیرنے یا ان کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے مقصد سے کی گئی کسی بھی تاویل یا تجزیے پر کان نہیں دھرتا۔

۴۔ تمام محققین و مفکرین جانتے ہیں کہ اس مکتبِ فکر کے وجود میں آنے کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ یورپ کی علمی و سائنسی ترقی کو دیکھ کر بہت سے عربی واسلامی ذہن خیرہ ہو کر رہ گئے تھے اور انھیں یہ وہم ہونے لگا تھا کہ مسلمان بھی ایسی ترقی صرف اس صورت میں حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اسلام کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں جیسا یورپ میں عیسائیت کے ساتھ کیا گیا۔ وہ اسلام کے غیبی حقائق کو مادی سائنسی ایجادات واکتشافات کی کسوٹی پر پرکھیں۔ جو غیبی امور سائنس کی رسائی سے ماوراء ہوں انہیں رد کر دیں اور جس معجزے کو سائنس کی تائید حاصل نہ ہو اس پر ایمان نہ لائیں۔ جب وہ ایسا کریں گے تبھی ویسی ترقی کر سکیں گے جیسی یورپ نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کی۔ اور تبھی وہ اس کے دوش بدوش چل سکیں گے۔

اس طرح اس مکتبِ فکر کے بانیوں نے ایک ایسے فکر کی بنا ڈالی جسے انھوں نے "دینی اصلاح" کا نام دیا، حالانکہ دینِ برحق میں کبھی کوئی فساد نہیں در آیا کہ کسی مصلح یا اصلاح کی ضرورت پڑے۔ اس اصلاح کا اولین مظہر یہ سامنے آیا کہ حیاتِ رسول ﷺ کا تجزیہ اس انداز سے کیا گیا کہ وہ یورپی ذہنیت کے مطابق اور علم جدید کے جھنڈے تلے آجائے۔ حسین ہیکل کی کتاب "لائف آف محمد" LIFE OF MOHAMMAD (SAW) اس میدان میں اولین تجربہ تھا۔ اس میں مصنف نے صراحت کی ہے کہ اس نے حضرت محمد ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ صرف سائنس کی روشنی میں کیا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق آپ کی زندگی میں نہ کوئی خارقِ عادت واقعہ ہے نہ معجزہ۔ اگر ہے تو وہ صرف اور صرف قرآن ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بوصیری کے اس شعر سے استدلال کیا ہے:

لم یمتحنا بما تعی العقول به   حرصاً علینا فلم نرتب ولم نهم

(آپ نے ہمارا خیال کرتے ہوئے ہمیں ایسی چیزوں سے نہیں آزمایا جو عقل کی حدود سے ماوراء ہوں۔ چنانچہ ہم نے سوال کیا، نہ غلطی کی)

لیکن اس قصیدے میں موجود ایک دوسرے شعر کو وہ فراموش کر گئے۔

جاءت لدعوته الاشجار ساجدة

تمشی الیه علی ساق بلا قدم

(آپ نے درختوں کو بلایا تو وہ بغیر قدم کے، اپنے تنوں پر آپ کے پاس آگئے اور سجدہ کیا۔)

اُس وقت کے شیخ الازہر شیخ مراغی نے اس کتاب کی تحسین کی اور اسے مبارک اقدام قرار دیا۔ اسی طرح محمد فرید وجدی نے ایک سلسلۂ مقالات شائع کیا جس میں اسلام اور سیرت نبوی کو سائنسی اسلوب میں سمجھنے کی بات کہی۔ خواہ اس سے ان صحیح واقعات کا بھی انکار لازم آئے جو قرآن وسنت سے ثابت ہیں۔ سائنسی اسلوب سے ان کی مراد یہ تھی کہ عقل غیبی امور، خوارق اور معجزات کو تسلیم نہیں کرتی خواہ ان سے متعلق صحیح اور متواتر روایات موجود ہوں۔ گویا سائنس کا اثبات اس وقت ہوتا ہے جب احساس و شعور سے ماوراء تمام چیزوں کا انکار کر دیا جائے۔

۵۔ یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اس وقت مصر پر قابض برطانوی حکومت نے اسلام کے اس نئے تصور کے ذریعے، جسے فکری رہنماؤں اور دانشوروں کا ایک گروہ پیش کر رہا تھا، کس طرح استحصال کیا۔ اس نے اس کا استعمال مسلمانوں کے دلوں میں دینی غیرت کو کمزور کرنے کے لئے کیا۔ جو شخص اس بات کا قائل ہو جائے کہ معجزے کا دین میں کوئی مقام نہیں ہے اس کے اندر دین کے لئے کیا غیرت باقی بچے گی؟ کیا دین انبیاء اور رسولوں کی جانب وحی الٰہی کے معجزہ کے علاوہ اور کسی چیز کا نام ہے؟ چنانچہ سامراجی تربیت نے مسلمانوں کو اسلامی نظام سے دور کر دیا اور ان کے درمیان ایک دوسرا نظام لا کھڑا کر دیا جو سراسر یورپی تھا۔

۶۔ وقت گزرتا گیا یہاں تک کہ ایک عرصہ کے بعد ہر انصاف پسند محقق پر یہ واضح ہو گیا کہ اس مکتبِ فکر کو آزادانہ فکری غور و خوض اور پاکیزہ علمی تحقیق کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ بلکہ وہ مسلمانوں کے ایک گروہ کی مرعوبیت اور احساسِ ضعف کا ردِ عمل تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں مخصوص حالات کی بدولت یورپی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، تو اس کی چمک دمک سے

ان کی نگاہیں حیرت زدہ ہو کر رہ گئیں، وہ اس کی لذتوں میں کھو گئے، انھوں نے اپنی خواہشات نفس کو اپنی عقلوں پر مسلط کر لیا اور ایک ایسے مکتبِ فکر کی بنا ڈالی جس کا شعار بظاہر دینی اصلاح تھا، مگر حقیقتاً وہ مغرب کی ترقی کے سامنے نفسیاتی پسپائی اور فکری مرعوبیت کا نتیجہ تھا۔

ساتھ ہی ہر محقق پر یہ بھی عیاں ہو گیا کہ اس مکتبِ فکر کے بانیوں اور علم برداروں کو یورپ کے مثل علم و سائنس کے میدان میں وہ ترقی نہ مل سکی جس کی وہ امید لگائے بیٹھے تھے یا انھوں نے دوسروں کو امید دلائی تھی۔ اس دینی اصلاح سے اگر کچھ حاصل ہوا تو یہ کہ وہ بیک وقت دونوں حقیقتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اپنی دینی حقیقت پر قائم رہے نہ سائنسی ترقی سے بہرہ ور ہو سکے۔[1]

۷۔ اس وجہ سے میں نے چاہا کہ اس کتاب میں میرا اہم کام یہ ہو کہ مذکورہ مکتب فکر کے بقیہ آثار کو بھی زائل کر دوں۔

کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی حیات رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ اس حیثیت سے کرنے کی کوشش کرے کہ آپ بے مثال عبقری، عظیم قائد یا تجربہ کار اور زیرک انسان تھے۔ ایسی کوشش درحقیقت ان عظیم الشان حقائق کے انکار یا ان سے کھلواڑ کے مثل ہے جن سے آنحضرت ﷺ کی زندگی معمور نظر آتی ہے۔ یہ روشن اور تابندہ حقائق بہانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ تمام اعلیٰ اخلاقی، عقلی اور نفسیاتی اوصاف سے متصف تھے اور ان سب کا سرچشمہ ایک عظیم الشان حقیقت تھی اور وہ یہ کہ آپؐ اللہ عزوجل کی جانب سے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ ہم فروعی چیزوں کو اصل جگہ رکھ دیں، پھر اصل کے مطلق وجود ہی کو فراموش کر دیں!.. یقیناً اس کے رد کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں کہ ہم اصل کی طرف متوجہ ہوں، بلکہ صرف اسی کو اختیار کریں۔

اسی طرح ایک مسلمان اگر سیرت نبویؐ کو ایک ایسا ماخذ سمجھتا ہے جس سے حیاتِ طیبہ کی واقفیت ہو سکتی ہے تو اس کے لئے یہ تصور قائم کر لینا بھی صحیح نہیں کہ آپ کی زندگی کا واحد معجزہ قرآن تھا۔ اور اگر وہ سیرت کو یہ مقام نہیں دیتا تو اسے قرآن کے بھی معجزہ ہونے کا انکار کر دینا

[1] اس کتاب کے شروع میں جو تمہیدی مباحث ہیں ان میں ایک مستقل فصل میں میں نے اس مکتب فکر کا تذکرہ کیا ہے اور اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے بالتفصیل بحث کی ہے۔

چاہئے، اس لئے کہ آپ کے دیگر معجزات کا علم بھی ہمیں اسی ذریعے سے ہوا ہے جس سے معجزۂ قرآن کا علم ہوا ہے، پھر ایک کو تسلیم کر لینا اور دوسرے کی خواہش نفس کے مطابق تاویل کرنا مطالعہ و تحقیق کی دنیا کی عجیب و غریب منطق ہے جو کسی شریف اور صاحب عقل شخص کو زیب نہیں دیتی۔

۸۔ قارئین نے اس کتاب کا جس پسندیدگی اور جوش و جذبے کے ساتھ استقبال کیا وہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ شر کے علمبرداروں، فکری حملہ آوروں، مستشرقین اور ان کے ہم نواؤں اور جاہلوں نے طویل عرصے میں جو عظیم جد و جہد کی ہے اور پے در پے کتابوں کا جو انبار لگا دیا ہے وہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنا دینے پر قادر نہیں ہو سکا ہے اور یہ کہ فکری حقیقت پر کبھی شب خوں نہیں مارا جا سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایک عرصے تک وہ فریب میں مبتلا رکھیں اور حق پر باطل کا لبادہ چڑھا کر اسے مشتبہ بنا دیں... مگر آخر کار فریب کا پردہ چاک ہو کر رہتا ہے، شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور حقیقت از سر نو نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ غور و تدبر اور بحث و تحقیق کرنے والوں کے لئے اس میں عبرت و نصیحت کا سامان ہے جس سے ان کے افکار میں مزید جلا اور تازگی پیدا ہو گی۔

لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان ان آخری سالوں میں اپنے عظیم اسلامی نظام سے دور ہو گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی یہ بات صحیح ہو۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ نئی مسلمان نسل آج اسلامی شعور، دقیق غور و فکر اور مشاہدہ کی جتنی صلاحیتوں سے مالا مال ہے ان سے مسلمان ماضی قریب کے کسی عہد میں بہرہ ور نہ تھے۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرے گا کہ یہ شعور ایک فعال مثبت تحریک کی صورت اختیار کر لے گا جو انحرافات کی تصحیح کرے گی، کجی کو درست کرے گی اور اسلامی نظام کو از سر نو قائم کرے گی۔

۹۔ دوسری جانب میں نے ان بحثوں کو لکھتے وقت خالص ادبی تجزیاتی اسلوب سے احتراز کرتے ہوئے تدریسی اسلوب اختیار کیا ہے، جس میں واقعات بیان کرنے کے بعد ان سے احکام اور اصول مستنبط کیے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ جس حلقے میں یہ کتاب پیش کی جا رہی ہے، وہ مؤخر الذکر اسلوب سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس انداز بحث سے قارئین کی پسندیدگی نے مجھے آمادہ کیا کہ میں اس میں مزید وسعت اور باریکی سے کام لوں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ میں نے بحث

و تحقیق کا حق نہیں ادا کیا ہے اور تمام موضوعات پر کلام نہیں کیا ہے۔ اس لئے کہ اولاً مجھے اپنی درماندگی اور بے بضاعتی کا احساس ہے۔ ثانیاً میں نہیں چاہتا کہ مسائل، احکام اور ان کے متعلقات پر بحثوں کو اتنا طول دے دوں کہ قاری کے لئے بآسانی پوری کتاب کا مطالعہ دشوار ہو جائے۔ کیونکہ کتاب اگر اس حد سے تجاوز کر جائے گی تو میری نظر میں اس کا فائدہ کم ہو جائے گا اور وہ ایسا مرجع بن جائے گی جس سے صرف مخصوص موقعوں پر استفادہ کیا جا سکے، عام حالات میں اس کا مطالعہ آسان نہ رہے گا۔

☆☆☆

۱۰۔ یہ اور بات ہے کہ بعض دوسرے لوگوں کو میرا یہ کام پسند نہیں آیا اور انہوں نے اس پر تنقید کی، لیکن افسوس کہ یہ تنقید خالص علمی انداز میں سامنے آنے کے بجائے کینہ و حسد کے پیراہن میں تھی۔ اگر کسی مخلص بھائی کی جانب سے مجھے متنبہ کیا جاتا کہ تم نے فلاں بحث میں غلطی کی ہے یا فلاں حکم یا دلیل بیان کرنے میں صحت کو ملحوظ نہیں رکھا ہے تو میں اس کا شکریہ ادا کرتا اور اس کے لئے اجر و ثواب کی دعا کرتا، مگر اس کے بجائے مجھے لاحاصل باتیں سننے کو ملیں، اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مقصد بدخواہی، انتقام اور بے جا عصبیت ہے۔

۱۱۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے طریقہ اور آپ کے اصحاب کے عمل میں مجھے ایسی واضح مثالیں ملیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی میں بھی آپ کا وسیلہ اختیار کرنا جائز تھا اور آپ کے وصال کے بعد بھی۔ چنانچہ میں نے ناقابل تردید دلائل و براہین کے ساتھ اس کا اثبات کیا ہے۔ اسی طرح میں نے سیرتِ نبوی میں بعض ایسی مثالیں پائیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ آنے والے کی عزت افزائی میں کھڑے ہونا جائز ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے دلائل بیان کر دیے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ علماء کے نزدیک آنے والے شخص کے لئے کھڑے ہونے اور بیٹھے شخص کے روبرو کھڑے ہونے میں فرق ہے، اور یہ کہ سنت سے اس سلسلہ میں کیا وضاحت ہوتی ہے؟ پھر میں نے بیان کیا کہ سنت صحیحہ میں وارد شروط و قیود، اور اصول و احکام کے مطابق کسی شخص کے لئے کھڑا ہونا جائز ہے۔ اسی طرح سیرت میں میں نے ایسی مثالیں پائیں جن سے چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضا کی مشروعیت معلوم ہوتی تھی، خواہ وہ سہواً چھوٹ گئی ہوں یا جان بوجھ کر چھوڑی گئی ہوں۔ چنانچہ میں نے اس کے دلائل بیان کرتے ہوئے ان کی روشنی میں

حکم درج کر دیا۔ اگر دلائل میری ان باتوں کے برخلاف ہوتے تو میں کبھی انہیں اختیار نہ کرتا اور وہی بات کہتا جس کی طرف دلیل سے رہنمائی ہو رہی ہوتی۔ لیکن یہ بہرحال نہیں ہو سکتا کہ میں احکام کی دلالتوں اور دلیلوں سے چشم پوشی کر کے ان لوگوں کی تقلید کرنے لگوں جنھوں نے ائمہ اور جمہور علماء کی مخالفت میں ایک نیا مسلک وضع کر لیا ہے اور جن کی بڑی تعداد ان کی توہین کرنے بلکہ علی الاعلان ان پر لعنت بھیجنے سے باز نہیں آتی۔ ہم اللہ سے پناہ مانگتے ہیں کہ ہمارے نزدیک کوئی علمی بحث دلوں میں راسخ عصبیت کا روپ دھار لے۔

۱۲۔ کاش یہ گروہ لوگوں کو ان فروعی مسائل میں الجھائے رکھنے کے بجائے کوشش کرتا کہ وہ ان عظیم اور اہم مسائل و مشکلات میں سر کھپائیں جنھیں حل کرنے اور ان کی آفتوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کے لئے بہت زیادہ طاقت و قوت اور عظیم جد و جہد کی ضرورت ہے، لیکن حیرت ہے کہ وہ کثرت سے پیش آنے والے ان واقعات اور دین و ایمان پر شب خون مارنے والے ان مسائل سے بے پروا ہے اور اس نے اپنے لئے ایک گوشۂ عافیت بنا لیا ہے جس میں بیٹھ کر لوگوں کے درمیان ایسے مسائل بھڑکاتا رہتا ہے جن میں قدیم اختلافات کے علاوہ کوئی نئی چیز نہیں اور جن میں پڑنے سے دلوں میں کینے بھڑکنے کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں۔

اگر یہ گروہ اپنے رویے میں مخلص ہوتا تو اس کے شایانِ شان یہ تھا کہ جس رائے پر وہ مطمئن ہوتا اسے اختیار کر لیتا اور دوسروں کو بھی آزادی دیتا کہ جس مسلک اور رائے پر وہ مطمئن ہوں اسے قبول کر لیں اور لڑ جھگڑ کر، زیادتی کر کے اور دوسروں کی آراء کا مذاق اڑا کر لوگوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی پیہم کوشش سے باز رہتا۔ ہم سے پہلے تمام مسلمان اعتقاد اور عمل سے تعلق رکھنے والے تمام قطعی امور پر مضبوطی سے جمے رہتے تھے اور متحد ہو کر ان کا دفاع کرتے تھے۔ لیکن جب دیگر ظنی اجتہادی مسائل میں بحث کرتے تھے تو ان میں آپس میں اختلاف کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان میں متعدد مسالک پیدا ہو جاتے تھے، لیکن کوئی بھی دوسروں پر اپنا سکہ جمانے اور اپنی رائے کا غلام بنانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اگر انہوں نے ایسا کیا ہوتا تو اسلامی اتحاد ابتدا ہی میں پارہ پارہ ہو چکا ہوتا اور اسلامی تاریخ میں قوت و طاقت، تہذیب اور عظمت کے وہ مظاہر مفقود ہوتے جو آج ہمارا سرمایۂ افتخار ہیں۔

۱۳۔ میں قاری سے درخواست کرتا ہوں کہ جن مسائل پر بحث کے دوران میں نے

مذکورہ گروہ کی رائے کی مخالفت کی ہے اور جمہور کے مسلک سے اتفاق ظاہر کیا ہے ان کے دلائل میں غور کرے، ان کی صحت اور قوت کا اندازہ کرے اور طریقۂ استدلال کو اچھی طرح سمجھ لے، پھر جس رائے پر اس کی عقل مطمئن ہو اسے قبول کر لے۔ لیکن فکری عصبیت کو نفس میں گھر کر لینے کا موقع نہ دے۔ مسئلہ یہ نہیں کہ کسی معاملے میں دو لوگوں کی رایوں میں اختلاف ہو اور ہر ایک کے پاس مضبوط دلیل ہو، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کوئی رائے دل میں راسخ عصبیت کی شکل اختیار کرے۔

میں اللہ سبحانہ سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں حق پر متحد کرے، ہمیں سیدھا راستہ دکھائے اور ہمارے تمام اعمال میں اخلاص پیدا فرمائے۔ وہ دعاؤں کو سننے والا اور انھیں شرفِ قبولیت بخشنے والا ہے۔

دمشق — محمد سعید بن ملا رمضان البوطی

۱۷ر جمادی الاولی ۱۳۸۸ھ / ۱۰ر ستمبر ۱۹۶۸ء

باب اوّل

تمہیدی مباحث

- اسلام کے فہم میں سیرتِ نبوی کی اہمیت
- مطالعۂ سیرت کے ارتقائی ادوار اور اس کا صحیح طریقہ
- جزیرۃ العرب اسلام کا گہوارہ کیوں بنا؟
- دعوتِ محمدی کا تعلق سابقہ آسمانی دعوتوں سے
- عہدِ جاہلیت اور بقایائے حنیفیت

اسلام کے فہم میں سیرتِ نبوی کی اہمیت

سیرتِ نبوی کے مطالعے کا مقصد محض یہ نہیں ہے کہ تاریخی واقعات سے آگاہی اور عہد نبوی میں پیش آنے والے حوادث کا اجمالی یا تفصیلی علم ہو جائے، اس لئے سیرتِ نبوی کے مطالعے کو دیگر تاریخی مطالعات کی حیثیت دینا اور آنحضرت ﷺ کی سیرت سے اس طرح واقفیت حاصل کرنا جیسے کسی خلیفہ کی سیرت یا کسی گزشتہ تاریخی عہد کے بارے میں حاصل کی جاتی ہے، مناسب نہیں ہے۔ مطالعۂ سیرت کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اسلامی حقائق کو اصول و ضوابط اور احکام کی حیثیت سے نظریاتی طور پر سمجھ لینے کے بعد انھیں آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں عملی شکل میں دیکھے۔ یعنی سیرتِ نبوی کا مطالعہ محض ایک تطبیقی عمل ہے جس کے ذریعے اسلامی حقائق کو کامل ترین شکل میں اعلیٰ ترین نمونہ — حضرت محمد ﷺ کی شخصیت — میں متشخص دیکھا جاتا ہے۔ اس مقصد کا اگر ہم بالتفصیل تجزیہ کریں تو اسے درج ذیل تفصیلی مقاصد میں بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات اور احوال کا مطالعہ کر کے آپ کی نبوی حیثیت کو سمجھا جا سکے اور اس چیز کی بخوبی وضاحت ہو جائے کہ آنحضرت ﷺ محض ایک عبقری شخصیت کے مالک نہ تھے جسکی بنا پر آپ کو اپنی قوم میں عظمت حاصل ہو گئی تھی، بلکہ آپ کی اولین حیثیت رسول کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی اور خصوصی تائید سے نوازا تھا۔

۲۔ تاکہ انسان کے سامنے اعلیٰ واشرف زندگی کے ہر معاملے میں عظیم نمونہ موجود رہے، اور وہ اسے اپنا دستور اور جادۂ منزل بنالے۔ یقیناً انسان جب بھی زندگی کے کسی پہلو میں اعلیٰ نمونہ کا متلاشی ہوگا، اسے واضح اور کامل ترین صورت میں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں پائے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اسے پوری انسانیت کے لئے رہنما بنادیا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (الاحزاب:۲۱)

(درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے)

٣۔ تاکہ انسان سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ کر کے اس سے کتاب الٰہی کو سمجھنے اور اس کی روح اور مقاصد سے آگاہی حاصل کرنے میں مدد لے سکے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی بکثرت آیات کی تفسیر و توضیح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور ان کے سلسلے میں آپ کے رویّوں سے ہوتی ہے۔ G-3/87

٤۔ تاکہ مطالعۂ سیرت کے ذریعے ایک مسلمان کے پاس عقیدہ، احکام اور اخلاق سے متعلق صحیح اسلامی تعلیمات کا ایک وافر ذخیرہ ہو جائے۔ اس لئے کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی اسلام کے تمام اصول و احکام کا عملی نمونہ تھی۔

٥۔ تاکہ داعی اور معلم کے سامنے طریقہائے تربیت و تعلیم کا ایک زندہ نمونہ رہے۔ اس لئے کہ حضرت محمد ﷺ ایک خیرخواہ معلم اور عظیم مربی تھے جس نے دعوت کے مختلف مراحل میں تعلیم و تربیت کے نفع بخش اور پاکیزہ طریقے اختیار کرنے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کی۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے سے مذکورہ بالا تمام مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ کی حیات انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام پہلوؤں پر حاوی تھی۔ اس سے ایک ایسے نوجوان کا نمونہ سامنے آتا ہے جو کردار کا صاف ستھرا اور اپنی قوم کے لوگوں اور معاشرے کے افراد کے ساتھ امانت دار ہے۔ ایک ایسے داعی کا نمونہ سامنے آتا ہے جو لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہے اور اپنے پیغام کی تبلیغ کے راستے میں پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ ایک ایسے سربراہ حکومت کا نمونہ سامنے آتا ہے جو پوری مہارت اور انتہائی حکمت کے ساتھ معاملات نپٹاتا ہے۔ ایک ایسے مثالی شوہر کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے۔ ایک ایسے باپ کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنی اولاد کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتا ہے۔ ایک ماہر فوجی سپہ سالار اور زیرک سیاستداں کا نمونہ سامنے آتا ہے۔ ایک ایسے مسلمان کا نمونہ سامنے آتا ہے جو اپنے رب کا عبادت گزار اور اس کی طرف یکسو ہوتا ہے اور اپنے اہل و عیال اور اصحاب کے ساتھ بھی پر لطف زندگی گزارتا ہے اور دقت و باریکی کے ساتھ دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھتا ہے۔

سیرت نبوی کے مطالعے سے انسانی زندگی کے یہ تمام پہلو اعلیٰ ترین نمونہ اور کامل ترین شکل میں ہمارے سامنے ابھر کر آجاتے ہیں۔

مطالعۂ سیرت کے ارتقائی ادوار
اور
اس کا صحیح طریقہ

سیرت نبوی اور تاریخ

اس میں شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ اس عظیم تاریخ کی تحریک کی اولین بنیاد ہے جس پر تمام مسلمان فخر کرتے ہیں خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں اور کسی علاقے کے رہنے والے ہوں۔ سیرت نبوی ہی سے آغاز کر کے مسلمانوں نے تاریخ کی تدوین کی... اس لئے کہ تاریخی واقعات سے متعلق جو چیزیں وہ سب سے پہلے ضبط تحریر میں لائے وہ سیرت نبوی کے واقعات ہی تھے۔ اس کے بعد ان واقعات کے تدوین عمل میں آئی جو عہد نبوی کے بعد سے آج تک پیش آئے ہیں۔ یہی نہیں کہ جزیرۃ العرب میں اسلام سے قبل عہد جاہلیت کی تاریخ کو بھی عرب اور غیر عرب مسلمانوں نے محفوظ اور مدوّن کیا۔ بایں طور سیرت نبوی وہ محور ہے جس کے گرد جزیرۃ العرب میں اسلامی تاریخ کی تدوین کی تحریک گردش کرتی ہے، اور وہ عامل ہے جس نے جزیرۃ العرب کے حالت کو اولاً اور پورے عالم اسلام کے حالات کو ثانیاً متاثر کیا ہے۔

واقعات کو جمع کرنے اور ان میں صحیح اور غلط کو پرکھنے کے سلسلے میں عرب اور غیر عرب مسلمانوں نے تاریخ نویسی کے فن کو جس دقیق علمی نہج پر استوار کیا، دوسری قوموں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نہج کو دریافت کرنے اور کامیابی کے ساتھ اسے اپنی تاریخی تحریروں میں برتنے پر وہ کبھی قادر نہ ہو سکتے تھے اگر ان کے سامنے سیرت نبوی کی تدوین کا مرحلہ نہ آیا ہوتا۔

انھوں نے دینی حیثیت سے اپنے اوپر لازم گردانا کہ تدوین سیرت کا کام پوری صحت کے ساتھ اس طرح انجام دیں کہ اس میں وہم کی آمیزش ہو سکے نہ بے بنیاد خبریں اور افواہیں سرایت کر سکیں۔ اس لئے کہ انھیں معلوم تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور سنت دونوں کتاب الٰہی کے فہم کی اولین کلید اور اس پر عمل اور تطبیق کی کیفیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔ انھیں کامل یقین تھا کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے نبی ہیں، قرآن اللہ کا کلام ہے، انھیں اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ قیامت کے دن بڑی باریکی سے اس کا حساب لے گا۔ ان تمام باتوں پر یقین نے انھیں آمادہ کیا کہ وہ ایک ایسا علمی نہج دریافت کرنے کی انتھک کوشش کریں جس کے ذریعے سیرت اور سنت نبوی کے حقائق کو محفوظ رکھا جاسکے۔ علمی نہج سے میری مراد اصولِ حدیث اور علم جرح و تعدیل ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ علوم اولاً سنتِ مطہرہ کی خدمت کے لئے وضع کیے گئے تھے، اور سیرت نبوی کی حیثیت اس کی بنیاد کی سی ہے۔ پھر انھیں عام تاریخ نویسی کے میدان میں بھی اختیار کر لیا گیا، اور وہ حقائق اور خرافات کے درمیان تمیز کی کسوٹی قرار پائے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ سیرت نگاری وہ اہم اور کشادہ شاہ راہ ہے جس پر چل کر مسلمان عام تاریخ کے مطالعے اور تدوین کی طرف مائل ہوئے اور یہ کہ انھوں نے روایات اور واقعات کی تحقیق کے لئے جن علمی اصول و ضوابط کا سہارا لیا ہے۔ وہ وہی ہیں جنھیں اسلام کے اولین سرچشموں کی حفاظت کے لئے وضع کیا گیا تھا۔

سیرت نگاری کا آغاز اور ارتقاء:

زمانی ترتیب میں سیرت نگاری کا مرحلہ تدوین سنت کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ سنت یعنی حدیث نبوی کی تدوین کا کام عموماً سیرت نبوی کے موضوع پر تصنیف و تالیف سے قبل ہی ہونے لگا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اطمینان ہو گیا کہ صحابہ پر قرآن کے معجزانہ اسلوب اور حدیث کے بلیغ اسلوب کا فرق بالکل واضح ہو گیا ہے اور اب ان کی طرف سے دونوں میں خلط ملط کرنے کا کوئی اندیشہ نہیں رہ گیا ہے تو آپ نے احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کی اجازت بلکہ حکم دے دیا۔ اس طرح سنت کی تدوین کا آغاز آپ کی حیات طیبہ ہی میں ہو گیا تھا۔

رہا آنحضرت ﷺ کی حیات طیبہ اور مغازی کی تفصیلات کو ضبط تحریر میں لانے کا معاملہ تو یہ کام تدوین سنت کے بعد انجام پایا، اگرچہ صحابہ آپ کی سیرت اور مغازی کو زبانی بیان کرنے کا اہتمام پہلے بھی کرتے تھے۔ سیرت نگاری میں اولیت کا شرف غالباً عروہ بن زبیر (متوفی ۹۲ھ) کو حاصل ہے۔ اس کے بعد ابان بن عثمان (متوفی ۱۰۵ھ) وہب بن منبہ (متوفی ۱۱۰ھ) شرحبیل بن سعد (متوفی ۱۲۳ھ) اور ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) نے بھی اس میدان میں خدمات انجام دیں۔ یقیناً ان لوگوں کا نام سیرت نگاری کی خدمت انجام دینے والوں میں سرفہرست ہے۔ اسی طرح ان کی تحریروں کو اس عظیم علمی کام میں اولیت کا شرف حاصل ہے، بلکہ وہ تاریخ نویسی کا اولین مرحلہ گردانی جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سیرت کے بہت سے واقعات کتاب اللہ اور کتب احادیث — جن میں آپؐ کے اقوال و افعال بیان کئے گئے ہیں — میں بکھرے ہوئے موجود ہیں۔

ان اولین سیرت نگاروں کی تمام تحریریں حوادث زمانہ کی نذر ہو گئیں اور ان میں سے کچھ بھی ہم تک نہیں پہنچا، سوائے چند منتشر روایات کے، جنھیں طبری نے نقل کیا ہے، اور وہب بن منبہ کی کتاب کے ایک جزء کے، جس کے ہائڈلبرگ (جرمنی) میں محفوظ ہونے کی خبر دی گئی ہے۔ لیکن یہ تحریریں مابعد طبقے کے لوگوں کی دسترس میں تھیں، چنانچہ انھوں نے ان کا بڑا حصہ اپنی تصنیفات میں شامل کر لیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان میں سے اکثر تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ اس طبقے میں محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۲ھ) سرفہرست ہیں۔ محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محمد بن اسحاق کی کتاب اس عہد میں سیرت نبوی پر لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ معتبر ہے۔[1] اگرچہ ان کی کتاب "مغازی" اپنی اصلی صورت میں ہم تک نہیں پہنچی ہے لیکن اس کی تالیف کے تقریباً پچاس سال بعد ابن ہشام نے اس کی تہذیب و تنقیح کر کے جو کتاب تیار کی تھی وہ ضرور دستیاب ہے۔ ابن خلکان نے لکھا ہے: "یہ ابن ہشام وہی ہیں جنھوں نے ابن اسحاق کی کتاب المغازی والسیر کی تہذیب و تلخیص کر کے ایک کتاب میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے واقعات جمع کئے تھے۔ یہ کتاب آج کل دستیاب ہے اور سیرت ابن ہشام کے نام سے معروف ہے۔"[2]

---

[1] ابن اسحاق کی سوانح حیات کے لئے دیکھئے: ابن سید الناس کی کتاب عیون الاثر کا مقدمہ

[2] وفیات الاعیان، ج ۱، ص ۲۹۰، المطبعۃ المیمنیۃ، مصر

بہر صورت سیرت نبوی کے مصادر جن پر تمام سیرت نگاروں نے بھروسہ کیا ہے خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، درج ذیل ہیں:

۱۔ کتاب اللہ: یہ نبی ﷺ کی حیات طیبہ کے عام حالات جاننے اور آپ کی پاکیزہ سیرت کے اجمالی مراحل سے واقف ہونے کا اولین ذریعہ ہے، اس سے قطع نظر کہ ان کا تذکرہ کس اسلوب میں کیا گیا ہے۔

۲۔ کتب احادیث: یہ وہ کتابیں ہیں جنھیں صداقت و امانت میں شہرت رکھنے والے ائمہ حدیث نے مدوّن کیا ہے مثلاً صحاح ستہ، امام مالک اور مسند امام احمد وغیرہ۔ ان اولین کتب احادیث میں رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال کو اس حیثیت سے جمع کیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی کا سرچشمہ ہیں۔ ان سے تاریخ کی تدوین مقصود نہ تھی۔ اسی لئے ان میں سے بہت سی کتابوں میں احادیث کو فقہی ابواب کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے اور کچھ کی ترتیب احادیث روایت کرنے والے صحابہ کرام کے ناموں کے اعتبار سے ہے۔ ان میں واقعات کی زمانی ترتیب کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔

۳۔ وہ راوی جنھوں نے نبی ﷺ کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ طبقۂ صحابہ میں سے بہت سے لوگ اس کا اہتمام کرتے تھے بلکہ کوئی صحابی ایسا نہیں ہے جو کسی موقعے پر رسول ﷺ کی صحبت میں رہا ہو اور اس نے اس وقت پیش آنے والے امور کا تذکرہ دیگر صحابہ اور بعد کے لوگوں سے ایک سے زائد مرتبہ نہ کیا ہو۔ لیکن ابتداء میں کسی صحابی نے واقعات سیرت کے جمع و تدوین میں دلچسپی نہ لی۔ یہاں میں تحریر اور تالیف یا تدوین میں فرق واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جہاں تک احادیث کو ضبط تحریر میں لانے کا تعلق ہے یہ کام رسول ﷺ کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا۔ رہا تدوین کا کام یعنی کتابی صورت میں یکجا کرنا تو یہ اس وقت ہوا جب مابعد عہد میں اس کی ضرورت محسوس کی گئی۔

سیرت نگاری کا علمی طریقہ

سیرت نگاری کا شمار تاریخ نویسی کے ذیل میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سیرت نبوی تاریخ کا نقطۂ آغاز تھی اور اس کے ذریعے عہد نبوی سے ماقبل اور مابعد کے واقعات و حوادث کو بھی قلم بند

کرنے کی تحریک ملی، لیکن سیرت نگاروں نے کتب سیرت کی تصنیف و تالیف میں کیا طریقہ کار اپنایا ہے؟

انہوں نے علمی اصول و قواعد — جن کا ہم عنقریب تذکرہ کریں گے — پر مبنی جو طریقہ کار اپنایا تھا اسے تاریخ نویسی کے میدان میں "معروضیت" کا نام دیا جاتا ہے۔ واقعات سیرت کو قلم بند کرنے کے سلسلے میں ان کا کام بس یہ تھا کہ جو کچھ پیش آ چکا ہے اسے علمی کسوٹی پر ثابت کر دیں۔ یہ کسوٹی اصول حدیث اور قواعد جرح و تعدیل پر مشتمل تھی۔ اول الذکر میں روایات کی اسناد اور متون سے بحث کی جاتی ہے اور مؤخر الذکر کا تعلق راویوں کی سوانح اور حالات سے ہوتا ہے۔

وہ سمجھتے تھے کہ ان انتہائی دقیق علمی قواعد کی چھلنی سے گزر کر جس تاریخی واقعے کا علم حاصل ہوتا ہے وہ ایک مقدس حقیقت ہے جسے بعینہ لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔ یہ ایک ناقابل معافی جرم اور عظیم خیانت ہے کہ ذاتی تجزیوں اور نفسانی خواہشات کو جو اکثر ماحول کا انعکاس اور عصبیت کا نتیجہ ہوتی ہیں، مسلط کر لیا جائے اور ان کی بنیاد پر جو چاہا جائے پیش کیا جائے اور جو چاہا جائے چھپا لیا جائے۔

علمی اصول و قواعد کے ذریعے اس تحفظ کے ساتھ اور تاریخ کے اس معروضی نقطۂ نظر کی بنیاد پر حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ ہم تک پہنچی ہے اور آپ کی زندگی کی تفصیلات کا ہمیں علم ہوا ہے مثلاً ولادت، نسب، بچپن، نو عمری اور جوانی کے مراحل میں پیش آنے والے خارق عادت واقعات، بعثت، نزول وحی، اخلاق، صداقت و امانت، آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ظاہر ہونے والے معجزات، حکم الٰہی کی تعمیل میں پیش آنے والے مراحل دعوت، صلح، دفاع، جہاد عام، دعوت الٰہی کو درپیش چیلنج، قرآن اور اس کی تشریح و توضیح کرنے والی احادیث نبوی کے ذریعے حاصل ہونے والے شرعی احکام و اصول وغیرہ۔

آنحضرت ﷺ کی سیرت کے اس سلسلۂ واقعات کی نسبت سے تاریخی عمل بس اتنا ہے کہ وہ بہت محفوظ طریقے پر علمی امانت و دیانت کے ساتھ ہم تک پہنچے ہیں اور اس سلسلے میں روایات کی اسناد و متون کی صحت اور راویوں کے معتبر ہونے کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ جہاں تک ان واقعات کو پورے طور پر قبول کر کے ان سے نتائج و احکام اور اصول و مبادی مستنبط کرنے کا

تعلق ہے تو یہ بالکل دوسرا عمل ہے جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں کو کسی بھی حال میں خلط ملط نہیں کیا جاسکتا۔ مؤخر الذکر بالکل الگ اور مستقل نوعیت کا علمی کام ہے جو دوسرے نہج اور قواعد و ضوابط پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعے واقعات سے نتائج اور اصول مستنبط کر کے انھیں ایسے علمی قالب میں پیش کیا جاتا ہے جو وہم اور نفسانی خواہشات (جنھیں ولیم جیمس جیسے لوگ "ارادۃ الاعتقاد" سے تعبیر کرتے ہیں) کے تسلط سے آزاد ہو۔

ان قواعد میں قیاس استقرائی، قانونِ التزام اور اس کی مختلف انواع، دلالت اور اس کی انواع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

سیرت نبوی کے واقعات سے ان قواعد کی روشنی میں بہت سے احکام مستنبط کئے گئے۔ ان میں سے کچھ کا تعلق عقائد وایمانیات سے ہے اور کچھ قانون سازی اور معاملات سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے لئے یہ جاننا بہت اہم ہے کہ وہ تدوینِ تاریخ سے علیحدہ اور اس کے معنی و مفہوم سے غیر متعلق ہیں۔ درحقیقت وہ اس علمی جد وجہد کا نتیجہ ہیں جو مذکورہ بالا علمی قواعد پر مبنی تاریخی عمارت کے حدود میں برپا ہوئی ہے۔

سیرتِ نبوی تاریخ نویسی کے جدید مسالک کی روشنی میں

انیسویں صدی میں تاریخ نویسی اور اس کی تدوین کے سلسلے میں معروضی طریقہ (جسے سائنسی نقطہ نظر کا بھی نام دیا جاتا ہے) کے علاوہ دیگر بہت سے طریقے وجود میں آئے۔ ان تمام طریقوں کا نقطۂ اشتراک "نظریۂ ذاتیت" ہے جس کے علم برداروں اور سرگرم داعیوں میں سے ایک فرائڈ ہے۔ اس نظریہ کو ماننے والے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے کہ مؤرخ واقعات کی تشریح و تعلیل اور ان کے کرداروں کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت اس میں ذاتی رجحان یا اپنے فکری، مذہبی یا سیاسی نقطہ نظر کو داخل کردے، بلکہ وہ اسے مؤرخ کی ذمہ داری تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کا کام محض خبریں دے دینا اور واقعات کو بلا تبصرہ نقل کر دینا ہی نہیں ہے۔ یہ طریقہ تاریخ نویسی کو خالص فنی عمل بنا دیتا ہے اور اس کی دقیق علمی حیثیت او جھل ہو جاتی ہے۔

یہاں ان تاریخی مسالک پر روشنی ڈالنے اور ان کا تنقیدی جائزہ لینے کا موقع نہیں۔ لیکن

میں اس امر پر اظہار افسوس سے نہیں رک سکتا کہ اس زمانے میں جب کہ سائنس اور اس کی منہاج کو اہمیت دی جانے لگی ہے، اس نظریے پر ایمان رکھنے والے اور اس کا علم بلند کرنے والے موجود ہیں۔ یہ نظریہ مفروضات، خیالات اور خواہشات نفس کے سہارے ان تمام حقائق اور واقعات کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے جنھیں زمانہ مختلف نسلوں کے درمیان اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس وہمی اور ظالمانہ قانون کے تحت نہ جانے کتنے حقائق مسخ ہوگئے، کتنے واقعات تبدیل ہوگئے، کتنی عظمتیں پامال ہوئیں اور کتنے معصوم اور بے گناہ مجرم ٹھہرے۔

کیا اس نئے نظریے نے سیرت نگاری اور اس کے طریقۂ تحلیل و تجزیہ کو بھی متاثر کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نویسی کا یہ نیا نظریہ محققین کے ایک گروہ کے نزدیک سیرت نبوی کے مطالعے اور فہم کے سلسلہ میں ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد بن گیا ہے۔ یہ مکتب فکر کیوں کر وجود میں آیا؟ اس کے پروان چڑھنے اور ترقی پانے کے عوامل کیا تھے؟ اور وہ آج کس دور سے گزر رہا ہے؟...

یہ مکتب فکر مصر پر برطانیہ کے تسلط کے ایام میں وجود میں آیا۔ ہم جانتے ہیں کہ مصر اس زمانے میں عالم اسلامی کا مرجع بنا ہوا تھا۔ جب بھی اسلام کے بارے میں علمی سطح پر کوئی بحث چھڑتی یا کوئی موضوع زیر بحث آتا، نگاہیں مصر ہی کی طرف اٹھتی تھیں۔ لوگ استفہام واستفتاء کے لئے ازہر کا اسی طرح رخ کرتے تھے جس طرح حج یا نماز میں خانہ کعبہ کا رخ کرتے ہیں۔

ایک جانب یہ پر ہیبت آواز تھی اور دوسری جانب سارا عالم اسلامی ہمہ تن گوش تھا۔ یہ صورتِ حال برطانوی سامراجیوں کو چین سے بیٹھنے دینے والی نہیں تھی۔ اگر چہ شمشیر و سنان کی طاقت اور عسکری تسلط کے ذریعے برطانیہ نے پورے مصر کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، لیکن یہ چیز عارضی تھی۔ جب تک اس زندہ قیادت کی باگ ڈور ازہر کے ہاتھ میں تھی اس وقت تک یہ غلامی دیرپا نہیں ہو سکتی تھی اس لئے برطانوی سامراج کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ ان کے علاوہ اور کوئی تیسرا راستہ نہ تھا۔

اول یہ کہ ازہر سے امت مسلمہ کا رابطہ منقطع کر دیا جائے، بایں طور پر کہ اس کی قیادت بے اثر ہو کر رہ جائے۔

دوم یہ کہ خود ازہر کے مرکز قیادت تک خفیہ رسائی حاصل کرلی جائے اور اسے اس رخ

پر چلایا جائے جس سے برطانیہ کے مفادات پورے ہوسکیں اور اسے اطمینان اور استحکام کے ساتھ اپنا تسلط جمانے کے مواقع حاصل ہوسکیں۔ برطانیہ نے دوسرا راستہ اختیار کرنے میں دیر نہیں لگائی اس لئے کہ اس میں آسانیاں بھی تھیں اور اس کا انکشاف ہو جانے کے امکانات بھی کم تھے۔ [3]

ازہر کی علمی وفکری قیادت تک خفیہ دراندازی کا واحد راستہ یہ تھا کہ اس تکلیف دہ مقام ضعف کو نشانہ بنایا جائے جس سے پوری امت مسلمہ بشمول اہل مصر کے احساسات مجروح تھے۔ ایک جانب مسلمان بے حیثیت اور پس ماندگی، انتشار اور تفرقے کا شکار تھے اور دوسری جانب وہ دیکھ رہے تھے کہ مغرب نے علم وفکر اور تہذیب وتمدن کے مختلف میدانوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔۔۔۔ وہ اس دن کی آس لگائے ہوئے تھے جب انہیں ان بیڑیوں سے نجات ملے گی جن کی وجہ سے وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے، اور وہ تہذیب وتمدن اور سائنس کے قافلے میں دوسروں کے ہم دوش ہوسکیں گے۔

چنانچہ اس راستے سے مصر کے بعض فکری رہنماؤں کے دلوں میں گھسنے کی کوشش کی گئی۔ یہ استعمار کی بہت بڑی سازش تھی۔ اس طرح انہیں یہ سمجھایا گیا کہ مغرب کو اپنی بیڑیوں سے تبھی آزادی ملی جب وہاں مذہب سائنسی پیمانوں کے تابع ہوگیا۔۔۔ مذہب ایک چیز ہے اور سائنس دوسری چیز۔ دونوں کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی اسی وقت ہوسکتی ہے جب پہلا دوسرے کے تابع ہوجائے۔ اگر عالم اسلام واقعی اسی طرح کی آزادی چاہتا ہے تو اسے بھی وہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ اسے اسلام کو اسی طرح سمجھنا ہوگا جس طرح مغرب میں عیسائیت کو سمجھا گیا۔ اور یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک فکر اسلامی ان تمام غیبیات سے چھٹکارا نہ پالے جو ناقابل فہم ہیں اور سائنسی پیمانوں میں فٹ نہیں ہوتیں۔

اس سرگوشی کو ان لوگوں نے بہت جلد صحیح تسلیم کر لیا جن کی نگاہوں کو یورپی نشأۃ ثانیہ کے مظاہر نے خیرہ کر دیا تھا، ان کے دلوں میں ایمانی حقائق راسخ تھے نہ ان کے ذہنوں میں سائنس کے حقائق وضوابط کا کوئی واضح تصور تھا۔ انہوں نے ہر اس غیبی عقیدہ کو تسلیم نہ کرنے کا اعلان کر دیا جس تک سائنسی تحقیقات کی رسائی نہ ہوسکی ہو اور جو انسانی تجربہ ومشاہدہ کے

[3] دیکھئے: مذکرات اللورد کرومر اور الاتجاهات الوطنية في الادب الحديث از ڈاکٹر محمد حسین

تحت نہ آسکا ہو۔

ان لوگوں نے جو سرگرمیاں انجام دیں انھیں بعد میں 'دینی اصلاح' کا نام دیا گیا۔ ان کی اصلاحی خدمات میں سے ایک خدمت یہ تھی کہ انہوں نے سیرت نگاری اور اس کے فہم کا ایک نیا طریقہ نکالا اور اس کے مطالعہ وتجزیہ کا ایک نیا نہج اپنایا جو ان کے ہدف سے میل کھاتا تھا اور جس میں غیبیات کے دائرے میں آنے والی تمام چیزوں اور خوارق کے دائرے میں آنے والے واقعات سے جو سائنس کی نظر میں ناقابل فہم اور ناقابل قبول تھے اعراض کیا گیا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے تاریخ نویسی کے سلسلے میں نظریۂ ذاتیت بہترین پناہ گاہ ثابت ہوا۔ اس کے ذریعے انھیں گوہر مقصود حاصل کرنے میں مدد ملی، اور سیرت نبوی پر ایسی کتابیں اور تحریریں منظر عام پر آنے لگیں جن میں روایت، سند اور نقل حدیث کے قواعد وشروط کا التزام کرنے کے بجائے ذاتی استنباط اور انفرادی ذوق کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور اپنی پسند کو معیار بنایا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس انداز تالیف میں مصنف کی نفسانی خواہشات، پوشیدہ اغراض اور رجحانات کا در آنا لازمی تھا۔ اس نہج کو اپنا کر ان اہل قلم نے سیرت نبوی میں معجزات اور خوارق کے قبیل کی ان تمام چیزوں کو محال قرار دے دیا جو عادت کے خلاف ہوں۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لئے عبقریت، عظمت، شجاعت اور ان جیسی دیگر صفات کا کثرت سے استعمال کیا تاکہ قاری کا ذہن ان سے ہٹ کر نبوت، وحی، رسالت اور دیگر ان امتیازی صفات کی طرف منتقل ہی نہ ہونے پائے جو آپ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حسین ہیکل کی کتاب "حیاتِ محمدؐ" Life of Mohammad سیرت نگاری کے اس رجحان کا بہترین نمونہ ہے۔ مصنف نے اپنے اس نقطہ نظر کا اظہار دوٹوک الفاظ میں بڑے فخر سے کیا ہے، لکھتا ہے:

"میں اپنی اس کتاب میں سیرت اور حدیث کی کتابوں کا پابند نہیں رہا ہوں۔ بلکہ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے علمی انداز میں پیش کروں۔۔۔!"

سیرت نگاری اور اس کے فہم کے اس نئے انداز کا ایک نمونہ مرحوم محمد فرید وجدی کا وہ سلسلۂ مقالات ہے جو مجلہ نور الاسلام میں السيرة المحمدية تحت ضوء العلم والفلسفة (سیرت محمدی سائنس اور فلسفہ کی روشنی میں) کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک جگہ

انہوں نے لکھا ہے:

"ہمارے قارئین نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ سیرت نگاری کے سلسلے میں ہماری خواہش ہے کہ اعجاز کے کسی پہلو کو نمایاں کرنے میں ہم افراط سے کام نہ لیں جب تک عام اسباب کے تحت — خواہ کسی قدر تکلف سے کام لے کر — اس کی تعلیل ممکن ہو۔"

اسی طرح اس اندازِ تالیف کا نمونہ بعض مستشرقین کی وہ تحریریں بھی ہیں جو حضرت محمد ﷺ کی حیات طیبہ کے بارے میں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کی یہ تحریریں ان تاریخی کتابوں کے ضمن میں ہیں جو اس نظریۂ ذاتیت پر مبنی ہیں جن کی طرف گزشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا۔

یہ لوگ آنحضرت ﷺ کے تقدس کے گن گاتے ہیں: آپؐ کی عظمت اور اوصاف حمیدہ میں رطب اللسان رہتے ہیں، لیکن کسی ایسی چیز کی طرف ہلکا سا بھی اشارہ نہیں کرتے جس سے قاری کا ذہن آپؐ کی حیات طیبہ میں نبوت یا وحی کی طرف منتقل ہو جائے۔ پھر یہ لوگ سندوں اور روایتوں کا بھی اہتمام نہیں کرتے، اس لئے کہ اس صورت میں انہیں بعض ایسے واقعات پر یقین کرنا پڑے گا جن پر اعتماد کرنا یا انھیں بیان کرنا ان کے مفاد میں نہیں۔

اس طرح اس نئے مکتبِ فکر کے علم برداروں کو تاریخ نویسی کے نظریۂ ذاتیت میں وسیع میدان ملا جس کے ذریعے وہ سیرت نبوی کے ان تمام حقائق کا انکار کر سکتے ہیں جو انہیں پسند نہ آئیں، خواہ ان کی پشت پر علم ویقین کے کتنے ہی مضبوط دلائل کیوں نہ ہوں؟ ان لوگوں نے اپنے ذاتی میلانات خواہشات اور اغراض کو تاریخ کے حقائق اور اس کے پس پردہ عوامل کے تجزیے کے سلسلے میں حکم بنالیا اور ان پر کسی چیز کی قبولیت یا عدم قبولیت کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ انھوں نے ان تمام خارق عادت واقعات کی، جو سنت متواترہ بلکہ صراحۃً قرآن سے ثابت تھے، تاویل کرلی جس سے وہ عام واقعات کی طرح معلوم ہونے لگے۔ اگر ان واقعات کی بآسانی تاویل ممکن نہ ہو سکی تو انہوں نے تکلف اور کھینچا تانی سے بھی گریز نہ کیا، مثلاً "طیرا ابابیل" والی آیت اپنے مفہوم میں صریح اور واضح تھی، مگر اس کی تاویل "چیچک کے مرض" سے کی گئی۔ "اسراء" جس کا تذکرہ قرآن میں صراحۃً آیا ہے، اسے روحانی سفر اور عالم خواب پر محمول کیا گیا۔ غزوۂ بدر میں اللہ تعالی نے مسلمانوں کی مدد ملائکہ بھیج کر کی تھی جیسا کہ قرآن میں بصراحت ذکر ہے، مگر اس کی تاویل یہ کرلی گئی کہ اس غزوہ میں اللہ تعالی کی مدد محض معنوی تھی۔

اس طرز پر ہونے والی عجیب وغریب اور مضحکہ خیز تاویلات میں سے ایک یہ ہے کہ رسول ﷺ کی بعثت، صحابہ کرام کے ایمان اور اسلامی فتوحات وغیرہ کے بارے میں یہ کہہ دیا گیا کہ یہ سب دراصل دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت تھی، جسے حصول رزق اور وسعت پسندی کے مقصد سے اقتصادی تنازعات نے بھڑکایا تھا اور مالداروں اور جاگیرداروں کے خلاف فقراء کے ردّعمل نے اسے ہوا دی تھی۔

اسلامی تاریخ اور خاص طور پر سیرت نبوی کے مطالعے کا یہ انداز در حقیقت ایک خطرناک سازش تھی جسے بعض سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھیں نہ دیکھ سکیں، مگر منافقین اور خواہشات نفس کے اسیروں نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے ان کے درمیان خوب قبول عام حاصل ہوا۔ ان سادہ لوحوں کی نگاہوں سے یہ چیز پوشیدہ رہ گئی کہ مسلمانوں سے جس چیز کا مطالبہ کیا جارہا ہے جسے انھوں نے "اسلامی عقیدے کے معاملات میں اصلاحی انقلاب" کا نام دیا ہے، یہ در حقیقت ایک سامراجی چال ہے جس کا مقصد اس عقیدے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے۔

ان لوگوں سے یہ حقیقت اوجھل رہ گئی کہ اسلام کو اس کے غیبی حقائق سے عاری کر دیا جائے تو اس خلا کو پر کرنے کے لیے ایسی چیزوں کا سہارا لینا پڑے گا جو اس کے وجود کو فنا کر کے رکھ دیں گی۔ اس لئے کہ وحی الٰہی — جو اسلام کا سرچشمہ ہے — تمام خوارق اور غیبی حقائق میں سر فہرست ہے۔ جو شخص سیرت نبوی میں پیش آنے والی خارق عادت چیزوں کا انکار کرتا ہے اور اس کی یہ دلیل دیتا ہے کہ یہ چیزیں قوانین فطرت سے میل نہیں کھاتیں اور سائنس سے ان کی تائید نہیں ہوتی، وہ ٹھیک اسی دلیل سے وحی الٰہی کا بھی انکار کر بیٹھے گا اور حشر ونشر، حساب وکتاب اور جنت وجہنم سے متعلق اس کی خبروں کو بھی تسلیم نہیں کرے گا۔

ان لوگوں کے ذہنوں سے یہ چیز پوشیدہ رہ گئی کہ جو دین بذاتِ خود صالح ہو اسے کسی زمانے میں کسی مصلح کی ضرورت نہیں رہتی اور نہ وہ کسی ایسی اصلاح کو گوارا کر سکتا ہے جو اس کا جوہر ہی بدل کر رکھ دے۔

ان لوگوں سے یہ تمام حقیقتیں پوشیدہ رہ گئیں، حالانکہ ان کا ادراک سائنس کے اولین اور بنیادی تقاضوں میں سے تھا۔ دراصل وہ لوگ اس کی حقیقت سے بہرہ ور اور اس کی منطقیت سے ہم آہنگ نہ تھے۔ ان کی آنکھیں یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور ترقی سے خیرہ ہو کر رہ گئی تھیں اور

سائنس کی ظاہری چمک دمک نے انہیں سحرزدہ کردیا تھا، جس کی بنا پر علم و منطق کے حقائق تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ وہ ظاہر سے آگے بڑھ کر باطن کا مکمل فہم حاصل کریں اور الفاظ کے معانی کو صحیح طریقے سے ہضم کرنے کی کوشش کریں۔ انہوں نے یہ سب کچھ تو نہ کیا، بس ان کی فکر پر ایک ایسی اصلاحی تحریک کا خیال چھایا رہا جو اسلامی عقائد میں اسی طرح کا انقلاب برپا کر دے جس طرح یورپ میں مسیحی عقائد میں برپا ہوا۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ جدید مکتب فکر، جس کی طرف گزشتہ صفحات میں مختصراً اشارہ کیا گیا، اس کی کوئی حقیقی سائنسی بنیاد نہ تھی جس نے عقل کو اپنا گرویدہ بنالیا ہو، بلکہ وہ محض جذباتی اشتعال انگیزی پر مبنی تھا۔

موجودہ دور میں اس مکتب فکر کا انجام

حقیقت یہ ہے کہ ماضی میں سیرت نگاری اور اس کے فہم کے سلسلے میں اس مکتب فکر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور بعض لوگوں کی جانب سے جس سرگرمی اور جوش و جذبے کا مظاہرہ ہوا۔ وہ ایک تاریخی موڑ تھا جو گزر گیا.... وہ لوگ معذور تھے جن کے لئے اس پر پیچ راہ سے گزرنا مقدر تھا جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ ان لوگوں نے طویل غفلت اور مدہوشی کے بعد جب آنکھ کھولی تو سامنے یورپ کی علمی ترقیاں تھیں۔ اور یہ فطری بات ہے کہ جب روشنی سے پہلا سابقہ پیش آتا ہے تو نگاہیں چندھیاں جاتی ہیں، کچھ دکھائی نہیں دیتا اور شبیہیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ جب کچھ وقت گزر جاتا ہے اور آنکھیں روشنی کی عادی ہو جاتی ہیں تو چیزوں میں فرق و امتیاز ہونے لگتا ہے۔ حقائق واضح ہو جاتے ہیں اور کچھ بھی غموض والتباس باقی نہیں رہتا۔ ایسا ہی اس معاملے میں بھی ہوا۔ چنانچہ آج تعلیم یافتہ اور باشعور نئی نسل کی نگاہوں کے سامنے سے پردے ہٹ گئے ہیں اور تمام حقائق اپنی صحیح صورت میں نظر آنے لگے ہیں۔ ان کے پیش روؤں نے سائنس کے الفاظ کو پکڑ رکھا تھا اور اس کی ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھایا تھا، مگر انہوں نے اس کی حقیقت اور جوہر کو اپنے پیش نظر رکھا اور باخبر محقق اور آزاد مفکر کی بصیرت سے کام لیا۔ چنانچہ انہیں اس بات پر پختہ یقین حاصل ہو گیا کہ خوارق اور معجزات میں سے کوئی چیز اپنے جوہر میں سائنس کے حقائق اور معیارات سے متعارض نہیں ہو سکتی۔ غیر عادی چیزوں

کو خوارق کہا ہی اس لئے جاتا ہے کہ لوگ ان کے مشاہدے کے عادی نہیں ہوتے۔ عادت اور انسیت کوئی ایسا سائنسی معیار نہیں ہے جس کی بنا پر فیصلہ کیا جاسکے کہ کیا چیز ممکن ہے اور کیا چیز غیر ممکن؟ سائنس کبھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ صرف وہی چیزیں ممکن الوقوع ہیں جنھیں دیکھنے کی انسانی نگاہیں عادی اور ان سے مانوس ہوں۔ رہی وہ چیزیں جو نگاہوں کے لئے نامانوس ہوں اور ان کا کبھی مشاہدہ بھی نہ ہوا ہو تو ان کا وقوع ناممکن ہے۔

آج ہر محقق اور ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ اس سلسلے میں سائنسدانوں کی جدید ترین تحقیق یہ ہے کہ اسباب اور ان کے مسببات کے درمیان جو تعلق ہم دیکھتے ہیں وہ محض کثرت سے مشاہدے میں آنے والے ربط باہمی کا تعلق ہے جسے تحلیل و تجزیہ پھر تعلیل کے مراحل سے گزار کر اس سے ایک قانون مستنبط کر لیا گیا ہے۔ یہ قانون اس تعلق کے ظہور کے تابع ہے نہ کہ اس کے برعکس۔

اگر تم سائنسی قانون سے پوچھو کہ کسی خارق عادت واقعہ یا معجزۂ الٰہی کے بارے میں اس کی رائے کیا ہے؟ تو وہ زبان حال سے (جسے ہر سائنسداں بلکہ عصری ثقافت سے بہرہ ور ہر شخص بآسانی سمجھ لے گا) یہی جواب دے گا کہ خوارق و معجزات میرے دائرۂ بحث اور موضوع اختصاص سے خارج ہیں، ان کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔ اگر کوئی خارق عادت واقعہ پیش آتا ہے تو اسی وقت وہ ایک ایسا موضوع بن جائے گا جس میں غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کیا جائے گا، اس کی علت معلوم کی جائے گی پھر اس سے ایک قانون مستنبط کر لیا جائے گا۔ [1]

وہ زمانہ گزر گیا جب بعض سائنسداں یہ گمان کرتے تھے کہ طبعی اسباب کا اثر ان کے مسببات پر حتمی ہوتا ہے، اس کی کبھی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں علمائے اسلام اور خاص طور پر امام غزالی نے بہت مدلل بحث کی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ اسباب اور مسببات کے درمیان تعلق محض یکجائی کا ہوتا ہے۔ علم کی مثال اس کے احکام اور قوانین کے سلسلے میں محض ایک دیوار کی سی ہے جو محض اس یکجائی کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس یکجائی کا راز کیا ہے؟ تو اس کا علم اس عظیم ہستی کو ہے جس نے کائنات کی ہر شئی کو پیدا کیا ہے، پھر اس کی رہنمائی کی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مشہور سائنسداں ڈیوڈ ہوم (DAVID HUME) نے اس

[1] اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے ہماری کتاب "کبری الیقینیات الکونیۃ"، ص ۳۲۹، و مابعد

حقیقت پر بہت وضاحت اور قطعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

یقیناً ہر عقل مند شخص جو عقل اور حقیقت کا احترام کرتا ہو، کسی بھی خبر کو ــــ خواہ اس میں کسی عام چیز کا بیان ہو یا کسی خارق عادت امر کا ــــ قبول کرنے کے لئے ایک شرط رکھے گا اور وہ یہ ہے کہ وہ خبر اس تک کسی محفوظ علم واسطے سے پہنچی ہو جو روایت واسناد کے قواعد اور جرح وتعدیل کے تقاضوں پر مبنی ہو، بایں طور کہ اس سے جزم ویقین حاصل ہو۔ ان عظیم علمی پیمانوں کا مفصل بیان طویل بحث وتمحیص کا متقاضی ہے جس کا یہ مقام متحمل نہیں ہے۔

آج صاحب علم کو انتہائی حیرت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ حسین ہیکل جیسے آدمی نے اپنی کتاب "حیات محمد" کے مقدمہ میں یہ لکھ دیا ہے:

"میں اپنی اس کتاب میں سیرت اور حدیث کی کتابوں کا پابند نہیں رہا ہوں بلکہ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے علمی انداز میں پیش کروں۔۔۔!"

بالفاظ دیگر وہ اطمینان دلاتے ہیں کہ انھوں نے عظمت علم کی پاسداری میں ان روایات تک کو قبول نہیں کیا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں!۔۔۔ گویا امام بخاری نے احادیث اور واقعات کو روایت کرنے میں جو بے مثال علمی احتیاط برتی ہے اور جن حیرت انگیز اور دلکش قواعد وضوابط کو ملحوظ رکھا ہے وہ جادۂ علم سے انحراف کے مثل ہیں ... اور اس وقت جب استنتاج، حدس وتخمین اور دیگر علمی ذرائع تحقیق کو بروئے کار لایا جارہا ہو تو علم کی عظمت کی پاسداری اور اس کے میزان کے التزام کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں قبول نہ کیا جائے۔

سیرت نبوی کا مطالعہ ہم کیسے کریں؟

یہ چیز معروف ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا جب جزیرۃ العرب میں ظہور ہوا تو آپ نے اپنے آپ کو دنیا کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیا کہ آپ نبی ہیں جسے اللہ تعالی نے تمام انسانوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ ان کے سامنے اس حقیقت کا اثبات کریں جس کے ساتھ گزشتہ انبیاء مبعوث ہوئے تھے، اور انھیں ان ذمہ داریوں کا احساس دلائیں جن کی یاددہانی گزشتہ انبیاء نے اپنی قوموں کو کی تھی۔ آپؐ نے واضح کر دیا کہ آپ سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی ہیں۔ دوسری جانب آپؐ نے اپنا تعارف اس حیثیت سے بھی کرایا کہ آپ دوسرے انسانوں کی طرح بس ایک

انسان ہیں۔ آپ کے اندر بھی انسانیت کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اس کے تمام احکام نافذ ہوتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں اگر آپ کا کچھ امتیاز ہے تو بس یہ کہ اللہ نے وحی کی وساطت سے آپ کو امین بنایا ہے کہ تمام انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچادیں جس سے انہیں اپنی شخصیتوں کا عرفان حاصل ہو جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ مملکت الٰہی کے نقشے میں زمان ومکان کے اعتبار سے اس دنیاوی زندگی کا کیا مقام ہے؟ اور یہ کہ مرنے کے بعد ان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ ساتھ ہی وہ یہ بھی جان لیں کہ ان کے اختیاری طرز عمل کا ان کے تشخصات (جن سے مفر نہیں) سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، یعنی ان پر لازم ہے کہ اپنے ایمان ویقین اور اختیاری طرز عمل میں اللہ کے بندے بن کر رہیں جس طرح کہ یہ بندگی ان میں اضطراری طور سے پائی جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ہر موقع پر ان کے سامنے واضح کیا کہ آپ اس پیغام کے مضمون میں، جسے تمام انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری اللہ تعالی نے آپ کے اوپر ڈالی ہے، کچھ بھی کمی یا بیشی یا تبدیلی نہیں کر سکتے، خود ارشاد باری نے اس حقیقت کو واشگاف کیا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ، لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ
فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ. (الحاقۃ: ۴۴-۴۷)

اور اگر اس نبی نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔

آنحضرت ﷺ نے خود کو دنیا کے سامنے سیاسی لیڈر، قومی رہنما، مفکر، مکتب فکر کے بانی یا معاشرتی مصلح کی حیثیت سے پیش نہیں کیا... یہی نہیں بلکہ آپ کی پوری زندگی میں کسی ایسے رویے کا اظہار نہیں ہوتا جس سے اشارہ ملتا ہو کہ آپ نے ان میں سے کوئی چیز حاصل کرنے کے لیے ذاتی کوشش کی ہو۔

جب معاملہ یہ ہو تو کسی ایسے انسان کی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت قرین عقل وانصاف بات یہ ہے کہ ہم اس کی پوری زندگی کا مطالعہ اس کے اس تشخص کے آئینے میں کریں جس کی بنیاد پر اس نے خود کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، تاکہ ہم اس کی بات کو پرکھ سکیں اور اس کی

صحت یا عدمِ صحت کے دلائل کو آشکارا کر سکیں۔

یہ چیز ہم پر لازم کرتی ہے کہ ہم اس کی زندگی کے تمام انسانی اور نجی پہلوؤں کا مطالعہ کریں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان سے ایسے رہنما خطوط حاصل کر سکیں جن کے ذریعے علمی و معروضی دلائل کے ساتھ اس شخص کی حقیقت آشکارا کی جا سکے جس کی بنا پر اس نے خود کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نبوت و رسالت کے ان معانی میں غور و خوض کرنے پر مجبور نہیں ہیں جن کی طرف آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو متوجہ کرنا چاہا تھا۔ لیکن ہماری یہ بات اس وقت قابل قبول ہو سکتی تھی جب معاملہ ہمارے انجام سے متعلق نہ ہوتا اور اس کا ہماری آزادی اور ہمارے طرزِ عمل سے کچھ تعلق نہ ہوتا۔ لیکن جب صورت حال یہ ہو کہ اس مسئلے کا ہماری ذات سے گہرا تعلق ہے اور اگر وہ مبنی برحقیقت ہے تو اس سے علم و معرفت اور سیرت و کردار کے معاملوں میں ہم پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کی انجام دہی کے لیے اگر ہم کوشش نہ کریں تو بد بختی، محرومی اور ہلاکت ہمارا مقدر ہو گی۔ جب صورت حال یہ ہو تو یہ چیز بڑی خطرناک ہو گی کہ ہم اس مسئلے کو اپنی ذات سے غیر متعلق تصور کریں یا اس سے بے توجہی کے ساتھ گزر جائیں!..

اس صورت میں یہ چیز کتنی بے موقع اور مہمل ہو گی کہ ہم آنحضرت ﷺ کی شخصیت کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے سے تو اعراض کریں جسے آپؐ نے خود دنیا کے ساتھ پیش کیا اور دیگر ان پہلوؤں میں غور و خوض کرنے میں لگے رہیں جن کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق ہے نہ آپ کی سیرت کے مذکورہ پہلو سے ان کا دور کا بھی رشتہ ہے۔ یقیناً اس سے بڑا مذاق اور کیا ہو گا کہ ایک شخص ہمارے سامنے کھڑا ہو کر اپنی شخصیت کا تعارف کرائے، وہ بتائے کہ "میں اللہ کا نبی ہوں" پھر پورے یقین و اعتماد کے ساتھ ہمیں آئندہ زندگی کے بارے میں ڈرائے، اور کہے "اللہ کی قسم جس طرح تم لوگ سوتے ہو اسی طرح ایک دن مر جاؤ گے، اور جس طرح نیند سے بیدار ہوتے ہو اسی طرح ایک دن مر کر اٹھو گے۔ اللہ کی قسم اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لیے جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو گے یا ہمیشہ کے لئے جہنم کے عذاب کو جھیلو گے" لیکن ہم اس کی شخصیت کو پہچاننے اور اس کی باتوں پر دھیان دینے کے بجائے بس اس کی عظمت، فصاحت یا

حکمت میں غور کرتے رہیں؟... کیا اس کی مثال ایسی نہیں ہے کہ تم چوراہے پر کھڑے ہو، تمہاری سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کدھر جائیں، اسی درمیان میں ایک شخص تمہارے پاس آئے اور تمہیں بتائے کہ فلاں راستہ سیدھا اور منزل مقصود تک پہنچانے والا ہے اور بقیہ راستے منزل سے دور لے جانے والے اور ہلاکت کی کھائیوں میں گرانے والے ہیں، مگر تم اس کی باتوں کی طرف دھیان دینے کے بجائے اس کی شکل و صورت، کپڑوں کے رنگ اور اندازِ گفتگو کو دیکھتے رہو، پھر ان کے مطالعہ و تجزیہ میں منہمک ہو جاؤ۔

عقل و منطق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم آنحضرت ﷺ کی نشو و نما، اخلاق و کردار، ذاتی اور خانگی زندگی، صبر اور جد و جہد، جنگ و امن، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ معاملات، دنیا اور اس کی لذتوں اور رنگینیوں کے بارے میں رویہ، غرض آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا معروضی مطالعہ کریں۔ ہمارا یہ مطالعہ صحت اور باریکی کے ساتھ اور علمی نہج پر ہو جس میں روایت و اسناد کے قواعد اور شروطِ صحت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، ساتھ ہی وہ نتیجہ خیز بھی ہو کہ اس سے ہم آپ کی نبوت اور آپ کی زندگی میں حقیقتِ وحی کی معرفت حاصل کر سکیں۔ اگر ہم کسی خواہش نفس یا تعصب سے آزاد ہو کر معروضی انداز میں مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک پہنچ جائیں گے تو ہم پر یہ انکشاف ہو گا کہ آپؐ نے جو تعلیمات اور احکامات دیے انھیں اپنی طرف سے گھڑ کر نہیں پیش کیا تھا بلکہ انہیں قضائے الٰہی کے مطابق پوری ایمان داری کے ساتھ رب العالمین کی جانب سے ہم تک پہنچایا تھا۔ اور اس وقت ہمیں یہ احساس ہو گا کہ ان تعلیمات اور احکام کی حفاظت اور ان کے نفاذ کے سلسلے میں ہم پر کتنی عظیم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

جو شخص سیرت نبوی کے خالص انسانی پہلوؤں کا مطالعہ اور تجزیہ کرے، لیکن اس پہلو سے مطلق تعرض نہ کرے جس کی بنیاد پر نبی کریم ﷺ نے خود کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا، وہ اپنے سامنے ایسی پیچیدہ گتھیاں پائے گا جنھیں سلجھانا اس کے لیے کسی طرح ممکن نہ ہو گا۔ مثلاً وہ اسلامی فتوحات کے معاملے میں حیران اور ششدر رہ جائے گا جب دیکھے گا کہ چند پرانی تلواروں نے جو پہلے اکثر خود گتھم گتھا رہتی تھیں، ساحرانہ طریقے پر ایرانی تہذیب کے قلعے کو فتح کر لیا اور رومی شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح وہ اس قانون کو دیکھ کر متحیر رہ جائے گا جو جزیرۃ العرب میں اس زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تھا جب وہاں کسی ثقافت کا اثر تک نہ ہوا

تھا اور کسی تہذیب و تمدن کا سایہ نہ پہنچا تھا۔ جزیرۃ العرب کو اس زمانے میں ایک مکمل اور ہمہ جہت قانون ملا جب وہ علم و ثقافت اور پیچیدہ معاشرتی زندگی کی جدوجہد کے ابتدائی راستے میں تھا۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہوا جب کہ ساجیات کے ماہرین کے نزدیک بدیہی امر یہ ہے کہ کسی قوم کی زندگی میں مکمل اور ہمہ جہت قانون اس وقت وجود میں آتا ہے جب اس کی تہذیب و ثقافت میں پختگی آجاتی ہے اور اس کا معاشرتی ڈھانچہ ترقی کے مراحل طے کر چکتا ہے۔

یہ پیچیدہ گتھیاں ہیں، اگر کوئی شخص آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اعتبار نہ کرے تو عام مادی اسباب و علل کے دائرے میں ان کو کسی طرح نہیں سلجھا سکتا۔ ہم نے بہت سے محققین کو دیکھا ہے جو ان گتھیوں کو سلجھانے میں ادھر اُدھر بھٹکتے ہیں اور انھیں سلجھانے کے بجائے خود ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور انتہائی حیرت و استعجاب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اس حیرت سے نکلنے کا راستہ واضح ہے، اور وہ یہ کہ سیرت نبوی کے مطالعے میں ہم منطقی اور معروضی نقطہ نظر اپنائیں اور اس امتیازی حیثیت کو آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے مطالعہ کا محور بنائیں جس کی بنیاد پر آپؐ نے خود کو لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

اس مطالعے کے نتیجے میں ہمیں یقین ہو جائے گا کہ آپ اللہ عزوجل کی جانب سے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ اور اس وقت ہماری حیرت دور ہو جائے گی اور ہم ان گتھیوں کو سلجھانے کا راز پا لیں گے۔ ضروری ہے کہ نبی کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس نے اسے مبعوث کیا ہے، تائید حاصل ہو۔ ضروری ہے کہ قرآن اس ذات باری کی طرف سے اترے۔ معلوم ہوا کہ یہ کامل اور ہمہ جہت قانون اس ذات باری کا نازل کیا ہوا اور مشروع کیا ہوا ہے، کسی جاہل اور ناخواندہ قوم کا بنایا ہوا نہیں ہے کہ اس پر تعجب اور حیرت ہو۔ یہ ذات باری اپنی کتاب میں ایمان لانے والوں سے کہتی ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آلِ عمران: ۱۳۹)

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ، وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ. (القصص ۵)

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے

گئے تھے اور انہیں پیشوا بنادیں۔

اِذْ تَسْتَغِيْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّىْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِيْنَ. وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ. اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (الانفال: ۹۔۱۰)

اور یاد کرو وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔ یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لیے بتادی کہ تمہیں خوش خبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔ ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

یہ آیات پیش نظر رہیں تو سارا ابہام دور ہو جاتا ہے، تمام گتھیاں سلجھ جاتی ہیں، نگاہوں کے سامنے سے پردے ہٹ جاتے ہیں اور کوئی حیرت اور اچنبھے کی بات نہیں رہتی۔ کیونکہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذات خالقِ کائنات کی ہے جو اپنے مومن بندوں کی مدد کرتا ہے اور جس پر چاہتا ہے انہیں فتح نصیب کرتا ہے۔ حیرت کی بات تو اس وقت ہوتی جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی نصرت اور اپنے مومن بندوں کی تائید کا وعدہ کیا ہوتا اور پھر نصرت و تائید کا معجزہ رونما نہ ہوا ہوتا۔

جزیرۃ العرب اسلام کا گہوارہ کیوں بنا؟

رسول کریم ﷺ کی سیرت پر روشنی ڈالنے اور جزیرۃ العرب (جہاں آپؐ کی پرورش وپرداخت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت کے لیے منتخب کیا) کے حالات کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ اللہ تعالیٰ کی وہ کیا حکمت تھی جس کی بنا پر آپ کی بعثت کے لئے دنیا کے دیگر خطوں کے بجائے اس سرزمین کا انتخاب کیا گیا اور اسلامی دعوت کی نشوونما دوسروں سے قبل عربوں کے ہاتھوں ہوئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ اسلام سے قبل عربوں کا مزاج اور خصائص کیا تھے؟ اور وہ جس خطہ زمین میں رہتے تھے اس کا محل وقوع کیا تھا؟ دوسری جانب ہمیں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ جزیرۃ العرب کے اردگرد جو دوسری قومیں آباد تھیں مثلاً ایرانی، رومی، یونانی، اور ہندوستانی، وہ کن عادات واطوار اور تہذیبی خصائص کی حامل تھی؟ اس مختصر جائزے کا آغاز ہم ان قوموں سے کرتے ہیں جو اسلام کی آمد سے ذرا پہلے جزیرۃ العرب کے اردگرد آباد تھیں:

اس زمانے میں دو سلطنتیں بہت نمایاں تھیں جن کے درمیان پوری متمدن دنیا منقسم تھی، ایک ایرانی دوسری روم۔ ان کے بعد یونان اور ہندوستان کا نمبر تھا۔

ایران مختلف فلسفیانہ مذاہب کی آماجگاہ بنا ہوا تھا جو باہم دست وگریباں تھے، ان میں سے ایک مذہب زردشت کا تھا جسے حکمراں طبقہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ (اس کے فلسفے میں آدمی کا اپنی ماں، بیٹی یا بہن سے نکاح کرنا باعث فضیلت تھا۔ یزدگرد دوم نے (جو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں ایران کا حکمراں تھا) اپنی بیٹی سے نکاح کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سی آوارگیاں اور بداخلاقیاں تھیں جن کے تذکرے کا یہاں موقع نہیں۔ ایک دوسرا مذہب مزدکیہ

تھا۔ اس کے بارے میں امام شہرستانی نے لکھا ہے کہ اس میں عورتوں اور مال ودولت کو، پانی آگ اور چارے کی طرح تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ اس دعوت کو، حرص وہوس کے اسیروں کے درمیان، زبردست مقبولیت حاصل تھی۔[۵]

روم پر اس عہد میں استعماری روح کا غلبہ تھا، اور مذہبی اعتبار سے شام اور مصر کے نصاریٰ سے اس کے اختلافات تھے۔ چنانچہ مسیحیت کو از سر نو تشکیل دینے اور اپنی لامحدود خواہشات اور مخصوص اغراض ومقاصد کی تکمیل کے لئے اس کی من مانی تاویل کرنے کی وجہ سے وہ عجیب وغریب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس سلسلے میں وہ اپنی عسکری قوت اور استعماری خواہش کا سہارا لیتا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی اس وقت اس کی حالت ایران سے بہتر نہ تھی بے حیائی، آوارگی اور بد خلقی عام تھی۔ بھاری ٹیکسوں اور تاوانوں کے ذریعے لوگ اقتصادی مظالم کی چکی میں پس رہے تھے۔

رہا یونان تو وہ کلامی اور فلسفیانہ خرافات واساطیر میں غرق تھا جن سے انسانیت کو کچھ بھی فائدہ پہنچنے والا نہ تھا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو جیسا کہ اس کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے "مورخین کا اس نقطہ پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی، اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے اس ملک کی تاریخ کا پست ترین دور تھا، ہندوستان کے اردگرد دوسرے ممالک میں جو اجتماعی اور اخلاقی انحطاط رونما تھا اس میں یہ ملک کسی سے پیچھے نہ تھا۔"[٦]

یہاں یہ جان لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اقوام کی — بے حیائی، آوارگی، انتشار واضطراب اور بدبختی میں مبتلا ہونے کا بنیادی سبب وہ تہذیب وتمدن تھے جنھیں وہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ تہذیب وتمدن محض مادی اقدار پر مبنی تھے۔ انھیں سیدھے اور صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرنے کے لیے کوئی اعلیٰ قدر موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ تہذیب کے مختلف عناصر اور مظاہر کی حیثیت محض وسیلہ اور سبب کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی قوم صحیح فکر اور اعلیٰ

[۵] دیکھئے الملل والنحل، الشہرستانی جلد دوم ص: ۸۶-۸۷

[٦] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ناشر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، طبع دہم ص: ۵۸

نصب العین سے محروم ہو تو تہذیب اسے انتشار واضطراب میں مبتلا کردینے اور بدبختی کی گہری کھائی میں گرادینے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ عقل سلیم سے بہرہ ور ہو — جو محض دین اور وحی الٰہی کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے — تو تہذیب وتمدن کی تمام قدریں کامل ترین سعادت کے مختلف انواع ومظاہر تک پہنچانے کا خوبصورت اور آسان ذریعہ بن جاتی ہیں۔

جزیرۃ العرب ان دنوں بہت پرسکون حالت میں تھا۔ وہ ان اضطرابات کے تمام مظاہر سے دور بلکہ الگ تھلگ تھا۔ اس کے باشندے ایرانیوں جیسی عیش وعشرت کے تمدن کے حامل نہ تھے کہ ان کے ذریعے بے حیائی اور آوارگی کے متنوع طریقے ایجاد کرسکیں، اباحیت اور اخلاقی انحطاط کے مظاہر کو اپنا سکیں اور انہیں مذہب کے سانچے میں ڈھال سکیں۔ انھیں رومیوں جیسی عسکری طاقت بھی حاصل نہ تھی جس کے ذریعے وہ اپنے اردگرد کے علاقوں پر تسلط جما سکیں۔ اور وہ یونانی فلسفہ وعلم کلام سے بھی تہی دامن تھے جس کے ذریعے خرافات واساطیر کا شکار ہو سکیں۔

ان کے مزاج اس خام مواد کے مشابہ تھے جو اب تک کسی سانچے میں ڈھلا نہ تھا۔ اس میں پاکیزہ انسانی فطرت صاف جھلکتی تھی اور اچھے انسانی اوصاف مثلاً وفاداری، ہمدردی، رحم وکرم، خودداری اور عفت وغیرہ کی طرف قوی میلان نظر آتا تھا۔ البتہ وہ اس معرفت سے محروم تھے جو ان پر ان خوبیوں تک پہنچانے والا راستہ منکشف کردے۔ وہ پرلے درجے کی جہالت اور اولین فطری حالت میں زندگی گزار رہے تھے۔ اس بنا پر وہ اس راستے سے بھٹک گئے تھے جو انسانی اقدار تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ وہ اولاد کو قتل کرتے تھے، اس کے پیچھے اپنی عالی نسبی اور ذلت سے نجات کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ وہ اپنا ضروری مال واسباب تک لٹادیتے تھے مگر اس کا محرک سخاوت اور فیاضی کا جذبہ تھا۔ ان کے درمیان خوں ریز جنگیں برپا ہوئی تھیں مگر اس کا سبب ان کی خودداری اور امداد باہمی کا جذبہ تھا۔

یہی وہ حالت تھی جسے اللہ تعالیٰ نے "بھٹکے ہونے" سے تعبیر کیا ہے، فرمایا:

وَإِنْ كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ۔ (البقرۃ۔ ۱۹۸)

ورنہ اس سے پہلے تم لوگ بھٹکے ہوئے تھے

اس حالت کا نمونہ اس وقت کی دوسری قوموں کی حالت سے کیا جائے تو اہل عرب

معذور قرار پاتے ہیں، اس لئے کہ وہ تہذیب وتمدن سے کوسوں دور تھے جبکہ دوسری قومیں تہذیب، ثقافت اور تمدن کی روشنی میں برائیوں اور انحرافات کا شکار تھیں۔ گویا وہ پوری آگاہی اور منصوبہ بندی کے ساتھ اور سوچ سمجھ کر فساد کے ولدل میں پھنسی ہوئی تھیں۔

جغرافیائی اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی جزیرۃ العرب ان اقوام کے بالکل وسط میں نظر آتا ہے۔ استاذ محمد المبارک نے لکھا ہے: "آج بھی دیکھا جائے تو جزیرۃ العرب دو مختلف تہذیبوں کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ ایک جانب مغرب کی مادی تہذیب ہے جس نے انسانوں کی بالکل ناقص تصویر پیش کی ہے جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور دوسری جانب انتہائی مشرق کی روحانی اور خیالی تہذیب ہے جو اس تہذیب کے مشابہ ہے جو ہندوستان، چین اور اردگرد کے ممالک میں پائی جاتی تھی۔" [۱]

☆ ☆ ☆

اسلام سے قبل جزیرۃ العرب کے باشندوں اور ان کے اردگرد رہنے والی دیگر مختلف اقوام کے حالات کا ہم تصور کریں تو بآسانی یہ حکمت الٰہی معلوم کرسکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت اور بعثت کے لیے جزیرۃ العرب کو خاص طور پر کیوں منتخب کیا گیا؟ اور پوری دنیا میں دعوت اسلامی کا علم بلند کرنے کے لیے اہل عرب کیوں ہراول دستہ بنے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ باطل مذاہب اور کھوٹی تہذیبوں کے علم برداروں کا علاج اور ان کی رہنمائی دشوار ہوتی ہے، اس لئے کہ ان میں جو برائیاں پائی جاتی ہیں اور جو بگاڑ موجود ہوتا ہے وہ ان کے لیے باعث افتخار ہوتا ہے، کیونکہ وہ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ابھی تلاش وتحقیق کے مرحلے سے گزر رہے ہوں وہ اپنی جہالت کا انکار اور تمدن، علم اور تہذیب کا دعوی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ اپنی خامیوں کا علاج کرنے اور رہنمائی قبول کرنے پر زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ حکمت نہیں ہے۔ اس قسم کا تجزیہ صرف ان لوگوں پر صادق آسکتا ہے جو محدود صلاحیت اور معمولی طاقت وقوت کے مالک ہوں۔ یہ لوگ آسان اور دشوار میں فرق کرتے ہیں اور آرام طلبی میں آسان کو ترجیح دیتے ہیں اور مشقت سے بچنے کے لیے دشوار سے

[۱] الامۃ العربیۃ فی معرکۃ تحقیق الذات ص: ۱۴۷

دور بھاگتے ہیں۔

اس انتخاب کے پس پردہ وہی حکمت تھی جو رسول اللہ ﷺ کو امیؐ (جو پڑھنا لکھنا نہ جانتا ہو) رکھے جانے میں تھی۔ تاکہ لوگوں کو آپ کی نبوت میں شبہ نہ رہے اور آپ کی دعوت کی صداقت کے بارے میں شکوک نہ پیدا ہونے پائیں۔ اس حکمت الٰہی کا تتمہ یہ تھا کہ جس ماحول میں آپ کی بعثت ہوئی تھی وہ بھی اردگرد کی دیگر قوموں کے مقابلے میں امی ہو یعنی اطراف کی تہذیبوں کی اسے ہوا نہ لگی ہو اور اس کے فکری پیانے گمراہ فلسفوں سے آلودہ نہ ہوئے ہوں۔ جس طرح اس وقت لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا جب وہ نبی ﷺ کو پڑھا لکھا اور سابقہ کتابوں، پرانی قوموں کی تاریخ اور پڑوسی ممالک کی تہذیبوں سے واقف دیکھتے۔ اسی طرح اس صورت میں بھی دلوں میں شک در آنے کا امکان تھا جب اسلامی دعوت کا ظہور کسی ایسی قوم کے درمیان ہوتا جو تہذیب وتمدن فلسفہ اور اس کی تاریخ میں درک رکھتی ہو مثلاً ایران، یونان، یاروم کی سلطنتیں۔ اس وقت کوئی فتنہ جو اور باطل پرور دعوی کر سکتا تھا کہ یہ تہذیبی تجربات اور فلسفیانہ افکار کا تسلسل ہے جس نے آخر میں اس بے مثال تہذیب اور کامل شریعت کی شکل اختیار کرلی ہے۔

قرآن کریم نے اس حکمت کو بہت صریح الفاظ میں بیان کیا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ، وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ.
(الجمعہ۔۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول خود انہی میں سے اٹھایا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے، ان کی زندگی سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے حالاں کہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

اللہ تعالی کی مشیت یہ تھی کہ اس کا رسول امی ہو اور جس قوم میں اس کا ظہور ہو اس کے افراد کی غالب اکثریت بھی امی ہو، تاکہ نبوت اور اسلامی شریعت کا معجزہ ذہنوں میں پوری طرح واضح ہو جائے اور اس کے اور مختلف انسانی دعوتوں کے درمیان کچھ التباس نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالی کا اپنے بندوں پر بہت بڑا احسان ہے۔

سرزمین عرب کو اسلام کا گہوارہ بنانے کی دیگر حکمتیں بھی ہیں جنھیں ہم سطور ذیل میں باختصار بیان کرتے ہیں:

۱۔ یہ چیز معلوم ومشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور جائے امن قرار دیا اور اسے پہلی عبادت گاہ بنایا جہاں وہ دینی شعائر انجام دے سکیں۔ اسی وادی میں ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت شرمندۂ تعبیر ہوئی۔ اس کا لازمی تقاضا تھا کہ یہی مبارک سرزمین اسلامی دعوت جو درحقیقت ملت ابراہیمی ہی کا دوسرا نام ہے — کا بھی گہوارہ بنے اور یہیں خاتم الانبیاء کی بعثت اور ولادت باسعادت ہو۔ آخر کیوں نہیں جب کہ آپؐ حضرت ابراہیم ہی کی نسل سے تھے۔

۲۔ جزیرۃ العرب کی جغرافیائی پوزیشن بھی اسے اس دعوت کا بار اٹھانے کا اہل بنا رہی تھی، اس لئے کہ — جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا — وہ اپنے اردگرد آباد مختلف قوموں کے بالکل وسط میں واقع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دعوت کی کرنیں اطراف کی تمام قوموں اور ملکوں میں بہت آسانی کے ساتھ پھیل گئیں۔ صدر اول اور عہد خلفائے راشدین میں اسلامی دعوت کی رفتار کار پر نظر ڈالیں تو اس بات کی بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔

۳۔ حکمت الٰہی کا یہ بھی تقاضا تھا کہ عربی زبان دعوت اسلامی کی زبان بنے اور وہی کلام الٰہی کی ترجمانی کا اولین وسیلہ اور اللہ اور بندوں کے درمیان واسطہ بنے۔

زبانوں کی خصوصیات میں اگر ہم غور کریں اور ان کے درمیان موازنہ کریں تو دیکھیں گے کہ عربی زبان کو ایسے بہت سے امتیازات حاصل ہیں جن سے دوسری زبانیں محروم ہیں، اس لئے اسی کو حق تھا کہ مختلف علاقوں اور ملکوں میں مسلمانوں کی پہلی زبان بنے۔

دعوت محمدی کا تعلق سابقہ آسمانی دعوتوں سے

حضرت محمد ﷺ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ دین کے بنیادی عقائد میں سے ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میری اور مجھ سے قبل آنے والے انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک بہت ہی حسین و جمیل عمارت بنائی، مگر اس کے ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ اسے گھوم گھوم کر دیکھنے لگے اور اس کی خوبصورتی پر حیرت کا اظہار کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ اس ایک اینٹ کی جگہ کو کیوں نہیں پُر کیا گیا؟ وہ اینٹ میں ہوں، اور میں خاتم النبیین ہوں۔" [۸]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت محمدی کا تعلق گزشتہ انبیاء کی دعوتوں سے تکمیل و تاکید کی اساس پر قائم ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ ہر نبی کی دعوت کی دو بنیادیں ہیں، اول عقیدہ، دوم شریعت و اخلاق۔ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس کے مضمون میں حضرت آدم علیہ السلام کی بعثت سے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی بعثت تک کوئی فرق نہیں آیا۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان، تمام نازیبا صفات سے اس کی تنزیہ اور آخرت حساب و کتاب، جنت اور جہنم پر ایمان داخل ہیں۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو ان باتوں پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے سے پہلے آنے والے نبی کی تصدیق کی اور بعد میں آنے والے نبی کی بعثت کی بشارت دی۔ اس طرح مختلف قوموں کی طرف انبیاء کی بعثت کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔ سب نے ایک ہی حقیقت کو واشگاف کیا جس کی تبلیغ کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ سب نے لوگوں کو ایک ہی بات کا قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ یہ کہ صرف خدائے واحد کے آگے سر تسلیم

۸ صحیح بخاری و صحیح مسلم (الفاظ صحیح مسلم کے ہیں)

خم کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس بات کو بہت وضاحت سے بیان کیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ۔ ۱۳)

اس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

اس بات کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ عقیدے کے معاملے میں انبیاء صادقین کی دعوتوں میں فرق ہو اس لئے کہ عقیدے کے امور خبر کے قبیل سے ہیں اور کسی چیز کے بارے میں خبر اگر دو اشخاص دے رہے ہیں اور دونوں سچے ہیں تو ان کی باتوں میں فرق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ بات انتہائی نامعقول ہوگی کہ ایک نبی تو لوگوں کے درمیان اس چیز کی تبلیغ کرے کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے، پھر اس کے بعد دوسرا نبی آکر یہ بتائے کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور دونوں اپنی باتوں میں سچے ہوں۔

یہ تو عقیدے کا معاملہ ہے۔ رہی شریعت یعنی ایسی قانون سازی جس سے فرد اور معاشرے کی زندگی کی تنظیم کی جاسکے تو یہ اس سے مختلف ہے۔ دو انبیاء کی شریعتوں میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت عقیدے کے برخلاف انشاء کے قبیل سے ہے، اس لئے اس پر وہ اشکال وارد نہیں ہوتا جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا۔ پھر یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ زمانی ارتقاء اور قوموں کا اختلاف شریعت کے ارتقاء اور اختلاف پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شریعت کی بنیاد ان چیزوں پر ہوتی ہے جن کا انسانوں کے دنیوی اور اخروی مصالح تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ گزشتہ انبیاء میں سے ہر ایک کی بعثت ایک مخصوص قوم کی طرف ہوئی تھی، اس لئے اس کے تشریعی احکام یک تنگ دائرے میں محدود تھے اور انہی معاملات میں تھے جن کا اس قوم کے مخصوص حالات تقاضا کرتے تھے۔

مثال کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔

اس وقت بنی اسرائیل کے حالات اس بات کا تقاضا کر رہے تھے کہ ان کی شریعت سخت ہو اور بحیثیت مجموعی رخصتوں کے بجائے عزیمتوں پر مبنی ہو۔ پھر جب کچھ عرصہ گزر گیا اور ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں کچھ سہل اور آسانیوں پر مبنی شریعت لے کر آئے۔ اس سلسلے میں قرآن نے حضرت عیسیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جو انہوں نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔

.....وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ. (آل عمران۔۵۰)

اور میں اس تعلیم وہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانے میں موجود ہے، اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔

اپنے اس ارشاد کے ذریعے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے واضح کر دیا کہ جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں وہ توریت کے بیانات کی تصدیق و تائید کرتے ہیں اور انہی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ لیکن جہاں تک شریعت اور حلال وحرام کے احکام کا سوال ہے تو ان میں کچھ تبدیلیاں کرنے اور بعض آسانیاں پیدا کرنے اور ان میں پائی جانے والی شدت کو ختم کرنے کا انہیں حکم دیا گیا ہے۔

گزشتہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر رسول کی بعثت دو چیزوں پر مشتمل تھی: ایک عقیدہ دوسری شریعت۔ عقیدے کے سلسلے میں ہر رسول کا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ بغیر ادنی سے فرق یا تبدیلی کے اسی عقیدے کا اثبات کریں جس کے ساتھ گزشتہ پیغمبر مبعوث ہوئے تھے، البتہ ہر رسول کی شریعت سابق شریعت کے لیے ناسخ تھی سوائے اس حصے کے جس کی اس نے تائید کی ہو یا اس کے بارے میں خاموش رہی ہو۔ یہ بات ان لوگوں کے مسلک کے مطابق ہے جو کہتے ہیں کہ "ما قبل شریعت ہمارے لیے بھی واجب التعمیل ہے اگر اس میں کوئی ایسا حکم نہ ہو جو ہماری شریعت سے متعارض ہو"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ متعدد آسمانی ادیان نہیں پائے جاتے، البتہ متعدد آسمانی شریعتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ما بعد نے ما قبل کو منسوخ کر دیا یہاں تک کہ آخری آسمانی

شریعت کو استقرار اور دوام حاصل ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ تھی کہ اس شریعت کو لانے والے پر انبیاء ورسل کا سلسلہ انتہا کو پہنچے۔

رہا دین برحق تو وہ صرف ایک ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک تمام انبیاء نے اسی کی طرف دعوت دی اور لوگوں کو اسی کو اختیار کرنے کا حکم دیا۔ اور وہ اسلام ہے۔

اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ. (البقرہ:۱۳۰-۱۳۲)

اب کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے اعراض کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت وجہالت میں مبتلا کر لیا ہو اس کے سوا کون یہ حرکت کر سکتا ہے؟ ابراہیم تو وہ شخص ہے جس کو ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لئے چن لیا تھا اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہو گا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ مسلم ہو جا تو اس نے فوراً کہا "میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا" اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی اور اسی کی وصیت یعقوب اپنی اولاد کو کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میرے بچو اللہ نے تمہارے لئے یہی دین پسند کیا ہے لہذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔

اسی کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے۔ قرآن کہتا ہے کہ جب فرعون نے جادوگروں کو سخت سزاؤں کی دھمکی دی تو انہوں نے جواب دیا:

إِنَّا إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ، وَمَا تَنقِمُ مِنَّا إِلَّا أَنْ آمَنَّا بِآيَاتِ رَبِّنَا لَمَّا جَاءَتْنَا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ. (الاعراف:۱۲۵-۱۲۶)

بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب ہی کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو

ہم نے انہیں مان لیا۔ اے رب ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہمیں دنیا سے اٹھا تو اس حال میں کہ ہم تیرے فرماں بردار ہوں۔

اسی کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی بعثت ہوئی۔ ارشاد باری ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران۔ ۵۲)

جب عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا "کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے؟" حواریوں نے جواب دیا "ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم (اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دینے والے) ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اگر تمام انبیاء عقیدۂ توحید کے ساتھ بھیجے گئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف نسبت کا دعویٰ کرنے والے (یعنی یہودی) اس سے مختلف دوسرا عقیدہ کیوں رکھتے ہیں؟ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف انتساب کا دعویٰ کرنے والے (یعنی عیسائی) کیوں اس سے مختلف دوسرا مخصوص عقیدہ رکھتے ہیں؟ اس کا جواب ہمیں قرآن کی درج ذیل آیات میں ملتا ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ، وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ. (آل عمران۔ ۱۹)

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔

سورہ شوریٰ میں یہ بیان کرنے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، حضرت ابرہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو اسی دین کے ساتھ معبوث کیا تھا جس کی وحی اس نے حضرت محمد ﷺ کی طرف کی ہے، قرآن کہتا ہے:

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ

رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ. (الشوریٰ۔ ۱۴)

لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں۔

ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء اسلام کے ساتھ اپنی قوموں میں بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر دین صرف وہی ہے۔ اہل کتاب اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ دین کے معاملے میں ہر نبی نے دوسرے نبی کی تصدیق و تائید کی ہے۔ اس صورت حال میں ان سے امید تو یہ تھی کہ اس کو چھوڑ کر دیگر متفرق عقائد نہیں اختیار کریں گے۔ لیکن انہوں نے علم آجانے کے بعد باہم اختلاف کیا، تفرقے میں پڑے اور اپنے انبیاء کے بارے میں ایسی باتیں گھڑیں جو انہوں نے نہیں کہی تھیں۔

عہدِ جاہلیت اور بقایائے حنیفیت

یہ بھی ایک اہم موضوع ہے جس کا واقعات سیرت میں غور وخوض کرنے اور ان میں پائے جانے والے موعظت ونصیحت کے پہلوؤں کو اجاگر کرنے سے قبل، جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسی حقیقت پر مشتمل ہے جس پر اس دین کے مخالفین برابر پردہ ڈالنے اور مختلف اوہام وخرافات کے ذریعے اس کا ابطال کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

اس حقیقت کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ اسی حنیفیت کا تسلسل ہے جس کے ساتھ ابوالانبیاء حضرت ابرہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن کریم کی بکثرت آیات میں اس کی صراحت ملتی ہے مثلاً:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا.... (الحج۔۷۸)

اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ قائم ہو جاؤ اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر۔ اللہ نے پہلے بھی تمہارا نام "مسلم" رکھا تھا اور اس (قرآن) میں بھی (تمہارا یہی نام ہے)۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ.
(آل عمران۔۹۵)

کہو اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے۔ اس لیے تم ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو، جو اللہ کے لیے یکسو تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔

تم جانتے ہو کہ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ انہوں نے اپنے

جد امجد کی ملت اور طریقے کو ورثے میں پایا تھا جو توحید، اللہ کی عبادت، اس کے حدود کے پاس ولحاظ اور اس کے محارم کی تقدیس پر مشتمل تھا اور ان میں سر فہرست بیت اللہ کی تعظیم وتقدیس، اس کے شعائر کا احترام اور حفاظت اور اس کی خدمت ہے۔ لیکن کئی صدیاں گزر جانے کے بعد انہوں نے اس حق میں، جو انہیں ورثے میں ملا تھا، بہت سی باطل چیزوں کی آمیزش کر لی، اور ان کا حال دیگر تمام قوموں کی طرح ہو گیا کہ جب ان میں جہالت عام ہو جاتی ہے، حق کو آئے ہوئے ایک عرصہ گزر جاتا ہے اور ان کی صفوں میں بہروپیے اور فسادی گھس جاتے ہیں تو حق اور باطل گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان میں شرک در آیا، وہ بت پرستی کے عادی ہو گئے، ان میں غلط رسوم ورواج اور بداخلاقیاں سرایت کر گئیں، وہ نور توحید اور طریقۂ حنیفیت سے بہت دور ہو گئے اور ان میں جاہلیت عام ہو گئی جو ایک طویل عرصے تک ان میں پیوست رہی، یہاں تک کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ذریعے ہی اس کے اثرات زائل ہو سکے۔

سب سے پہلا شخص جس نے عربوں میں شرک داخل کیا اور انہیں بت پرستی پر آمادہ کیا قبیلۂ خزاعہ کا جد اعلیٰ عمرو بن لحی تھا۔ ابن اسحاق نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے قبیلۂ خزاعہ کے ایک صحابی حضرت اکثم بن جونؓ سے فرمایا: "اے اکثم! میں نے عمرو بن لحی کو جہنم میں اپنی انتڑیاں گھسیٹتے ہوئے دیکھا ہے، اس سے سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والے تم ہو۔" اکثم نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! کیا اس کی مشابہت مجھے نقصان پہنچائے گی؟" آپ نے فرمایا: "نہیں، تم صاحب ایمان ہو جب کہ وہ کافر تھا۔ سب سے پہلے اسی نے دین اسماعیل میں تبدیلی کی، بت نصب کئے اور بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مقرر کئے۔"[۹]

---

۹ سیرت ابن ہشام ۱/۷۶، یہ حدیث الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بخاری اور مسلم میں بھی آئی ہے
بحیرہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسے اہل عرب بتوں کے نام پر اس کا کان چیر کر آزاد چھوڑ دیتے تھے۔ سائبہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جسے کوئی کام بن جانے پر بطور شکرانہ بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ سے مراد وہ اونٹنی ہے جس کے شروع کے دو بچے مادہ ہوں، اسے بھی بتوں کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور حام سے مراد وہ اونٹ ہے جس کا پوتا بچے دینے کے قابل ہو گیا ہو۔ ایسے بوڑھے اونٹ کو بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا، نہ اس پر سواری کی جاتی تھی اور نہ اسے باربرداری کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

ابن ہشام کی ایک روایت سے یہ تفصیل بھی معلوم ہوتی ہے کہ عمرو بن لحی نے کیسے عرب میں بت پرستی داخل کی؟ اس نے لکھا ہے: "عمرو بن لحی اپنے کسی کام سے شام گیا۔ جب وہ سرزمین بلقاء کے مآب نامی علاقے میں پہنچا تو وہاں اس نے عمالقہ کو بتوں کی پرستش کرتے ہوئے دیکھا (یہ لوگ عملاق۔ یا عملیق۔ کی نسل سے تھے اور عملاق حضرت نوح کے بیٹے سام کی نسل سے تھا) اس نے ان سے دریافت کیا: "یہ کیا چیزیں ہیں جن کو پوجتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا: "یہ بت ہیں جن کی ہم پرستش کرتے ہیں۔ ان سے ہم بارش کرنے کی درخواست کرتے ہیں تو یہ پانی برساتے ہیں۔ ان سے مدد چاہتے ہیں تو یہ ہماری مدد کرتے ہیں" اس نے کہا: "مجھے بھی ایک بت دے دو۔ میں اسے سرزمین عرب لے جاؤں گا، تاکہ وہاں کے لوگ بھی اس کی پرستش کریں" انہوں نے ایک بت اس کے حوالے کردیا جس کا نام 'ہبل' تھا۔ اسے لا کر اس نے کعبے میں نصب کردیا اور لوگوں کو اس کی پرستش اور تعظیم کا حکم دیا"[۱۰]

اس طرح جزیرۃ العرب میں بت پرستی پھیل گئی اور اہل عرب شرک میں مبتلا ہو گئے، انہوں نے عقیدۂ توحید کو ترک کر دیا، حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا دین بدل ڈالا اور انہی گمراہیوں اور اعتقادی اور عملی برائیوں میں مبتلا ہو گئے جن کا دوسری قومیں شکار ہو گئی تھیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کی جہالت، نورِ علم سے محرومی اور ارد گرد کے مختلف قبیلوں اور قوموں سے اثر پزیری تھا۔

البتہ ان میں کچھ لوگ ایسے موجود تھے جو عقیدۂ توحید اختیار کیے ہوئے تھے، حنیفیت کے طریقے پر قائم تھے اور زندگی بعد موت کا اقرار کرتے تھے۔ ان کو پختہ یقین تھا کہ ایک دن اللہ تعالیٰ نیکو کار لوگوں کو اجر و انعام سے نوازے گا اور گناہ گاروں کو سزا دے گا۔ یہ لوگ بت پرستی کو ناپسند کرتے تھے جس میں اہل عرب مبتلا تھے، اور ان فکری گمراہیوں سے بھی محفوظ تھے جن میں دوسرے لوگ غلطاں و پیچاں تھے، اگرچہ دن بدن ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ ان میں قس بن ساعدۃ الایادی، رئاب الشنی، بحیرا راہب، اور دیگر بہت سے لوگوں کو شہرت حاصل ہوئی۔

اسی طرح ان کی بہت سی عادتیں اور رسوم و رواج عہد ابراہیمی کے بقایا اور دین حنیفیت

[۱۰] سیرت ابن ہشام ۱/ ۷۷، نیز دیکھئے کتاب الاصنام، ابن الکلبی ص: ۸-۹

کے اصول اور شعائر پر مبنی تھے۔ اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں دھندلا پن آتا جا رہا تھا۔ ان کی جاہلیت میں حنیفیت کے شعائر اور اصول و مبادی کے کسی قدر اثرات پائے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کا اظہار ان کی زندگی میں بگڑی ہوئی شکل میں ہوتا تھا، مثلاً خانہ کعبہ کی تعظیم، طواف، حج و عمرہ، وقوف عرفہ، قربانی وغیرہ کہ یہ سب چیزیں اصلاً شروع اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے چلی آرہی تھیں۔ لیکن ان میں انہوں نے کچھ تبدیلی کرلی تھی اور بہت سی چیزیں اپنی طرف سے داخل کرلی تھیں۔ مثلاً حج و عمرہ کے دوران وہ جو تلبیہ پڑھتے تھے ان میں شرکیہ جملہ داخل کر لیا تھا۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ: "قبیلۂ کنانہ اور قبیلۂ قریش کے لوگ جب تلبیہ پڑھتے تھے تو لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ (میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں) کے ساتھ یہ بھی شامل کر لیتے تھے: الا شريك هو لك تملكه وماملك (سوائے اس شریک کے جو تیرا ہے۔ تو اس کا مالک ہے اور ان چیزوں کا بھی جس کا وہ مالک ہے) اس طرح وہ پہلے تو توحید کا اقرار کرتے پھر اس کے ساتھ اپنے بتوں کو بھی شریک کر لیتے البتہ اللہ تعالیٰ کو ان کا بھی مالک بنا دیتے۔

خلاصہ یہ کہ جزیرۃ العرب کی تاریخ اس حنیفیت کے زیر سایہ پروان چڑھی جس کے ساتھ ابوالانبیاء حضرت ابرہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ چنانچہ وہاں کے باشندوں کی زندگیاں عقیدۂ توحید اور ایمان و ہدایت کی روشنی سے معمور تھیں، لیکن جوں جوں زمانہ دراز ہوتا گیا۔ صدیاں گزرتی رہیں اور وہ حضرت ابراہیمؑ کے عہد سے دور ہوتے گئے اسی کے بقدر آہستہ آہستہ وہ حق سے دور ہوتے گئے اور ان کی زندگیوں پر شرک اور جہالت کی تاریکیاں اور فکر کی گمراہیاں مسلط ہوتی گئیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کے درمیان حق کی کچھ روشن نشانیاں اور مبادیات موجود تھیں جو ان کی تاریخ کے ساتھ سبک روی سے آگے بڑھ رہی تھیں البتہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ ان پر ضعف و اضمحلال طاری ہوتا جا رہا تھا۔ اسی طرح ان کی تاریخ کے ہر دور میں حق کے حامی اور علم بردار موجود رہے ہیں۔ البتہ ان کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

خاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے ذریعے جب دین حنیف کا شعلہ دوبارہ بھڑکا تو وحی الٰہی نے اس طویل عرصے میں طاری ہونے والی کثیف تاریکیوں اور گمراہیوں کو کافور

کر دیا اور ان کی جگہ ایمان اور توحید کی مشعلیں روشن کیں اور حق و عدل کی بنیادیں استوار کیں۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام جن تعلیمات کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور الٰہی شریعتوں نے جن کا اثبات کیا تھا ان میں سے کچھ تعلیمات جو اس زمانے تک باقی رہ گئی تھیں، وحی الٰہی نے ان کی بھی تائید اور تجدید کی۔

☆ ☆ ☆

اس صورت حال میں یقیناً یہ کہنے کی کوئی حاجت نہیں رہی کہ جس چیز کا ہم نے اثبات کیا ہے وہ بالکل بدیہی ہے اور اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جسے تاریخ کی ادنیٰ سی بھی واقفیت ہو۔ اسی طرح یہ چیز اس شخص کے لیے بھی بدیہی ہے جس نے اسلام کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہو۔ لیکن اس زمانے میں ہمیں مجبوراً اپنا بہت سا وقت بدیہیات کو ثابت کرنے اور واضح چیزوں کو واضح کرنے میں ضائع کرنا پڑتا ہے، اس لئے کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کس طرح بعض لوگ اپنے اعتقادات کو اپنے دلوں میں پوشیدہ خواہشات کے تابع کر دیتے ہیں۔

جی ہاں! اس قسم کے لوگ اب بھی زندہ ہیں اور انہیں مطلق احساس نہیں ہے کہ اس طرح انہوں نے اپنی عقلوں کو ذہنی و فکری غلامی کی کتنی بھاری بیڑیوں میں جکڑ رکھا ہے۔

ارادہ عقیدے کے تابع ہو یا عقیدہ ارادے کے تابع؟ دونوں کے درمیان کتنا عظیم فرق ہے۔ وہ چیز کتنی بلند اور عظیم الشان ہے اور یہ چیز کتنی پست اور گھٹیا۔

جو کچھ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس کے بالکل بدیہی اور مدلل ہونے کے باوجود بعض لوگ ایسے پائے جاتے ہیں جو کہتے ہیں کہ بعثت سے ذرا پہلے جاہلی معاشرے میں مثالی اور قابل تقلید طریقے پر بیداری آنے لگی تھی اور عرب کے سوچنے سمجھنے والے لوگ شرک و بت پرستی کے مظاہر اور ان سے وابستہ جاہلی خرافات کے خلاف بغاوت کرنے لگے تھے۔ اس بیداری کا نقطہ عروج حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور آپ کی دعوت تھی۔

اس دعویٰ کا مقصد — جیسا کہ مخفی نہ ہو گا — یہ دکھانا ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ جاہلی معاشرے کی توحید کے حقائق سے آگاہی میں اضافہ ہو رہا تھا اور وہ نور ہدایت سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ جوں جوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے دور ہوتے جا رہے تھے اور ان کے درمیان صدیاں حائل ہوتی جا رہی تھیں، وہ آپؐ کی دعوت اور

اس کے مبادیات سے قریب تر ہوتے گئے یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ذریعے یہ قرب اپنی انتہا کو پہنچ گیا...!

کیا تاریخ بھی اسی کی گواہی دیتی ہے؟ یا اس سے اس کے بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے؟

آزادی سے غور و فکر اور بحث و تحقیق کرنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ جس عہد میں حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی وہ جاہلیت کے تمام زمانوں کے مقابلے میں ملت ابراہیمی سے سب سے زیادہ ہٹا ہوا تھا۔ آپؐ کی بعثت کے وقت عربوں میں حنفیت کے جو شعائر اور عناصر باقی تھے، مثلاً بتوں سے نفرت، ان کی پرستش سے اجتناب اور بعض ان فضائل اور اقدار کی جانب رغبت جنھیں اسلام نے بھی باقی رکھا، ان کی حیثیت "بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی" جیسی تھی۔ چند صدیوں پہلے ان کے نزدیک ان شعائر و اقدار کا جتنا واضح تصور موجود تھا اب اس کا دسواں حصہ بھی نہ بچا تھا۔ اگر ان لوگوں کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے کہ عہد بعثت کا جاہلی معاشرہ نور ہدایت سے قریب تر ہو گیا تھا جب کہ گزشتہ صدیوں میں وہ اس سے کافی دور تھا تو اس اعتبار سے تو آنحضرت ﷺ کی بعثت کئی صدیوں قبل ہونی چاہئے تھی..!!

کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس سے ہٹ کر ایک دوسری بات کہتے ہیں اور وہ یہ کہ عربوں میں جو روایات، رسوم و رواج اور غیبی عقائد معروف تھے، جب محمد (ﷺ) ان میں سے بیشتر کا خاتمہ نہ کر سکے تو آپ نے انہیں مذہبی رنگ دے دیا اور انہیں اس طرح پیش کیا جیسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کا حکم دیا گیا ہو۔ بالفاظ دیگر محمد (ﷺ) نے عربوں کے درمیان پائے جانے والے تمام غیبی عقائد کو باقی رکھا اور انہیں کنٹرول کرنے کے لیے ایک ایسے خدا کا تصور پیش کیا جو ہر چیز پر قادر ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ چنانچہ اہل عرب اسلام کے بعد بھی جادو، جن اور ان جیسے دیگر تمام عقائد پر قائم رہے اور جس طرح وہ اسلام سے قبل خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تھے، اس کا احترام اور تقدیس بجالاتے تھے اور اس کے پاس مخصوص شعائر اور رسوم انجام دیتے تھے، اسی طرح اسلام کے بعد بھی کرتے رہے۔

یہ لوگ اپنے اس دعوی کو دو مفروضوں پر قائم کرتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ کسی بھی حال میں یہ مفروضے غلط قرار پائیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ محمد (ﷺ) نبی نہیں تھے اور دوسرا یہ کہ عربوں میں جو شعائر اور رسوم رائج تھے وہ ان کے خود ساختہ تھے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ

انہیں خود انہوں نے ایجاد کیا تھا۔ گویا خانہ کعبہ کا احترام اور تقدیس ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے اثرات میں سے نہ تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا حکم دیا تھا۔ بلکہ یہ چیز عربی ماحول کی پیداوار تھی اور وہ ان رسوم میں سے ہے جنھیں عربوں نے خود وجود بخشا تھا۔

ان دونوں مفروضوں کو کوئی کمزوری یا خلل لاحق نہ ہونے پائے اسے یقینی بنانے کے لیے یہ لوگ ان تمام روشن دلائل اور عظیم تاریخی حقائق سے آنکھیں موند لیتے ہیں جو ان کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں یا ان کی تردید کرتے اور ان کا فساد و بطلان واضح کرتے ہیں۔

یہ چیز معروف ہے کہ کوئی شخص حقیقت تک ہرگز رسائی نہیں حاصل کر سکتا اگر وہ پہلے سے اپنے ذہن میں ایک مفروضہ قائم کر کے اس کی بنیاد پر اس کا متلاشی ہو۔ اس قسم کی بحث و تحقیق انتہائی مہمل اور مضحکہ خیز ہو گی۔

اگر ہمارا مقصود نفسِ حقیقت ہو اور ہم دوسروں کے سامنے جھوٹ گھڑ کر پیش کرنا اور محض تعصب کی وجہ سے اور آزاد تحقیق کے نام پر انہیں ایک مخصوص فکر — خواہ وہ کیسی بھی ہو اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ ہو — قبول کرنے پر مجبور کرنا نہ چاہتے ہوں تو ہمارے لیے اس سے مفر نہیں کہ ہم ہر عقلی دلیل یا ہر تاریخی واقعے کا اعتبار کریں۔ پس ہمارے لیے کسی حال میں ممکن نہیں کہ ہم محض یہ مفروضہ تسلیم کرنے کے لیے کہ (حضرت) محمد (ﷺ) نبی نہیں تھے، آپ کی نبوت کے مختلف دلائل مثلاً وحی، معجزۂ قرآن، آپ کی اور انبیاء سابقین کی دعوتوں میں مطابقت اور آپ کے اخلاق و اوصاف سے چشم پوشی کر لیں۔ اسی طرح ہمارے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ محض یہ مفروضہ تسلیم کرنے کے لئے کہ عہدِ جاہلیت میں پائے جانے والے شعائر و عادات جنہیں ہم بقایائے حنیفیت کا نام دیتے ہیں، در حقیقت عربوں کے ایجاد کردہ رسوم تھے جنہیں محمد (ﷺ) نے مذہب کا رنگ دے دیا تھا — اس تاریخ سے صرف نظر کر لیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ عزوجل کے حکم اور ہدایت کے بموجب کی تھی، اور اس حقیقت سے اغماض برت لیں کہ تمام انبیاء نے توحید، حشر و نشر، جزاء و سزا، جنت و جہنم اور دیگر غیبی حقائق پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی جیسا کہ تمام کتبِ سماوی سے معلوم ہوتا ہے، تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نسلوں کا حافظہ اس کی شہادت دیتا ہے۔

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اس پر کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں لاتے۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اس تصور کو خوشنما عبارتوں میں پیش کریں، اور بس۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ان کی بات دلائل و براہین سے آراستہ بھی ہے یا نہیں؟

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا، اگر آپ اس کی کوئی مثال چاہتے ہیں تو مشہور انگریز مستشرق گب کی کتاب "مذہبی فکر کی اساس" کا مطالعہ کیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اندھی عصبیت ان لوگوں پر کتنا اثر دکھاتی ہے؟ یہ عجیب و غریب عصبیت جس شخص پر طاری ہو جاتی ہے اسے دیانت و شرافت کے لوازم سے عاری کر دیتی ہے اور وہ عظیم دلائل اور روشن حقائق کے سامنے اندھا بہرا بن جاتا ہے تاکہ اسے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا پڑے۔

گب کی نظر میں اسلامی فکر کی بنیاد حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے قبل عرب احیائیت پر مبنی غیبی عقائد و افکار ہیں۔ اس کے مطابق آپؐ نے ان میں غور و فکر کیا، ان میں سے جن میں کچھ تبدیلی کرنا آپ کے لیے ممکن ہو سکا انہیں تبدیل کر دیا، بقیہ کو مذہب کا لبادہ اوڑھا دیا اور ان کی مناسبت سے کچھ دیگر افکار اور مذہبی رسوم ایجاد کر لیے۔ اس وقت آپ کے سامنے ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ آپ اس مذہبی زندگی کو صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام اقوام و قبائل کے لیے نمونہ بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اس کا حل آپ نے یہ نکالا کہ اس زندگی کو قرآن کی بنیاد پر استوار کیا۔

یہ ہے گب کی مذکورہ بالا کتاب کا خلاصہ ——— اس میں شروع سے آخر تک یہی افکار پیش کیے گئے ہیں۔ آپ اس کی ان باتوں پر ایک بھی دلیل نہ پائیں گے۔ اس کے ان افکار کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو اس بات میں ذرا سا بھی شک نہ رہے گا کہ مصنف جس جگہ بیٹھ کر یہ کتاب لکھ رہا تھا وہاں اس نے اپنی عقلی صلاحیتوں کو پھٹکنے بھی نہیں دیا، بلکہ ان کے بدلے اوہام و خرافات کو جگہ دے دی تھی اور ان کی رہنمائی میں اپنے افکار و خیالات پیش کیے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ گب جب اپنی اس کتاب کے عربی ترجمے پر مقدمہ لکھ رہا تھا تب اسے احساس ہوا کہ قارئین اسلام کے بارے میں اس کے ان افکار کو حقارت سے رد کر دیں گے۔ چنانچہ اس نے معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے لکھا: "ان فصول میں جو افکار پیش کیے گئے ہیں وہ مؤلف کے دماغ کی اختراع نہیں ہیں بلکہ اس سے پہلے بہت سے مفکرین اور سرکردہ مسلم

علماء پیش کر چکے ہیں۔ان کے ناموں کا استقصاء طول کا باعث ہوگا۔ یہاں بطور مثال صرف ایک عالم دین کا نام ذکر کیا جاتا ہے اور وہ ہیں شیخ کبیر شاہ ولی اللہ دہلوی"

اس کے بعد گب نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغۃ (جلد اول ص: ۱۲۲) سے ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسے اطمینان تھا کہ کوئی قاری اصل کتاب سے رجوع کرنے اور حوالے کی تحقیق کرنے کی زحمت نہیں اٹھائے گا۔ اسی لیے اس نے حسب خواہش تحریف سے کام لیا، اور صرف اتنی عبارت لے لی جسے خود ساختہ مفہوم پہنایا جاسکے۔اس نے شاہ ولی اللہ کی جو عبارت نقل کی ہے وہ یہ ہے:

"نبی ﷺ کی بعثت در حقیقت دو بعثتوں پر مشتمل تھی۔ آپ کی پہلی بعثت بنی اسماعیل کی طرف تھی۔اس کا تقاضا تھا کہ آپ کی شریعت کی بنیاد ان شعائر، عبادات، معاملات اور عادات واطوار پر ہو جو ان کے یہاں معروف ہوں، اس لیے کہ شریعت موجود چیزوں میں در آئی تحریفات کی اصلاح کا نام ہے نہ کہ غیر معروف چیزوں کے مکلّف کرنے کا"[۱]

جبکہ مذکورہ بالا عبارت کے ساتھ حجۃ اللہ البالغۃ میں درج ذیل عبارت بھی ہے:

"جاننا چاہیے کہ آنحضرت ﷺ حنیفیتِ اسماعیلیت کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے تاکہ اس میں پیدا ہو جانے والی کجی کو دور کر سکیں، اس میں در آئی تحریفات کا ازالہ کر سکیں اور اس کے نور کو عام کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ملة ابيكم ابراهيم" (اپنے باپ ابراہیم کے طریقے پر چلو) اس صورت میں لازم ہوا کہ اس امت کے اصول مسلّم اور طریقے طے شدہ ہوں۔ نبی ﷺ جب ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس کے اندر صراط مستقیم کے بقایاجات موجود تھے تو ان میں تبدیلی کر دینا قطعی نامناسب تھا، بلکہ انھیں باقی رکھنا ضروری تھا، اس لئے کہ یہ چیز ان کے نفوس سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی اور اس طرح ان پر بآسانی حجت قائم کی جاسکتی تھی۔ بنو اسماعیل اپنے باپ اسماعیل کے طریقے پر عمل پیرا اور ان کی شریعت پر قائم تھے یہاں تک کہ عمرو بن لحی پیدا ہوا۔ اس نے اپنی فاسد رائے سے اس میں بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا، خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ اس نے بت پرستی کو رائج کیا، بتوں کے نام پر جانوروں کو آزاد چھوڑنے اور ان کے کان چیرنے کا چلن عام کیا۔ اس وقت دین

[۱] دیکھئے گب کی کتاب مذہبی فکر کی اساس ص: ۵۸

میں فساد پیدا ہو گیا، صحیح اور غلط گڈمڈ ہو گئے اور جہالت، شرک اور کفر کا غلبہ ہو گیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث کیا تاکہ آپ کجی کو درست کریں اور فساد کی اصلاح کریں۔ آپؐ نے ان کی شریعت کو دیکھا، اس میں سے جو چیزیں حضرت اسماعیلؑ کے طریقے کے مطابق یا شعائر اللہ میں سے تھیں انہیں باقی رکھا اور جن چیزوں میں تحریف اور فساد در آیا تھا یا وہ شرک وکفر میں سے تھیں ان کا ابطال کیا اور ان کے غلط ہونے پر مہر ثبت کر دی"

☆ ☆ ☆

درج بالا مثال ہم نے بحث و مباحثہ کے لیے نہیں ذکر کی ہے، اس لئے کہ اس قسم کی لغو بات میں مباحثہ لاحاصل ہے، بلکہ اسے پیش کر کے ہم قاری کو یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اندھی عصبیت آدمی کو کہاں پہنچادیتی ہے؟ اور اہل مغرب کے نزدیک علمی طریقۂ بحث اور معروضیت کی کیا حقیقت ہے جس کا بعض لوگ ڈھنڈورا پیٹتے ہیں؟ اسی طرح ہم یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مغرب کی اندھی اور ذلت آمیز تقلید بعض مسلمانوں کو کہاں سے کہاں پہنچادیتی ہے۔؟

گزشتہ تفصیل سے آپ پر بخوبی واضح ہو گیا ہو گا کہ ظہور اسلام سے قبل عربوں میں رائج جاہلی فکر اور اسلام کے درمیان تعلق کی کیا حقیقت ہے؟ اسی طرح عہد جاہلیت اور ملت حنفی جس کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، دونوں کے درمیان کیا تعلق پایا جاتا ہے؟ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ جب عربوں میں رائج رسوم ورواج کا خاتمہ کر رہے تھے اور ان کے خلاف برسرپیکار تھے تو آپ نے بہت سے عادات واطوار اور اصول ومبادی کیوں باقی رکھے؟

☆ ☆ ☆

گزشتہ صفحات میں جو تمہیدی مباحث پیش کیے گئے ہیں وہ سیرت نبوی کے مطالعہ اور ان سے دروس ونصائح کے استنباط سے قبل ضروری تھے۔ آئندہ بحثوں میں آپ مزید دلائل پائیں گے جن سے یہ باتیں مزید واضح ہوں گی، ان کے نکھار میں اضافہ ہوگا اور ان کی حقیقت اور بھی واشگاف ہو کر سامنے آجائے گی۔

باب دوم

ولادت سے بعثت تک

- آں حضرت ﷺ کا نسب، ولادت اور رضاعت
- شام کا پہلا سفر، پھر کسبِ معاش کی جد و جہد
- حضرت خدیجہؓ کے مال کی تجارت اور ان سے نکاح
- خانۂ کعبہ کی تعمیر میں آں حضرت ﷺ کی شرکت
- غارِ حرا میں خلوت گزینی
- آغازِ وحی

آنحضرت ﷺ کا نسب، ولادت اور رضاعت

آنحضرت ﷺ کا سلسلۂ نسب درج ذیل ہے:

محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب (انہیں شیبۃ الحمد بھی کہا جاتا تھا) ابن ہاشم بن عبد مناف (ان کا نام مغیرہ بھی ہے) ابن قصی (ان کا نام زید بھی ہے) ابن کلاب بن مرّہ بن کعب بن غالب بن فہر بن مالک بن النضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معدّ بن عدنان۔

آپؐ کے نسب مبارک کے اس قدر حصہ پر ماہرین انساب کا اتفاق ہے، اس کے اگلے حصے میں اختلاف ہے اور اس کے بارے میں اعتماد کے ساتھ کوئی بات کہنا ممکن نہیں۔ البتہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ عدنان حضرت اسماعیل بن ابراہیم خلیل اللہ علیہما السلام کی نسل سے تھے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بہترین قبائل اور ان کی افضل شاخوں اور پاکیزہ نسلوں سے منتخب فرمایا تھا۔ آپ کے سلسلۂ نسب میں کسی مرحلہ پر بھی جاہلیت کی گندگی سرایت نہیں ہوئی تھی۔ امام مسلمؒ نے اپنی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کی اولاد میں کنانہ کو منتخب فرمایا، کنانہ میں سے قریش کو منتخب فرمایا، قریش میں سے ہاشم کو منتخب فرمایا اور بنو ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا۔"

آپ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی، یعنی اس سال جب ابرہہ الاشرم نے مکہ پر حملہ کرنے اور خانۂ کعبہ کو ڈھانے کی کوشش کی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی روشن نشانی کے ذریعے — جس کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے — اس کا منہ پھیر دیا تھا۔ راجح قول یہ ہے کہ وہ دوشنبہ کا دن تھا

اور ربیع الاول کی بارہ تاریخ تھی۔

آپ یتیم پیدا ہوئے۔ آپ کے والد عبداللہ کا جب انتقال ہوا تو آپؐ ابھی شکم مادر ہی میں تھے (آپ کی والدہ کو اس وقت صرف دو ماہ کا حمل تھا) آپ کی پیدائش پر آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپؐ کی خبر گیری کی اور اس زمانہ میں عربوں کے رواج کے مطابق آپ کی رضاعت کا انتظام کیا، اور اس کے لیے قبیلہ بنوسعد بن بکر کی ایک خاتون حلیمہ بنت ابی ذوئیب کی خدمات حاصل کیں۔

تمام اصحاب سیر کا اتفاق ہے کہ قبیلہ بنوسعد کے علاقے میں اس سال خشک سالی تھی، کھیتیاں سوکھ گئی تھیں اور چارہ نہ ملنے کی وجہ سے جانور دودھ نہ دیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ جوں ہی دائی حلیمہ کے گھر پہنچے اور ان کی گود میں سکون پایا، ان کے گھر کے ارد گرد سرسبزی اور ہریالی آگئی، چنانچہ ان کی بکریاں روزانہ شام کو شکم سیر ہو کر آتی تھیں اور ان کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہوتی تھیں۔

ابھی آپ قبیلہ بنوسعد ہی میں تھے کہ شقِ صدر کا مشہور واقعہ پیش آیا جسے امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے[1] اس کے بعد آپ اپنی والدہ کے پاس واپس آگئے۔ اس وقت آپ پانچ سال کے ہو چکے تھے۔

جب آپ کی عمر چھ سال کی ہوئی تو آپ کی والدہ آمنہ کا انتقال ہو گیا۔ تب آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں آگئے۔ پھر جب آپ آٹھ سال کے ہوئے تو دادا کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد چچا ابوطالب نے آپ کی سرپرستی کی۔

دروس ونصائح

سیرت نبوی کے اس حصے سے کچھ اہم اصول مستنبط ہوتے ہیں اور چند اہم نصیحتیں ملتی ہیں۔ انہیں ہم باختصار سطور ذیل میں بیان کرتے ہیں:

[1] قبیلہ بنوسعد میں آپؐ کی پرورش، رضاعت اور شق صدر کے واقعے کے لیے دیکھئے صحیح مسلم ۱/۱۰۱-۱۰۲، نیز سیرت ابن ہشام ۱/۶۴

۱۔ اہل عرب اور قریش کی فضیلت کے وجوہ:

آنحضرت ﷺ کے نسب مبارک سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے عربوں کو تمام انسانوں سے ممتاز بنایا تھا اور عربوں میں بھی قریش کو دیگر قبائل پر فضیلت بخشی تھی۔ یہ وضاحت امام مسلمؒ کی روایت کردہ حدیث میں موجود ہے۔ اس مضمون کی دیگر بہت سی احادیث ہیں۔ مثلاً ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: "میں کون ہوں؟" صحابہ نے عرض کیا: "آپ اللہ کے رسول ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہوں۔ اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا، پھر انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا، اور مجھے ان میں سے بہتر گروہ میں رکھا۔ پھر اس بہتر گروہ کو مختلف قبائل میں تقسیم کیا اور مجھے ان میں سے بہتر قبیلہ میں رکھا۔ پھر اس قبیلہ کو خاندانوں میں تقسیم کیا، اور مجھے ان میں سے بہتر خاندان میں رکھا۔ اس خاندان میں بھی میں سب سے افضل ہوں"[2]

جاننا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس قوم سے محبت کی جائے جس میں آپ کا ظہور ہوا اور اس قبیلے سے عقیدت کا اظہار کیا جائے جس میں آپ کی ولادت ہوئی۔ یہ محبت وعقیدت افراد اور نسل سے نہیں بلکہ بحیثیت حقیقت مجردہ ہونی چاہئے، اس لیے کہ عربوں اور ان میں سے قریش کو شرف اور فضیلت محض رسول اللہ ﷺ کے ان کی طرف انتساب سے حاصل ہوئی۔

یہ چیز اس کے منافی نہیں ہے کہ عربوں اور قریش میں سے جو لوگ اللہ کے راستے سے دور رہے اور اسلامی عظمت وشرف کے بلند مقام کو حاصل نہ کر سکے وہ اس فضیلت کے مستحق نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ اس انحراف اور انحطاط نے انہیں اس شرف انتساب سے محروم کر دیا جو انہیں رسول اللہ ﷺ سے حاصل تھا اور اسے یکسر ناقابل اعتبار بنا دیا۔

۲۔ رسول ﷺ کے یتیم پیدا ہونے کی حکمتیں:

یہ چیز اتفاقیہ نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ یتیم پیدا ہوئے، پھر بہت جلد اپنے دادا سے بھی محروم ہو گئے۔ چنانچہ ابتدائی زندگی میں آپ کی پرورش باپ کی تربیت وسرپرستی اور ماں کی

[2] ترمذی ۹/۲۳۶، کتاب المناقب

شفقت و محبت سے محرومی کی حالت میں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی کی پرورش کے ایسے حالات پیدا کرنے میں متعدد روشن حکمتیں تھیں۔ اس کی سب سے اہم حکمت یہ تھی کہ اہل باطل کو لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کرنے اور اس وہم میں مبتلا کرنے کا موقع ہی نہ ملے کہ محمد (ﷺ) نے بعد میں جس دعوت کا علم بلند کیا اور جو پیغام عام کیا اس کی انہیں بچپن ہی میں اپنے باپ اور دادا کی سرپرستی میں تربیت مل چکی تھی۔ اس شبہے کو تقویت اس بات سے ملتی کہ آپؐ کے دادا عبدالمطلب اپنی قوم کے سردار تھے اور انہیں رفادہ اور سقایہ کے مناصب حاصل تھے۔[1] اور عام طور سے ایسا ہی ہوتا ہے کہ دادا اپنے پوتے کی اور باپ اپنے بیٹے کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ وہ اس کی میراث کی حفاظت کر سکے۔

اللہ کی حکمت یہ تھی کہ اہل باطل کو اس قسم کا شبہ پیدا کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ چنانچہ اس نے اپنے رسول کی پرورش کا انتظام باپ، ماں اور دادا سے دور رکھ کر کیا۔ آپؐ نے اپنا بچپن اپنے پورے خاندان سے دور قبیلہ بنو سعد کے دیہات میں گزارا۔ پھر جب دادا کا انتقال ہو گیا اور آپ اپنے چچا ابو طالب کی کفالت میں آگئے جو ہجرت مدینہ سے تین سال قبل تک زندہ رہے، تو حکمتِ الٰہی کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا۔ اس طرح اس وہم کی بھی کوئی گنجائش باقی نہ رہی کہ آپ کی دعوت میں آپ کے چچا کا بھی کچھ دخل تھا اور یہ مسئلہ دراصل قبیلہ، خاندان، لیڈری اور منصب کا مسئلہ تھا۔

اس طرح حکمت الٰہی کے بموجب آپؐ نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی۔ نہ آپ کو قریبی رشتہ داروں کی سرپرستی حاصل رہی جو آپ کے ناز و نخرے اٹھاتے اور نہ آپ کے پاس مال و دولت کی فراوانی تھی جس سے آپ کے عیش و عشرت میں اضافہ ہوتا۔ بلکہ محض عنایت الٰہی آپ کے اوپر جلوہ فگن رہی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آپؐ کے دل میں مال و جاہ کی عظمت گھر نہ کرنے پائے اور آپ اپنے خاندان میں پائے جانے والے عہدوں اور مناصب سے متاثر نہ ہونے

[1] رفادہ سے مراد حاجیوں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا اور سقایہ سے مراد ان کو آب زمزم پلانا ہے۔ قریش زمانہ جاہلیت میں آپس میں چندہ کر کے کافی سرمایہ اکٹھا کر لیتے تھے اور اس کے ذریعے سامان خوراک، کشمش، نبیذ وغیرہ خرید کر ایام حج میں لوگوں کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔

پائیں۔ اور دوسری طرف لوگوں کی نظروں میں نبوت کا تقدس اور دنیا کی جاہ و حشمت گڈمڈ نہ ہو جائے اور وہ یہ نہ گمان کرنے لگیں کہ آپؐ نے موخر الذکر شیٔ کو حاصل کرنے کے لیے پہلی چیز کو ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے۔

۳۔ حلیمہ کے ساتھ فضل الٰہی کا معاملہ اور اس سے استنباطات:

اصحاب سیر کا متفقہ بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ کے حلیمہ کے گھر پہونچتے ہی اس کے اطراف کے علاقے میں خوب ہریالی آگئی جب کہ اس سے پہلے وہ خشک اور چٹیل میدان تھا۔ اسی طرح ان کی بوڑھی اونٹنی کے تھن خوب بھر گئے جب کہ اس سے پہلے وہ بالکل خشک رہتے تھے۔ ان سے ایک قطرہ دودھ نہ ٹپکتا تھا۔ اس سے بارگاہ الٰہی میں رسول اللہ ﷺ کی عظمت شان اور عالی مقامی کا پتہ چلتا ہے، اور واضح ہوتا ہے کہ اس وقت بھی جب کہ آپ ابھی نو عمر اور دوسرے بچوں کی طرح ایک بچے تھے، اللہ تعالیٰ کی عنایات آپ کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اس کا مظہر یہ ہے کہ حلیمہ سعدیہ (جنھیں آپ کو دودھ پلانے کا شرف حاصل ہوا) کے گھر آپ کے پہونچتے ہی اس گھر پر اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کی بارش ہونے لگی۔ اس میں کچھ حیرت اور تعجب بھی نہ ہونا چاہئے۔ اسلامی شریعت نے تعلیم دی ہے کہ اگر بارش رک جائے تو نیک لوگوں اور حضرت محمد ﷺ کے اہل بیت کی برکت سے ہم بارش کی دعا کریں۔ اس طرح امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعا قبول کرلے گا[2] پھر اس جگہ کے شرف و فضیلت کا کیا کہنا جہاں خود آپؐ کی ذات گرامی بنفس نفیس موجود ہو۔ اگر آپ کے سبب سے آسمان سے بارش ہو سکتی ہے اور زمین سے سوتے پھوٹ سکتے ہیں تو خشک بنجر زمین بدرجہ اولیٰ لہلہا سکتی ہے۔ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اور وہی مسبب الاسباب ہے۔ یہ بات عین مناسب ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی برکت اور انعام الٰہی کے اسباب میں سر فہرست ہو، اس لئے کہ آپ انسانوں کی طرف اللہ کی رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ارشاد باری ہے:

[2] اہل صلاح و تقویٰ اور خاندان نبوت سے تعلق رکھنے والوں کے واسطے سے دعا کرنا مستحب ہے۔ خواہ استسقاء کا معاملہ ہو یا کوئی دوسرا۔ اس پر جمہور ائمہ و فقہاء کا اتفاق ہے۔ دیکھئے فتح الباری ۲/ ۳۳۹، نیل الاوطار ۲/ ۷، سبل السلام ۲/ ۱۳۴، المغنی، ابن قدامہ حنبلی ۲/ ۲۶۵

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ. (الانبیاء:۱۰۷)

اے نبی ہم نے تو تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

۴۔ واقعۂ شقِ صدر نبوت کے نمایاں اشارات میں سے ہے:

واقعہ شق صدر اس زمانے میں پیش آیا تھا جب آپ قبیلہ بنو سعد میں پرورش پا رہے تھے اس کا شمار نبوت کے اشارات میں ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعے کوئی اہم کام لینے والا ہے۔ یہ واقعہ بہت سے صحابہ سے متعدد صحیح سندوں سے مروی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ "حضرت جبرئیل رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ اس وقت آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو لے کر زمین پر لٹا دیا، سینہ مبارک شق کیا اور اس میں سے دل نکالا پھر اس میں سے لوتھڑے کی مانند ایک چیز نکالی اور کہا: یہ شیطان کا حصہ ہے۔ پھر دل کو ایک سنہری طشت میں رکھ کر آبِ زمزم سے دھویا اور اچھی طرح صاف کر کے اس کو اپنی جگہ واپس رکھ دیا۔ بچے اپنی ماں — دائی حلیمہ کے پاس بھاگتے ہوئے آئے اور خبر دی کہ محمد کا قتل ہو گیا۔ لوگ بھاگے ہوئے وہاں پہنچے تو آپ کو اس حال میں پایا کہ آپ کا چہرہ فق تھا۔"[۵]

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کی حکمت یہ نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے جسم مبارک میں کوئی غدۂ شر تھا جسے نکال کر پھینک دیا گیا۔ اس لیے کہ اگر انسان سے شر صادر ہونے کا سبب کوئی غدہ یا جسم کے کسی گوشے میں پایا جانے والا لوتھڑا ہوتا تو جراحی عمل (SURGERY) کے ذریعے برے آدمی کو نیک بنایا جانا ممکن ہوتا۔ بلکہ اس کی حکمت یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کا معاملہ مشتہر ہو جائے اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپ کو بچپن ہی سے مختلف مادی وسائل کے ذریعے عصمت اور وحی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، تاکہ جب آپ اپنی رسالت کا اعلان کریں تو لوگ بآسانی آپ پر ایمان لے آئیں اور آپ کی تصدیق کریں۔ گویا یہ معنوی تطہیر کا عمل تھا جسے اس مادی اور حسی شکل میں پیش کیا گیا، تاکہ اس کی حیثیت الٰہی اعلان کی ہو جائے جسے لوگ

---

۵ صحیح مسلم ۱/۱۰۱-۱۰۲۔ صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شقِ صدر کا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا تھا۔

اپنے کانوں سے سن سکیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ واللہ اعلم

بہر حال اس واقعے کی جو بھی حکمت ہو لیکن اس کا پیش آنا صحیح روایات سے ثابت ہے۔ اس لیے اسے ظاہر اور حقیقت سے پھیر کر اس کی دور دراز اور پر تکلف تاویل کرنے کی کوشش کرنا مناسب نہیں۔ روایات کی صحت کے باوجود اگر کوئی شخص اس طرح کی کوشش کرتا ہے تو اس کا اس کے علاوہ اور کوئی مطلب نہیں کہ اللہ عزوجل پر اس کا ایمان کمزور ہے۔

جاننا چاہیے کہ کسی خبر کو قبول کرنے کا پیمانہ روایت کی صحت و صداقت ہے۔ اگر کوئی روایت پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے تو اسے بسر و چشم قبول کرنے سے مفر نہیں۔ اس وقت ہمارا کام بس یہ ہو گا کہ عربی زبان کی دلالتوں اور قواعد کے ذریعے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کلام میں اصل حقیقت ہوتی ہے۔ اگر ہر قاری اور ہر محقق کو اجازت ہو کہ وہ کلام کی حقیقت کو نظر انداز کر کے اس کے مختلف مجازی معانی اپنے پیش نظر رکھے اور ان میں سے جو معنی بھی اسے اچھا لگے اسے اختیار کر لے تو زبان کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ جائے گی، اس کی دلالت ختم ہو جائے گی اور لوگ معانی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔

پھر تاویل کرنے اور حقیقت کو قبول نہ کرنے کی ضرورت کیا ہے؟

اس کی ضرورت اسی وقت ہو گی جب اللہ پر ایمان کمزور ہو اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور آپ کی رسالت کی سچائی پر پختہ یقین نہ ہو۔ ورنہ اگر بات یہ نہیں ہے تو ہمیں ان تمام باتوں پر یقین کر لینا چاہیے جو صحیح روایات سے ہم تک پہنچی ہیں، خواہ ان کی حکمت و علت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

شام کا پہلا سفر، پھر کسبِ معاش کی جدّو جہد

جب آنحضرت ﷺ بارہ سال کے ہوگئے تو ایک مرتبہ آپ کے چچا ابو طالب نے ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ اس سفر میں انہوں نے آپ کو اپنے ساتھ لے لیا قافلے نے راستے میں بصریٰ میں پڑاؤ ڈالا۔ وہاں بحیرا نامی ایک راہب تھا۔ وہ انجیل سے واقف اور نصرانیت پر عمل پیرا تھا۔ بحیرا کی نبی ﷺ پر نظر پڑی تو وہ آپ کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے آپؐ سے گفتگو بھی کی۔ پھر ابو طالب کی طرف متوجہ ہوا اور ان کی درمیان یہ گفتگو ہوئی:

بحیرا : یہ لڑکا آپ کا کون ہے؟

ابو طالب : میرا بیٹا ہے (ابو طالب شدید محبت و شفقت کی بنا پر آنحضرت ﷺ کو بیٹا کہتے تھے)

بحیرا : ہرگز نہیں، اس لڑکے کا باپ زندہ نہیں ہوسکتا۔

ابو طالب : یہ میرا بھتیجا ہے۔

بحیرا : اس کے باپ کو کیا ہوا؟

ابو طالب : اس کے باپ کا اسی وقت انتقال ہو گیا تھا جب وہ اپنی ماں کے پیٹ میں تھا۔

بحیرا : تم نے سچ کہا۔ اسے لے کر وطن واپس جاؤ اور یہود سے اس کی حفاظت کرو۔ اللہ کی قسم اگر یہود اسے دیکھ لیں گے تو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ آئندہ تمہارے اس بھتیجے کی عظیم شان ہوگی۔

اس گفتگو کے بعد ابو طالب فوراً آنحضرت ﷺ کو مکہ واپس لے آئے[6]۔ جب رسول ﷺ کی عمر کچھ اور زیادہ ہوئی اور آپ جوانی کی سرحد میں داخل ہوئے تو کسبِ معاش کی جدو جہد

[6] سیرت ابن ہشام ۱/۱۸۰ باختصار، اس روایت کو امام طبری نے اپنی تاریخ ۲/۲۸۷ میں، بیہقی نے سنن میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں روایت کیا ہے۔ ان روایات کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر.........)

شروع کی اور بکریاں چرانے کا پیشہ اختیار کیا۔ بعد میں آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا: "میں چند قیراط (سکوں) کے عوض اہل مکہ کی بکریاں چراتا تھا"[7] اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو لہو و لعب کے ان مظاہر سے محفوظ رکھا جن کی طرف عموماً اس عمر کے نوجوانوں کا میلان ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"دو مرتبہ سے زیادہ کبھی مجھے ان کاموں سے دلچسپی نہیں ہوئی جو اہل جاہلیت کرتے تھے۔ اور دونوں مرتبہ اللہ نے مجھے ان سے محفوظ رکھا، اس کے بعد کبھی میرے دل میں ان کا خیال تک نہیں آیا، یہاں تک کہ اللہ نے مجھے رسالت سے سرفراز فرمایا: ایک مرتبہ میں نے اس لڑکے سے جو میرے ساتھ مکہ کے بالائی حصے میں بکریاں چرایا کرتا تھا کہا کہ تم ذرا میری بکریوں کی دیکھ بھال کرو، میں مکہ میں جاکر رات کی ان دلچسپیوں میں حصہ لوں جن میں دوسرے نوجوان حصہ لیتے ہیں۔ اس نے کہا ٹھیک ہے۔ میں شہر کی طرف چلا۔ ابھی شہر میں داخل ہی ہوا تھا کہ پہلے گھر میں گانے بجانے کی آوازیں سنیں۔ میں نے دریافت کیا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا: شادی ہے۔ میں بیٹھ گیا۔ اللہ نے میرے کانوں پر پردہ ڈال دیا۔ میں سو گیا یہاں تک کہ دن

تفصیل میں کچھ اختلاف ہے۔ اس روایت کو امام ترمذی نے دوسرے انداز سے مفصل نقل کیا ہے۔ لیکن شاید اس کی سند میں کچھ ضعف ہے، اسی لیے انہوں نے خود بھی لکھا ہے: "یہ حدیث حسن غریب ہے، ہم اسے صرف اسی سند سے جانتے ہیں۔" اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن غزوان ہے۔ اس کے بارے میں 'میزان' میں تحریر ہے: "اس سے بعض منکر احادیث مروی ہیں۔ ان میں سب سے منکر حدیث وہ ہے جو اس نے یونس بن ابی اسحاق سے روایت کی ہے اور جس میں نبی ﷺ کی نوعمری میں ابو طالب کے ساتھ شام کے سفر کا بیان ہے۔" اور ابن سید الناس نے لکھا ہے: "اس روایت کے متن میں بعض منکر باتیں ہیں (دیکھئے عیون الاثر ۱/۴۳) عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود شیخ ناصر الدین البانی نے (جنہوں نے شیخ محمد غزالی کی کتاب فقہ السیرۃ کی احادیث کی تخریج کی ہے) اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے: "اس کی سند صحیح ہے۔" انہوں نے امام ترمذی کا تبصرہ بھی مکمل نقل نہیں کیا ہے بلکہ اس کا صرف اتنا حصہ دیا ہے: "یہ حدیث حسن ہے۔" حالانکہ ان کی عادت ہے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ صحیح حدیث کو بھی بسا اوقات ضعیف قرار دے دیتے ہیں جہاں تک قدر مشترک کا تعلق ہے وہ بہت سے طرق سے ثابت ہے ــــ اور اس میں کوئی ضعف نہیں ہے۔

[7] بخاری

نکل آیا اور سورج کی گرمی سے میری آنکھ کھلی۔ میں اپنے ساتھی کے پاس لوٹ آیا اور اس کے دریافت کرنے پر سارا ماجرا سنادیا۔ دوسری رات میں نے اپنے ساتھی سے پھر وہی بات کہی۔ وہ راضی ہو گیا۔ میں مکہ میں داخل ہوا مگر اس رات بھی وہی کچھ ہوا جو گزشتہ رات ہو چکا تھا (تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ سو گیا اور دن نکلنے تک سوتا رہا) اس کے بعد پھر کبھی اس طرح کی کسی چیز کی طرف میرا میلان نہیں ہوا"۵

دروس ونصائح

۱۔ اہل کتاب کو آنحضرت ﷺ کی بعثت کا علم تھا

واقعہ بحیرا کو عام سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس کی روایت حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے تفصیل سے کی ہے۔ اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کے پاس علم تھا کہ نبی ﷺ کی بعثت ہونے والی ہے۔ وہ آپ کی علامات سے بھی واقف تھے۔ اس لئے کہ تورات اور انجیل میں آپ کی بعثت کی پیشین گوئی اور آپ کی علامات اور اوصاف مذکور تھے۔ اس چیز کے شواہد کثرت سے ہیں۔

مثال کے طور پر سیرت نگاروں نے بیان کیا ہے کہ رسول ﷺ کی بعثت سے پہلے یہود آپؐ کے ذریعے اوس وخزرج کے مقابلے میں فتح ونصرت کی آس لگائے ہوئے تھے۔ وہ ان سے کہتے تھے کہ عنقریب ایک نبی کی بعثت ہونے والی ہے۔ ہم اس کی پیروی کریں گے پھر اس کے ساتھ تم سے جنگ کریں گے اور عاد وارم کی طرح تمہارا قتل عام کریں گے۔ مگر آپؐ کی بعثت کے بعد انہوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور آپ پر ایمان نہیں لائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَمَّا جَآءَ هُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِنْدِاللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا، فَلَمَّاجَآءَ هُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ. (البقرہ۔۸۹)

اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے اس کے ساتھ ان کا کیا

---

۵ اس حدیث کو ابن اثیرؒ اور حاکمؒ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت کیا ہے۔ حاکمؒ نے لکھا ہے: "یہ حدیث صحیح اور مسلمؒ کی شرط پر ہے۔" ـــ طبرانی میں یہ حضرت عمار بن یاسرؓ سے مروی ہے۔

برتاؤ ہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی، باوجودیکہ اس کی آمد سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح ونصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان بھی گئے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کردیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر۔

قرطبی اور دیگر مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَ هُمْ، وَاِنَّ فَرِيْقاً مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۔۱۴۶)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں مگر ان میں سے ایک گروہ جانتے بوجھتے حق کو چھپا رہا ہے۔

تو حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے (جو پہلے یہودی تھے بعد میں مشرف باسلام ہو گئے تھے) دریافت کیا: کیا تم محمد ﷺ کو اسی طرح پہچانتے ہو جیسے اپنے بیٹے کو۔ انہوں نے جواب دیا: "ہاں بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھی طرح۔ اللہ نے آسمان میں اپنے امین کو زمین میں اپنے امین کے پاس بھیجا اور اس کی صفات بتائیں، اس طرح میں نے اسے پہچان لیا۔ رہا میرا بیٹا تو مجھے نہیں معلوم کہ اس کی ماں نے کیا کیا؟" اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ کے اسلام قبول کرنے کا سبب یہ تھا کہ وہ انجیل، راہبوں اور علمائے اہل کتاب سے نبی ﷺ کی خبریں اور علامتیں معلوم کرتے رہتے تھے۔

اس حقیقت کی نفی اس چیز سے نہیں ہو جاتی کہ بہت سے اہل کتاب اس علم کا انکار کرتے ہیں اور متداول انجیلوں میں نبی ﷺ کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اس لیے کہ ان کتابوں میں پے در پے تبدیلی اور تحریف ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتَابَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ○ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِاللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَناً قَلِيْلاً فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ.

(البقرہ۷۸-۷۹)

ان میں ایک دوسرا گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں بس اپنی بے

بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا یہ لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجب ہلاکت۔

۲۔ نبی ﷺ کے بکریاں چرانے کی حکمت:

رہا روزی کمانے کی غرض سے آں حضرت ﷺ کا بکریاں چرانے کی جانب مائل ہونا تو اس سے تین اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں:

اول: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کو اعلیٰ ذوق اور لطیف احساس سے نوازا تھا۔ آپؐ کے چچا آپ کا بہت خیال رکھتے اور آپ کے ساتھ باپ کی طرح محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن آپ نے جوں ہی اپنے اندر کمانے کی طاقت محسوس کی، فوراً کمانے اور محنت و مشقت کرنے لگے تاکہ اپنے چچا کے اخراجات کا بار کچھ ہلکا کر سکیں۔ ممکن ہے اس کام سے ہونے والی آمدنی بہت معمولی ہو اور جناب ابو طالب کے تعلق سے اس کی کچھ اہمیت نہ ہو، لیکن بہرحال یہ ایک قابل تعریف اور مبنی بر اخلاق رویہ تھا جو حتی المقدور کوشش، پاکیزگیٔ طبع اور حسن معاملہ پر دلالت کرتا ہے۔

دوم: اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنے نیک بندوں کے لیے کیسی زندگی پسند کرتا ہے۔ قدرت الٰہی کے لیے آسان تھا کہ نبی ﷺ کے لیے آپ کی ابتدائی زندگی میں عیش و عشرت کے اتنے اسباب و وسائل فراہم کر دے کہ آپ کو روزی حاصل کرنے کے لیے محنت و مشقت کرنے اور بکریاں چرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے، لیکن آپ کا اسوہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کے لیے بہترین مال وہ ہے جو وہ محنت و مشقت کر کے کمائے اور اپنے سماج اور انسانوں کی خدمت کے عوض حاصل کرے اور سب سے برا مال وہ ہے جو اسے بغیر محنت کے بستر پر لیٹے ہوئے اور بغیر اپنے سماج کو فائدہ پہنچائے مل جائے۔

سوم: کسی دعوت کو لوگوں کے درمیان قدر و منزلت حاصل نہیں ہو سکتی اگر اس کے علم بردار

کی روزی روٹی اس دعوت سے وابستہ ہو یا اس کی گزر اوقات لوگوں کے صدقات و عطیات سے ہوتی ہو۔ اس لیے اسلامی دعوت کے علم بردار کے شایان شان یہ ہے کہ اپنی روزی کے لیے ذاتی محنت یا باعزت ذریعۂ آمدنی کو بنیاد بنائے۔ اسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے تاکہ دنیا میں اس پر کسی کا احسان نہ ہو، اگر ایسا ہوگا تو وہ بغیر اس کی پروا کیے اس کے سامنے حق بات نہیں کہہ سکتا۔

اس وقت اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اس چیز کا خیال نہیں آیا تھا اس لیے کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ عنقریب آپ کو دعوت اور پیغام الٰہی کے سلسلے میں ذمہ داری دی جانے والی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے لیے جو راستہ چنا تھا اس میں یہ حکمت پائی جاتی ہے۔ اور واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی ماقبل بعثت زندگی میں کوئی چیز ایسی نہ ہو جو مابعد بعثت آپ کی دعوت کے راستے میں رکاوٹ بنے یا اس پر کوئی منفی اثر ڈالے۔

۳۔ عالم شباب میں آنحضرت ﷺ کو ہر برائی سے محفوظ رکھنے کی حکمت:

نبی ﷺ کے اس بیان سے کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے بچپن اور نوجوانی ہی سے ہر طرح کی برائی سے محفوظ رکھا تھا" ہمارے سامنے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں، دونوں اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہیں:

اول: نبی ﷺ تمام بشری خصوصیات سے بہرہ ور تھے۔ آپ کے دل میں بھی مختلف فطری میلانات پائے جاتے تھے جو عام طور سے ہر نوجوان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ بھی تماشا اور لہو و لعب میں لذت محسوس کرتے تھے اور آپ کے جی میں آتا تھا کہ آپ بھی دوسروں کی طرح اس سے لطف اٹھائیں۔

دوم: اس کے باوجود اللہ عزوجل نے آپ کو انحراف کے تمام مظاہر اور ہر اس چیز سے محفوظ رکھا جو دعوت کے تقاضوں سے میل نہ کھاتی ہو۔ اس وقت بھی جب کہ ابھی وحی نہیں آئی تھی یا شریعت نہیں ملی تھی کہ وہ آپ کو بہت سی خواہشات نفس کی تکمیل سے روک دے، آپ کے پاس ایک ایسا خفیہ محافظ تھا جو آپ کے دل میں پیدا ہونے والی ایسی خواہشات کی راہ میں آڑے آجاتا تھا جو کہ آپ کے منصب سے میل نہیں کھاتی تھیں۔

یہ ایک واضح دلیل ہے کہ آنحضرت ﷺ تربیت ور ہنمائی کے معروف اسباب ووسائل کے واسطے کے بغیر اللہ تعالیٰ کی مخصوص نگرانی میں زندگی گزار رہے تھے۔ ورنہ عصمت کے معاملے میں آپ کی رہنمائی کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے جب کہ آپ کے ارد گرد رہنے والے، گھر کے افراد، پڑوسی اور قوم کے لوگ اس راستے سے ناآشنا اور اس رخ سے ناواقف تھے؟!

اللہ تعالیٰ کی یہ مخصوص نگرانی جو نبی ﷺ کے عہد شباب میں جاہلیت کی تاریکیوں میں قندیل کے مثل تھی، ان عظیم نشانیوں میں سے ہے جن سے آپ کی نبوت پر دلالت ہوتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ آپ کی شخصیت اور نفسیاتی، فکری اور اخلاقی رجحانات کی تشکیل میں نبوت کو اصل واساس کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ چیز آسان تھی کہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش اس طرح ہو کہ آپ کے دل سے خواہشات ولذات کے تمام فطری محرکات ختم کر دیے گئے ہوں۔ آپ کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا ہی نہ ہو جو آپ کو آمادہ کرے کہ اپنی بکریاں اپنے ساتھی کے پاس چھوڑ کر مکہ جائیں اور وہاں لہو ولعب کرنے، تماشا دیکھنے اور قصے سنانے والوں کو تلاش کریں۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سے ظاہر ہوتا کہ آپ کی نفسیاتی بناوٹ معمول سے ہٹی ہوئی ہے۔ اس مظہر کے نمونے ہر قوم اور ہر زمانے میں پائے جاتے ہیں۔ اس صورت میں اس چیز کا اظہار نہ ہوتا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی مخفی نگرانی میں ہیں اور اس کی عنایت خاص آپ کو ناز یبا کاموں سے باز رکھتی ہے، باوجودیکہ ان کی جانب فطری میلانات پائے جاتے ہیں۔ حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ رسول کریم ﷺ کی اس الٰہی نگرانی سے لوگوں پر ایسی حقیقتیں روشن ہو جائیں جن کے ذریعے آپ کی رسالت پر ان کا ایمان لانا آسان ہو جائے اور شک وشبہ کے دھندلکے کافور ہو جائیں۔

حضرت خدیجہؓ کے مال کی تجارت اور ان سے نکاح

حضرت خدیجہؓ — ابن اثیر اور ابن ہشام کی روایت کے مطابق — باعزت، مال دار اور تاجر خاتون تھیں۔ وہ لوگوں سے اجرت طے کر کے ان کے ذریعے اپنے مال کی تجارت کرواتی تھیں۔ جب انہیں رسول اللہ ﷺ کی سچائی، امانت داری اور حسن اخلاق کا علم ہوا تو آپ کو بلا بھیجا اور پیش کش کی کہ ان کا مال شام لے جا کر تجارت کریں۔ جو معاوضہ وہ دوسروں کو دیتی ہیں اس سے زیادہ انہیں دیں گی۔ ساتھ میں اپنے غلام میسرہ کو بھی بھیج دیں گی۔ آنحضرت ﷺ نے یہ پیش کش قبول کرلی اور ان کا مال لے کر ان کے غلام میسرہ کے ساتھ شام گئے۔ اس سفر میں توفیق الٰہی نے ساتھ دیا اور آپ کئی گنا منافع لے کر واپس لوٹے۔ آپ نے پوری امانت ودیانت کے ساتھ خدیجہ کا مال مع منافع لوٹا دیا۔ میسرہ نے سفر میں نبی ﷺ کے خصائص اور اعلیٰ اخلاق کا جو مشاہدہ کیا، اس سے بہت مرعوب اور متاثر ہوا۔ اس نے واپس آکر سب کچھ حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا۔

حضرت خدیجہؓ آنحضرت ﷺ کی غایت درجہ امانت داری سے بہت متاثر ہوئیں۔ ممکن ہے آپؐ کے ذریعے مال تجارت میں ہونے والے عظیم منافع اور برکت سے بھی حیرت زدہ ہو گئی ہوں۔ انہوں نے اپنی ایک سہیلی نفیسہ بنت منیہ کے واسطے سے نکاح کی پیش کش کی۔ نبی ﷺ نے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور اس سلسلے میں اپنے چچاؤں سے گفتگو کی۔ ان لوگوں نے خدیجہؓ کے چچا عمرو بن اسد سے مل کر نکاح کا پیغام دیا۔ اس طرح آنحضرت ﷺ کا حضرت خدیجہؓ سے نکاح ہو گیا۔ اس وقت آپؐ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال کی تھی۔

رسول اللہ ﷺ سے نکاح سے قبل حضرت خدیجہ کا دو مرتبہ نکاح ہو چکا تھا۔ پہلی مرتبہ

عتیق بن عائذ تمیمی سے اور ان کے بعد ابو ہالہ تمیمی (ہند بن زرارہ) سے ۹

دروس ونصائح

آنحضرت ﷺ کا حضرت خدیجہؓ کے مال کی تجارت کرنا، محنت ومشقت کی اسی زندگی کا تسلسل تھا جس کا آغاز آپ نے بکریاں چرا کر کیا تھا۔ اس کی حکمت وموعظت پر ہم گزشتہ صفحات میں کسی قدر روشنی ڈال چکے ہیں۔

۱۔ اسلام میں حضرت خدیجہؓ کی فضیلت:

جہاں تک نبی ﷺ کی زندگی میں حضرت خدیجہؓ کی قدر ومنزلت کا سوال ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ آپؐ کی پوری زندگی میں بلند مقام پر فائز رہیں۔ صحیحین کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہ علی الاطلاق اپنے زمانے کی بہترین خاتون تھیں۔

بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: "اُن خواتین میں سب سے بہتر مریم بنت عمران تھیں اور ان خواتین میں سب سے بہتر خدیجہ بنت خویلد ہیں۔" ۱۰

بخاری ومسلم ہی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "نبی ﷺ کی بیویوں میں سے کسی پر مجھے کبھی غیرت نہیں آئی سوائے خدیجہ کے، حالانکہ میں نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ (وہ مزید فرماتی ہیں) رسول اللہ ﷺ جب بھی بکری ذبح کرتے تو فرماتے: خدیجہ کی سہیلیوں کو بھی بھجوادو۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: ایک دن مجھے غصہ آیا۔ میں نے کہا: کیا آپ

۹ ابن سید الناس، عیون الاثر۔ ابن حجر، الاصابہ، وغیرہ۔ اہل سیر کا اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجہ کا سب سے پہلے کس سے نکاح ہوا تھا؟ ابن سید الناس نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور قتادہ اور ابن اسحاق نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ ان کے پہلے شوہر عتیق بن عائذ اور دوسرے ہند بن زرارہ تھے۔

۱۰ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ "اُن خواتین" سے مراد آسمان کی خواتین اور "اِن خواتین" سے مراد زمین کی خواتین ہیں۔ طیبی فرماتے ہیں: پہلی ضمیر اس امت کی طرف راجع ہے جس سے مریم کا تعلق تھا اور دوسری ضمیر اس امت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مزید دیکھئے فتح الباری ۷/۹۱۔

خدیجہ خدیجہ کی رٹ لگائے رہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "خدیجہ کی محبت میرے اندر رچ بس گئی ہے۔" ۱۱

احمد اور طبرانی نے مسروق کے واسطے سے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتی ہیں: "گھر سے نکلتے نکلتے اگر خدیجہ کا ذکر آجاتا تو رسول اللہ ﷺ ان کو اچھے الفاظ سے یاد کرتے تھے اور ان کی تعریف وتوصیف فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کا تذکرہ کرنے لگے۔ مجھے غیرت آگئی۔ میں کہہ بیٹھی: کیا آپ ایک بڑھیا کو یاد کرتے رہتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے بہتر سے نوازا ہے۔ آپ غضب ناک ہوگئے۔ پھر فرمایا: نہیں اللہ کی قسم اس نے مجھے اس سے بہتر بیوی نہیں دی۔ وہ مجھ پر ایمان لائی جب لوگوں نے انکار کیا۔ اس نے میری تصدیق کی جب لوگوں نے جھٹلایا۔ اس نے اپنے مال کے ذریعے میری ڈھارس بندھائی جب لوگوں نے مجھے کچھ دینے سے منع کر دیا۔ اور اللہ نے مجھے اس کے ذریعے اولاد سے نوازا جب کہ دوسری بیویوں سے میری کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"

۲۔ آں حضرت ﷺ کی ازدواجی زندگی پر ایک نظر:

حضرت خدیجہؓ سے نبی ﷺ کے نکاح سے پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپؐ کے پیش نظر جسمانی لذت اندوزی کے اسباب اور لوازمات نہیں تھے۔ اگر آپ اپنے ہم عمر دیگر نوجوانوں کی طرح اس پر توجہ دیتے تو اپنے سے کم عمر یا کم از کم اپنے برابر عمر کی خاتون سے نکاح کرتے۔ حضرت خدیجہؓ سے نکاح سے واضح ہوتا ہے کہ آپؐ ان کی شرافت ونجابت کی بنا پر ان کی جانب مائل ہوئے تھے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں اپنی قوم میں "عفیفہ طاہرہ" (عفت مآب وپاک باز) کے لقب سے مشہور تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات پینسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس وقت نبی ﷺ کی عمر پچاس سال تھی۔ حضرت خدیجہ سے نکاح کے بعد پچیس سال کا عرصہ آں حضرت ﷺ نے اس طرح گزارا کہ کسی دوسری خاتون یا دوشیزہ سے نکاح کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ بیس سال سے پچاس سال تک کی عمر کا زمانہ ایسا ہوتا ہے جب انسان میں شہوانی محرکات کی بنا پر زیادہ

۱۱ متفق علیہ، حدیث کے الفاظ مسلم کے ہیں۔

عورتوں سے تعلق قائم کرنے اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اتنی عمر اس طرح گزار دی کہ خدیجہ کے ساتھ کسی دوسری عورت کو بیوی یا باندی کی حیثیت سے اکٹھا کرنے کا خیال تک دل میں نہ لائے۔ اگر آپ چاہتے تو ایسا کر سکتے تھے اور یہ اس وقت کے عُرف اور عادت کے خلاف بھی نہ ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ آپؐ نے جس خاتون — حضرت خدیجہؓ — سے نکاح کیا وہ بیوہ تھیں اور ان کی عمر آپ سے تقریباً دوگنی تھی۔

یہ تفصیل ان لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے جن کے دلوں پر اسلام کی قوت وعظمت دیکھ کر سانپ لوٹتے ہیں۔ یہ عیسائی مبلغین یا مستشرقین ہیں یا ان کے زرخرید غلام ہیں جو ٹھیک ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ان کی مثال قرآن کی تعبیر کے مطابق بالکل ایسی ہے جیسے چرواہا جانوروں کو پکارتا ہے اور وہ ہانک پکار کی صدا کے سوا کچھ نہیں سنتے۔ (البقرہ۔۱۷۱)

انہوں نے گمان کیا کہ نبی ﷺ کے نکاح کا موضوع ایسا ہے جس کے ذریعے اسلام کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے اور محمد ﷺ کی شہرت کو داغ دار کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے خیال کیا کہ وہ آپ کو لوگوں کے سامنے ایک ایسے شہوت پرست اور جسمانی لذت میں ڈوبے شخص کی صورت میں پیش کر سکتے ہیں جو اپنی گھریلو زندگی اور عام معاملات میں قلب وروح کی پاکیزگی سے محروم ہے۔ یہ چیز معلوم اور بدیہی ہے کہ عیسائی مبلغین اور مستشرقین اسلام کے ازلی دشمن ہیں۔ انہوں نے اس دین پر طعن کرنے کو پیشہ بنالیا ہے جس سے ان کی روزی روٹی وابستہ ہے، اور اسلام میں کیڑے نکالنا ان کا شب وروز کا وطیرہ ہے۔ رہے وہ بھولے بھالے لوگ جو آنکھ بند کر کے ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں تو ان کی اسلام سے دشمنی سماع اور تقلید پر مبنی ہے۔ وہ کسی تحقیق یا فہم کے لیے اپنے ذہنوں کو کھولنا نہیں چاہتے بلکہ محض دوسروں کی پیروی کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے اسلام سے ان کی دشمنی اس بلے (Badge) کے مثل ہے جسے آدمی اپنے سینے پر محض اس مقصد سے لگا لیتا ہے کہ اسے دیکھ کر لوگ اسے کسی مخصوص پارٹی کا کارکن سمجھنے لگیں۔ اور یہ چیز معلوم ہے کہ "بلا" محض ایک علامت ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام سے ان کی دشمنی بھی محض ایک علامت کے طور پر ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ لوگوں کے درمیان اپنی پہچان کرواتے ہیں کہ ان کا اسلامی تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں، بلکہ ان کی وابستگی دراصل اس سامراجی فکر سے ہے جس کی نمائندگی فکری استعمار کے داعی عیسائی مبلغین

اور مستشرقین کرتے ہیں۔

ان کا یہ انتخاب بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر فہم کی ادنیٰ کوشش کے ہے۔ ہاں ان کی اسلام سے دشمنی محض علامتی ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی قوم اور اپنے لوگوں کے درمیان اپنی پہچان کرواتے ہیں، یہ ان کا کوئی فکری عمل نہیں ہوتا ہے جس کا مقصد بحث وتحقیق ہو۔

نبی ﷺ کے نکاح کا موضوع تو ان آسان ترین موضوعات میں سے ہے جن کی وضاحت ایک ہوش مند، اپنے دین سے آگاہ اور اپنے نبی کی سیرت سے واقف مسلمان اس کے برعکس صورت میں کر سکتا ہے جس کا پروپیگنڈہ دین کے دشمن زور وشور سے کرتے ہیں۔

وہ چاہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی شخصیت پر ایک شہوت پرست اور جسمانی لذتوں میں ڈوبے ہوئے آدمی کی تصویر چسپاں کر دیں، جب کہ آپ کی ازدواجی زندگی اس کے بالکل برعکس صورت حال پیش کرتی ہے۔ ایک شہوت پرست آدمی عہد جاہلیت کے عرب جیسے ماحول میں پچیس سال کی عمر تک پاک بازی کے ساتھ ایسی زندگی نہیں گزار سکتا کہ اپنے اردگرد کے فاسد ماحول کا شکار نہ ہو۔ ایک شہوت پرست آدمی اس کے بعد اس پر تیار نہیں ہو سکتا کہ ایک ایسی عورت سے نکاح کر لے جو بیوہ اور اس سے دوگنی عمر کی ہو۔ پھر اس کے ساتھ اس طرح زندگی گزارے کہ کسی اور طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، جب کہ اس کے اردگرد بہت کچھ تھا اور شہوت براری کے بہت سے راستے تھے، یہاں تک کہ جوانی پھر ادھیڑ عمری کے مرحلے سے گزر کر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو جائے۔

رہا اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات سے نکاح کا معاملہ تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک واقعہ مربوط ہے اور ہر نکاح کی ایک حکمت اور ایک سبب ہے۔ ان سے آنحضرت ﷺ کی عظمت ورفعت شان اور اعلیٰ اخلاق پر ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان نکاحوں کی کوئی حکمت اور کوئی مقصد ہو لیکن بہر حال ان کا مقصد شہوت براری اور جنسی خواہش کی تکمیل نہیں تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نکاح آپ اپنی عمر کے اس حصے میں کرتے جب اس خواہش کی تکمیل کا فطری وقت ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب کہ آپ اس وقت خالی الذہن تھے، دعوت کے مسائل ومشاغل سے آپ کا واسطہ نہیں پڑا تھا جو آپ کی فطری ضروریات کی تکمیل میں آڑے آتے۔

آنحضرت ﷺ کو ازدواجی زندگی کے دفاع میں مفصل بحث کی ضرورت نہیں جیسا کہ

بہت سے محققین کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس موضوع میں کوئی دشواری یا پیچیدگی ہے جس میں غور و خوض یا بحث و تحقیق کی ضرورت ہو، اگر چہ اسلام کے دشمن ایسا گمان کرتے ہیں۔

اسلام کے بہت سے حقائق ایسے ہیں جن کا اس کے دشمن ابطال تو کر نہیں پاتے۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بارے میں مسلمان بحث و مباحثے میں الجھ جائیں اور اس طرح دفاعی پوزیشن اختیار کرلیں۔

خانۂ کعبہ کی تعمیر میں آں حضرتؐ کی شرکت

خانۂ کعبہ پہلا گھر ہے جسے اللہ کے نام پر اس کی عبادت کے لیے اور اس کی وحدانیت کا اعلان کرنے کے لیے بنایا گیا۔ اس کی تعمیر ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، بتوں کے خلاف جنگ چھیڑنے اور جن عبادت خانوں میں وہ نصب تھے انہیں ڈھانے کے بعد، کی تھی۔ انہوں نے اس کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی وحی اور اس کے حکم سے کی تھی:

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھِیْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ. (البقرہ۔۱۲۷)

اور یاد کرو، ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

خانہ کعبہ اس کے بعد متعدد مرتبہ حوادثِ روزگار کا شکار ہوا، جس سے اس کی بنیادیں کمزور ہو گئیں اور اس کی دیواریں پھٹ گئیں۔ ان حوادث میں سے ایک سیل عرم نامی طوفان تھا جو بعثت نبوی سے چند سال پہلے مکہ میں آیا تھا۔ اس سے اس کی دیواروں کی شکستگی اور بنیادوں کی کمزوری میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کی بنا پر قریش مجبور ہوئے کہ کعبہ کی دیواریں منہدم کر کے ازسرِ نو اس کی تعمیر کریں، اس لیے کہ اس عمارت کو ان کے درمیان بہت احترام اور تقدس حاصل تھا۔ خانہ کعبہ کا احترام اور تعظیم عربوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی محفوظ اور باقی رہ جانے والی چیزوں میں سے تھی۔

بعثت سے قبل رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کی ازسرِ نو تعمیر میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ آپ تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھر کندھے پر رکھ کر لاتے تھے۔ اس حالت میں آپ کے

بدن پر صرف تہبند ہوتا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر صحیح قول کے مطابق پینتیس ۳۵ سال تھی۔

امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"جب خانہ کعبہ کی تعمیر ہونے لگی تو نبی ﷺ اور آپ کے چچا عباسؓ پتھر ڈھونے لگے۔ ایک موقع پر عباسؓ نے آپ سے کہا: اپنا تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو۔ آں حضرت ﷺ زمین پر گر پڑے اور آپ کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں اور کہنے لگے: میرا تہبند لاؤ۔ انہوں نے تہبند باندھ دیا۔

اسی موقع پر قبائل کے درمیان اختلاف ہوا کہ حجر اسود کو دوبارہ اس کی جگہ پر نصب کرنے کے شرف کا کون مستحق ہے؟ اس دشوار مسئلے کو حل کرنے میں آپ کا نمایاں کردار تھا۔ کیونکہ تمام لوگوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا جو آپ نے اس مسئلے کو حل کرنے لیے پیش کی تھی۔ آپ لوگوں کے درمیان "امین" مشہور تھے اور سب آپ سے محبت کرتے تھے۔

دروس ونصائح

آں حضرت ﷺ کی سیرت کے اس حصے سے متعلق چار باتیں قابل ذکر ہیں:

۱۔ خانہ کعبہ کی اہمیت، عظمت اور تقدس

اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو روئے زمین پر جو عظمت اور تقدس عطا کیا ہے اس کی دلیل کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ اس کی تعمیر ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کی تھی۔ تاکہ وہ پہلا گھر ہو جسے صرف اللہ کی عبادت کے لیے قائم کیا گیا۔ اور وہ لوگوں کے لیے مرکز اور جائے امن بنے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے یا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ طواف یا اعتکاف کرنے والوں پر کعبہ کا کوئی اثر پڑتا ہے۔ اس لیے کہ باوجود اپنے تقدس اور بارگاہ الٰہی میں عظمت کے، وہ پتھر کی ایک عمارت ہے اور پتھر نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ اس کی حقیقت بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا اور ان سے بتوں کو توڑنے، طاغوتوں کی سرکوبی کرنے، بت خانوں کو ڈھانے، طاغوت کے مظاہر اور نقوش کا خاتمہ کرنے اور اس کی عبادت کو کالعدم کرنے کا کام لیا تو اس کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ روئے زمین پر ایک ایسی عمارت تعمیر ہو جو

توحید اور صرف عبادت الٰہی کی علامت ہو اور زمانہ گزرنے کے باوجود دین اور عبادت کے صحیح مفہوم اور شرک وبت پرستی کے بطلان کی تعبیر ہو۔ انسانیت نے ایک طویل زمانہ گزار لیا تھا جس میں وہ پتھروں کے آگے سر جھکاتی، بتوں اور طاغوتوں کی پوجا کرتی اور ان کے لیے عبادت خانے تعمیر کرتی تھی—اب وقت آگیا تھا کہ اس پر ان کا بطلان اور کھوٹ ظاہر ہو جائے۔ اب وقت آگیا تھا کہ ان عبادت خانوں کے بدلے وہ اس نئی علامت سے روشناس ہو۔ اس عبادت خانے سے آگاہ ہو جسے صرف اللہ کی عبادت کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس میں انسان داخل ہو تو اسے اپنی عظمت کا احساس ہو، وہ خالق کائنات کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے۔ اگر اللہ کی واحدانیت پر ایمان رکھنے والوں اور اس کا دین قبول کرنے والوں کے لیے— خواہ وہ کتنے ہی مختلف ملکوں اور دور دراز علاقوں کے ہوں اور ان کی قومیتیں اور زبانیں کتنی ہی جدا ہوں— ضرورت ہوئی کہ کوئی رابطہ کی چیز ہو جس کے ذریعے ان کا باہم تعارف ہو سکے اور کوئی مرکز ہو جس کی طرف وہ رجوع ہو سکیں، تو اس مقصد کے لیے اس گھر سے زیادہ مناسب اور کوئی چیز نہیں جسے توحید کی علامت کے طور پر اور شرک وکفر وبت پرستی کا رد کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ یہ گھر باہمی رابطہ کا ذریعہ ہے جس کے احاطے میں وہ ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرتے ہیں، ایک مرکز ہے جہاں وہ سب جمع ہوتے ہیں اور ان کا جمع ہونا اس حق کے ساتھ ہوتا ہے جس کی ترجمانی کے لیے اس گھر کو تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ گھر ایک علامت ہے جس کے ذریعے روئے زمین پر مسلمانوں کی وحدت کا اظہار ہوتا ہے اور توحید اور عبادت الٰہی کی ترجمانی ہوتی ہے جبکہ معبودان باطل تو ہر زمانے میں پائے جاتے رہے ہیں۔ درج ذیل ارشاد باری کا یہی مطلب ہے:

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى ط

(البقرہ۔ ۱۲۵)

اور یاد کرو کہ ہم نے اس گھر (کعبے) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا کہ ابراہیم جہاں عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو۔

بیت اللہ الحرام کا طواف کرنے والا بھی یہی مفہوم اپنے پیش نظر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں اللہ کی عبودیت کا مفہوم راسخ رہتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ جن کاموں کا

اس نے حکم دیا ہے ان کی انجام دہی کا وہ مکلف ہے۔ اسی بنا پر یہ گھر اس قدر مقدس ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا اتنا بلند مقام ہے، اور اسی لیے اس کا حج اور طواف مشروع کیا گیا ہے۔

۲۔ خانہ کعبہ کی کتنی مرتبہ تعمیر ہوئی؟

خانہ کعبہ کی تعمیر اب تک چار مرتبہ یقینی طور پر ہوئی ہے۔ کیا ان کے علاوہ بھی کبھی اس کی نوبت آئی ہے؟ اس سلسلے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ اس میں اختلاف ہے۔

پہلی مرتبہ تعمیر کا کام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تعاون سے انجام دیا تھا۔ اس کا حکم انہیں ان کے رب نے دیا تھا۔ یہ چیز کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے صراحۃً ثابت ہے۔ قرآن میں ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ. (البقرہ۔ ۱۲۷)

اور یاد کرو، ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے اے ہمارے رب! ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے، تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

رہی سنت تو اس مضمون کی بہت سی احادیث ہیں۔ مثلاً امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ہے: "پھر انہوں نے (یعنی ابراہیم نے) کہا: "اے اسماعیل، اللہ نے مجھے ایک کام کرنے کا حکم دیا ہے" انہوں نے عرض کیا: اسے کر ڈالیے۔ فرمایا: تم میرا تعاون کروگے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس جگہ ایک گھر بناؤں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ اس جگہ ان دونوں نے گھر کی بنیادیں استوار کیں۔ اسماعیل پتھر لا لا کر دیتے تھے اور ابراہیم انہیں دیوار میں چنتے تھے۔" [۱۲]

زرکشی نے ازرقی کی تاریخ مکہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی اونچائی سات ہاتھ، لمبائی تیس ہاتھ اور چوڑائی بائیس ہاتھ رکھی تھی۔ یہ عمارت بغیر

[۱۲] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب قولہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

چھت کے تھی [۱۳] سہیلی نے بیان کیا ہے کہ اس کی اونچائی نو ہاتھ تھی۔ [۱۴] میرے نزدیک یہ روایت ازرقی کی روایت کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہے۔

دوسری مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر قریش نے بعثت نبوی سے قبل کی تھی اور اس میں نبی ﷺ نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ اس موقعے پر انہوں نے اس کی اونچائی اٹھارہ ہاتھ کی تھی اور اس کی لمبائی میں سے چھ ہاتھ سے کچھ زائد کم کر دیے تھے۔ [۱۵]

اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا: اے عائشہؓ اگر جاہلیت کا عہد ابھی جلد ہی نہ گزرا ہوتا اور تمہاری قوم کے دلوں میں اس کی یاد تازہ نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ خانہ کعبہ کو منہدم کرکے از سر نو اس کی تعمیر کی جائے۔ پھر اس کا جو حصہ نکال دیا گیا تھا اسے شامل کر دیتا۔ اس میں ایک دروازہ مشرق میں اور ایک دروازہ مغرب میں لگاتا۔ اس طرح اسے ٹھیک انہی بنیادوں پر استوار کرتا جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسے تعمیر کیا تھا" [۱۶]

تیسری مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر یزید بن معاویہ کے زمانے میں ہوئی تھی جب شامی فوجوں کے حملے کے نتیجے میں اس میں آگ لگ گئی تھی۔ اس حادثہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شام کی فوجوں نے حصین بن نمیر سکونی کی قیادت میں، یزید کے حکم سے، ۶۳ھ میں، مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اس موقعے پر انہوں نے منجنیق کا آزادانہ استعمال کیا تھا جس کے نتیجے میں خانہ کعبہ منہدم ہو گیا تھا اور اس میں آگ لگ گئی تھی۔ حضرت ابن زبیرؓ نے توقف کیا یہاں تک کہ ایام حج میں جب لوگ اکٹھا ہوئے تو انہوں نے مشورہ کیا اور کہا: "لوگو، مجھے خانہ کعبہ کے سلسلے میں مشورہ دو۔ اس کی منہدم دیواروں کو بالکل زمیں بوس کرکے دوبارہ تعمیر کروں یا صرف مرمت کروا دوں؟" حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا "میری رائے ہے کہ آپ صرف مرمت کروا دیں اور اس گھر کو اور اس کے پتھروں کو جوں کا توں رہنے دیں۔" حضرت ابن زبیرؓ نے فرمایا: "اگر تم میں سے کسی کے گھر میں آگ لگ جائے تو وہ محض مرمت پر اکتفا نہیں کرے گا،

[۱۳] دیکھئے اعلام الساجد، زرکشی ص: ۳۶

[۱۴] عیون الاثر ۱/ ۵۲

[۱۵] صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل مکہ۔ اعلام الساجد، زرکشی ص: ۳۶

[۱۶] متفق علیہ۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔

بلکہ چاہے گا کہ بہتر سے بہتر طریقے پر از سر نو اس کی تعمیر کرے، پھر خانہ خدا کے ساتھ ایسا کیوں ہو؟ میں تین دن استخارہ کروں گا، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ تین دن کے بعد حضرت ابن زبیرؓ کے حکم سے منہدم دیواریں زمیں بوس کردی گئیں۔ ابن زبیرؓ نے اس کے ارد گرد چند ستون کھڑے کر کے ان پر پردے لٹکا دیے، پھر از سر نو خانہ کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی۔ ابن زبیر نے نئی تعمیر میں چھ ہاتھ شامل کر دیے جو پہلے نکال دیے گئے تھے۔ اور اونچائی میں بھی دس ہاتھ کا اضافہ کر دیا۔ ساتھ ہی اس میں دو دروازے لگائے۔ ایک داخل ہونے کے لیے اور دوسرا نکلنے کے لیے۔ اس اضافہ کی جرأت انہیں حضرت عائشہؓ کی مذکورہ بالا حدیث سے ہوئی تھی۔ [17]

چوتھی مرتبہ خانہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت کے بعد ہوئی۔ امام مسلمؒ نے حضرت عطاء سے روایت کیا ہے کہ ابن زبیر کی شہادت کے بعد حجاج نے عبدالملک بن مروان کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ ابن زبیر نے خانہ کعبہ کی تعمیر جس بنیاد پر کی تھی وہ مکہ کے معتبر لوگوں کی رائے کے مطابق ہے۔ کیا اسے باقی رکھا جائے؟ عبدالملک نے جواب دیا نہیں ابن زبیر کے عمل سے کچھ غرض نہیں۔ تم ایسا کرو کہ انہوں نے اونچائی میں جو اضافہ کیا ہے اس کو تو رہنے دو۔ لیکن حطیم کا جو اضافہ کیا ہے اسے خارج کر کے سابقہ بنیاد پر دیوار کھڑی کر دو اور جو دوسرا دروازہ انہوں نے کھول دیا ہے اسے بند کر دو" چنانچہ حجاج نے ابن زبیر کی بنائی ہوئی عمارت کو ڈھا کر اس کی تعمیر سابقہ بنیاد پر کی۔ [18]

کہتے ہیں کہ ہارون رشید نے اپنے عہد حکومت میں ارادہ کیا کہ خانہ کعبہ کی دیواریں منہدم کر کے اس کی تعمیر ان بنیادوں پر کرے جن پر حضرت ابن زبیر نے اسے استوار کیا تھا تو امام مالک بن انسؒ نے فرمایا: "اے امیر المومنین! میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، آپ ایسا نہ کریں کہ یہ گھر آپ کے بعد آنے والے بادشاہوں کے لیے کھیل بن جائے اور جو چاہے

[17] دیکھیے عیون الاثر، ابن سید الناس ۱/ ۵۳، اعلام الساجد، زرکشی ص: ۴۶، حضرت عائشہ سے مروی حدیث کو امام مسلم نے باب نقض الکعبۃ وبناؤہا (۲/۶۹) میں روایت کیا ہے، طبری وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ خانہ کعبہ میں آگ اس کے اردگرد روشن کی جانے والی آگ سے اڑنے والی چنگاری سے لگی تھی۔ دیکھیے تاریخ طبری ۵/ ۹۸ھ۔

[18] صحیح مسلم ۴/ ۹۹

اپنی مرضی کے مطابق اس میں تبدیلی کرتا رہے۔ اس طرح لوگوں کے دلوں سے اس کی ہیبت نکل جائے گی" اس طرح امام مالک نے ہارون رشید کو اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا۔ [19]

مذکورہ بالا چار مواقع پر خانہ کعبہ کی تعمیر یقینی طور سے ہوئی ہے۔ کیا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے بھی موجود تھا؟ اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا، اسی وجہ سے اس میں اختلاف ہے۔

بعض آثار وروایات میں ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے کی تھی۔ اس سلسلے میں بیہقی نے اپنی کتاب دلائل النبوۃ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے آدم اور حوا کے پاس جبرئیل کو بھیج کر حکم دیا کہ میرے لئے ایک گھر بناؤ۔" حضرت جبرئیل نے جگہ کی نشان دہی کی۔ حضرت آدم زمین کھودتے تھے اور حوا مٹی ہٹاتی تھیں۔ یہاں تک پانی نکل آیا۔ نیچے سے آواز آئی: "اے آدم بس کرو۔" جب ان دونوں نے گھر بنالیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کی کہ اس کا طواف کرو۔ کہا گیا: "تم پہلے انسان ہو اور یہ پہلا گھر ہے۔" پھر صدیاں بیت گئیں یہاں تک کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اس کا حج کیا۔ پھر صدیاں گزر گئیں یہاں تک کہ حضرت ابراہیم نے اس کی بنیادیں بلند کیں۔" یہ روایت نقل کرنے کے بعد امام بیہقی نے لکھا ہے: "اس روایت کو صرف ابن لھیعہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے اور معلوم ہے کہ ابن لھیعہ ضعیف ہے اور اس کی روایت قابل قبول نہیں۔"

بیہقی کی مذکورہ بالا روایت سے ملتے جلتے مفہوم کی بعض دیگر روایات اور آثار بھی ہیں لیکن وہ سب ضعف و نکارت سے خالی نہیں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی تعمیر سب سے پہلے حضرت شیث علیہ السلام نے کی تھی۔ اگر ان کمزور آثار وروایات کو قبول کر لیا جائے تو ان

[19] ہارون رشید کے خانہ کعبہ کی دیواریں منہدم کرنے کا ارادہ کرنے کا تذکرہ امام نووی نے شرح مسلم میں اور علامہ ابن حجر نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں کیا ہے، عیون الاثر اور اعلام الساجد میں ہے کہ یہ ارادہ کرنے والا ابو جعفر منصور تھا۔ امام مالک دونوں کے معاصر تھے اس لیے یہ ارادہ کرنے والا دونوں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

کی رو سے خانہ کعبہ کی تعمیر اب تک پانچ مرتبہ ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس کی تعمیر چار مرتبہ تو یقینی طور پر ہوئی ہے، اس کے علاوہ کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ البتہ ترمیمات و اصلاحات وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہیں۔

۳۔ معاملات نپٹانے میں نبی ﷺ کی حکمت

اس سے واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کتنی حکمت سے معاملات کو سلجھا دیتے تھے اور اختلافات اور خصومات کی جڑ کاٹ دیا کرتے تھے۔ کن لوگوں کے درمیان؟ ان لوگوں کے درمیان جن کے مابین اگر کسی بات پر جھگڑا ہو جاتا تو خون بہائے بغیر ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ اس معاملے میں بھی ان کا اختلاف اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ قریب تھا کہ جنگ کی آگ بھڑک اٹھے۔ بنو عبدالدار خون سے لبریز ایک پیالہ لائے اور اس میں ہاتھ ڈال کر انہوں نے اور بنو عدی نے جان کی بازی لگا دینے کا عہد کیا۔ قریش چار پانچ دن اسی حال میں رہے۔ کسی تدبیر سے ان کے درمیان اتحاد کی کوئی صورت نظر نہ آرہی تھی۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فتنہ کی اس آگ کو ٹھنڈا کیا۔ آنحضرت ﷺ کی اس امتیازی خصوصیت کو عبقریت اور فطری ذہانت کا نام دینے کی بجائے یہ کہنا چاہئے کہ آپؐ کے ذریعے اس حکمت کا ظہور اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے آئندہ رسالت و نبوت کا کام لینا چاہتا تھا۔ آپ کی ذات گرامی کی اولین بنیاد یہ ہے کہ آپ رسول و نبی تھے۔ دیگر تمام خصوصیات مثلاً عبقریت، ہوشیاری اور ذہانت وغیرہ اس کے بعد آتی ہیں اور اس کے تابع ہیں۔

۴۔ کتنی قربت، کتنی دوری

آنحضرت ﷺ کو قریش کے تمام طبقات کے نزدیک قدر و منزلت حاصل تھی۔ وہ آپ کو ''امین'' کہہ کر پکارتے تھے۔ آپ سے محبت کرتے تھے۔ آپ کی باتوں کو سچ جانتے تھے۔ آپ کے حسن واخلاق کے قائل اور آپ کے اخلاص کے معترف تھے۔

یہی لوگ تھے جن کے پاس بعد میں آپ اللہ کا پیغام لے کر گئے تو ان کے دل بغض و عناد سے بھر گئے۔ انہوں نے آپ کو جھٹلایا اور طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائیں۔

غارِ حرا میں خلوت گزینی

جب آنحضرت ﷺ کی عمر چالیس سال کے قریب ہوئی تو آپ کے اندر وقتاً فوقتاً عزلت پسندی پروان چڑھنے لگی۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں غار حرا میں خلوت گزینی کا شوق پیدا کر دیا۔ حرا ایک پہاڑ کا نام ہے جو مکہ کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ آپؐ اس میں جا کر کئی کئی راتیں عبادت الٰہی میں گزارتے تھے۔ بسا اوقات دس راتیں، کبھی اس سے بھی زیادہ، یہاں تک کہ کبھی ایک ماہ۔ پھر گھر واپس آتے مگر تھوڑے ہی عرصے کے بعد دوبارہ سامان خوراک لے کر غار حرا کا رخ کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقعے پر جب آپ غارِ حرا میں خلوت گزیں تھے، وحی کا نزول ہوا۔

دروس و نصائح

مسلمان کی تربیت میں عزلت نشینی اور خلوت گزینی کی اہمیت اور اس کی شرائط:

بعثت سے کچھ عرصہ قبل رسول اللہ ﷺ کی اس خلوت پسندی سے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جس کی مسلمانوں اور خاص طور پر دعوت الی اللہ کا کام کرنے والوں کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان خواہ کیسے ہی اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہو اور کتنی طرح کی عبادات میں مشغول رہتا ہو مگر اس کا اسلام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ کچھ اوقات خلوت اور گوشۂ تنہائی میں نہ گزارے جس میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کر سکے، اللہ تعالیٰ کا مراقبہ کر سکے اور کائنات کے مظاہر اور اللہ کی عظمت پر ان کی دلالتوں میں غور و فکر کر سکے۔

یہ چیز ہر اس مسلمان کے لیے ضروری ہے جو صحیح اسلام کا خواہاں ہو۔ اسی سے اندازہ کیا

جاسکتا ہے کہ اس کی اہمیت اس شخص کے لیے کتنی ہوگی جو اپنے آپ کو داعی الی اللہ اور راہ حق کے علم بردار کے بلند مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ نفس کی کچھ بیماریاں ایسی ہیں جن کا علاج صرف گوشہ نشینی ہی سے ممکن ہے۔ اور اس کا محاسبہ دنیا کے شور و شغب اور مظاہر سے الگ تھلگ ہو کر ہی ہو سکتا ہے۔ غرور، خود پسندی، حسد، ریا، حب دنیا یہ سب ایسی بیماریاں ہیں جو نفس میں راسخ اور دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو جاتی ہیں اور انسان کے اندر کی دنیا کو تہ و بالا کر دیتی ہیں۔ اگرچہ ظاہر میں وہ نیک اعمال اور مقبول عبادات انجام دیتا رہتا ہے اور دعوت و ارشاد اور وعظ و نصیحت کے کاموں میں مشغول رہتا ہے۔ ان بیماریوں کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ انسان وقتاً فوقتاً گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر غور کرے کہ اس کے نفس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ وہ زندگی کے ہر لمحے میں اللہ کی عنایات اور توفیق کا کس قدر محتاج ہے؟ پھر وہ لوگوں کے بارے میں غور کرے کہ وہ خالق عزوجل کے سامنے کتنے بے بس ہیں؟ اور یہ کہ ان کی مدح و ستائش یا تنقید و تنقیص سب بے معنی ہے۔ ساتھ ہی عظمت الٰہی کے مظاہر میں تدبر و تفکر کرے۔ آخرت، حساب و کتاب اور اس کی طوالت، اللہ کی بے پایاں رحمت اور اس کی زبردست پکڑ کا خیال دل میں لائے۔ ان امور میں طویل اور بتکرار غور و فکر کرنے سے نفس کو لاحق یہ بیماریاں زائل ہو جائیں گی۔ دل علم و عرفان اور صدق و صفا کے نور سے منور ہو جائے گا۔ اس میں زندگی کی دھڑکن پیدا ہو جائے گی اور دنیا کی آلائشیں اس کے شفاف آئینے کو گدلا نہ کر سکیں گی۔

ایک دوسری چیز جس کی مسلمانوں اور خاص طور پر کار دعوت انجام دینے والوں کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے، یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت پروان چڑھائی جائے۔ کیونکہ یہی قربانی اور جہاد کا سرچشمہ اور ہر روشن اور صحیح دعوت کی اساس ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت محض اس پر عقلی ایمان سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ صرف عقلی چیزیں کبھی جذبات اور دلوں کو متاثر نہیں کر سکی ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے والوں میں سرفہرست ہوتے اور ان کے دل اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے معمور ہوتے۔ کیا کبھی سنا گیا ہے کہ کسی سائنسداں نے کسی ریاضیاتی قاعدہ یا الجبرا کے کسی پرابلم پر ایمان لا کر اپنی روح کو قربان کر دیا ہو؟

اللہ پر ایمان لانے کے بعد دل میں اس کی محبت جاگزیں کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے احسانات و انعامات میں زیادہ سے زیادہ تدبر کیا جائے۔ اس کی عظمت و جلالت میں غور و فکر کیا جائے۔ پھر دل اور زبان سے زیادہ سے زیادہ اس کا ذکر کیا جائے۔ اور یہ کام صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب انسان بار بار تھوڑے عرصے کے لیے دنیا کے مشاغل اور شور و شغب سے کٹ کر خلوت گزیں ہو جایا کرے۔

جب مسلمان ایسا کرے گا اور اسے اس عمل کو انجام دینے کی توفیق ملے گی تو اس کے دل میں محبت الٰہی راسخ ہو جائے گی، پھر اس کی نظر میں ہر بڑی چیز چھوٹی بن جائے گی، دل لبھانے والی ہر چیز ہیچ ہو جائے گی، وہ ہر اذیت اور تکلیف کو بخوشی گوارا کر لے گا، توہین یا استہزا کی کاروائیاں اس کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈال سکیں گی۔ یہ ہے وہ بڑا ہتھیار جس سے اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والوں کو لیس ہونا چاہیے۔ اور یہی ہے وہ زاد راہ جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو اسلامی دعوت کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لئے نوازا تھا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ خوف، محبت اور امید جیسے دل میں پیدا ہونے والے وجدانی محرکات کا جو اثر مرتب ہوتا ہے وہ محض عقلی فہم سے نہیں ہوتا۔ امام شاطبیؒ نے اس موضوع پر اچھی بحث کی ہے۔ انہوں نے ان محرکات کے سلسلے میں عام مسلمانوں (جو اپنے عمومی اسلام کے محرک سے تکالیف شرعیہ کے دائرے میں آئے ہیں) اور خواص (جنہوں نے محض تعقل اور فہم سے بڑھ کر کسی دوسری چیز کی وجہ سے ان تکالیف کو اختیار کیا ہے) دونوں کے درمیان فرق کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

"پہلی قسم کا حال اس شخص کا ہے جو محض دائرہ اسلام میں ہونے اور ایمان کا عہد و پیمان باندھنے کی وجہ سے عمل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے نزدیک اور کوئی محرک نہیں ہوتا۔ دوسری قسم کا حال اس شخص کا ہے جس سے خوف، امید یا محبت کے غلبہ کی وجہ سے اعمال کا صدور ہوتا ہے۔ خوف ایک کوڑا ہے جو آدمی کو کسی کام پر آمادہ کرتا ہے۔ امید آدمی میں شوق پیدا کر کے کام کرواتی ہے۔ اور محبت ایسا جذبہ ہے جس کے نتیجے میں آدمی بے اختیار کام کرنے لگتا ہے۔ خوف کھانے والا مشقت کے باوجود عمل کرتا ہے۔ زیادہ تکلیف دہ چیز سے خوف اسے کم تکلیف دہ چیز پر صبر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ امید رکھنے والا بھی مشقت کے باوجود عمل کرتا

ہے۔ عیش و آرام کی امید اسے تھکن اور مشقت برداشت کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ محبت کرنے والا محبوب سے ملاقات کے شوق میں جی جان سے عمل کرتا ہے۔ دشوار چیز اس کے لیے آسان بن جاتی ہے۔ دور کی چیز اس کے لیے قریب ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی ساری قوت لگا دیتا ہے اور اس کے باوجود سمجھتا ہے کہ اس نے محبت کا حق نہیں ادا کیا اور نعمتوں پر شکر نہیں بجالایا''[۴۰]

دل میں ان وجدانی محرکات کو پیدا کرنے کے لیے مختلف وسائل اور تدابیر اختیار کرنے پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اسی کو جمہور علماء و محققین کے نزدیک ''تصوف''، بعض لوگوں کے نزدیک ''احسان'' اور بعض دیگر حضرات مثلاً امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک ''علم السلوک'' کہتے ہیں۔[۴۱]

بعثت سے کچھ عرصہ قبل رسول اللہ ﷺ کی خلوت گزینی انھی محرکات کو پیدا کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔ لیکن خلوت کا یہ مطلب نہیں لینا چاہئے کہ انسانوں سے بالکلیہ قطع تعلق کر کے پہاڑوں اور غاروں کو جائے سکونت بنالیا جائے اور اس کام کو موجب فضیلت سمجھا جائے جیسا کہ بعض منحرف الفکر لوگوں کا خیال ہے۔ یہ چیز آنحضرت ﷺ اور عام صحابہ کرام کے طریقے کے خلاف ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اصلاح حال کے لیے بطور علاج گوشہ نشینی اختیار کی جائے جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا۔ دوا بقدر ضرورت اور وقتِ ضرورت لینی چاہئے ورنہ وہ دیگر امراض اور عوارض پیدا کر دے گی۔ بعض صالحین کے تذکرے میں جو یہ آتا ہے کہ وہ لوگوں سے الگ تھلگ مستقل گوشہ نشیں رہتے تھے، اس کا سبب کوئی مخصوص وجہ ہو گی ان کا یہ عمل دیگر لوگوں کے لیے حجت نہیں ہے۔

---

[۴۰] الموافقات، شاطبی ۲/۱۴۱، نیز دیکھیے مؤلف کی کتاب ضوابط المصلحہ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص: ۱۱۱-۱۱۳

[۴۱] دیکھیے فتاوی ابن تیمیہ کی دسویں جلد۔ اس سے واضح ہوگا کہ امام ابن تیمیہ حقیقی تصوف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور وہ لوگ ان پر بہتان باندھتے ہیں جو اپنے باطل خیالات کو ان کے نام کے حوالے سے عام کرنا چاہتے ہیں۔

آغازِ وحی

امام بخاری نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ آغازِ وحی کی کیفیت یوں بیان کرتی ہیں: ''رسول اللہ ﷺ پر وحی کی ابتدا اچھے خوابوں کی شکل میں ہوئی۔ آپ جو خواب دیکھتے وہ ایسا ہوتا گویا آپ اسے دن کی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ تنہائی پسند ہو گئے اور کئی کئی شب و روز غار حرا میں رہ کر عبادت کرنے لگے۔ جب سامانِ خوراک ختم ہو جاتا تو واپس اپنے گھر والوں (حضرت خدیجہؓ) کے پاس آتے اور سامان لے کر دوبارہ غار حرا میں چلے جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب آپ غار حرا میں تھے، آپ پر وحی نازل ہوئی۔ فرشتے نے آپ کے پاس آکر کہا: پڑھو، آپؐ نے فرمایا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں،'' آپؐ فرماتے ہیں ''اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو، میں نے کہا: میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی، پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا پڑھو۔ میں نے پھر کہا: ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں'' اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ، الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ. (العلق: ۱-۵)

پڑھو (اے نبی) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کانپتے، لرزتے واپس آئے اور حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ

کے پاس پہنچ کر فرمایا: "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ،" آپ کو اڑھادیا گیا، جب آپ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ کو سارا قصہ سنایا اور فرمایا: "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔" انہوں نے کہا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ رشتے داروں سے اچھا سلوک کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کو م کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔ پھر حضرت خدیجہ آپ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس گئیں جو ان کے چچازاد بھائی تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں (بت پرستی چھوڑ کر) عیسائی ہوگئے تھے۔ عبرانی میں لکھنا جانتے تھے، چنانچہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے، بہت بوڑھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا: بھائی جان ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سن لیجیے۔ ورقہ نے حضور سے کہا: بھتیجے کیا ہوا؟ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا وہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا: یہ وہی ناموس (یعنی جبرئیل یا وحی) ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ کاش میں اس وقت طاقت ور ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا: ہاں، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپ کا وہ زمانہ پایا تو میں آپ کی پرزور مدد کروں گا۔" پھر زیادہ مدت نہ گزری کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا اور وحی بھی موقوف رہی۔

فترۃ الوحی (وحی بند رہنے) کا زمانہ کتنا تھا اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مدت تین سال بتائی ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک اس سے کم ہے۔ راجح روایت بیہقی کی ہے جس کے مطابق یہ مدت چھ ماہ کی تھی [۲۲]

امام بخاری نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فترۃ الوحی کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا: "ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا، یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ منظر دیکھ کر دہشت زدہ ہوگیا اور گھر لوٹ آیا۔ میں نے گھر والوں سے کہا: مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

---

۲۲ دیکھیے فتح الباری ۱/ ۲۱

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ.
(المدثر: ۱-۵)

تاکید اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو اور اپنے کپڑے پاک رکھو اور گندگی سے دور رہو۔

اس کے بعد لگاتار وحی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

دروس ونصائح

حیات طیبہ میں وحی کا مظہر اور اس کی حقیقت:

آغاز وحی کی یہ حدیث وہ اساس ہے جس پر دین کے تمام حقائق بشمول عقائد وشرائع مبنی ہیں۔ اس کو سمجھے اور اس پر یقین کیے بغیر ان تمام غیبی خبروں اور تشریعی احکامات پر یقین کرنا ممکن نہیں جنھیں لے کر نبی ﷺ تشریف لائے تھے۔ اس لیے کہ وحی کی حقیقت ہی وہ حد فاصل ہے جو ان دو انسانوں کے درمیان فرق کرتی ہے جن میں سے ایک خود سے غور وفکر کرتا ہے اور اپنی رائے اور عقل سے قوانین بناتا ہے اور دوسرا اپنے رب کے پاس سے اس کا پیغام لے کر آتا ہے اور اس میں ادنیٰ سی بھی تبدیلی یا کمی یا زیادتی نہیں کرتا۔

اس لیے اسلام میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنے والے نام نہاد محققین آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں وحی کو خاص طور سے موضوع بحث بناتے ہیں اور کھینچ تان کر اور کمال عیاری سے اس کی حقیقت میں التباس پیدا کرنے اور اس میں اور الہام، قلبی واردات یہاں تک کہ مرگی کے درمیان خلط ملط کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، اس لیے کہ انہیں معلوم ہے کہ وحی کا موضوع حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے دین پر مسلمانوں کے ایمان ویقین کا سرچشمہ ہے۔ اگر انہیں اس کی حقیقت میں شک ہو جائے تو اس سے حاصل ہونے والے عقائد اور احکام کا وہ آسانی انکار کر دیں گے۔ اور وہ اس نظریے کو پیش کرنے کے لیے راہ ہموار کر سکیں گے کہ محمد (ﷺ) نے جن اصولوں اور شرعی احکام کی طرف دعوت دی ہے وہ ان کی ذاتی سوچ کا نتیجہ تھے۔

اس مقصد سے فکری محاذ پر یلغار کرنے والوں نے وحی کے مظہر کی تاویل کرنے والے

مورخین کے بیانات اور صحیح احادیث کی تصریحات سے پھیرنے اور اس کی عیاں حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور اپنے اپنے خیال کے مطابق عجیب و غریب اور پر تکلف تصورات پیش کیے ہیں، کسی نے کہا کہ محمد (ﷺ) برابر غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ مسلسل تدریجی کشف کے نتیجے میں ان کے دل میں ایک ایسا عقیدہ آگیا جو ان کے خیال میں بت پرستی کا خاتمہ کر سکتا تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر یہ بات کہی کہ انہوں نے قرآن اور اسلام کے اصول و مبادی بحیرا راہب سے سیکھے تھے۔ کسی نے کہا کہ بات یہ ہے نہ وہ، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ محمد (ﷺ) اعصابی مریض یا بالفاظ دیگر مرگی کا شکار تھے۔ ۲۳

جب یہ عجیب و غریب اور بے سروپا تاویلات ہماری نظروں سے گزرتی ہیں جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت کا اقرار نہ کرنا پڑے تو ہم پر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مذکورہ بالا طریقے پر نزول وحی کا آغاز کیے جانے میں کیا حکمت الٰہی پوشیدہ تھی؟ کیوں رسول اللہ ﷺ نے پہلی مرتبہ جبرئیل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، جبکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وحی پس پردہ آجائے؟ کیوں اللہ نے آپ کے دل میں رعب ڈال دیا اور آپ اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، جب کہ اللہ کی آپ سے محبت اور آپ کی حفاظت کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ وہ آپ کے دل میں سکینت نازل فرماتا اور آپ کی ڈھارس باندھتا، چنانچہ آپ پر خوف طاری ہوتا نہ لرزہ آتا؟ کیوں آپ کو اپنی جان کا ڈر ہوا اور یہ خیال پیدا ہوا کہ غار میں دکھائی دینے والا کہیں جن نہ ہو؟ کیوں آپ نے یہ نہیں سوچ لیا کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا امانت دار فرشتہ تھا؟ کیوں اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا جس کے سبب آپؐ پر اتنی گھبراہٹ طاری ہونے لگی کہ ـــ امام بخاری کی روایت کے مطابق ـــ آپ کوشش کرتے کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرالیں۔

جس شکل میں وحی کا آغاز ہوا اس کو دیکھتے ہوئے فطری طور پر یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ان میں بڑی حکمت کا پتا چلتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ان میں کوئی شخص آزادانہ غور و فکر کرے تو اس پر حقیقت نصف النہار کی طرح عیاں ہو جائے گی۔ وہ فکری محاذ پر یلغار کرنے والوں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسے گا نہ ان کے خود

۲۳ دیکھئے حاضر العالم الاسلامی ۱/ ۳۸-۳۹

ساختہ اور بے بنیاد خیالات سے متاثر ہوگا۔

حضرت محمد ﷺ جب غار حرا میں گوشہ نشیں تھے تو ایک بار اچانک جبرئیل کو اپنے سامنے پایا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ کہہ رہے تھے "پڑھو۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ وحی کوئی ذاتی اور داخلی چیز نہیں تھی جس کا تعلق محض قلبی واردات سے ہو، بلکہ یہ ایک خارجی حقیقت کے استقبال اور اس سے استفادہ کا معاملہ تھا۔ فرشتے نے آپ کو تین مرتبہ بھینچا، پھر چھوڑ دیا اور ہر مرتبہ کہا "پڑھو۔" یہ انداز اسی بیرونی استفادہ کی تاکید تھی اور اس تصور کی مزید نفی تھی کہ یہ محض اندرون نفس پیدا ہونے والا خیال ہے۔

آپؐ نے غار میں جو کچھ دیکھا اور سنا اس سے آپ کے دل میں خوف اور رعب طاری ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنی گوشہ نشینی ختم کرکے کانپتے لرزتے ہوئے گھر واپس آئے۔ اس سے ہر عقل و دانش رکھنے والے پر واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ آس لگائے نہیں بیٹھے تھے کہ آپ کو رسول بنایا جانے والا ہے۔ وحی کا نزول آپ کے تصور سے ہم آہنگ ہو کر یا آپ کے دل میں آئے کسی خیال کی تکمیل کے طور پر نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے آغاز نے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم کر دیا تھا اور یہ صورت حال اچانک آپ کے ساتھ پیش آئی تھی۔ پہلے سے آپ کو اس کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اور یقیناً یہ معاملہ اس شخص کے ساتھ پیش نہیں آتا جو برابر غور و فکر میں مشغول رہتا ہو، یہاں تک کہ مسلسل تدریجی کشف کے نتیجے میں اس کے دل میں ایک ایسا عقیدہ تشکیل پا جائے جس کی طرف دعوت دینے پر وہ آمادہ ہو جائے۔

پھر یہ کہ الہام، قلبی واردات، روحانی کشف اور عالم بالا کے بارے میں تفکرات کی صورتوں میں خوف اور رعب طاری نہیں ہوتا اور چہرہ فق نہیں ہوتا۔ بتدریج غور و فکر کرنے اور اچانک خوف اور رعب سے دوچار ہونے میں کوئی ربط اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عام مفکرین اور غور و تدبر کرنے والے اچانک اور پے درپے خوف اور رعب کے حملوں کا شکار رہتے۔

یہ چیز معروف ہے کہ خوف، دہشت، کپکپی، اور چہرہ کا رنگ بدل جانا، یہ سب غیر اختیاری انفعالات میں سے ہیں۔ ان کا بناوٹی مظاہرہ ممکن نہیں کہ ہم یہ فرض کر سکیں کہ ان کو اپنے اوپر مصنوعی طور سے طاری کرکے نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ نے دھوکہ دینے کی کوشش کی ہو، یا یہ

فرض کر سکیں کہ بعثت سے قبل کی آپ کی معروف خصلتیں اچانک بدل گئی ہوں۔

آنحضرت ﷺ اچانک ایک خوف ناک صورت حال سے دوچار ہو گئے تھے۔ اس کی مزید وضاحت آپ کے اس وہم سے ہوتی ہے کہ غار میں آپ نے جس کو دیکھا تھا اور جس نے آپ کو بھینچا تھا اور آپ سے گفتگو کی تھی وہ کہیں جن نہ ہو۔ اپنے اس وہم کا اظہار آپ نے اپنی رفیقۂ حیات حضرت خدیجہ سے کیا۔ ان سے پورا واقعہ بیان کرنے کے بعد آپ نے فرمایا: "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" یعنی جن سے۔ لیکن حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دی کہ آپ جن اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں ان کو دیکھتے ہوئے شیاطین اور جنات کا آپ پر اثر نہیں ہو سکتا۔

اللہ عزوجل اس بات پر قادر تھا کہ اپنے رسول کو ڈھارس دیدے اور انہیں یہ بتا کر مطمئن کردے کہ ان سے گفتگو کرنے والے جبریئل ہیں۔ اللہ کے ایک فرشتے، جو یہ خبر دینے کے لیے آئے تھے کہ وہ لوگوں کی طرف اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ کی ماقبل بعثت کی شخصیت اور مابعد بعثت کی شخصیت دونوں کے درمیان مکمل علیحدگی کا اظہار ہو جائے اور یہ واضح ہو جائے کہ اسلامی عقائد یا اسلامی شریعت کا کوئی جزء رسول اللہ ﷺ کے دماغ میں پہلے سے پک نہیں رہا تھا اور آپ نے پہلے اس کی طرف دعوت دینے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دوسری جانب حضرت خدیجہ کے آنحضرت ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے جانے اور ان کے سامنے پورا واقعہ بیان کرنے سے اس بات کا مزید ثبوت مل گیا کہ آپ کو جس چیز سے اچانک سابقہ پیش آیا تھا وہ وہی وحی الٰہی ہے جو پہلے کے انبیاء پر نازل ہو چکی ہے۔ اس طرح آپ کا خوف دور ہو گیا، ذہن میں آنے والے مختلف تصورات کافور ہو گئے اور التباس کے بادل چھٹ گئے۔

اس کے بعد وحی موقوف ہو گئی اور اس کا سلسلہ چھ ماہ یا اس سے کچھ زائد (باختلاف اقوال) منقطع رہا، تو اس میں بھی دلکش الٰہی معجزہ پوشیدہ ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکری محاذ پر یلغار کرنے والے ان لوگوں کا قطعی رد ہو جاتا ہے جو وحی نبوی کی تاویل اس انداز پر کرتے ہیں کہ وہ طویل اور پیہم غور و فکر کے نتیجے میں حاصل ہونے والا کشف تھا اور اس کا تعلق

آپ کے خارج سے نہیں بلکہ اندرون نفس سے تھا۔

حکمت الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ جس فرشتے کو آپ نے پہلی مرتبہ غار حرا میں دیکھا تھا وہ ایک طویل مدت تک نظروں سے اوجھل رہے اور اس کی وجہ سے آپ قلق واضطراب کا شکار رہیں، یہاں تک کہ یہ قلق بڑھ کر اس خوف تک جا پہنچے کہ کوئی ایسی لغزش تو نہیں سرزد ہو گئی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی و رسالت سے سرفراز کرنے کا ارادہ کر لینے کے بعد آپ کو چھوڑ دیا ہو۔ یہ اندیشہ ہوتے ہی دنیا آپ پر تنگ ہو گئی، آپ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچتے تو دل میں یہ خیال آتا کہ خود کو نیچے گرا کر ہلاک کر دیں!۔ یہاں تک کہ ایک دن آپ نے اسی فرشتے کو دیکھا جو غار حرا میں نظر آیا تھا۔ وہ آسمان وزمین پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے آپ سے کہا: "اے محمد! آپ لوگوں کی طرف اللہ کے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔" آپ دوبارہ خوف زدہ اور لرزہ باندام گھر واپس آئے۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ. (المدثر: ۱-۲)

یہ حالت جس سے رسول اللہ ﷺ کو سابقہ پیش آیا اس کی روشنی میں، وحی میں نفسیاتی الہام کی حیثیت سے غور و فکر ایک جنونی کوشش لگتی ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز بالکل بدیہی ہے کہ جس شخص کا نفسیاتی الہامات اور تفکرات سے واسطہ پڑتا ہو وہ ان حالات سے نہیں گزرتا۔

اس سے واضح ہوا کہ آغاز وحی کا واقعہ جس طرح صحیح و ثابت حدیث میں مذکور ہے **اس** سے وحی اور آنحضرت ﷺ کی نبوت کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کرنے والوں کی پوری عمارت ڈھ جاتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نزول وحی کا آغاز اس انداز سے کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم حکمت پوشیدہ تھی۔

ممکن ہے اس کے بعد شکوک و شبہات پیدا کرنے والے یہ سوال کریں کہ پھر جب بعد میں محمد ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی اور اس وقت ان کے بہت سے اصحاب بھی موجود رہتے تھے تو وحی لانے والے فرشتے کو آپ کے علاوہ کوئی دوسرا کیوں نہیں دیکھ پاتا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چیزوں کے موجود ہونے کی شرط یہ نہیں ہے کہ وہ آنکھوں سے دکھائی دیں۔ اس لیے کہ ہمیں بینائی کا جو ذریعہ حاصل ہے اس کی اپنی ایک حد ہے۔ **اگر ایسا نہ ہو** تو اس کا تقاضا یہ ہو کہ کوئی چیز جب نگاہوں سے اتنی دور ہو جائے کہ دکھائی نہ دے رہی ہو تو معدوم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ جو ان دیکھنے والی آنکھوں کا خالق ہے، اس کے لیے یہ بہت معمولی اور

آسان کام ہے کہ کسی کی بینائی اتنی تیز کرے کہ وہ ایسی چیزیں دیکھ لے جسے دوسروں کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی ہوں۔ مالک بن نبی نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"رنگوں کا اندھاپن (COLOUR BLINDNESS) ہمارے سامنے ایک مثالی حالت ہے۔ جن لوگوں کو یہ مرض ہو جاتا ہے انہیں بعض رنگ دکھائی نہیں پڑتے۔ اسی طرح بعض شعاعیں ایسی ہیں جنھیں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مثلاً ULTRA VIOLET RAYS اور INFRARED RAYS اور کوئی چیز ایسی نہیں جو سائنٹفک طور سے ثابت کردے کہ یہ معاملہ تمام آنکھوں کے ساتھ ہے۔ اس لیے کہ بعض آنکھوں کی حساسیت کم اور بعض کی زیادہ ہوتی ہے" [۲۴]

پھر یہ کہ بعد میں وحی کے مسلسل نزول سے خود بخود اس کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ وحی محض ایک نفسیاتی مظہر نہیں تھا جیسا کہ شبہات پیدا کرنے والے کہتے ہیں۔ وحی کی حقیقت پر درج ذیل نکات سے بخوبی روشنی پڑتی ہے:

۱۔ قرآن اور حدیث میں واضح فرق کیا گیا۔ آپؐ قرآن کے نازل ہوتے ہی فوراً اسے ضبط تحریر میں لانے کا حکم دیتے تھے، جبکہ حدیث کے سلسلے میں صرف اس پر اکتفا کرتے تھے کہ صحابہ اسے زبانی یاد کرلیں۔ اس فرق کا سبب یہ نہیں تھا کہ حدیث آپ کی بات ہوتی تھی جس کا نبوت سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن ٹھیک انہی الفاظ اور حروف میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے آپ پر وحی ہوتا تھا، جبکہ حدیث کے معنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے لیکن الفاظ اور جملے آپ کے ہوتے تھے۔ اسی لیے آپ احتیاط فرماتے تھے کہ اللہ کا کلام جسے آپ جبرئیل سے حاصل کرتے تھے اور آپ کی باتیں دونوں خلط ملط نہ ہو جائیں۔

۲۔ نبی ﷺ سے بعض چیزوں کے بارے میں سوال کیا جاتا تو آپ کوئی جواب نہ دیتے تھے۔ بسا اوقات آپ کے سکوت پر ایک لمبا عرصہ گزر جاتا تھا، یہاں تک کہ جب اس سوال کے سلسلے میں قرآن کی کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ سوال کرنے والے کو طلب فرماتے اور اس کے سامنے اس کی تلاوت کرتے تھے۔ اسی طرح بسا اوقات بعض معاملات میں آپ

[۲۴] الظاہرۃ القرآنیہ ص: ۱۲۷

متعین طور پر کوئی موقف اختیار کرتے تھے لیکن بعد میں نازل ہونے والی آیات میں آپ کو اس سے روک دیا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کبھی آپ کو عتاب اور ملامت بھی کی جاتی تھی۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ اُمی تھے۔۔۔ اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی انسان محض کشف سے تاریخی حقائق جان لے، مثلاً حضرت یوسف کا قصہ، ام موسیٰ کا قصہ جب اس نے اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا تھا اور فرعون کا قصہ وغیرہ۔۔۔ اور یہ چیز بھی آپؐ کے امی ہونے کی حکمتوں میں سے ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ

(العنکبوت۔۴۸)

اے نبی، تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

۴۔ نبی ﷺ چالیس سال تک اپنی قوم کے درمیان صادق کی حیثیت سے مشہور رہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی حق گوئی اپنی ذات کے بارے میں بھی ہو۔ اور وحی کے سلسلے میں آپ کی نگاہوں کے خطا کرنے کا کوئی امکان رہا ہو یا آپ کے ذہن میں کوئی شبہ پیدا ہوا ہو تو یقینی طور پر آپ نے اسے دور کرلیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحی کے ساتھ آپؐ کے اولین تعلق کے سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی:

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ (یونس۔۹۴)

اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ فی الواقع یہ تیرے پاس حق ہی آیا ہے تیرے رب کی طرف سے۔ لہٰذا تو شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

اسی لیے روایت میں آتا ہے کہ یہ آیت نازل ہونے کے بعد آپؐ نے فرمایا: "نہ مجھے شک ہے اور نہ میں کسی سے پوچھوں گا" [۲۵]

[۲۵] یہ روایت ابن کثیر نے قتادہ سے نقل کی ہے۔

باب سوم

بعثت سے ہجرت تک

- حیاتِ نبوی ﷺ میں دعوتِ اسلامی کے مراحل
- خفیہ دعوت
- اعلانِ دعوت
- ایذاء رسانی
- مصالحت کی کوششیں
- معاشی مقاطعہ
- اسلام میں پہلی ہجرت
- خدمت نبوی ﷺ میں پہلا وفد
- غم کا سال
- ہجرتِ طائف
- معجزۂ اسراء و معراج
- قبائل سے حضور ﷺ کی ملاقات اور انصار کے قبولِ اسلام کا آغاز
- پہلی بیعت عقبہ
- دوسری بیعت عقبہ
- صحابہ کو ہجرتِ مدینہ کی اجازت
- ہجرتِ رسول

حیاتِ نبوی میں دعوتِ اسلامی کے مراحل

آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں، بعثت سے وفات تک اسلامی دعوت چار مراحل سے گزری ہے۔

پہلا مرحلہ : خفیہ دعوت۔ یہ مرحلہ تین سال پر محیط ہے۔

دوسرا مرحلہ : علانیہ دعوت، صرف زبان سے۔ یہ مرحلہ ہجرت تک جاری رہا۔

تیسرا مرحلہ : علانیہ دعوت، سرکشوں اور جنگ کا آغاز کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے۔ یہ مرحلہ صلح حدیبیہ کے سال تک جاری رہا۔

چوتھا مرحلہ : علانیہ دعوت، مشرکین، ملحدین، بت پرستوں اور ان تمام لوگوں کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے جنھوں نے راہ دعوت میں رکاوٹ کھڑی کی یا دعوت و تبلیغ کے باوجود اسلام قبول نہیں کیا۔ یہی وہ مرحلہ ہے جس پر اسلامی شریعت کا نظام قائم اور اسلام میں جہاد کا حکم مبنی ہے۔

خفیہ دعوت

نبی ﷺ حکم الٰہی کی تعمیل کرنے لگے اور لوگوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے اور بت پرستی کو ترک کرنے کی دعوت دینے لگے۔ لیکن یہ کام آپ خفیہ طریقے سے انجام دیتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں قریش جو شرک اور بت پرستی میں بڑے متعصب تھے، بھڑک نہ جائیں۔ اسی لیے آپ قریش کی عمومی مجلسوں میں اپنی دعوت پیش نہ کرتے تھے۔ بلکہ صرف انہی لوگوں کو اپنا مخاطب بناتے تھے جن سے قرابت کا تعلق تھا یا پہلے سے جان پہچان تھی۔

سب سے پہلے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں میں یہ حضرات تھے: خدیجہ بنت خویلد،

علی بن ابی طالب، آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ، ابو بکر بن ابی قحافہ، عثمان بن عفان، زبیر بن العوام، عبدالرحمن بن عوف، سعد بن ابی وقاص وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

یہ لوگ نبی ﷺ سے خفیہ طریقے سے ملتے تھے، ان میں سے کوئی جب عبادت کرنا چاہتا تو مکہ کی گھاٹیوں میں چلا جاتا تھا تاکہ وہاں قریش کی نگاہوں سے چھپ کر اسے انجام دے سکے۔

جب دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں کی تعداد تیس سے متجاوز ہو گئی (جن میں مرد اور عورتیں دونوں تھے) تو رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے ایک صحابی حضرت ارقم بن ابی ارقم کے گھر کو خاص کر دیا جہاں آپ تعلیم و تربیت کی ضرورتوں کے لیے ان سے ملاقات کرتے تھے۔ اس عرصے میں دعوت کا حاصل تقریباً چالیس مرد و عورت تھے، جن میں سے بیشتر فقراء، غلام یا ایسے لوگ تھے جن کی قریش کی نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔[1]

دروس و نصائح

۱۔ دعوت نبوی کے آغاز میں رازداری کیوں برتی گئی؟

اس میں شک نہیں کہ ان ابتدائی سالوں میں اسلام کی دعوت و تبلیغ میں نبی ﷺ کی رازداری کا سبب اپنی جان کا خوف نہیں تھا۔ اس لیے کہ آپ کو جب دعوت کا مکلف بنایا گیا تھا اور یہ وحی نازل ہوئی تھی: یا ایھا المدثر قم فانذر الدثر: ۱-۲ (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو) تبھی آپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ آپ لوگوں کی طرف اللہ کے رسول ہیں اور آپ کو یقین تھا کہ جس اللہ نے آپ کو مبعوث کیا ہے اور اس دعوت کی ذمہ داری دی ہے وہی آپ کی حفاظت فرمائے گا اور لوگوں کے شر سے بچائے گا۔ اگر اللہ تعالیٰ روز اول ہی یہ حکم دیتا کہ لوگوں تک علی الاعلان دعوت پہنچائیں تو آپ ایک لمحہ بھی توقف نہ کرتے خواہ اس میں آپ کو اپنی ہلاکت نظر آتی۔

(لیکن اللہ عزوجل نے آپ کو الہام کیا — اور رسول کا الہام وحی کے قبیل سے ہوتا ہے — کہ ابتدائی مرحلے میں دعوت کا آغاز رازداری اور خفیہ طریقے سے کریں) اور اسے صرف انہی لوگوں کے سامنے پیش کریں جن کے بارے میں گمان غالب ہو کہ وہ اس پر کان

[1] اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن ہشام ۱/ ۲۴۹-۲۶۱

دھریں گے اور ایمان لائیں گے۔ اپنے اس عمل کے ذریعے آپ نے کار دعوت انجام دینے والوں کو ایک اہم تعلیم دی۔ آپ نے انہیں احتیاط ملحوظ رکھنے اور ظاہری اسباب اختیار کرنے کی تلقین کی اور واضح کیا کہ دعوت کے اہداف تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مطلوبہ وسائل اختیار کرنا عقل سلیم کا تقاضا ہے۔ لیکن یہ ضرور خیال رہے کہ یہ چیز خدائے واحد پر اعتماد اور توکل پر نہ غالب آجائے اور انسان اسباب ووسائل اختیار کرنے میں اس حد تک آگے نہ بڑھ جائے کہ وہ اس کے فکر اور تصور پر اثر انداز ہونے لگیں، اس لیے کہ یہ چیز نہ صرف یہ کہ دعوت اسلامی کے مزاج کے منافی ہے بلکہ اس سے ایمان باللہ کی اصل بھی مخدوش ہو جاتی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس عرصہ میں آنحضرت ﷺ کی دعوت کا اسلوب بحیثیت امام حکمت و تدبیر کے قبیل سے تھا۔ اس کا تعلق بحیثیت نبی آپ کی تبلیغی سرگرمیوں سے نہیں تھا۔

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ دعوت اسلامی کے علم برداروں کو ہر زمانے میں دعوت کے انداز میں لچک رکھنا چاہیے۔ جس زمانے سے ان کا تعلق ہو اس کے مطابق دعوت پیش کرنے میں جہاں جیسی ضرورت ہو رازداری، اعلان، نرمی یا سختی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اسلامی شریعت اس لچک کا تقاضا کرتی ہے اور سیرت نبوی کے مذکورہ بالا چاروں مراحل سے اس جانب رہنمائی ملتی ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے میں ہر حالت میں مسلمانوں کا مفاد اور دعوت اسلامی کا مفاد پیش نظر رکھنا چاہیے۔

اسی لیے جمہور فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی موقعے پر مسلمانوں کی تعداد اتنی قلیل ہو یا آلات حرب اتنے ناکافی ہوں کہ غالب گمان ہو کہ اگر وہ جنگ کریں گے تو دشمنوں کو کچھ نقصان پہنچائے بغیر خود جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے تو اس صورت میں حفاظت جان کے مفاد کو مقدم رکھنا مناسب ہے۔ اس لیے کہ اس کے بالمقابل حفاظت دین کا مفاد پورا نہیں ہو سکتا یا اس کا پورا ہونا موہوم ہو گا۔

امام عز بن عبدالسلام اس قسم کے جہاد میں مشغول ہونے کو حرام قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

"اگر دشمن کو نقصان پہنچانا ممکن نہ ہو تو پسپائی اختیار کرنا واجب ہے، اس لیے کہ ثابت

قدم رہنے میں جانوں کا ضیاع ہے اور اس صورت میں کفار کے دل ٹھنڈے ہوں گے اور مسلمانوں کو ذلت کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ ایسے موقعے پر ثابت قدمی سراسر فساد ہے، اس میں کسی چیز کا مفاد نہیں۔"[۲]

یہاں حفاظتِ جان کے مفاد کو مقدم رکھنے کی بات محض ظاہری اعتبار سے کہی گئی ہے، ورنہ حقیقت میں اس میں حفاظتِ دین کا مفاد ہے۔ اس لیے کہ ایسے حالات میں دینی مفاد کا تقاضا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی جانوں کی حفاظت ہو تاکہ وہ دیگر مفتوحہ علاقوں میں پیش قدمی اور جہاد کر سکیں۔ بصورتِ دیگر اگر وہ ہلاک ہو گئے تو اس میں خود دین کا نقصان ہے کیونکہ اس طرح کفار کو موقع مل جائے گا کہ اپنے سامنے مسدود راستوں کو کھولنے کے لیے معرکہ برپا کر دیں۔

حاصل یہ کہ اگر اعلان یا قتال کی وجہ سے دعوت کو نقصان پہنچتا ہو تو رازداری یا صلح واجب ہے، لیکن اگر علی الاعلان دعوت پیش کی جا سکتی ہو اور ایسا کرنا فائدہ مند ہو تو اس معاملے میں رازداری برتنا جائز نہیں۔ اور اگر طاقت ہو اور دفاع کے وسائل موجود ہوں تو ظالموں اور اسلامی دعوت کے بدخواہوں کے ساتھ صلح جائز نہیں۔ اسی طرح اگر کافروں کے علاقوں میں گھس کر جہاد کرنے کے اسباب و وسائل فراہم ہوں تو اس سے پہلو تہی جائز نہیں۔

۲۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے اولین لوگ اور ان کے سب سے پہلے اسلام قبول کرنے کی حکمت:

سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مرحلہ میں دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں میں سے بیشتر لوگ غریب، کمزور یا غلام تھے۔ اس کی کیا حکمت تھی؟ اور اسلامی ریاست کی بنیاد اس قسم کے لوگوں پر قائم ہونے کا کیا راز تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ انبیاء کی دعوت کا، اولین مرحلے میں فطری نتیجہ ہے۔ انبیاء کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم انہیں عار دلاتی تھی کہ ان کے متبعین جو ہر وقت ان کے اردگرد رہتے ہیں، گھٹیا درجے اور پست حیثیت کے لوگ ہیں۔ وہ کہتی تھی:

۲۔ قواعد الاحکام فی مصالح الانام ۱/۹۵، نیز دیکھیے راقم سطور کی کتاب ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص: ۲۶۱

مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ
(ھود۔۲۷)

ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ بس ایک انسان ہو ہم جیسے، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے یہاں اراذل تھے، بے سوچے سمجھے تمہاری پیروی اختیار کر لی ہے۔

فرعون اور اس کے درباری حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کو ذلیل اور کمزور خیال کرتے تھے۔ انہیں ہلاک کرنے کا تذکرہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا. (الاعراف۔۱۳۷)

اور ان کی جگہ ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے، اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جسے ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قوم ثمود کی طرف مبعوث کیا۔ اس قوم کے گھمنڈی لیڈروں نے ان کی دعوت سے منہ پھیر لیا، جبکہ کمزور اور بے حیثیت لوگوں نے اس پر لبیک کہا:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ. قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ. (الاعراف:۷۵۔۷۶)

اس کی قوم کے سرداروں نے، جو بڑے بنے ہوئے تھے، کمزور طبقے کے ان لوگوں سے جو ایمان لے آئے تھے، کہا: کیا تم واقعی یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کا پیغمبر ہے؟ انہوں نے جواب دیا: بے شک، جس پیغام کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے اسے ہم مانتے ہیں۔ ان بڑائی کے مدعیوں نے کہا: جس چیز کو تم نے مانا ہے ہم اس کے منکر ہیں۔

اس کا راز یہ ہے کہ دین جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام انبیاء اور رسولوں کو مبعوث کیا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کو قبول کرتے ہی انسان دوسرے انسانوں کے اقتدار اور حکومت سے نکل کر خدائے واحد کے اقتدار اور حکومت میں آ جاتا ہے۔ یہ ایسی حقیقت

ہے جس سے سب سے پہلے نام نہاد معبودوں کی الوہیت، خود ساختہ حکمرانوں کی حکمرانی اور سربرآوردہ طبقے کے اثر و رسوخ کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ دوسری جانب یہ سب سے پہلے کمزور، ذلیل اور غلام بنالیے جانے والوں کو اپیل کرتی ہے۔ چنانچہ اسلامی دعوت کے سلسلے میں نام نہاد معبودوں اور خود ساختہ حکمرانوں کا ردعمل دشمنی اور عناد کا ہوتا ہے، جب کہ کمزور لوگ اس پر لبیک کہتے ہیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقت اس گفتگو سے بخوبی عیاں ہے جو جنگ قادسیہ میں ایرانی فوج کے سپہ سالار رستم اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی فوج کے معمولی سپاہی حضرت ربعی بن عامرؓ کے درمیان ہوتی ہے۔ رستم نے ان سے دریافت کیا: ”تمہیں ہم سے جنگ کرنے اور ہمارے علاقوں میں گھس آنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟“

انہوں نے جواب دیا: ”ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدائے واحد کی غلامی میں لے آئیں“

پھر انہوں نے رستم کے دائیں بائیں صف بستہ اور سر جھکائے ہوئے درباریوں کو دیکھا اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

”ہم تک تم لوگوں کے عقل مند ہونے کی خبریں پہنچتی تھیں، لیکن میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم سے بڑھ کر بے وقوف قوم اور کوئی نہیں۔ ہم مسلمانوں میں کوئی کسی کو غلام نہیں بناتا۔ میرا تو خیال تھا کہ تم لوگ بھی اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کا معاملہ کرتے ہوگے جیسے ہم کرتے ہیں۔ جو کچھ تم نے کیا اس سے بہتر تھا کہ مجھے بس اتنی بات بتا دیتے کہ تم میں سے بعض لوگ دوسروں کے خدا بنے بیٹھے ہیں۔“

یہ سن کر کمزور اور معمولی حیثیت کے لوگ چہ مہ گوئیاں کرنے لگے: ”اللہ کی قسم اس عربی شخص نے سچ کہا“ رہے سردار اور سربرآوردہ طبقے کے لوگ تو ان پر حضرت ربعیؓ کی یہ گفتگو بجلی بن کر گری اور وہ لرزہ براندام ہوگئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”اس نے تو ایسی بات کہی ہے کہ ہمارے غلام اس کی طرف کھنچے جا رہے ہیں“ [۳]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن کمزور لوگوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا وہ اس

۳؎ اس واقعہ کی تفصیل کے لیے دیکھیے: اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء تالیف محمد خضری ص: ۱۰۰

میں مخلص نہیں تھے اور ان کا ایمان بے غرض نہیں تھا، بلکہ اس کے ذریعے ان کا مقصد مستکبرین کی اذیتوں اور ان کے تسلط سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اس لیے کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان اور حضرت محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کی تصدیق قریش کے سرداروں اور کمزوروں کے درمیان قدر مشترک تھی۔ ان میں سے ہر شخص جانتا تھا کہ نبی ﷺ اپنے رب کی جانب سے جن چیزوں کی خبر دے رہے ہیں وہ سب برحق ہیں، لیکن ان سرداروں اور سربرآوردہ لوگوں کو ان کی سرداری آنحضرت ﷺ کی اطاعت اور تابع داری سے روکتی تھی۔ اس کی نمایاں ترین مثال آپؐ کے چچا ابو طالب تھے۔ رہے غریب اور کمزور لوگ تو انہیں آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت اختیار کرنے سے روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ مزید برآں خدائے واحد کی الوہیت پر ایمان لاتے ہی انہیں اپنی عظمت کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ اللہ کے اقتدار کے علاوہ کسی دوسرے اقتدار کو اور اس کی قوت کے علاوہ کسی دوسری قوت کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ یہ شعور — جو اللہ عزوجل پر ایمان کا ثمرہ تھا — جس شخص میں بھی پیدا ہو جاتا تھا اس کی قوت میں اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ اس کے نشے میں سرشار رہتا تھا۔

اس سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آج کے دور میں فکری یلغار کرنے والے بعض پیشہ ور لوگ کتنی غیر معقول بات کہتے اور کتنا بڑا الزام لگاتے ہیں، جب وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے جو دعوت پیش کی وہ عرب کے مخصوص ماحول کی پیداوار تھی اور اس وقت کی عربی فکر کی تحریک کی ترجمانی کر رہی تھی۔

اگر ایسا ہوتا تو تین سال گزرنے کے بعد اس دعوت کا حاصل محض چالیس مرد و عورت نہ ہوتے، جن میں سے بیشتر غریب، کمزور اور غلام تھے اور ان میں سرفہرست عجم سے تعلق رکھنے والے (مثلاً روم کے صہیبؓ اور حبشہ کے بلالؓ) تھے۔

آنے والی بحثوں میں آپ دیکھیں گے کہ عربی ماحول ہی نے آنحضرت ﷺ کو اپنے وطن سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور آپ کے متبعین کو مجبور کیا کہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ادھر ادھر منتشر ہو جائیں اور ہجرت کر کے ملک حبشہ چلے جائیں۔ اس کا سبب اس دعوت سے اس کی نفرت تھی، جس کے بارے میں یہ پیشہ ور لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے آپؐ نے اس ماحول کے رجحانات اور افکار کی ترجمانی کی تھی۔

اعلانِ دعوت

ابن ہشام نے لکھا ہے: "پھر لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا۔ ان میں عورتیں اور مرد دونوں تھے۔ یہاں تک کہ اسلام کا آوازہ مکہ کی فضا میں بلند ہوا اور جگہ جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔ تب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ انہیں جس حق کا امین بنایا گیا ہے اس کا برملا اظہار و اعلان کریں، لوگوں کے سامنے اسے پیش کریں اور انہیں اس کی طرف دعوت دیں۔ خفیہ دعوت اور علانیہ دعوت کے درمیان تین سال کا وقفہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ. (الحجر: ۹۴)

پس اے نبی جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.
(الشعراء: ۲۱۴-۲۱۵)

اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ اور ایمان لانے والوں میں سے جو لوگ تمہاری پیروی اختیار کریں ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے رب کے حکم پر یوں عمل کیا کہ کوہ صفا پر چڑھ گئے اور بلند آواز سے صدا لگائی: اے بنی فہر، اے بنی عدی! یہ صدا سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ جو کسی وجہ سے خود نہ پہنچ سکا اس نے حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے اپنا نمائندہ بھیج دیا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ ان سے مخاطب ہوئے اور ارشاد فرمایا:

"تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر میں تم کو یہ اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک

لشکر کھڑا ہے جو تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو کیا تم اس بات پر یقین کرو گے؟

انہوں نے جواب دیا: "ہم نے آپ کو کبھی جھوٹ بولتے ہوئے نہیں پایا"

تب آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تو میں تم کو ایک سخت عذاب سے ڈرا رہا ہوں جو بالکل تمہارے سامنے ہے۔"

اس مجمع میں ابولہب بھی تھا۔ اس نے کہا۔ "تمہارا سارا دن برباد ہو۔ کیا صرف یہی کہنے کے لیے تم نے ہمیں بلایا تھا۔" اس پر سورۂ لہب نازل ہوئی: تَبَّتْ يَدَا اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ...... الآیۃ (ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ) [4]

پھر رسول اللہ ﷺ کوہ صفا سے اتر آئے۔ آپؐ نے رشتہ داروں میں تبلیغ کے فرمانِ الٰہی پر اس طرح عمل کیا کہ اپنے تمام گھر والوں، رشتہ داروں اور اہلِ خاندان کو جمع کیا اور ان کو یوں مخاطب کیا:

"اے بنی کعب بن لوئی! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی مرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی عبد شمس! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی عبد مناف! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے بنی عبد المطلب! اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم سے بچا۔ میں اللہ کی بارگاہ میں تم لوگوں کو کچھ بھی فائدہ نہ پہنچا سکوں گا۔ البتہ میری تم سے جو رشتہ داریاں ہیں ان کا پاس و لحاظ رکھوں گا۔" [5]

آں حضرت ﷺ کے اعلانِ دعوت پر قریش کا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے آپ سے منہ پھیر لیا۔ آپ کی دعوت کی طرف سے آنکھیں موند لیں۔ یہ کہنے لگے کہ وہ اس دین کو نہیں چھوڑ سکتے جو انہیں ان کے آباء و اجداد سے ملا ہے اور ان کے مراسم زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے انہیں متنبہ کیا کہ اپنے افکار اور عقلوں کو اندھی تقلید کی غلامی سے آزاد کر لیں اور عقل و منطق کو کام میں لائیں۔ آپؐ نے ان پر واضح کر دیا کہ ان کے معبود جن کے آگے وہ سر جھکاتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں، انہیں کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔

---

[4] متفق علیہ

[5] متفق علیہ، الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

اور یہ کہ آباءواجداد کے وقت سے ان کی پرستش ہوتے رہنا ان کے لیے سندِ جواز فراہم نہیں کرتا کہ وہ بھی بغیر سوچے سمجھے محض تقلیداً ان کا اتباع کرتے رہیں۔ جب کہ ارشاد باری ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا، اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ. (المائدہ۔ ۱۰۴)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ باپ دادا ہی کی تقلید کیے چلے جائیں گے، خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور صحیح راستہ کی انہیں خبر ہی نہ ہو؟

چنانچہ جب آں حضرت ﷺ نے ان کے معبودوں کی مذمت کی، انہیں کم عقل ٹھہرایا اور جب انہوں نے یہ کہا کہ وہ بتوں کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ان کے آباء واجداد کی روایات ہیں تو ان کے آباء واجداد کو نادان اور بے عقل قرار دیا۔ تب انہوں نے اس معاملہ کو سنگین گردانا، آپؐ کی دعوت کو نامانوس سمجھا اور اس کی مخالفت اور سرکشی پر کمربستہ ہوگئے۔ صرف چند لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اسلام قبول کرنے کی توفیق دی۔ آپؐ کے چچا ابوطالب نے اگرچہ اسلام تو قبول نہیں کیا لیکن آپ کی سرپرستی اور حمایت کی اور مخالفتوں کے ہجوم میں آپ کے سپر بنے۔

دروس ونصائح

سیرت نبوی کے اس حصے سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں، جنہیں ہم سطور ذیل میں باختصار بیان کرتے ہیں:

۱۔ حضورؐ کی دعوت کا مقصد عرب قومیت کی ترویج نہیں تھی

رسول اللہ ﷺ نے جب قریش اور عام عربوں کے سامنے اسلامی دعوت کا اعلان کیا تو ان کے سامنے ایک ایسی چیز پیش کی جس کی انہیں قطعی توقع نہیں تھی اور جس سے وہ بالکل نامانوس تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کو سن کر ابولہب نے سخت سست کہا تھا اور سرداران

قریش اس کی دشمنی اور مخالفت پر کمربستہ ہوگئے تھے۔

اس سے ان لوگوں کی قطعی تردید ہوجاتی ہے جو اس دین کی تعلیمات اور احکام کو قومیت کا ثمرہ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اپنی دعوت کے ذریعے اس وقت عربوں کی خواہشات اور مفادات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

جو شخص آں حضرت ﷺ کی حیات طیبہ سے واقف ہو اسے اس مضحکہ خیز دعویٰ کا رد کرنے کے لیے کچھ محنت نہیں کرنی پڑے گی۔ جو حضرات لوگوں کے درمیان اس دعویٰ کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں وہی سب سے پہلے اس کے بودے پن اور نامعقولیت سے واقف ہیں۔ لیکن بہرحال وہ اسے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ دین کے اقتدار اور تسلط کو دیگر اصولوں اور افکار کے راستے سے ہٹایا جاسکے۔ ان کے نزدیک کسی دعویٰ کی ترویج کے لیے ضروری نہیں کہ وہ صحیح بھی ہو۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے مفادات اور اغراض ان کی ترویج کا تقاضا کرتے ہوں۔ تمہیدی مبحث میں "عہدِ جاہلیت اور بقایائے حنفیت" کے زیر عنوان ہم اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔

۲۔ رشتہ داروں کے درمیان دعوت و تبلیغ کا حکم دینے کی حکمت

یہ ممکن تھا کہ عمومی حکم فاصدع بما تومر (جس چیز کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے بانگ پکارے کہہ دو) پر اکتفا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو خاص طور پر اعزاء اور قرابت داروں کو ڈرانے کا حکم نہ دیتا۔ اس لیے کہ خاندان کے افراد اور رشتہ دار ان لوگوں میں شامل تھے جن کے درمیان آپؐ کو دعوت اور انذار کا فریضہ انجام دینا تھا۔ لیکن رشتہ داروں کو ڈرانے کا خصوصی حکم دینے کی کیا حکمت تھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے ذریعے اس ذمہ داری کے مختلف درجات کی جانب اشارہ مقصود تھا جو عام طور پر ہر مسلمان اور خاص طور پر دعوت کے میدان میں کام کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔

ذمہ داری کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کا ذمہ دار ہو۔ اس درجے کا حق ادا کرنے کے لیے آغاز وحی کا وقفہ اتنا طویل رکھا گیا کہ آں حضرت ﷺ کو اطمینان ہوجائے کہ آپ نبی

مرسل ہیں اور آپ پر اللہ عز و جل کی جانب سے وحی نازل ہوتی ہے، تاکہ اپنی ذات پر سب سے
پہلے آپ خود ایمان لے آئیں اور خود کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والے احکام، شرائع اور
تعلیمات کو حاصل کرنے کے لیے تیار کرلیں۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے اہل و عیال اور رشتہ داروں کا ذمہ دار ہو۔ اس ذمہ
داری کا حق ادا کرنے کی ہدایت دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دعوت کے اعلان اور تبلیغ کا عمومی
حکم دینے کے بعد خاص طور پر اہل و عیال اور اعزاء و اقرباء کو انذار و تبلیغ کا حکم دیا۔ ذمہ داری کے
اس درجے میں ہر وہ مسلمان شریک ہے جو ایک خاندان میں، رشتہ داروں کے درمیان رہتا ہو۔
رسول کے اپنی قوم کو دعوت دینے میں اور مسلمان کے اپنے خاندان میں رشتہ داروں کو دعوت
دینے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اتنا کہ رسول ایک نئی شریعت کی طرف دعوت
دیتا ہے جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہے اور مسلمان اس رسول کی دعوت کو پیش کرتا،
اس کی طرف سے تبلیغ کرتا اور اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ جس طرح نبی یا رسول کے لیے جائز
نہیں کہ اس کے پاس جو وحی آئی ہے اسے اپنی قوم تک نہ پہنچائے، اسی طرح خاندان کے سربراہ
کے لیے بھی جائز نہیں کہ اپنے اہل و عیال اور خاندان کے افراد تک دین کی تبلیغ نہ کرے۔ بلکہ
اس پر لازم ہے کہ انہیں دین کی اتباع پر آمادہ کرے اور اس سلسلے میں اپنے اثر و رسوخ اور دباؤ کو
بھی استعمال کرے۔

رہا ذمہ داری کا تیسرا درجہ تو وہ یہ ہے کہ عالم اپنے محلہ یا شہر کا اور حاکم اپنے ملک اور قوم کا
ذمہ دار ہو۔ وہ دونوں اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں، اس لیے کہ وہ آپ کے
قانونی وارث ہیں۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”علماء انبیاء کے وارث ہیں“ اور اس لیے ک
امام اور حاکم کو خلیفہ یعنی رسول اللہ ﷺ کا جانشین کہا جاتا ہے۔
علم اور سوجھ بوجھ اسلامی معاشرے میں امام اور حاکم کی لازمی خصوصیات میں سے ہیں
اس لیے رسول اللہ ﷺ سے متعلق ذمہ داری اور علماء اور حکام سے متعلق ذمہ داری دونوں می
وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اتنا کہ رسول اللہ تعا
کی جانب سے بھیجی گئی نئی شریعت کی تبلیغ کرتا ہے، جب کہ یہ لوگ اس کے نقش قدم پر چ
اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرتے اور اپنے افعال اور تبلیغ میں اس کی سنت و سیر

التزام کرتے ہیں۔

آں حضرت ﷺ اس مرحلے میں اپنی ذات کے سلسلے میں بھی ذمہ داری انجام دے رہے تھے اس لیے کہ آپ اس کے مکلف تھے۔ اپنے خاندان اور اہل و عیال کے سلسلے میں بھی ذمہ داری انجام دے رہے تھے اس لیے کہ آپ ایک خاندان کے سربراہ تھے اور مختلف رشتہ داریاں رکھتے تھے۔ پھر آپ تمام انسانوں کے سلسلے میں بھی ذمہ داری انجام دے رہے تھے اس لیے کہ آپ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی اور رسول تھے۔

نبی ﷺ کے ساتھ پہلی ذمہ داری میں ہر مکلف، دوسری ذمہ داری میں ہر سربراہِ خاندان اور تیسری ذمہ داری میں علماء اور حکام شریک ہیں۔

۳۔ اسلام میں ”روایات“ کا وجود نہیں:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کی مذمت کی کہ انہوں نے اپنے آباء و اجداد سے موروثہ روایات کی خوبیوں یا خرابیوں میں غور کیے بغیر خود کو ان کا غلام بنا رکھا ہے، اور انہیں دعوت دی کہ اپنی عقلوں کو اندھی پیروی اور عقل و منطق کی اساس سے محروم روایات کی عصبیت کی غلامی سے آزاد رکھیں۔

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ یہ دین بشمول عقائد و احکام، عقل و منطق پر مبنی ہے۔ اور اس کو اختیار کرنے کا مقصد انسانوں کا دنیوی اور اخروی مفاد ہے۔ اسی لیے ایمان باللہ اور اس سے متعلق دیگر اعتقادی امور کی صحت کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ یقین اور آزاد فکر کی اساس پر قائم ہوں اور اس میں کسی عرف یا تقلید کا دخل نہ ہو۔ صاحب جوہرۃ التوحید اپنے معروف ارجوزہ میں فرماتے ہیں:

فکلّ من قلّد فی التوحید　　　ایمانہ لم یخل من تردید

(جس شخص نے بھی توحید کے معاملے میں تقلید کی اس کا ایمان غیر معتبر ہے)

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ دین روایات کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے اور اس کی غلامی سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے آیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے تمام اصول اور احکام عقلِ سلیم پر مبنی ہیں، جب کہ روایات محض تقلید اور پیروی کے محرک پر قائم ہوتی ہیں، یعنی ان میں بحث

تحقیق اور آزادانہ غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اہل زبان اور ماہرین سماجیات کے عرف میں 'روایات' ان عادات کے مجموعے کو کہتے ہیں جو آباؤ اجداد سے چلی آتی ہیں یا جو کسی ماحول یا کسی شہر میں لوگوں کے باہمی ربط سے عام ہو گئی ہیں، بشرطیکہ ان عادات کو بقا و دوام ملنے کا بنیادی سبب محض تقلید ہو۔

اس تعریف کی رو سے سماج میں رائج زندگی گزارنے کے طریقے، خوشیوں کے موقعے پر لہو ولعب کے مظاہر، رنج و غم کے موقعے پر ماتم کی شکلیں اور وہ تمام چیزیں جن کے لوگ عادی ہو گئے ہوں اور وہ زمانہ قدیم سے نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہوں یا تاثر اور ربط باہمی کی وجہ سے انہیں خود بخود اختیار کر لیا گیا ہو، ایسی تمام چیزوں کو زبان اور سماجیات کی اصطلاح میں روایات کہتے ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں جسے "روایات" کا نام دیا جا سکے، خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا دیگر نظاموں اور احکام سے۔ عقیدہ عقل و منطق کی اساس پر قائم ہے اور احکام کی بنیاد دنیوی اور اخروی مصالح پر ہے۔ یہ مصالح غور و تدبر سے سمجھ میں آجاتے ہیں، اگرچہ ان کے ادراک سے کچھ لوگ بعض عوارض و اسباب کی وجہ سے قاصر رہتے ہیں۔

اسی طرح اس تفصیل سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ لوگ کتنی بڑی غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلام کے عبادات، احکام و قوانین اور اخلاقیات کو "اسلامی روایات" کا نام دیتے ہیں۔ اس غلط نام کے رواج پانے سے ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اسلامی اخلاقیات کی قدر و قیمت اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ایسے الٰہی اصول ہیں جن میں انسانیت کی سعادت کا راز پنہاں ہے۔ بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلامی نظام اور اسلامی اخلاق ایسی قدیم عادتوں پر مشتمل ہے جو باپ دادا کے زمانے سے چلی آرہی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس قدیم میراث کو ایک ایسے زمانے میں جس کی ہر چیز ترقی یافتہ، اعلیٰ درجے کی اور نئی ہے، معاشرے کے لیے لازم قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے تو اکثر لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی احکام کو 'روایات' کا نام دینے کی غلطی ایسی نہیں ہے جو نادانستہ طور سے سرزد ہو گئی ہو، بلکہ یہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا مقصد باطل اور پُر فریب اصطلاحوں کے ذریعے اسلام کے خلاف جنگ برپا کرنا ہے۔ 'اسلامی روایات' کی اصطلاح کو رو

دینے کا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بیشتر نظاموں اور احکام پر 'روایات' کا پردہ ڈال دیا جائے۔ یہاں تک کہ جب ایک زمانہ گزر جائے، لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اسلام کے نظاموں اور احکام کی حیثیت روایات کی ہے، اور وہ یہ بھول جائیں کہ یہ نظام در حقیقت ایسے اصول ہیں جو عقلِ سلیم کی بنیاد پر قائم ہیں، تو اس وقت دشمنانِ اسلام کے لیے آسان ہوگا کہ ایسی جگہ سے اس پر حملہ کریں جہاں سے اسے نقصان پہنچایا جا سکتا ہو۔

اسلام نے جو نظام اور قوانین پیش کیے ہیں ان کی حیثیت اصول و مبادی کی ہے۔ اصول اس چیز کو کہتے ہیں جو غور و فکر پر مبنی اور قرینِ عقل ہو اور اس کا مقصد کسی متعین ہدف تک رسائی ہو۔ انسانوں کے وضع کردہ اصول تو بسا اوقات غلط ہو جاتے ہیں، اس لیے کہ ان کے پیش کرنے والوں کے افکار میں انحرافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اسلام کے اصول کبھی غلط نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ جس ذات نے انہیں وضع کیا ہے وہی عقول و افکار کا بھی خالق ہے۔ محض یہ عقلی دلیل ان اصولوں پر ایمان لانے اور ان کی عظمت اور صحت کا یقین کرنے کے لیے کافی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جب اسلام کے بیشتر اصول و مبادی اور احکام جیسے نکاح و طلاق، حجاب اور عصمتِ نسواں اور اخلاق و کردار کے عام مسائل پر 'روایات' کا پردہ ڈال دیا گیا ہو تو فطری طور پر اس کے بعد کچھ ایسے لوگ نمودار ہوں گے جو ان روایات کو ترک کر دینے، ان کی قید سے نکلنے اور ان کی بیڑیاں توڑ دینے کی دعوت دیں گے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب آزادیٔ فکر و رائے کو غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں روایات کا کوئی وجود نہیں۔ یہ تو ایسا دین ہے جو عقل کو روایات کے شکنجوں سے آزاد کرنے کے لیے آیا ہے، جیسا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے ابتدائی مراحل میں دیکھا ہے۔ روایات معاشرتی طور و طریق کے وہ دھارے ہیں جن میں لوگ خود بخود محض نقل اور تقلید کے محرک سے بہہ جاتے ہیں، جب کہ اصول وہ خط ہے جس کے ذریعے زمانے کی رفتارِ ترقی کو منضبط کیا جانا چاہیے۔

روایات کی مثال ان طفیلی نباتات کی ہے جو معاشرے کے فکری میدانوں میں خود بخود اُگ آتی ہیں۔ یہ ضرر رساں ہوتی ہیں اس لیے انہیں اکھاڑ کر پھینک دینا اور فکرِ سلیم کی راہ کو ان سے پاک کر دینا ضروری ہے۔

ایذا رسانی

پھر رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب سے، قریش کی دشمنی میں شدت آگئی۔ انہوں نے آپ کو اذیت پہنچانے کے لیے نت نئے طریقے اپنائے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ نبی ﷺ حجر میں نماز ادا کر رہے تھے۔ عقبہ بن ابی معیط آیا اور آپ کے گلے میں چادر ڈال کر اتنی زور سے بل دیا کہ آپ کا گلا گھٹنے لگا۔ حضرت ابو بکرؓ آگے بڑھے اور اس کا کندھا پکڑ کر اسے نبی ﷺ کے پاس سے ہٹایا اور فرمایا: کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس بنا پر جان سے مار ڈالنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے" [۶] اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ حرم میں نبی ﷺ نماز میں مصروف تھے۔ اس وقت وہاں قریش کے چند سردار بھی موجود تھے۔ عقبہ بن ابی معیط اونٹ کی اوجھ لے کر آیا اور جب آپ سجدے میں گئے تو آپ کی پیٹھ پر ڈال دیا۔ اس کے بوجھ سے آپ اپنا سر نہ اٹھا سکے، یہاں تک کہ صاحب زادی فاطمہؓ آئیں، اس کو آپ کی پیٹھ سے ہٹایا اور یہ حرکت کرنے والے کو بد دعا دی۔" [۷]

آں حضرت ﷺ جب سرداران قریش کی مجلسوں میں جاتے یا ان کے قریب سے گزرتے تو وہ آپ کا مذاق اڑاتے، فقرے کستے اور آپ کو ستانے کے نت نئے حربے آزماتے۔ طبری اور ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ ایک مرتبہ آپ مکہ کی ایک گلی سے گزر رہے تھے۔ ایک شخص نے ایک مٹھی مٹی لے کر آپ کے سر پر ڈال دی۔ آپ اسی حالت میں گھر واپس تشریف لائے۔ آپ کی ایک صاحب زادی نے آپ کا سر دھلایا۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر

۶ بخاری

۷ بخاری

رونے لگی تو آپ نے فرمایا:

"بیٹی، مت رو، اللہ تمہارے باپ کی حفاظت کرے گا۔" [۸]

آپ کے اصحاب نے بھی طرح طرح کے مظالم سہے، یہاں تک کہ ان کی تاب نہ لا کر کوئی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، کسی کی بینائی چلی گئی، لیکن انہوں نے اللہ کے دین سے اپنا رشتہ نہ توڑا۔ ان پر عذاب کے جو پہاڑ توڑے گئے ان کی تفصیلات کا بیان طول کا باعث ہوگا۔ یہاں ہم بطور نمونہ حضرت خباب بن الارتؓ کا وہ بیان نقل کرتے ہیں جسے امام بخاری نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ خانہ کعبہ کے سائے میں ایک چادر اوڑھے ہوئے تشریف فرما تھے۔ اس وقت ہمیں مشرکین کی جانب سے سخت اذیتیں پہنچ رہی تھیں۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا (اب بھی) آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں فرمائیں گے؟ یہ سننا تھا کہ آپ اٹھ کر بیٹھ گئے، روئے مبارک سرخ ہو گیا۔ آپ نے فرمایا: "تم سے پہلے کے لوگوں کے جسموں پر لوہے کی کنگھیاں چلائی گئیں جس سے گوشت اور پٹھے ہڈی سے الگ ہو جاتے تھے، اس کے باوجود وہ دین حق کو ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اس کام کو اللہ تعالیٰ یقیناً پورا کر کے رہے گا یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔" [۹]

دروس ونصائح

رسول اور آپ کے اصحاب کے شدید اذیتیں برداشت کرنے میں حکمت:

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو مشرکین کی جانب سے جن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ان پر مشتمل واقعات میں اگر کوئی شخص غور کرتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلا سوال یہ ابھرتا ہے کہ اگر نبیؐ اور آپ کے اصحاب حق پر تھے تو پھر یہ عذاب کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے کیوں انہیں اس سے بچا نہیں لیا جب کہ وہ اس کے دین کے علم بردار تھے، ان کے درمیان اس کا رسول

۸ دیکھئے تاریخ طبری ۲/ ۳۴۴، سیرت ابن ہشام ۱/ ۱۵۸

۹ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب کو قریش کی جانب سے پہنچنے والی اذیتوں کی تفصیلات کے لیے دیکھئے کتب سیرت مثلاً سیرت ابن ہشام یا تہذیب السیرۃ اور نورالیقین للخضری وغیرہ۔

موجود تھا، وہ اس کی طرف دعوت دینے والے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے والے تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ مکلف ہے، یعنی اللہ عزو جل نے اس سے وہ بار اٹھانے کا مطالبہ کیا ہے جس میں مشقت اور پریشانی ہے۔ اسلام کی طرف دعوت اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد اس کے اہم متعلقات میں سے ہیں۔ مکلف ہونا عبودیتِ الٰہی کے اہم لوازم میں سے ہے۔ اگر انسان کسی چیز کا مکلف نہ ہو تو عبودیتِ الٰہی کے کوئی معنی نہیں، اور اللہ کی عبودیت اس کی الوہیت کے تقاضوں میں سے ہے۔ اگر ہمیں اس کی عبودیت کا احساس نہ ہو تو اس کی الوہیت پر ایمان کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبودیت کا تقاضا ہے کہ انسان مکلف ہو اور مکلف ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ مشقت برداشت کرے، نفس کا مجاہدہ کرے اور خواہشات پر قابو رکھے۔

اس لیے اس دنیا میں اللہ کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ دو کام انجام دیں:

ایک یہ کہ اسلام کو مضبوطی سے تھامیں اور صحیح اسلامی معاشرہ قائم کریں۔

دوسرے یہ کہ اس کے لیے مشقت برداشت کریں، خطرات سے کھیلیں اور جان و مال کی بازی لگائیں۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ مقصد پر ایمان لائیں۔ ساتھ ہی اس نے اس بات کا بھی مکلف کیا ہے کہ اس مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لیے طویل اور پرمشقت راستہ اختیار کریں، خواہ اس میں کتنے ہی خطرات اور کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں۔

اگر اللہ چاہتا تو اسلامی معاشرے کے قیام کا راستہ بہت آسان اور ہموار بنا دیتا۔ لیکن اس صورت میں اس چیز کا اظہار نہ ہو پاتا کہ اس راستے پر چلنے والا اللہ عزوجل کا بندہ ہے، اس نے اس پر ایمان کا اعلان کرتے ہی اپنی جان اور مال کا اس کے ہاتھ سودا کر لیا ہے، اور اس کی تمام خواہشات رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کے تابع اور ماتحت ہیں۔ اور اس صورت میں اس بات کا بھی امکان تھا کہ اس راستے پر مومن اور منافق، سچے اور جھوٹے سب چلنے لگیں، ان میں ایک دوسرے سے کوئی فرق اور امتیاز باقی نہ رہے۔

اس سے واضح ہوا کہ اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے والے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد کرنے والے جو کچھ مصیبت اور مشقت اٹھاتے ہیں وہ ابتدائے تاریخ سے اس

کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، جس کا تین حکمتیں تقاضا کرتی ہیں:

اول: اس سے اللہ تعالیٰ کی صفتِ عبودیت کا اظہار ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ. (الذاریات۔۵۶)

میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

دوم: اس سے اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مرد اور عورت کو بسلامتیٔ عقل و حواس اور سنِ رشد کو پہنچنے کے بعد اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کو اپنی ذات پر نافذ کرے اور اسلامی نظام کو اپنے معاشرے میں برپا کرے خواہ اس کے لیے اسے کتنی ہی سختیاں برداشت کرنی اور کتنی ہی تکلیفیں جھیلنی پڑیں۔

سوم: اس سے سچ بولنے والوں اور جھوٹ بولنے والوں میں فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اگر اسلام اور محبتِ الٰہی کا زبانی دعویٰ کافی ہو تو سچے اور جھوٹے برابر ہو جائیں۔ درحقیقت ابتلاء و آزمائش ہی وہ کسوٹی ہے جو سچے اور جھوٹے میں فرق کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے:

الٓمّٓ. اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ، وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ. (العنکبوت:۱-۳)

ا۔ل۔م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالاں کہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ. (آل عمران۔۱۴۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔

اگر یہ اللہ تعالیٰ کی، اپنے بندوں کے معاملے میں سنت ہے تو تم اس میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ اس کا یہ معاملہ اپنے انبیاء اور برگزیدہ بندوں کے ساتھ بھی رہا ہے۔ اس راہ میں اللہ کے رسول ﷺ کو اذیت پہنچائی گئی۔ آپ سے پہلے کے تمام انبیاء و رسل بھی ستائے گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کو بھی طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض ان تکلیفوں کی تاب نہ لا کر چل بسے اور بعض بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ان لوگوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی، باوجود یہ کہ اس کی بارگاہ میں ان کی بہت فضیلت اور بڑا درجہ تھا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان اسلامی معاشرے کے قیام کی راہ میں جو تکلیفیں اٹھاتا ہے وہ درحقیقت رکاوٹیں یا بندشیں نہیں ہیں جو مقصد تک پہنچنے میں حارج ہوتی ہیں، جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں۔ بلکہ وہ اس راستے میں جس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے مسلمان کو حکم دیا ہے، پیش آنے والی لازمی چیزیں ہیں، یعنی مسلمان اس راستے میں جس قدر تکلیفیں اٹھائیں گے اور جس قدر جان کی بازی لگائیں گے اسی قدر وہ منزل مقصود سے قریب ہوں گے۔

اس لیے اگر مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے یا وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہو تو اسے مایوسی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس دین کا مزاج اس کے برعکس صورت کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی جب بھی مسلمان یہ محسوس کریں کہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش میں ان کی تکلیفوں اور مصائب میں اضافہ ہو رہا ہے تو وہ اسے فتح و نصرت کی بشارت سمجھیں۔ اس کی واضح دلیل درج ذیل آیت کریمہ ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ، مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصْرُ اللَّهِ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ. (البقرۃ ۲۱۴)

کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا، حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں

اللہ کی مدد قریب ہے۔

جو لوگ اسلامی دعوت کا مزاج نہیں سمجھے تھے اور اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اس راہ میں پیش آنے والی تکلیفیں اور اذیتیں نصرتِ الٰہی سے محروم ہونے کی علامت ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا۔ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (ہاں اللہ کی مدد قریب ہے)

اس کی واضح دلیل حضرت خباب بن الارتؓ کا واقعہ بھی ہے۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں سخت ترین تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے ان مصائب کا تذکرہ کر کے مسلمانوں کے لیے نصرتِ الٰہی کی دعا کی درخواست کی۔ اس موقع پر آں حضرت ﷺ نے انہیں جو جواب دیا اس کا مفہوم یہ تھا:

"اگر تمہیں ان مصیبتوں اور اذیتوں پر تعجب ہے اور تم حیرت زدہ ہو کہ اللہ کے راستے میں یہ سب کیوں؟ تو تمہیں جان لینا چاہیے کہ اس راستے میں یہ سب پیش آکر رہے گا۔ اور یہ تمام اہل ایمان بندوں کے معاملے میں اللہ کی سنت ہے۔ ان میں سے بہت سوں کو اس کے دین پر چلنے کے جرم میں یہ سزا دی گئی کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کی کھال کھینچ لی گئی، اس کے باوجود وہ اس کام سے باز نہیں آئے۔ اگر تمہیں ان مصیبتوں میں مایوسی اور نصرتِ الٰہی سے محرومی کی علامتیں نظر آتی ہیں تو یہ تمہارا وہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس راہ میں مصائب و آلام کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ تم صحیح راستے پر چل رہے ہو اور کامیابی تمہارے قدم چومنے والی ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس دین کو غالب کر کے رہے گا یہاں تک کہ آدمی صنعاء سے حضرموت تک کی طویل مسافت طے کرے گا اور اسے اللہ کے علاوہ کسی کا ڈر نہیں ہوگا" ایک روایت میں یہ اضافہ ہے "اسے اپنے ریوڑ پر بھیڑیا کے حملے کا اندیشہ تو ہوگا" (لیکن اپنے لوٹ لیے جانے کا کوئی خطرہ نہ ہوگا)

یہی راز ہے اس بات میں کہ نبی ﷺ نے اگرچہ اپنے اصحاب کو خوش خبری دے دی تھی کہ اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ایران و روم کے ملکوں پر فتح دے دے گا لیکن اس کے باوجود یہ ممالک آپ کی وفات کے کافی دنوں کے بعد فتح ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کی فضیلت اور اس کی آپ سے محبت کا تقاضا تھا کہ یہ ممالک آپ کی حیات میں اور آپ کی قیادت اور نگرانی میں فتح ہوتے چہ جائیکہ تاریخ میں ان کی فتح آپ کے کسی پیرو کی سپہ سالاری میں مقدر ہو۔

لیکن کامیابی کا دوسرا قانون ہے۔

مسلمانوں نے نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں شام و عراق پر فتح حاصل کرنے کے لیے پوری قیمت نہیں چکائی تھی۔ اور کامیابی پانے کے لیے پوری قیمت چکانا لازمی ہے۔ ورنہ کامیابی نہیں مل سکتی خواہ اللہ کا رسول ان کے درمیان موجود ہو۔ مسئلہ یہ نہیں کہ اگر کسی معرکے میں اللہ کا رسول موجود ہو یا وہ اس کی قیادت اور نگرانی میں برپا ہو تو محض اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے محبت کرتا ہے، فتح یقینی ہو۔ بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ فتح و کامرانی سے ہم کنار ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول سے بیعت کی ہے، یہ ثابت کر دکھائیں کہ وہ اپنی بیعت میں سچے ہیں اور انہوں نے سر تسلیم خم کرتے وقت اللہ سے جو عہد کیا تھا اس پر قائم ہیں۔ ارشاد باری ہے:

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ. (التوبہ-۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔

مصالحت کی کوششیں

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ عتبہ بن ربیعہ جو اپنی قوم کے سرداروں میں سے اور صاحب رائے شخص تھا، اس نے ایک مرتبہ قریش کی ایک مجلس میں یہ تجویز رکھی: "اے سردارانِ قریش۔ اگر آپ لوگوں کی رائے ہو تو میں محمد [ﷺ] کے پاس جا کر ان سے گفتگو کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں۔ وہ ان میں سے جس تجویز کو بھی مان لیں اسے ہم بھی قبول کر لیں۔ اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں" ان لوگوں نے کہا: "ہاں ٹھیک ہے اے ابوالولید! جاؤ جا کر بات کرو۔" عتبہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا: "بھتیجے! ہمارے خاندان میں تم کو جو عزت حاصل ہے اور جس اعلیٰ حسب و نسب کے تم مالک ہو اس سے تم خوب واقف ہو۔ تم نے اپنی قوم کے سامنے ایک مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا ہے اور پوری قوم کو بے وقوف ٹھہرا لیا ہے...... میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمہارے سامنے رکھتا ہوں ان پر غور کرو شاید ان میں سے کسی کو قبول کر لو۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ابوالولید! آپ کہیں، میں سنوں گا۔"

اس نے کہا: "بھتیجے! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے اگر اس سے تمہارا مقصد مال و دولت حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تم کو اتنا کچھ دے دیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر اس سے بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنا لیں، یہاں تک کہ کسی معاملے کا فیصلہ تمہارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیں۔ اور اگر تم پر کوئی آسیب آتا ہے اور تمہیں کچھ نظر آنے لگا ہے جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو تو ہم بہترین اطباء بلوا دیں اور ہم سب مل کر اپنے خرچ پر تمہارا علاج کرا دیں۔"

عتبہ یہ کہہ چکا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ابوالولید! جو کچھ کہنا تھا آپ کہہ چکے؟" اس

نے کہا: "ہاں۔" آپ نے فرمایا: "اب میری سنیے۔" پھر آپ نے سورۂ حم السجدہ کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی:

حٰمٓ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ. بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ. وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ. قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ. (حم السجدہ: ۱-۶)

ح۔م۔ یہ خدائے رحمٰن ورحیم کی طرف سے نازل کردہ چیز ہے۔ ایک ایسی کتاب جس کی آیات خوب کھول کر بیان کی گئی ہیں۔ عربی زبان کا قرآن۔ ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں بشارت دینے والا اور ڈرا دینے والا۔ مگر ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی اور وہ سن کر نہیں دیتے۔ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہوگئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہو گیا ہے۔ تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے۔" اے نبی ان سے کہو۔ "میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا خدا تو بس ایک ہی خدا ہے۔ لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اس سے معافی چاہو۔ تباہی ہے مشرکوں کے لیے۔"

آپؐ مزید آیات کی تلاوت کرتے رہے اور عتبہ سنتا رہا۔ یہاں تک کہ جب آپ اس آیت پر پہنچے:

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ. (حم السجدہ-۱۳)

اب اگر یہ لوگ منہ موڑتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تم کو اسی طرح کے ایک اچانک ٹوٹ پڑنے والے عذاب سے ڈراتا ہوں جیسا عاد وثمود پر نازل ہوا تھا۔

تو اس نے آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر کہنے لگا: "ایسی بات نہ کہو۔" آیت میں جو دھمکی کا مضمون پایا جاتا ہے اس سے اس پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ پھر عتبہ اٹھ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ جب ان کے پاس آکر بیٹھا تو انہوں نے

کہا: "ابوالولید! کیا خبر ہے؟" اس نے کہا: "میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ ویسا اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ خدا کی قسم۔ وہ نہ شعر ہے، نہ سحر، نہ کہانت۔ اے اہل قریش میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اللہ کی قسم اس کا جو کلام میں سن کر آیا ہوں۔ وہ رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو اگر عرب اس پر غالب آگئے تو تم اس کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ اور اگر وہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور اس کی عزت تمہاری عزت ہوگی۔"

یہ سنتے ہی سردارانِ قریش بول اٹھے: "ابوالولید! اس کی زبان کا جادو تم پر بھی چل گیا" عتبہ نے کہا: "میری جو رائے تھی وہ میں نے بتادی۔ اب تمہارا جو جی چاہے کرو۔"

طبری اور ابن کثیر وغیرہ نے روایت کیا ہے کہ "مشرکین کا ایک وفد جس میں ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل بھی تھے، رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو وہ لوگ انہیں اتنا مال دے دیں کہ سب سے زیادہ مال دار ہو جائیں، ان کی شادی سب سے حسین وجمیل عورت سے کردیں، لیکن وہ ان کے معبودوں کو برا بھلا کہنا اور ان کے رسوم ورواج پر تنقید کرنا بند کردیں۔ آپؐ نے جب ان کی یہ پیش کش ٹھکرادی اور فرمایا کہ وہ برابر اس حق کی طرف دعوت دیتے رہیں گے جس کو لے کر آئے ہیں تو ان لوگوں نے ایک دوسری تجویز رکھی: "تم ایک دن ہمارے معبودوں کی عبادت کرو، ہم ایک دن تمہارے معبود کی عبادت کریں گے" آپؐ نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔ اس پر سورۂ کافرون نازل ہوئی:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ. لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ. وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ. لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ. (الکافرون: ۱-۶)

کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو، نہ تم ان کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

سردارانِ قریش نے ایک بار پھر ویسی ہی کوشش کی جیسی عتبہ بن ربیعہ کرچکا تھا۔ وہ ایک وفد کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور پیش کش کی کہ اگر یہ سب کچھ تم سردار بننے کی

خواہش میں کر رہے ہو تو ہم تمہیں سردار بنائے لیتے ہیں۔ اگر مال کی طلب میں کر رہے ہو تو تمہارے لیے مال و دولت اکٹھا کرنے پر تیار ہیں۔ اور اگر کوئی آسیب مسلط ہو گیا ہے تو علاج کا بندوبست کیے دیتے ہیں۔ جواب میں حضورؐ نے فرمایا:

"مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے جیسا کہ تم گمان کر رہے ہو، نہ میں جو چیز تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا مقصد یہ ہے کہ تم سے تمہارے مال طلب کروں یا تم میں شرف حاصل کروں یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ بلکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے 'بشیر' (ایمان لانے پر خوش خبری دینے والا) اور 'نذیر' (ایمان نہ لانے پر ڈرانے والا) بنوں۔ میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیے ہیں اور تمہیں نصیحت کر دی ہے۔ اب اگر تم اس چیز کو قبول کرتے ہو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں تو تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں خوش نصیبی ہے اور اگر اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا، یہاں تک کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔"

اس پر ان لوگوں نے کہا: "ہم نے آپ کے سامنے جو تجویزیں رکھی ہیں اگر ان میں سے کوئی بھی آپ کو قابل قبول نہیں ہے تو آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک کے حدود اربعہ بہت تنگ ہیں، یہاں پانی کی بڑی قلت ہے اور ضروری سامانِ آسائش بھی فراہم نہیں۔ آپ اپنے رب سے جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، ہمارے لیے دعا کر دیجئے کہ وہ ان پہاڑوں کو جن کی وجہ سے ہمارا علاقہ تنگ ہے، تھوڑا سا اور کھسکا دے، ہمارے لیے شام اور عراق کے دریاؤں کے مثل دریا جاری کر دے اور ہمارے باپ دادا کو زندہ کر دے، ان زندہ ہونے والوں میں قصی بن کلاب ضرور ہوں، کیونکہ وہ مرد باصفا تھے۔ ان لوگوں سے ہم دریافت کریں گے کہ آپ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط؟ آپ اپنے رب سے یہ بھی دعا کریں کہ وہ آپ کو باغات، محلات اور سونے اور چاندی کے خزانے عطا کر دے، تاکہ اس طرح آپ کی تمام خواہش پوری ہو جائیں۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اگر آپ اسے پورا کر دکھائیں گے تو ہم آپ کو سچا مان لیں گے۔ اور جان لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کا بلند مرتبہ ہے اور اس نے آپ کو رسول

بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں۔"

یہ مطالبے سن کر حضورؐ نے فرمایا: "میں یہ سب نہیں کروں گا اور نہ میں اپنے رب سے یہ کرنے کی درخواست کروں گا۔"

پھر ان لوگوں نے طویل بحث و مباحثہ اور مخاصمت کے بعد کہا: "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ سب باتیں آپ کو یمامہ کا ایک شخص، جس کا نام رحمٰن ہے، سکھاتا ہے۔ اللہ کی قسم، ہم رحمٰن پر کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اے محمد ہم تمہیں معذور سمجھتے ہیں۔"

ساتھ ہی ان لوگوں نے یہ دھمکی بھی دی: "اللہ کی قسم ہم تم کو اور تمہاری ان کارروائیوں کو جو تم ہمارے درمیان کر رہے ہو یونہی نہیں چھوڑ دیں گے۔ یہاں تک کہ یا ہم تمہیں ختم کر دیں یا تم ہمیں ختم کر دو۔" یہ کہتے ہوئے وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

دروس و نصائح

آں حضرت ﷺ کی سیرت کے اس حصے سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

۱۔ اسلامی دعوت کی حقیقت اور دنیوی اغراض و مقاصد کے مقابلے میں اس کا امتیاز

اس سے اس دعوت کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے جسے لے کر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تھے۔ اور اس میں اور دیگر اغراض و مقاصد میں جو بسا اوقات نئی دعوتوں کو پیش کرنے والے اور انقلاب اور اصلاح کا نعرہ بلند کرنے والے اپنے دلوں میں چھپائے رکھتے ہیں، فرق کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔

کیا نبی ﷺ اپنی دعوت کی آڑ میں بادشاہی حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا آپ سرداری کے بلند مقام تک پہنچنے کے متمنی تھے یا دولت کمانا چاہتے تھے؟ کیا آپ کو کوئی مرض لاحق ہو گیا تھا جس کی بنا پر آپ کو کچھ نظر آنے لگا تھا؟

یہ سب احتمالات تھے جنہیں ممکن ہے فکری یلغار کرنے والے اور اس دین کے دشمن پیش

کرتے۔ لیکن قربان جایئے ان اسرار پر جنہیں اللہ رب العالمین نے اپنے رسول کی زندگی میں پوشیدہ رکھے تھے۔ آپ کی زندگی ایسے واقعات اور مثالوں سے بھری ہوئی ہے جو ایسے ہر احتمال کی جڑ کاٹ دیتی ہیں، ایسے ہر شبہ کو ختم کر دیتی ہیں۔ اور فکری یلغار کرنے والے ششدر رہ جاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ فکری جنگ برپا کرنے کے لیے کون سا راستہ اپنائیں؟!

اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کا مظہر یہ تھا کہ مشرکین قریش نے اپنے دلوں میں یہ سارے احتمالات قائم کیے، پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ متعدد مرتبہ مصالحتی گفتگو کی۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کی دعوت کا مزاج کیا ہے؟ آپ کی رسالت کا مقصد کیا ہے؟ اور وہ خوب جانتے تھے کہ آپ ان کے کسی لالچ کے دام میں آنے والے نہیں اور ان کی کوئی پیش کش قبول نہیں کر سکتے۔ لیکن مشیت الٰہی سے یہ سب کچھ اس لیے ہوا تاکہ آئندہ اگر فکری محاذ پر حملہ کرنے اور تشکیک پیدا کرنے والے یہ احتمالات پیش کرنا چاہیں تو تاریخ انہیں جھٹلا دے۔

کریمر اور وان ولوٹن جیسے لوگوں نے بہت غور و فکر کیا، لیکن انہیں شبہات پیدا کرنے کا کوئی راستہ نظر نہ آیا، سوائے اس کے کہ وہ حقیقت سے اپنی آنکھیں موند لیں اور دعویٰ کریں کہ محمد [ﷺ] کی دعوت کے محرکات یہ تھے کہ وہ اس کی آڑ میں سرداری اور بادشاہی کے خواہش مند تھے۔ اگر وہ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش میں چٹانوں سے اپنے سر ٹکرا دیں تو بھی وہ کامیاب نہ ہوں گے اور انہیں منہ کی کھانی پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے پہلے عتبہ بن ربیعہ اور اس جیسے دوسرے لوگوں سے یہی کام لیا۔ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کے سامنے ان محرکات اور خواہشات کو پیش کیا کہ آپ انہیں بخوشی قبول کر لیں۔ اگر آپ ان کی پیش کش قبول کر لیتے تو قریش کے تمام لوگ آپ کے تابع فرمان ہوتے اور آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ایذا و تعذیب دینے کے جو حربے انہوں نے اختیار کر رکھے تھے ان سے دست کش ہو جاتے۔ پھر آپؐ نے کیوں ان کے سامنے کسی نرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اور کیوں اس موقعے کو غنیمت نہیں جانا، اگر آپ کی رسالت اور دعوت کے پس پردہ یہی محرکات کار فرما تھے؟!!

کیا کوئی شخص جو بادشاہی اور سرداری کا خواہش مند ہو، اس کی قوم کے لوگ اس کے سامنے ان چیزوں کی پیش کش کریں، اس سے مصالحت کے انداز میں گفتگو کریں، پیش کش قبول

کر لینے کی صورت میں تکریم کا اظہار کریں اور رد کر دینے کی صورت میں دھمکی دیں۔ کیا وہ شخص سب کچھ سن لینے کے بعد آخر میں انہیں یہ جواب دے گا:

"میں جو چیز تمہارے پاس لے کر آیا ہوں اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم سے تمہارے مال طلب کروں یا تم میں شرف حاصل کروں یا تمہارا بادشاہ بن جاؤں۔ بلکہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، مجھ پر ایک کتاب نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر و نذیر بنوں۔ میں نے اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا دیے ہیں اور تمہیں نصیحت کر دی ہے۔ اب اگر تم اس چیز کو قبول کرتے ہو جو میں تمہارے پاس لایا ہوں تو تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں خوش نصیبی ہے۔ اور اگر اسے رد کرتے ہو تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے۔"

آں حضرتؐ کی معاشی زندگی آپ کے اس قول سے پوری طرح مطابقت رکھتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ زبان سے تو سرداری اور بادشاہی سے لاتعلقی ظاہر کر رہے ہوں لیکن پس پردہ ان کے حصول کے لیے سعی و عمل میں مصروف ہوں۔ آپ کا کھانا پینا بہت معمولی تھا۔ آپ کی معاشی حالت فقراء و مساکین کی حالت سے بہتر نہ تھی۔ امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "نبی ﷺ کا جس وقت وصال ہوا، میرے پاس کھانے والی کوئی چیز نہ تھی، سوائے تھوڑے سے جو کے۔ ایک عرصے تک میں وہی استعمال کرتی رہی" بخاری ہی کی روایت ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا: "نبی ﷺ نے زندگی بھر دستر خوان پر کھانا نہیں کھایا اور آپ نے زندگی بھر چپاتی روٹی نہیں استعمال کی۔"

آپ کا لباس بھی انتہائی معمولی ہوتا تھا۔ گھر میں ضروریات کی چیزیں بھی بہت مختصر تھیں۔ چٹائی پر لیٹتے تھے جس سے آپ کے پہلو میں نشان پڑ جاتا تھا۔ کبھی نرم بستر پر سوئے نہیں۔ ایک دن آپ کی ازواج جن میں سیدہ عائشہؓ بھی تھیں، آپ کے پاس اکٹھا ہوئیں اور فقر و فاقہ کی شکایت کرنے لگیں۔ انہوں نے آپ سے مطالبہ کیا کہ زینت و لباس کے لیے انہیں مزید خرچ دیا جائے تاکہ ان کا رکھ رکھاؤ دیگر صحابیات سے کم تر نہ ہونے پائے۔ آپ نے غصے میں سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (الاحزاب: ۲۸-۲۹)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے سامنے ان آیتوں کی تلاوت فرمائی، پھر انہیں اختیار دیا کہ چاہیں تو اسی حالت میں آپ کی رفاقت میں زندگی گزاریں، ورنہ اگر وہ مزید نان و نفقہ، سامان زیب و زینت اور مال و دولت کے مطالبے پر اصرار کریں گی تو آپ انہیں چھوڑ دیں گے اور خوب صورت طریقے سے رخصت کر دیں گے۔ تمام ازواج مطہرات نے اسی حالت میں آپ کے ساتھ رہنا منظور کر لیا۔ [1]

۲۔ حکمت کا مفہوم اور اس کے حدود:

اس سے اس حکمت کا مفہوم واضح ہوتا ہے جسے رسول ﷺ اختیار فرماتے تھے۔ ک
حکمت یہ ہے کہ آپ دعوت کی راہ میں جو تدبیر بھی چاہیں اختیار کریں، خواہ اس کی جو بھ
کیفیت یا نوعیت ہو؟ کیا شریعت نے آپ کو یہ حق دے دیا ہے کہ اگر آپ کا مقصد برحق ہے
آپ اس کو حاصل کرنے کے لیے جو راہ چاہیں اپنائیں اور جو ذریعہ چاہیں اختیار کریں؟

نہیں...... اسلامی شریعت نے جس طرح مقاصد کو متعین کر دیا ہے اسی طرح اس
وسائل کی بھی نشان دہی کر دی ہے۔ تم پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعین کردہ مقصد تک ر
حاصل کرنے کے لیے صرف وہی متعین راہ اپناؤ جو اس نے بتائی ہے۔ حکمت اور تدبیر کے مخ
معتبر معانی ہیں لیکن صرف انہی جائز وسائل کے حدود میں۔

اس کی دلیل سطور بالا میں مذکور واقعات ہیں۔ اس چیز کا شمار حکمت اور تدبیر کے
میں ہو سکتا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان لوگوں کے ساتھ سرداری یا بادشاہی کی شرط پر مصا

[1] بخاری، مزید تفصیل کے لیے دیکھئے تفسیر ابن کثیر

کر لیں اور اپنے دل میں یہ مصمم ارادہ کر لیتے کہ بادشاہی یا سرداری کو بعد میں اسلامی دعوت کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنا لیں گے، خصوصاً جب کہ حکمراں اور بادشاہ کا اپنی رعایا پر بہت اثر و رسوخ ہوتا ہے۔ اسی لیے افکار و نظریات کے علم بردار حکومت پر قبضہ جمانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تاکہ اقتدار کے ذریعے لوگوں پر اپنے افکار و نظریات تھوپ سکیں۔

لیکن نبی ﷺ نے اس حکمت عملی کو پسند نہیں کیا اور دعوت کے اس ذریعے کو اختیار نہیں فرمایا، اس لیے کہ یہ خود دعوت کے اصول و مبادی سے ٹکراتا تھا۔

اگر اس طرح کے اسلوب کو حکمت اور درست تدبیر کی ایک قسم قرار دے دیا جائے تو سچے اور بے لوث مخلص اور جھوٹے دھوکہ باز میں کوئی فرق نہ رہ جائے اور مخلص داعیان اور مکار اور شعبدہ باز حکمت و تدبیر کا لیبل لگا کر ایک ہی راہ پر چلنے لگیں۔

ذریعہ اور مقصد دونوں کے معاملے میں اس دین کا فلسفہ شرافت اور سچائی پر مبنی ہے۔ جس طرح مقصد اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ سچائی، شرافت اور کلمۂ حق پر قائم نہ ہو اسی طرح ذریعے کو بھی سچائی، شرافت اور کلمۂ حق کے اصول کا پابند ہونا چاہیے۔

اس لیے اسلامی دعوت کے علم برداروں کو بیشتر حالات میں قربانی اور جہاد کی ضرورت ہے، کیونکہ جو راستہ وہ اختیار کیے ہوئے ہیں وہ انہیں بہت زیادہ دائیں بائیں مڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔

یہ سوچنا غلط ہے کہ دعوت میں حکمت کی مشروعیت کا مقصد داعی کے کام کو آسان بنانا یا اس کو پریشانیوں اور تکلیفوں سے بچانا ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جو لوگوں کی عقلوں اور ذہنوں کو زیادہ اپیل کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب حالات مختلف ہوں اور دعوت کے راستے میں انکار و عناد کی رکاوٹیں کھڑی کی جا رہی ہوں تو اس وقت حکمت یہ ہے کہ جہاد کی تیاری کی جائے اور جان و مال کی قربانی کے لیے تیار رہا جائے۔ حکمت یہ ہے کہ جس وقت جس کام کی ضرورت ہو وہی انجام دیا جائے۔

یہ ہے فرق حکمت اور فریب دہی کے درمیان، یہ ہے فرق حکمت اور مصالحت کے درمیان۔

سیرت میں یہ واقعہ محفوظ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بعض سرداران قریش میں دین کو سمجھنے کی طرف رجحان پایا۔ اس سے آپ بہت خوش ہوئے۔ آپ ان کی طرف

پورے طور سے متوجہ ہو کر ان سے گفتگو کرنے لگے اور اسلام کے جن حقائق کے بارے میں وہ دریافت کر رہے تھے ان کی وضاحت کرنے لگے۔ اتنے میں نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ کا وہاں سے گزر ہوا۔ وہ بھی کھڑے ہو کر آپ کی گفتگو سننے اور کچھ چیزیں دریافت کرنے لگے۔ آپؐ چونکہ ان سرداروں کے ہدایت پا جانے کی خواہش رکھتے تھے اور اس موقعے کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے اس لیے آپ نے اس وقت حضرت ابن ام مکتومؓ کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہ سوچ کر کہ انہیں بعد میں کسی دوسرے موقعے پر جواب دے دیں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو سورۂ عبس میں عتاب فرمایا اور آپ کے اس اجتہاد کو قبول نہیں فرمایا، اگرچہ اس کا مقصد جائز اور پاکیزہ تھا۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے ایک مسلمان کی دل شکنی ہوتی تھی یا اس سے مشرکین کے دلوں کو مائل کرنے کے لیے اس سے اعراض اور بے توجہی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو جائز اور قابلِ قبول نہیں قرار دیا گیا۔

حاصل یہ کہ کسی کو حق نہیں کہ حکمتِ دعوت کے نام پر اسلام کے احکام اور اصولوں میں کچھ تبدیلی کر دے یا اس کے حدود سے تجاوز کر جائے یا اس کی پابندیوں کا خیال نہ رکھے۔ اس لیے کہ حکمت اسی وقت تک حکمت ہے جب کہ وہ شریعت اور اس کے اصول و مبادی اور اخلاقیات کے حدود میں رہے۔

۳۔ قریش کے مطالبات کیوں پورے نہیں کیے گئے؟

اس سے اظہار ہوتا ہے کہ قریش کے ان مطالبات کے جواب میں، جو انہوں نے اتباع کے لیے بطور شرط پیش کیے تھے، آں حضرت ﷺ نے کیا موقف اختیار کیا؟ اس موقف کی اللہ تعالیٰ نے بھی تائید فرمائی، چنانچہ عام مفسرین کے مطابق یہ آیات نازل ہوئیں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًاۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًاۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًاۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًاؒ (بنی اسرائیل: ۹۰-۹۳)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے، یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اس میں نہریں رواں کر دے، یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے۔ جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے، یا خدا اور فرشتوں کو رو در رو ہمارے سامنے لے آئے، یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے، یا تو آسمان پر چڑھ جائے اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اوپر ایسی تحریر نہ اتار لائے جسے ہم پڑھیں۔ اے نبیؐ! ان سے کہو "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"

مشرکین کے ان مطالبات کو اللہ تعالیٰ نے پورا نہیں کیا اس کا سبب یہ نہیں تھا ـــ جیسا کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں ـــ کہ رسول اللہ ﷺ کو قرآن کریم کے علاوہ اور کوئی معجزہ دیا ہی نہیں گیا۔ بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ کفر و عناد کے سبب اور نبی ﷺ کا مذاق اڑانے کے لیے ایسے مطالبات کر رہے ہیں ـــ جیسا کہ ان کے مطالبے کے انداز اور مطالبات کی نوعیت سے واضح ہے۔ اگر اللہ جانتا کہ ان میں صدقِ طلب اور حسنِ نیت ہے اور وہ نبی ﷺ کی نبوت کی صداقت جانچنے کے لیے ایسی باتیں کر رہے ہیں تو وہ ضرور ان کے مطالبات کو پورا کر دکھاتا۔ لیکن قریش کا معاملہ تو ویسا تھا جس کی ترجمانی اللہ تعالیٰ نے ایک دوسری آیت میں یوں فرمائی ہے:

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ، لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ۔ (الحجر: ۱۴-۱۵)

اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔ بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قریش کے مطالبۂ معجزات کو پورا نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزات ہی نہیں عطا فرمائے تھے۔ واقعاتِ سیرت سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سے معجزات سے نوازا تھا جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں ان شاء اللہ تفصیل سے ان کا تذکرہ کریں گے۔ دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

معاشی مقاطعہ

موسیٰ بن عقبہؒ، ابن اسحاقؒ اور دیگر اصحاب سیر سے مختلف سندوں سے مروی ہے کہ ایک موقعے پر کفار قریش نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے پر اتفاق کیا اور اس سلسلے میں بنو ہاشم اور بنو مطلب سے گفتگو کی۔ لیکن وہ لوگ آپ کو ان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہوئے۔ جب قریش اپنے اس منصوبے میں ناکام رہے تو انہوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ آپؐ سے، آپ کا ساتھ دینے والے مسلمانوں سے اور بنو ہاشم اور بنو مطلب میں سے آپ کی حمایت کرنے والوں سے بالکلیہ ترک تعلق کر لیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دستاویز تیار کی جس میں عہد کیا کہ جب تک بنو مطلب رسول اللہ ﷺ کو قتل کے لیے ان کے حوالے نہیں کر دیں گے اس وقت تک وہ ان سے شادی بیاہ کے تعلقات رکھیں گے نہ خرید و فروخت کریں گے، نہ ان تک وسائل رزق پہنچنے دیں گے، نہ ان سے کسی معاملے میں صلح کریں گے اور نہ کسی نرمی کا مظاہرہ کریں گے۔ یہ دستاویز تیار کر کے انہوں نے کعبہ میں لٹکا دی۔

کفار قریش اس دستاویز پر تین سال تک عمل کرتے رہے۔ محرم ۷ بعثت سے ۱۰ بعثت تک۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مقاطعہ دو سال تک قائم رہا۔

موسیٰ بن عقبہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہجرت حبشہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اسی مقاطعہ کے دوران آپؐ نے صحابہ کو حبشہ چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ جب کہ ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہجرت حبشہ اور حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے بعد کا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو مطلب، شعب بنو مطلب (بنو مطلب کی گھاٹی) میں قید ہو کر رہ گئے۔ مکہ مختلف گھاٹیوں میں بنا ہوا تھا۔ شعب بنو مطلب میں بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام افراد اکٹھا ہو گئے، خواہ وہ مسلمان ہوں یا کافر۔ مسلمان تو دینی

جذبے سے جمع ہوئے تھے اور کافروں نے خاندانی حمیت میں ایسا کیا تھا۔ صرف ابولہب (عبدالعزی بن عبدالمطلب) نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اس موقعے پر وہ نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کی مخالفت میں قریش سے جا ملا تھا۔

ان تین سالوں میں نبی ﷺ اور مسلمانوں کو شدید پریشانیوں اور سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ صحیح روایتوں میں ہے کہ انہیں بسا اوقات درختوں کے پتے کھا کھا کر گزارا کرنا پڑا۔ سہیلیؒ نے بیان کیا ہے کہ اس زمانے میں کوئی قافلہ سامانِ تجارت لے کر مکہ آتا اور کوئی مسلمان اپنے گھر والوں کے لیے کھانے کی کوئی چیز خریدنے بازار آتا تو ابولہب ان تاجروں سے کہتا: "اے تاجرو! محمد کے ساتھیوں کے لیے نرخ بڑھا دو تاکہ وہ تم سے کوئی چیز نہ خرید سکیں؟ چنانچہ وہ لوگ چیزوں کی قیمتیں کئی گنا کر دیتے، جس کے نتیجے میں وہ مسلمان کوئی چیز نہ خرید پاتا، اور اپنے بچوں کے پاس اس حال میں واپس لوٹتا کہ وہ بھوک سے بلبلا رہے ہوتے اور اس کے پاس کوئی چیز نہ ہوتی جس سے وہ ان کی دل جوئی کر سکتا۔

جب اس محاصرہ کو تین سال ہو گئے تو بنو قصی کے بعض لوگوں نے اس پر ایک دوسرے کو ملامت کی۔ چنانچہ انہوں نے اس معاہدہ کو ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ ادھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جس دستاویز میں یہ معاہدہ تحریر تھا اس میں دیمک لگ گئی، صرف وہ کلمات دیمک سے محفوظ رہے جو ذکر اللہ پر مشتمل تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب کو اس کی خبر دی تو انہوں نے دریافت کیا: "کیا تمہارے رب نے تمہیں اس کی خبر دی ہے؟" آپؐ نے فرمایا: ہاں۔ ابوطالب اپنے خاندان کے چند لوگوں کے ساتھ قریش کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ دستاویز لا کر دکھائیں۔ انہوں نے یہ تاثر دیا کہ وہ ان کی شرائط مان لیں گے۔ وہ لوگ دستاویز لے کر آئے۔ وہ لپٹی ہوئی شکل میں تھی۔ ابوطالب نے کہا: "میرے بھتیجے نے مجھے بتایا ہے — اور اس کی کوئی بات کبھی جھوٹی نہیں ہوئی — کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری اس دستاویز پر ایک دیمک کو مسلط کر دیا ہے جس نے اس میں درج ظلم و زیادتی اور قطع رحمی کی باتوں کو کھا لیا ہے۔ اگر بات یہی ہے جیسا کہ اس نے بتایا ہے تو تم لوگ ہوش میں آؤ اور اپنے اس غلط فیصلے سے رجوع کر لو۔ اللہ کی قسم ہم اسے تمہارے حوالے نہیں کریں گے یہاں تک کہ ہمارے خاندان کا آخری فرد بھی ہلاک ہو جائے۔

اور اگر اس کی بات غلط ہے تو ہم اسے تمہارے حوالے کر دیں گے، تم جیسا چاہو اس کے ساتھ معاملہ کرو۔ ان لوگوں نے جواب دیا: "آپ کی بات ہمیں منظور ہے۔" انہوں نے دستاویز کھولی تو اسے ویسا ہی پایا جیسا آں حضرت ﷺ نے خبر دی تھی۔ اس پر وہ کہنے لگے: "یہ تمہارے بھتیجے کا جادو ہے" اب ان کی سرکشی اور دشمنی میں اور اضافہ ہو گیا۔

پھر قریش کے پانچ سرداروں نے اس معاہدے کو کالعدم قرار دینے اور محاصرے کو ختم کرنے میں پہل کی۔ ان لوگوں کے نام یہ ہیں: ۱۔ ہشام بن عمرو بن الحارث ۲۔ زہیر بن امیہ ۳۔ مطعم بن عدی ۴۔ ابوالبختری بن ہشام اور ۵۔ زمعہ بن اسود۔

سب سے پہلے اس کا علانیہ اظہار زہیر بن امیہ نے کیا۔ وہ خانہ کعبہ میں موجود لوگوں کے پاس گیا اور کہا: "اے اہلِ مکہ، کیا ہم لوگ اچھے سے اچھا کھائیں اور اچھے سے اچھا پہنیں اور بنو ہاشم اور بنو مطلب دانے دانے کو ترسیں اور کوئی ان سے خرید و فروخت نہ کرے؟ اللہ کی قسم میں اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گا جب تک کہ قطع رحمی اور ظلم پر مبنی یہ دستاویز چاک نہ کر دی جائے۔"

بقیہ چاروں نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ پھر مطعم بن عدی نے اٹھ کر دستاویز چاک کر دی۔ اس کے بعد یہ پانچوں اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر بنو ہاشم اور بنو مطلب اور ان کے ساتھ محصور مسلمانوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ گھاٹی سے نکل کر اپنے اپنے گھروں میں رہنا شروع کریں۔

دروس و نصائح

۱۔ حضورؐ کے اہل خاندان نے آپ کی حمایت کیوں کی؟

گزشتہ تفصیل سے واضح ہے کہ نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کو تین سال تک کتنی سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔ یہ تکلیفیں جھیلنے میں بنو ہاشم اور بنو مطلب نے ان کا ساتھ دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ سے دست کش ہو جانے پر تیار نہیں ہوئے تھے۔

یہاں یہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ ان مشرکین کے اس رویے کا کیا سبب عقیدہ اور مذہب سے قطع نظر آں حضرت ﷺ کی حمایت و مدافعت کی وجہ قرابت اور

داری کی حمیت تھی اور یہ احساس تھا کہ اگر انہوں نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے علاوہ قریش کے دوسرے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے مشرکین کو چھوٹ دے دی کہ وہ محمد [ﷺ] کو قتل کر دیں تو اس سے خود ان کی رسوائی ہو گی۔

اس طرح انہوں نے اپنی دو خواہشات کو یکجا کر دیا تھا:

اول: شرک پر قائم رہنا اور اس حق سے سرتابی کرنا جسے لے کر محمد ﷺ تشریف لائے تھے۔

دوم: حمیت کا اظہار جس کی بنا پر آدمی اپنے رشتہ دار کی، دوسرے شخص کے ظلم اور زیادتی کے مقابلے میں مدافعت کرتا ہے، خواہ وہ حق پر ہو یا برسرِ باطل۔

رہے مسلمان اور ان میں بھی سرفہرست اللہ کے رسول ﷺ تو ان لوگوں نے ان شدائد پر صبر و عزیمت کا مظاہرہ اس لیے کیا تھا کہ انہوں نے اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا، آخرت کو دنیا پر ترجیح دی تھی اور اللہ کی خوشنودی کے مقابلے میں دنیا ان کی نظروں میں ہیچ ہو گئی تھی۔ یہاں ہم اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالنا چاہیں گے۔

فکری محاذ پر یلغار کرنے والے کچھ اہل باطل کہتے ہیں:

"محمد [ﷺ] کی دعوت کے پس پردہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کی عصبیت کار فرما تھی جو اس کی مدافعت اور حمایت پر ہر وقت تیار رہتی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مشرکین قریش نے جب مسلمانوں کا مقاطعہ کیا تو اس موقعے پر ان خاندانوں نے سلبی موقف اپنایا تھا۔"

یہ کھلا ہوا مغالطہ ہے۔ ظاہری طور پر بھی اس پر عقل و منطق کا پردہ پڑا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ چیز بالکل فطری تھی کہ بنو مطلب اور بنو ہاشم اپنے خاندان کے ایک فرد کی مدافعت میں حمیت جاہلی میں مبتلا ہوں، جب وہ دیکھیں کہ کوئی اجنبی ہاتھ اس کی طرف بری نیت سے بڑھ رہا ہے اور اس کو جان کی دھمکی دے رہا ہے۔

جاہلی حمیت جب رشتہ داروں کو اس قسم کے تعصب میں مبتلا کرتی ہے تو ان کے سامنے کوئی اصول نہیں ہوتا اور وہ اس معاملے میں حق یا باطل سے متاثر نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے پیش نظر صرف اور صرف عصبیت ہوتی ہے۔

اسی لیے آں حضرت ﷺ کے رشتہ داروں میں دو ایسی صفتیں جمع ہو گئی تھیں جو بظاہر متضاد تھیں۔ ایک: آپ کی دعوت سے سرتابی اور اس کا انکار اور دوسری: تمام مشرکین قریش

کے مقابلے میں آپ کی نصرت وحمایت۔

اس کے باوجود، نبی ﷺ سے تعلق اور آپ کی حمایت کا مظاہرہ کرکے انہوں نے آپ کو کیا فائدہ پہنچایا؟ انہیں بھی ایسی ہی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا جیسی اذیتوں سے آں حضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب دوچار ہوئے۔ قریش نے مسلمانوں کا مقاطعہ کرکے جس طرح چاہا بہیمیت اور درندگی کا مظاہرہ کیا اور بنوہاشم اور بنو مطلب ان کی شدت میں کچھ تخفیف نہ کرسکے۔

یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں کی جانب سے آپ کی حمایت اس پیغام کی حمایت نہ تھی جس کے ساتھ آپ کی بعثت ہوئی تھی، بلکہ یہ غیروں کے مقابلے میں آپ کی ذات کی حمایت تھی۔ اگر مسلمانوں نے اس حمایت سے فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعے کافروں پر غلبہ حاصل کرنے اور ان کی سازشوں اور جارحیت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو ان کی یہ کوشش بڑی مبارک اور یہ تدبیر بڑی کامیاب تھی۔

۲۔ کیا رسول اللہ ﷺ کی دعوت "دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت" تھی؟

جہاں تک رسول اللہ ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب کا تعلق ہے تو آخر انہیں کون سی چیز اس کٹھن کے ماحول میں راہِ استقامت پر قائم رکھے ہوئے تھی؟ اور ان شدائد کو برداشت کرکے وہ کس مقصد کے حصول کے آرزومند تھے؟

اس سوال کا وہ لوگ کیا جواب دیں گے جو حضرت محمد ﷺ کی رسالت اور آپ کے اصحاب کے ایمان کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ یہ دائیں بازو کے خلاف بائیں بازو کی بغاوت ہے، بالفاظ دیگر عیش وعشرت کے دل دادہ مال دار لوگوں کے خلاف غریب اور ظلم وزیادتی کے شکار لوگوں کی بغاوت تھی۔

رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اذیتیں دیے جانے کے جن واقعات کا ہم نے گذشتہ صفحات میں تذکرہ کیا ہے ان کا تصور کیجیے، پھر اس کی روشنی میں جواب دیجیے: کیا اسلامی دعوت کو ایسی معاشی بغاوت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جسے فقر وفاقہ اور بھوک نے بھڑکایا ہو اور مکہ کے تاجروں اور وہاں کی اقتصادیات پر قابض لوگوں کے خلاف نفرت نے ہوا دی ہو؟!!

مشرکین نے آں حضرت ﷺ کے سامنے بادشاہی، مال ودولت اور سرداری کی پیش کش کی۔ اس شرط پر کہ آپ اسلام کی دعوت سے دست بردار ہوجائیں۔ پھر آپ اس پر آمادہ کیوں نہیں ہوئے؟ اور آپؐ کے اصحاب نے — اگر ان کا مقصد فقر وفاقہ سے نجات اور آسودگی کا حصول تھا — آپؐ پر قریش کی پیش کش کو قبول کرلینے کے لیے دباؤ کیوں نہیں ڈالا؟ کیا بائیں بازو کی بغاوت کے علم بردار اقتدار اور مال ودولت سے زیادہ کچھ چاہتے ہیں۔

آں حضرت ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے اصحاب کا آپ کے خاندان والوں کے ساتھ مکمل معاشی اور سماجی مقاطعہ کیا گیا۔ چنانچہ کوئی سامانِ تجارت ان کے ہاتھوں تک نہ پہنچ پاتا تھا اور کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے گھروں میں داخل نہ ہو پاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہوگئے۔ لیکن انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور اپنے رسول کے گرد حلقہ بنائے رہے۔ کیا ایسا ہی کرتے ہیں وہ لوگ جن کے دلوں میں روزی روٹی کے لیے بغاوت کا جذبہ موجزن رہتا ہے؟!

جب نبی ﷺ نے اپنے اصحاب کو مدینہ منورہ ہجرت کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے مال، زمین، جائیداد، سب کچھ وطن میں چھوڑا اور خالی ہاتھ مدینہ کا رخ کیا۔ وہ ایسی تمام چیزوں سے دست کش ہوگئے جن میں مال کی محبت میں گرفتار لوگ دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے کسی چیز کو اللہ پر ایمان کے برابر درجہ نہیں دیا اور پیچھے رہ جانے والی دنیا اور منہ موڑ لینے والے اقتدار کو معمولی اہمیت بھی نہ دی۔ کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بائیں بازو کی بغاوت تھی جو روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے برپا ہوئی تھی؟!

یہ لوگ اپنے خود ساختہ تصورات پر دو چیزوں کو دلیل بناتے ہیں:

اول: یہ کہ مکہ میں اصحاب محمد ﷺ کی اولین جماعت زیادہ تر فقراء، غلاموں اور مظلوموں پر مشتمل تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ آں حضرت ﷺ کی اتباع کرکے اپنی پریشانیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے اور اس نئے دین کے زیر سایہ اپنے لیے بہتر معاشی مستقبل کی امید رکھتے تھے۔

دوم: یہ کہ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ دنیا اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ان لوگوں کے قدموں میں آگئی اور مال ودولت کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقصد کا حصول

رسول اللہ ﷺ کے منصوبے میں شامل تھا۔

ان دلیلوں پر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ سراسر وہم و خیال پر مبنی ہیں۔ اور ان کے پیچھے ان کا مخصوص انداز فکر کارفرما ہے۔

یہ بات کہ اصحاب محمد ﷺ کی اولین جماعت زیادہ تر فقراء اور غلاموں پر مشتمل تھی، صحیح ہے۔ لیکن اس حقیقت اور اس وہم میں کوئی نسبت ہی نہیں۔ جو شریعت لوگوں کے درمیان عدل و مساوات قائم کرنا اور ہر ظالم، گھمنڈی اور سرکش کو لگام دینا چاہے گی، یہ بات طے شدہ ہے کہ اس سے وہ تمام لوگ نہ صرف اعراض کریں گے بلکہ اس کے خلاف برسرپیکار ہوں گے جو ظلم و زیادتی اور سرکشی کی زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ اس شریعت سے انہیں جتنے فائدے حاصل ہوں گے اس سے زیادہ نقصانات ہوں گے۔ اسی طرح یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ اس شریعت کا ہر کمزور اور مظلوم بلکہ ہر وہ انسان استقبال کرے گا جس کا سرکشی اور استحصال کی تجارت میں کوئی حصہ نہ ہو۔ اس لیے کہ اس سے انہیں نقصانات کے مقابلے میں فائدے زیادہ حاصل ہوں گے۔ یا کم از کم یہ کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات ایسے نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اس شریعت کی ذمہ داریوں اور تقاضوں پر عمل کرنے میں گرانی محسوس کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے گرد اکٹھا ہونے والے بیشتر لوگوں کو اس بات کا یقین تھا کہ آپؐ حق پر ہیں اور آپؐ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے نبی ہیں، لیکن سرداری کے منصب پر فائز اور عظمت و اقتدار کے دل دادہ لوگوں کا مزاج اور ان کے حالات ایسے تھے جو اس حق کے سامنے خود سپردگی اور اس سے ہم آہنگی کی راہ میں سنگ گراں بن گئے۔ رہے دوسرے لوگ تو وہ جس چیز پر ایمان لے آئے تھے اور اس پر انہوں نے یقین کر لیا تھا اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے انہیں روکنے والی کوئی چیز نہ تھی۔

یہ حقیقت جو ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والی ہے اس کا اس دعویٰ سے کیا جوڑ جو یہ لوگ کرتے ہیں؟

رہی یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ نے اسلامی دعوت کو عام کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا اس

کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان دولت و ثروت کے سرچشموں پر قبضہ کر لیں اور بادشاہوں کو اقتدار سے بے دخل کر کے ان کی حکومتوں پر خود تسلط جما لیں، اس لیے کہ بعد کے دنوں میں عملاً ایسا ہی ہوا، تو یہ حقیقت سے اتنی ہی دور ہے جتنا مشرق اور مغرب۔

اگر مسلمانوں نے صدق دل سے اسلام قبول کرنے کے بعد مختصر عرصہ میں روم و ایران کی مملکتوں کو فتح کر لیا، تو کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ روم و ایران پر اقتدار حاصل کرنے کے لالچ میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے؟!

حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کے قبول اسلام کے پس پردہ دنیا کی رنگینیوں اور لذتوں کا حصول ہوتا تو ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو پاتا اور اس معجزۂ فتح کا ادنیٰ حصہ بھی ظہور میں نہ آتا۔

اگر لشکر قادسیہ کو تیار کرتے اور سالار لشکر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو رخصت کرتے وقت حضرت عمرؓ کو کسریٰ کے خزانوں کا لالچ ہوتا، اور ان کے منہ میں یہ سوچ کر پانی آگیا ہوتا کہ وہ بھی کسریٰ کی طرح اس کے تخت سلطنت پر بیٹھیں گے اور اس کی طرح دنیاوی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں گے، تو حضرت سعدؓ کبھی فتح و کامرانی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے تھے اور ان کی واپسی ہزیمت اور ذلت کے بوجھ کے ساتھ ہوتی۔ لیکن ان لوگوں نے دین کی نصرت و حمایت کے لیے علم جہاد بلند کیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب و بامراد کیا، اقتدار کی باگیں ان کے ہاتھ میں دے دیں اور ان کے سامنے مال و دولت کے اتنے ڈھیر لگا دیے کہ ان کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

اگر معرکۂ قادسیہ کے موقع پر مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہوتی کہ ان کے پاس مال کے ڈھیر لگ جائیں گے اور وہ دنیا کی نعمتوں اور زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور ہوں گے، تو حضرت ربعی بن عامرؓ رستم کے دربار میں عیش و عشرت کے مظاہر پر، جن میں وہ ڈوبا ہوا تھا، حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے اور اپنے نیزے کی نوک سے قیمتی فرش اور قالینوں کو پھاڑتے ہوئے، نہ گئے ہوتے، اور رستم سے یہ نہ کہا ہوتا کہ "اگر تم لوگ اسلام قبول کر لو گے تو ہم تم سے کوئی تعرض نہ کریں گے اور تمہاری سرزمین اور مال تمہارے حوالے کر دیں گے"

کیا جو شخص حکومت، زمین اور مال و دولت چھیننے کے لیے آتا ہے، وہ یہی بات کہتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا تھا اس لیے کہ وہ ان کے بارے میں فکر مند نہیں رہتے تھے، بلکہ ان کی ساری تگ ودو اللہ کی رضاجوئی کے لیے ہوتی تھی۔

اگر ان کے جہاد کا مقصد دنیا کی یہ نعمتیں حاصل کرنا ہوتا تو وہ ان میں سے کچھ بھی حاصل نہ کرپاتے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ان کے معاملے میں اللہ کا یہ قانون پورا ہو کر رہا:

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ. (القصص۔۵)

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنادیں اور انہی کو وارث بنائیں۔

اس قانون کا سمجھنا ہر صاحبِ عقل کے لیے آسان ہے۔ لیکن اس کی صرف ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ وہ تمام مفادات اور اغراض کی غلامی سے آزاد ہو۔

اسلام میں پہلی ہجرت

اللہ کے رسول ﷺ نے جب دیکھا کہ آپ کے اصحاب آزمائشوں اور مصیبتوں سے دوچار ہیں اور آپ انہیں ان سے نجات دلانے اور ان کی مدافعت کرنے پر قادر نہیں ہیں تو آپ نے ان سے فرمایا: "اچھا ہو کہ تم لوگ یہاں سے نکل کر حبشہ چلے جاؤ۔ وہاں ایک ایسا بادشاہ ہے جس کے یہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا اور وہ بھلائی کی سرزمین ہے۔ جب تک اللہ تمہاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔"

اس ارشاد کے مطابق مسلمان، فتنے کے اندیشے سے اور اپنا دین وایمان بچانے کی غرض سے حبشہ چلے گئے۔ یہ اسلام میں پہلی ہجرت تھی۔ ان ہجرت کرنے والوں میں سرفہرست حضرت عثمان بن عفانؓ، ان کی بیوی حضرت رقیہ بنت رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوحذیفہؓ، ان کی بیوی، حضرت زبیر بن عوامؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ تھے...... یہاں تک کہ آں حضرت ﷺ کے اصحاب میں اسی سے زائد افراد حبشہ پہنچ گئے۔[1]

جب قریش نے یہ دیکھا تو نجاشی شاہِ حبش کے پاس عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص (یہ اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے) کو اس امید کے ساتھ بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دے گا اور انہیں دوبارہ ان کے دشمنوں کے حوالے کردے گا۔

یہ لوگ اپنے ساتھ نجاشی اور اس کے حاشیہ نشینوں اور درباریوں کے لیے بہت سے تحفے تحائف لے کر گئے تھے۔ انہوں نے نجاشی سے گفتگو کرنے سے پہلے اس کے درباریوں سے گفتگو کرلی تھی اور ان کی خدمت میں تحفے پیش کرکے انہیں اپنے حق میں رام کرلیا تھا۔

[1] یہ روایت زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں ذکر کیا ہے ۱/۳۳۰، نیز دیکھئے فتح الباری ۷/۱۳۰

جب انہوں نے نجاشی سے اس سلسلے میں گفتگو کی تو اس نے جواب دیا "جب تک میں مسلمانوں سے ان کے نئے دین کے بارے میں گفتگو نہ کرلوں، ان میں سے کسی کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔" مسلمانوں کو اس کے دربار میں لایا گیا۔ اس وقت وہاں قریش کے دونوں نمائندے بھی موجود تھے۔ نجاشی نے ان سے دریافت کیا: "یہ کیسا دین ہے جسے تم لوگوں نے اختیار کیا ہے؟ تم نے اپنی قوم کا دین بھی چھوڑ دیا ہے اور میرے دین میں بھی داخل نہیں ہوئے ہو، نہ دنیا کے دوسرے ادیان ہی میں سے کسی کو اختیار کیا ہے۔"

اس پر حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے نجاشی کو مخاطب کر کے ایک برجستہ تقریر کی، انہوں نے فرمایا:

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں پڑی ہوئی ایک قوم تھے۔ بت پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے فحش کام کرتے تھے۔ ہمیں رشتہ داری کا پاس و لحاظ نہ تھا۔ ہم سایوں کے ساتھ برا معاملہ روا رکھتے تھے۔ ہم میں سے طاقت ور کمزور کو کھا جاتا تھا۔ ہم اسی حال میں تھے کہ اللہ نے ہماری طرف خود ہم میں سے ہی ایک رسول بھیجا جس کے نسب، صداقت، امانت اور پاک دامنی کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اس کی توحید کے قائل ہوں اور اسی کی عبادت کریں اور مٹی پتھر کے ان بتوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہم اور ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ اس نے ہمیں راست گوئی، امانت داری اور صلہ رحمی کا حکم دیا اور ہم کو فواحش سے روکا...... ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان لے آئے اور جو کچھ وہ اللہ کی طرف سے لایا تھا اس میں اس کی پیروی کی۔ اس پر ہماری قوم ہم پر ٹوٹ پڑی۔ اس نے ہم کو عذاب دیے اور دین کے معاملے میں ہم پر ظلم توڑے تاکہ ہمیں بتوں کی عبادت کی طرف پھیر دے...... آخر کار جب انہوں نے ہم پر سختی کی اور ظلم ڈھایا اور ہماری زندگی تنگ کر دی تو ہم آپ کے ملک کی طرف نکل آئے اور دوسروں کے بجائے آپ کے یہاں آنا پسند کیا اور آپ کی پناہ لینا چاہی، اس امید پر کہ آپ کے یہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔"

پھر نجاشی نے ان سے کہا کہ ذرا مجھے وہ کلام سناؤ جو تمہارے رسول [ﷺ] پر اللہ کی طرف سے اترا ہے۔ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی۔ اسے سن کر نجاشی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، یہاں تک کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ اس نے کہا "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰؑ لائے تھے، دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں" پھر اس نے قریش کے سفیروں کو مخاطب کر کے کہا: "واپس جاؤ، بخدا میں ان لوگوں کو ہرگز تمہارے سپرد نہیں کروں گا۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

(دوسرے روز) یہ لوگ پھر نجاشی کے دربار میں واپس آئے اور اس سے کہا: "اے بادشاہ یہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے متعلق ایک بڑی بات کہتے ہیں۔ ذرا ان کو بلا کر دریافت تو کیجئے کہ ان کا ان کے بارے میں کیا عقیدہ ہے؟ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور ان سے دریافت کیا۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے جواب دیا: "ہم ان کے بارے میں وہی بات کہتے ہیں جو ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں سکھائی ہے: "وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی طرف سے ایک روح اور ایک کلمہ ہیں جسے اللہ نے کنواری مریم پر القا کیا تھا۔"

یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: "اللہ کی قسم، جو کچھ تم نے کہا، عیسیٰ بن مریم اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے۔"

پھر اس نے قریش کے ان سفیروں کو ان کے تحفے واپس کر دیے۔ اور جن مسلمانوں نے اس کی پناہ حاصل کی ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ اس طرح قریش کے یہ سفراء ناکام و نامراد واپس لوٹے۔

کچھ عرصہ کے بعد مہاجرین حبشہ کو اہل مکہ کے اسلام قبول کر لینے کی خبر پہنچی تو ان میں سے کچھ لوگ واپس لوٹ آئے۔ جب وہ مکہ کے قریب پہنچے تو انہیں پتا چلا کہ یہ خبر غلط تھی۔ اس وقت وہ لوگ کسی کی پناہ لے کر یا خفیہ طریقے سے مکہ میں داخل ہوئے۔ ان لوگوں کی تعداد تینتیس تھی۔ ان میں حضرت عثمان بن مظعونؓ ولید بن مغیرہ کی پناہ میں اور حضرت ابو سلمہؓ ابوطالب کی پناہ میں داخل ہوئے۔

دروس و نصائح

حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت سے تین باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ عقیدے کی حفاظت کے لیے وطن اور زمین جائیداد کو قربان کیا جاسکتا ہے نہ کہ اس کے برعکس:

دین کو مضبوطی سے تھامنا اور اس کی بنیادوں کو قائم کرنا ہر قوت کا سرچشمہ ہے۔ یہ مال، زمین جائیداد، آزادی اور عزت و شرافت کے حقوق کی حفاظت کا ضامن ہے۔ اس لیے اسلام کی دعوت دینے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا فرض ہے کہ اپنے تمام وسائل دین اور اس کے اصول و مبادی کی حمایت و مدافعت میں لگادیں اور وطن، زمین جائیداد، مال اور زندگی کو عقیدے کی حفاظت اور اس کی ترویج کا ذریعہ بنادیں۔ یہاں تک کہ اگر عقیدے کی راہ میں ان سب کو قربان کردینے کی ضرورت پڑے تو اس میں بھی دریغ نہ کریں۔

اس لیے کہ اگر دین کا وجود نہ رہا یا وہ مغلوب ہوگیا تو وطن، مال اور زمین جائیداد بھی کسی کام نہ آئیں گے، بلکہ بہت جلد وہ سب بھی ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ لیکن اگر دین کی شان و شوکت قائم رہی، معاشرے میں اس کی بنیادیں مستحکم اور دلوں میں اس کا عقیدہ راسخ رہا تو اگر اس کی راہ میں مال، زمین جائیداد اور وطن وغیرہ قربان بھی ہوگئے ہیں تو وہ واپس مل جائیں گے اور ان کی واپسی پہلے سے زیادہ عزت و شرافت، طاقت و قوت اور بصیرت کے ساتھ ہوگی۔

کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جس کا ظہور تاریخ کے ہر دور میں ہوتا رہتا ہے کہ معنوی طاقتیں مادی طاقتوں اور مفادات کی محافظ اور نگراں ہوتی ہیں۔ کوئی قوم جب تک اپنے اخلاق، اپنے پاکیزہ عقیدہ اور اپنے صحیح معاشرتی اصولوں سے مالا مال رہتی ہے اس وقت تک اس کا مادی اقتدار بھی خوب مستحکم، راسخ اور مضبوط رہتا ہے۔ لیکن جب اس کے اخلاق پامال ہوجاتے ہیں، اس کے عقیدے میں اضطراب آجاتا ہے اور اس کا نظام اور اصول و مبادی پراگندہ ہوجاتے ہیں تو اس کا مادی اقتدار بھی بہت جلد اضمحلال کا شکار ہوجاتا ہے اور اس کے مادی مفادات بھی روبہ زوال ہوجاتے ہیں۔

ممکن ہے کوئی قوم ایسی نظر آئے جو اپنے عقیدے میں راہِ صواب سے ہٹی ہوئی ہو اور اس کا اخلاقی اور معاشرتی معیار بھی پست ہو، لیکن اس کے باوجود اسے طاقت و قوت اور مادی اقتدار حاصل ہو۔ لیکن درحقیقت ایسی قوم بہت تیزی سے گہری کھائی کی طرف رواں دواں رہتی ہے۔ اس کی اس سرعتِ رفتار کے محسوس نہ ہونے کا سبب تاریخ کی طویل عمر (جو صدیوں

پر محیط ہے) کے مقابلے میں انسان کی کم عمری ہے۔ ایسی حرکت کو غافل اور بے خبر انسان کی آنکھ نہیں دیکھ پاتی، اسے تاریخ کی کھلی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔

ممکن ہے کوئی قوم ایسی نظر آئے جو صحیح عقیدے کی حفاظت اور پاکیزہ معاشرتی نظام کے قیام کی راہ میں مال و دولت، وطن، زمین جائیداد اور دیگر مادی لوازم سے محروم ہوگئی ہو، لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرتا ہے کہ اس عقیدے اور اس نظام کے علم بردار اپنے چھینے گئے وطن پر غلبہ پاجاتے ہیں، اپنے غصب شدہ مال کو حاصل کرلیتے ہیں اور ان کی طاقت و قوت میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ کائنات، انسان اور زندگی کے بارے میں صحیح تصور آپ کو صرف اسلام کے عقیدے میں ملے گا جو اس روئے زمین پر اللہ کا دین ہے۔ اور پاکیزہ، عدل پرور معاشرتی نظام صرف اسلام کا نظام ہے۔ اسی لیے اسلام کی دعوت کی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کی راہ میں مال، وطن اور زندگی کی قربانیاں پیش کی جائیں۔ اسی صورت میں مسلمان اپنے لیے مال، وطن اور زندگی کی ضمانت حاصل کرسکتے ہیں۔

اسی لیے اسلام میں ہجرت کا اصول مشروع ہوا۔ رسول ﷺ نے جب دیکھا کہ آپ کے اصحاب قریش کی اذیتوں کا شکار ہیں اور دین کے معاملے میں ان کے فتنے میں پڑجانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے تو آپ نے انہیں ہجرت کرنے اور اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جانے کا مشورہ دیا۔

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ خود یہ ہجرت دین کے راستے میں عذاب اور تکلیفیں جھیلنے کی ایک غیر معمولی صورت ہے۔ ہجرت درحقیقت اذیت سے راہِ فرار اور راحت کی جستجو کا نام نہیں ہے بلکہ یہ کشادگی اور نصرتِ الٰہی آنے تک مقامِ آزمائش کی تبدیلی کا نام ہے۔

اسی طرح آپ کو یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ مکہ اس وقت دارالاسلام نہیں تھا کہ کہا جاتا کہ ان صحابہ نے اپنی جانیں بچانے کے لیے دارالاسلام کو چھوڑ کر ایک کافر ملک میں جانا کیوں گوارا کیا؟ اس وقت مکہ، حبشہ اور دیگر ممالک کی حیثیت برابر تھی۔ اپنے دین پر عمل کرنے اور دوسروں کو اس کی طرف دعوت دینے میں جہاں بھی صحابی کو زیادہ آسانی تھی وہاں وہ قیام کرنے کا حق رکھتا تھا۔

رہا دارالاسلام سے کسی دوسری جگہ ہجرت کرنے کا معاملہ تو یہ بعض حالات میں واجب،

بعض حالات میں جائز اور بعض حالات میں حرام ہے۔ واجب اس وقت ہے جب وہاں رہ کر مسلمان اسلامی شعائر مثلاً نماز، روزہ، اذان اور حج وغیرہ ادا نہ کر سکے۔ اور جب وہاں رہنے کی صورت میں وہ کسی پریشانی اور تنگی میں مبتلا ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہاں سے نکل کر کسی دوسرے اسلامی ملک میں چلا جائے۔ لیکن اس صورت میں اس کا دارالاسلام سے ہجرت کرنا حرام ہے جب اس کے وہاں سے نکل آنے کی صورت میں اسلامی فرائض میں سے کوئی فریضہ لاپروائی کا شکار ہو جائے، کیونکہ اسے انجام دینے والا وہاں کوئی نہ ہو۔[12]

۲۔ حضرت محمد ﷺ اور حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے درمیان تعلق کی حقیقت

اس سے اس تعلق کی حقیقت واضح ہوتی ہے جو سیدنا محمد ﷺ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی تعلیمات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نجاشی حضرت عیسیٰ کے دین پر تھا۔ وہ نصرانیت کا مخلص اور سچا پیرو تھا۔ اس کے اخلاص کا تقاضا تھا کہ وہ اس کو چھوڑ کر اس کے مخالف چیز کی طرف اپنا میلان ظاہر نہ کرے اور ان لوگوں کی حمایت نہ کرے جن کا عقیدہ انجیل اور حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے ٹکراتا ہو۔ یعنی اگر ان لوگوں کے جو حضرت عیسیٰ سے اپنے تعلق اور انجیل سے اپنی وابستگی کا دعوی کرتے ہیں، یہ خیالات صحیح ہوتے کہ عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور وہ تین میں کے تیسرے ہیں، تو نجاشی، جو نصرانیت کے سچے پیروؤں میں سے تھا، ضرور ان کا قائل ہوتا، اور وہ ضرور مسلمانوں کی باتیں رد کر دیتا اور قریش کے سفراء جس مقصد سے آئے تھے اسے پورا کر دیتا۔

لیکن ہم نے دیکھا کہ نجاشی نے جب قرآن کی آیات سنیں اور جانا کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے بارے میں وہ کیا کہتا ہے تو اس نے برجستہ کہا: "یقیناً یہ کلام اور جو کچھ عیسیٰ لائے تھے دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہیں" یہ بات اس نے ان پادریوں اور انجیل کے علماء کے سامنے کہی جو اس کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

اس سے یہ بدیہی حقیقت اور بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی عقیدہ لے کر آئے تھے۔ ان کے درمیان آپس میں سرمو بھی اختلاف نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اہل کتاب کا آپسی اختلاف جہالت اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں تھا بلکہ علم کی روشنی

[12] دیکھیے تفسیر قرطبی ۵/۳۵۰، اور احکام القرآن ابن العربی ۲/۷۸۸

آجانے کے بعد ہوا تھا اور ان کی سرکشی پر مبنی تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَآتَيْنَاهُمْ بَيِّنَاتٍ مِنَ الْأَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ.

(الجاثیہ۔۱۷)

اور ہم نے دین کے معاملے میں انہیں واضح ہدایات دے دیں۔ پھر جو اختلاف ان کے درمیان رونما ہوا (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آجانے کے بعد ہوا۔ اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ مشروط طور پر غیر مسلموں کی پناہ حاصل کی جاسکتی ہے:

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ وہ وقتِ ضرورت غیر مسلموں کی پناہ حاصل کر سکتے ہیں، خواہ پناہ دینے والا اہل کتاب میں سے ہو مثلاً نجاشی کہ وہ اس وقت نصرانی تھا، بعد میں مشرف باسلام ہوا[13]، یا مشرک ہو مثلاً وہ لوگ جن کی پناہ لے کر حبشہ سے واپس ہونے والے مسلمان مکہ میں داخل ہوئے تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے چچا ابو طالب، اور مطعم بن عدی جس کی پناہ لے کر رسول اللہ ﷺ طائف سے واپسی پر مکہ میں داخل ہوئے تھے۔

بدیہی طور پر یہ اس بات سے مشروط ہے کہ اس قسم کی پناہ سے اسلامی دعوت کو کوئی نقصان پہنچنے یا دین کے کسی حکم کے بدل جانے کا اندیشہ نہ ہو یا اس کی وجہ سے کسی حرام کام پر خاموشی نہ لازم آتی ہو۔ اگر ایسا ہو تو مسلمان کے لیے ایسی پناہ حاصل کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس کی دلیل آں حضرت ﷺ کا یہ موقف ہے کہ جب آپ کے چچا ابو طالب نے آپ سے کہا کہ ان کی رعایت کریں اور ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں جسے وہ سہار نہ سکیں، اس لیے مشرکین کے معبودوں کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہیں جو ان لوگوں کو ناگوار ہو۔ جب ابو طالب نے یہ بات کہی تو اس وقت آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اپنے چچا کی پناہ سے نکل جائیں گے، لیکن اس بات پر رضامند نہیں ہوئے تھے کہ کسی ایسی چیز پر خاموشی اختیار کر لیں جس کو بیان کرنا اور اس کی وضاحت کرنا ضروری ہو۔

[13] صحیح مسلم میں ہے کہ نجاشی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو آں حضرت ﷺ نے صحابہ کو اس کی خبر دی پھر ان کے ساتھ آبادی سے باہر نکل کر اس کی نماز جنازہ ادا کی۔

خدمتِ نبوی میں پہلا وفد

اسی عرصے میں جب کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحاب مشرکین کی جانب سے شدید تکلیفیں اور اذیتیں اٹھا رہے تھے، آپؐ کی خدمت میں، مکہ کے باہر سے ایک وفد، اسلام کو سمجھنے کے لیے حاضر ہوا۔ یہ لوگ حبشہ کے نصاریٰ تھے جو حضرت جعفر بن ابی طالب کی مکہ واپسی☆ پر ان کے ساتھ آئے تھے۔ ان کی تعداد تیس سے کچھ زائد تھی۔ ان لوگوں نے ایک مجلس میں آں حضرت ﷺ سے ملاقات کی اور آپ کے اوصاف و احوال سے واقفیت حاصل کی۔ آں حضرت ﷺ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی کچھ آیات کی تلاوت فرمائی تو سب کے سب ایمان لے آئے۔ ابو جہل کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے ان لوگوں کے پاس جا کر سخت ملامت کی۔ اس نے ان سے کہا:

"تم سے زیادہ احمق گروہ تو کبھی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ تمہاری قوم نے تو تم کو اس لیے بھیجا تھا کہ تم اس شخص کے حالات کی تحقیق کر کے آؤ اور انہیں ٹھیک ٹھیک خبر دو، مگر تم ابھی اس کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ اپنا دین چھوڑ کر اس پر ایمان لے آئے اور اس کی باتوں کی تصدیق کر دی۔"

اس پر انہوں نے جواب دیا:

"سلام ہے بھائیو تم کو۔ ہم تمہارے ساتھ جہالت بازی نہیں کر سکتے۔ ہمیں ہمارے طریقے پر چلنے دو اور تم اپنے طریقے پر چلتے رہو۔ ہم جان بوجھ کر اپنے آپ کو بھلائی سے محروم نہیں رکھ سکتے۔"

☆ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ غزوۂ خیبر کے موقع پر حبشہ سے مدینہ واپس آئے تھے۔ نصاریٰ کا یہ وفد کسی اور کے ساتھ مکہ آیا ہوگا۔ (مترجم)

ان لوگوں کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنَاهُمُ الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ o وَاِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ قَالُوْآ اٰمَنَّا بِهٖ، اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا اِنَّا کُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَo اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ یُنْفِقُوْنَo وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ سَلَامٌ عَلَیْکُمْ لَا نَبْتَغِی الْجَاهِلِیْنَ۔[14] (القصص: ۵۲-۵۵)

جن لوگوں کو اس سے پہلے ہم نے کتاب دی تھی وہ اس (قرآن) پر ایمان لاتے ہیں۔ اور جب ان کو یہ سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ "ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے، ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں" یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کا اجر دوبار دیا جائے گا اس ثابت قدمی کے بدلے جو انہوں نے دکھائی۔ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ "ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔"

دروس و نصائح

اس واقعہ کی روشنی میں دو باتیں ہماری توجہ کی مستحق ہیں:

۱۔ راہ دعوت کے مصائب و آلام ناکامی سے عبارت نہیں:

ایسے حالات میں جب کہ مسلمان عذاب، ایذاء، مقاطعہ اور سختیوں سے دوچار تھے، اس وفد کا، رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور اسلام کا تعارف حاصل کرنے کے لیے مکہ آنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اسلامی دعوت کے علم بردار اس راہ میں جو آلام و مصائب اٹھاتے ہیں انہیں کسی بھی حال میں ناکامی و نامرادی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور اس سے کمزوری، پسپائی یا مایوسی

[14] اس روایت کو ابن اسحاق اور مقاتل نے اور طبرانی نے سعید بن جبیرؓ سے نقل کیا ہے، نیز دیکھیے ابن کثیر، قرطبی اور نیساپوری کی تفسیریں۔

لازم نہیں آتی۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا، کامیابی حاصل کرنے اور نصرت الٰہی سے بہرہ ور ہونے کے لیے ایذاء و تعذیب کی راہ سے گزرنا لازمی ہے۔ یہ وفد تیس سے زائد نصرانی مردوں پر مشتمل تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ ان کی تعداد چالیس سے زائد تھی۔ یہ لوگ سمندر کا سینہ چیرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ نئی دعوت سے اپنی وفاداری کا اظہار کریں اور زبانِ حال سے یہ اعلان کریں کہ اسلامی دعوت کے دشمن اس کی راہ میں خواہ کتنی ہی رکاوٹیں کھڑی کریں اور اس کے علم برداروں کو کتنی ہی تکلیفیں دیں، ستائیں، مقاطعہ کریں اور ان کے خلاف سازشیں کریں لیکن ہرگز اسے برگ و بار لانے اور مشرق و مغرب میں پھیلنے سے نہیں روک سکتے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو جہل پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی تھی۔ اس کا اظہار ان کینہ توز الفاظ سے ہوتا ہے جو اس کی زبان پر آگئے تھے اور جن کے ذریعے اس نے اس وفد کے ارکان کو مخاطب کیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ اس کے اور اس جیسے دیگر افراد کے بس میں زیادہ سے زیادہ یہی تو تھا کہ وہ مسلمانوں کو مزید ظلم و ستم کا نشانہ بنانے لگیں۔ رہا یہ کہ دعوت کی ترقی رک جائے اور وہ برگ و بار لانا بند کر دے تو ایسا کرپانا ان کے لیے قطعی ناممکن تھا۔

۲۔ ارکان وفد کے ایمان کی نوعیت:

اس وفد کے ارکان کے ایمان کی کیا نوعیت تھی؟ وہ ان لوگوں کا ایمان تھا جو کفر کی تاریکیوں سے نکل کر روشنی کی طرف آئے ہوں؟

واقعہ یہ ہے کہ ان کا ایمان محض ان کے سابقہ ایمان کا تسلسل تھا، اور وہ جو عقیدہ اور دین پہلے اختیار کیے ہوئے تھے اس کے تقاضے پر عمل تھا۔ یہ لوگ (سیرت نگاروں کی تعبیر کے مطابق) اہل انجیل تھے۔ انجیل پر ایمان رکھتے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرتے تھے۔ انجیل میں چونکہ اس رسول کی اتباع کا حکم دیا گیا تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے گا اور اس کی صفات اور خصوصیات بیان کی گئی تھیں اس لیے ان کے ایمان کے تسلسل کا تقاضا تھا کہ وہ اس نبی (یعنی حضرت محمد ﷺ) پر بھی ایمان لے آئیں۔

معلوم ہوا کہ آں حضرت ﷺ پر ان کا ایمان ایک دین کو چھوڑ کر دوسرے دین کو اختیار

کرنے کا عمل نہیں تھا جس کا سبب ایک کو دوسرے سے بہتر قرار دینا ہو۔ بلکہ یہ حضرت عیسیٰ اور جو کچھ وہ لے کر آئے تھے اس پر ایمان کی حقیقت کا تسلسل تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں نازل ہونے والی آیات میں سے ایک یہ آیت بھی تھی:

وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ

(القصص۔ ۵۳)

اور جب ان کو یہ (قرآن) سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے، یہ واقعی حق ہے۔ ہمارے رب کی طرف سے، ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔"

یعنی حضرت محمد ﷺ جس چیز کی طرف دعوت دے رہے ہیں اس پر ہم ان کی بعثت سے قبل ہی ایمان رکھتے تھے، اس لیے کہ انجیل بھی اس پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے۔

یہی ہر اس شخص کا معاملہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ یا حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی تعلیمات کو صحیح طریقے پر مضبوطی سے تھامے گا۔ اس لیے کہ انجیل اور تورات پر ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ قرآن اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لایا جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ اہل کتاب کو اسلام کی دعوت کے ضمن میں ان سے صرف اس چیز کا مطالبہ کریں کہ تورات یا انجیل جس پر ایمان کا وہ دعویٰ کرتے ہیں، اس کی تعلیمات پر عمل کریں۔ ارشاد باری ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (المائدہ۔ ۶۸)

کہہ دو کہ اے اہل کتاب، تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ توراۃ اور انجیل کو قائم نہ کرو۔

گزشتہ تفصیل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے حضرت محمد ﷺ کی بعثت تک دین حق صرف ایک ہی رہا ہے، ایک سے زائد نہیں۔ اور بعض لوگ 'ادیان سماوی' کی جو تعبیر اختیار کرتے ہیں وہ مہمل ہے۔

ہاں، آسمانی شریعتیں متعدد رہی ہیں اور ہر آسمانی شریعت ماقبل شریعت کی ناسخ رہی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ "دین" کا اطلاق سب سے پہلے عقیدے پر ہوتا ہے اور "شریعت" کا اطلاق عبادات اور معاملات سے متعلق احکام پر ہوتا ہے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔

غم کا سال

آں حضرت ﷺ کی بعثت کا دسواں سال آپ کے لیے 'غم کا سال' تھا۔ اسی میں آپ کی زوجہ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ اور آپ کے چچا جناب ابوطالب کی وفات ہوئی۔ ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے: "خدیجہؓ اور ابوطالب کی وفات کے درمیان ایک مہینہ پانچ دن کا فاصلہ تھا۔"

حضرت خدیجہؓ — جیسا کہ ابن ہشام نے لکھا ہے — راہِ اسلام کی سچی رفیقِ سفر تھیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے اپنی پریشانیاں بیان کرتے اور ان کے پاس انسیت اور تسلی پاتے تھے۔ رہے ابوطالب تو وہ آپؐ کے معاملے میں آپ کے دست و بازو اور آپ کی پناہ تھے۔ اور قوم کے معاملے میں آپ کے مددگار تھے۔

ابن ہشام کہتے ہیں: "جب ابوطالب کی وفات ہو گئی تو قریش کے لوگوں نے آپ کو ایک اذیتیں پہنچانی شروع کر دیں جو وہ ان کی زندگی میں نہ پہنچا سکتے تھے۔ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سرِ بازار آپ کے سرِ مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔ ایک صاحب زادی نے سر دُھلایا۔ دُھلاتے ہوئے وہ روتی جاتی تھیں اور آپ انہیں تسلی دینے کے لیے یہ فرماتے جاتے تھے: "رو نہیں میری بیٹی، اللہ تیرے باپ کا حامی ہے۔" [۱۵]

اس سال نبی ﷺ نے راہِ دعوت میں شدید تکلیفیں جھیلیں، جس کی بنا پر آپ نے ا... "غم کا سال" قرار دیا۔

دروس و نصائح

سیرت نبوی ﷺ کے اس حصے سے درج ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

---

۱۵ اسے ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ نیز دیکھئے تاریخ طبری ۲/ ۵۴۴

۱۔ ابوطالب اور خدیجہؓ کے جلد وفات پا جانے میں حکمت:

غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ قضائے الٰہی نے مکہ میں مسلمانوں کو طاقت و قوت حاصل ہونے اور استحکام ملنے سے قبل ہی جناب ابوطالب کو کیوں اٹھا لیا جب کہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ وہ رسول ﷺ کو بہت سے مصائب و شدائد سے حتی الامکان بچاتے تھے؟ اسی طرح قضائے الٰہی نے حضرت خدیجہؓ کو اتنی جلد کیوں اٹھا لیا جب کہ ان کے پاس آں حضرت ﷺ انسیت اور تسلی پاتے تھے اور ان کے تعاون سے آلام و شدائد کے احساسات سے دامن کش ہو جاتے تھے۔ دونوں کے اتنی جلد دنیا سے اٹھا لیے جانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی؟

اس سے ایک بہت اہم مظہر پر دلالت ہوتی ہے جس کا اسلامی عقیدے کی بنیاد سے گہرا تعلق ہے۔

اگر جناب ابوطالب مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو جانے تک زندہ رہتے اور برابر اپنے بھتیجے کی حمایت و مدافعت کرتے اور انہیں مشرکین کی اذیتوں سے بچاتے رہتے تو اس سے کسی کو اس بات کا وہم ہو سکتا تھا کہ اس دعوت کے پس پردہ ابوطالب کی شخصیت تھی اور یہ کہ انہوں نے اگرچہ اس پر ایمان کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس کے جھنڈے تلے نہیں آئے تھے لیکن وہی اسے آگے بڑھا رہے تھے اور اپنی قوم کے درمیان اپنی حیثیت اور مقام و مرتبے کے ذریعے اس کی حمایت کر رہے تھے۔ اور کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ رسول ﷺ کو کارِ دعوت کی انجام دہی کے دوران خوش قسمتی سے اپنے چچا کی حمایت حاصل ہو گئی تھی جس کی بنا پر آپ ایذاء و تعذیب سے محفوظ رہے تھے، جب کہ دیگر مسلمان اس جیسی حمایت سے محروم تھے اس لیے انہیں ستایا گیا اور طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔

اس بنا پر حکمتِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے چچا جناب ابوطالب اور اپنی زوجہ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ سے محروم ہو جائیں۔ ان لوگوں سے محروم ہو جائیں جو ظاہر میں آپ کے حامی و مددگار اور مونس و غم خوار تھے، تاکہ اس کے ذریعے دو اہم حقیقتیں منکشف ہو جائیں:

اول: یہ کہ حمایت، حفاظت اور نصرت سب کچھ اللہ عزوجل کی طرف سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ذمہ لے لیا تھا کہ وہ اپنے رسول کی، مشرکین اور دشمنوں سے حفاظت فرمائے گا۔ اب چاہے

یہ حفاظت کسی انسان کے واسطے سے ہوتی یا بلا واسطہ ہوتی، بہر حال آپ لوگوں کے شر سے محفوظ رہتے اور آپ کی دعوت اللہ تعالیٰ کی نصرت اور توفیق سے منتہائے کمال کو پہنچتی۔

دوم: یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی، لوگوں سے حفاظت کا جو وعدہ کیا ہے ارشاد ہے: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. المائدہ۔۶۷ (اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو لوگوں کی طرف سے کوئی اذیت، مصیبت یا تکلیف نہیں پہنچے گی، بلکہ حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ آپ قتل سے محفوظ رہیں گے۔ اسی طرح کسی ایسی رکاوٹ یا جارحیت کا سامنا نہیں ہوگا جس سے اسلامی دعوت کا کام رک جائے، ورنہ حکمتِ الٰہی کا فیصلہ یہ ہے کہ انبیاء بھی راہِ دعوت میں غیر معمولی تکلیفیں برداشت کریں۔ یہ حفاظت الٰہی کے منافی نہیں ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور رسولوں سے وعدہ فرمایا ہے:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں یہ ارشاد فرمایا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ، اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ.
(الحجر: ۹۴-۹۵)

پس اے نبی جس چیز کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم ان مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لیے کافی ہیں۔

وہیں ساتھ ہی اس کا یہ بھی ارشاد ہے:

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ، وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ. (الحجر: ۹۷-۹۹)

ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے (اس کا علاج یہ ہے کہ) اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجالاؤ اور اس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے۔

اس سنتِ الٰہی کی جلیل القدر حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے راہِ دعوت میں شدید تکلیفیں برداشت کی ہیں اسی طرح ہر زمانے میں دعوت اسلامی کی

ذمہ داری انجام دینے والے عام مسلمانوں کو اگر ایسی ہی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ انہیں ہلکا سمجھیں اور بخوشی گوارا کرلیں۔

اگر نبی ﷺ بغیر کسی مشقت اور پریشانی کے اپنی دعوت میں کامیاب ہوگئے ہوتے تو آپ کے اصحاب اور بعد کے مسلمان بھی یہ خواہش رکھتے کہ آپ کی طرح انہیں بھی کوئی مشقت نہ برداشت کرنا پڑے اور اگر دعوت اسلامی کی راہ میں ان کے سامنے مصائب اور آزمائشیں آتیں تو ان کو گراں گزرتا۔

لیکن اس صورت میں مسلمانوں کا یہ احساس ان پر ہونے والے عذاب اور تکلیفوں کے اثر میں کمی کردے گا کہ وہ بھی ویسی ہی تکلیفیں برداشت کررہے ہیں جیسی رسول اللہ ﷺ نے برداشت کی تھیں اور وہ ٹھیک اسی راہ پر چل رہے ہیں جس پر چلتے ہوئے اللہ کے رسول کو تکلیفیں دی گئی تھیں۔

لوگوں کے، ان کا مذاق اڑانے اور اہانت کرنے سے انہیں خواہ کتنی ہی تکلیف پہنچے لیکن یہ چیز ان کے دست و بازو کو کمزور نہیں کرسکتی جب کہ انہیں معلوم ہو کہ اللہ کے رسول ﷺ کو ستانے کے ایسے طریقے اختیار کیے گئے کہ سربازار آپ کے سر مبارک پر مٹی ڈالی گئی، آپ مجبوراً گھر واپس آئے تو آپ کی ایک صاحب زادی نے آپ کا سر دھلایا۔ آپ کے ساتھ یہ سب ہوا جب کہ آپ اللہ کے محبوب اور اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ اسی طرح ہجرتِ طائف میں جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے، آپ کو شدید تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ مسلمان ہر آزمائش کو جھیل لیں گے اور ہر عذاب کو بخوشی برداشت کرلیں گے اس احساس کے ساتھ کہ وہ بھی اسلامی دعوت کی راہ میں ویسی ہی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں جیسی ان کے رسول نے اٹھائی تھیں۔

۲۔ حضورؐ نے اس سال کو غم کا سال کیوں قرار دیا؟

سیرت کے اس حصے سے متعلق دوسری چیز یہ ہے کہ بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے، اس سال کو 'غم کا سال' قرار دینے کا سبب محض یہ تھا کہ اس میں آپ کے چچا جناب ابوطالب اور زوجہ حضرت خدیجہ بنت خویلدؓ کی وفات ہوئی تھی، بسا اوقات یہ لوگ اس سے استدلال کرتے ہوئے، اپنے عزیزوں کی وفات پر طویل زمانے تک سوگ منانے اور

رنج و غم کا اظہار کرنے کو جائز قرار دے لیتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کی سمجھ کا پھیر اور اندازے کی غلطی ہے۔

نبی ﷺ کو اس قدر شدید غم محض اپنے چچا اور اپنی رفیقۂ حیات کی جدائی کا نہیں تھا، اور نہ آپ نے اس سال کو 'غم کا سال' محض اس وجہ سے قرار دیا تھا کہ اپنے ان قریبی رشتہ داروں کے وفات پاجانے کی وجہ سے آپ کی طبیعت ملول ہوگئی تھی، بلکہ آپ کے غم کا حقیقی سبب یہ تھا کہ ان دونوں کی وفات کے بعد اسلامی دعوت کے بیشتر راستے مسدود ہوگئے تھے۔ آپ کے چچا کی حمایت سے دعوت کے بہت سے میدان اور تعلیم و تربیت اور رہنمائی کے مختلف راستے کھلے ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ذمہ داری سونپی تھی اس کی انجام دہی میں آپ کو کچھ کامیابی بھی ملتی تھی۔

لیکن ان کی وفات کے بعد یہ سارے راستے بند ہوگئے۔ قدم قدم پر آپ کو عناد اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ جہاں بھی تشریف لے جاتے دعوت کے تمام راستے مسدود پاتے۔ آپ گھر سے نکلتے، پھر اس حال میں واپس آتے کہ کسی نے آپ کی دعوت سنی ہوتی نہ آپ پر ایمان لایا ہوتا۔ بلکہ تمام لوگ مذاق اڑاتے، آپ کے ساتھ زیادتی کرتے اور تمسخر و استہزاء سے کام لیتے۔ یہ صورتِ حال آپ کے لیے باعثِ رنج و الم تھی کہ آپ کی دعوتی کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی ہیں۔ اسی لیے آپؐ نے اس سال کو 'غم کا سال' قرار دیا۔

یہ دیکھ کر کہ لوگ اس حق پر ایمان نہیں لا رہے ہیں جسے لے کر آپ تشریف لائے تھے، آپ اکثر غمگین رہا کرتے تھے۔ اس غم کو ہلکا کرنے کے لیے اس زمانے میں ہی ایسی آیات نازل ہوتی تھیں جن میں آپ کی دل جوئی اور تسلی کی جاتی تھی اور یاد دہانی کرائی جاتی تھی کہ دعوت و تبلیغ سے زیادہ آپ کی اور کوئی ذمہ داری نہیں۔ اس لیے اگر لوگ آپ کی دعوت کو قبول نہیں کر رہے ہیں اور ایمان نہیں لا رہے ہیں تو خواہ مخواہ آپ کی جان ان لوگوں کی خاطر غم و افسوس میں نہ گھلے۔ مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ کیجیے:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ، وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ (الانعام: ۳۳-۳۵)

اے نبی ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان سے تمہیں رنج ہوتا ہے۔ لیکن یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم دراصل اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جاچکے ہیں، مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں، انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔ تاہم اگر ان لوگوں کی بے رخی تم سے برداشت نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ زور ہے تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر سکتا تھا لہٰذا نادان مت بنو۔

ہجرتِ طائف

جب قریش نے نبی ﷺ کو سخت اذیتیں پہنچائیں (جس کا بیان گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے) تو آپ نے طائف کارخ کیا۔ آپ چاہتے تھے کہ وہاں کا قبیلہ بنوثقیف اسلامی دعوت کے کام میں آپ کی مدد اور حمایت کرے۔ آپ کو امید تھی کہ جو دعوت لے کر آپ آئے ہیں اسے وہاں کے لوگ قبول کرلیں گے۔

جب رسول اللہ ﷺ طائف پہنچے تو وہاں قبیلہ ثقیف کے سرداروں سے ملے، ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور جس مقصد سے ان کے پاس تشریف لے گئے تھے اس سلسلے میں گفتگو کی۔ ان لوگوں نے آپ کی دعوت کو سختی سے رد کردیا۔ اور اتنی درشتی اور بدتہذیبی سے پیش آئے جس کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ دیکھ کر آپ ان کے پاس سے اٹھ گئے۔ چلتے ہوئے آپ نے ان سے کہاکہ میرے ساتھ تم لوگوں نے جو برتاؤ کیا سو کیا مگر کم ازکم اتنا کرو کہ میرا معاملہ مخفی رکھو اور قریش کو یہاں میرے آنے کی خبر نہ ہونے پائے۔ ان لوگوں نے آپ کی یہ بات بھی نہ مانی۔ پھر انہوں نے اپنے اوباشوں اور غلاموں کو آپ کے خلاف اکسادیا۔ وہ آپ کو گالیاں دینے اور آپ پر آوازے کسنے لگے۔ انہوں نے آپ پر اتنے پتھر برسائے کہ آپ کے دونوں پیر لہولہان ہوگئے۔ اس موقعے پر حضرت زید بن حارثہؓ آپ کے ساتھ تھے۔ وہ آپ کو پتھروں سے بچانے کے لیے خود پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے رہے، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ [16]

رسول اللہ ﷺ جب عتبہ بن ربیعہ کے باغ تک پہنچے تو وہ بدمعاش لوگ جو آپ کا تعاقب کررہے تھے، واپس ہوگئے۔ آپ تھکن اور زخموں سے چور انگور کی ایک بیل کے سا

[16] طبقات ابن سعد ۱/۱۹۶

میں بیٹھ گئے۔ ربیعہ کے دونوں بیٹے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ جب آپ کو اس سائے میں کچھ اطمینان نصیب ہوا تو آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے:

"خداوندا۔ میں تیرے ہی حضور اپنی بے بسی و بے چارگی اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی بے قدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین۔ تو سارے کمزوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کررہا ہے؟ کیا کسی بیگانے کے حوالے جو مجھ سے درشتی سے پیش آئے؟ یا کسی دشمن کے حوالے جس کو تونے مجھ پر قابو پالینے کا یارا دے دیا ہے؟ اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں۔ مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اس نور کی، جو اندھیرے میں اجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ مجھے اس سے بچالے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی رہوں ہوں یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔"

یہ منظر دیکھ کر باغ کے مالک، ربیعہ کے دونوں بیٹوں کے دل میں ہمدردی کا جذبہ امڈ آیا۔ انہوں نے اپنے ایک عیسائی غلام کو (جس کا نام عداس تھا) بلایا اور اس کے ہاتھ انگوروں کا ایک خوشہ طبق میں رکھ کر آپؐ کے پاس بھیجا۔ عداس نے جب انگور لے جاکر آپ کے سامنے رکھا اور آپ سے تناول فرمانے کے لیے کہا تو آپ نے بسم اللہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور اسے کھایا۔ عداس حیرت سے بولا: اللہ کی قسم اس علاقے کے لوگ تو یہ الفاظ نہیں کہتے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: تم کہاں کے رہنے والے ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟ اس نے کہا: میں عیسائی ہوں اور نینوئ (موصل کے قریب ایک گاؤں) کا رہنے والا ہوں۔ آپ نے فرمایا: "مرد صالح یونس بن متی کی بستی کے؟ اس نے پوچھا: آپ ان کو کیسے جانتے ہیں؟۔ فرمایا: وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں" یہ سنتے ہی عداس آپ پر جھکا اور آپ کے سر، ہاتھوں اور قدموں کو چومنے لگا۔ [17]

[17] تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن ہشام ۱/۴۲۰

ابن اسحاق نے لکھا ہے: "پھر رسول اللہ ﷺ طائف سے واپس ہوئے اور مکہ کا رخ کیا۔ راستے میں چند روز نخلہ کے مقام پر ٹھہرے۔ وہیں ایک رات آپ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزرا انہوں نے قرآن سنا، ایمان لے آئے اور واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔

اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس واقعہ کی خبر دی۔ سورۂ احقاف میں ہے:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا
فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ. (احقاف: ۲۹)

(اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ) جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمہاری طرف لے آئے تھے تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انہوں نے آپس میں کہا خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب وہ پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔

سورۂ جن میں بھی اس واقعہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ واپس مکہ تشریف لے جانے کا قصد کیا تو انہوں نے عرض کیا: "آپ وہاں کیسے داخل ہوں گے جب کہ قریش آپ کو نکال چکے ہیں؟" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "اے زید جو حالات تم دیکھ رہے ہو ان سے نکلنے کے لیے اللہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی و ناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔" پھر آپ نے قبیلہ خزاعہ کے ایک شخص کو مطعم بن عدی کے پاس بھیجا اور ان کو اطلاع دی کہ آپ ان کی پناہ میں مکہ میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ مطعم پناہ دینے پر تیار ہو گئے۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ مکہ واپس لوٹ آئے۔ [۱۸]

دروس و نصائح

نبی ﷺ کی اس ہجرت میں غور کریں اور دیکھیں کہ اس میں آپ کو کتنی زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور کس انداز سے آپ کی مکہ واپسی ہوئی تو اس سے ہمیں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

[۱۸] طبقات ابن سعد ۱/۱۹۶، سیرت ابن ہشام ۱/۳۸۱

۱۔ حضورؐ کو پہنچنے والی تکلیفیں آپؐ کے تبلیغی اعمال کا ایک حصہ تھیں:

نبی ﷺ کو راہِ دعوت میں مختلف طرح کی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خاص طور سے سفر طائف کے دوران آپ نے سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ یہ آپ کے تبلیغی کاموں کا ایک حصہ تھا۔

جس طرح آپ کائنات اور اس کے خالق کے بارے میں صحیح عقیدہ اور عبادات، اخلاق اور معاملات سے متعلق اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے کے لیے تشریف لائے تھے، اسی طرح آپ اہل ایمان کو یہ بتانے آئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے صبر لازم کیا ہے۔ آپؐ نے ان کے سامنے صبر واستقامت کا عملی مظاہرہ فرمایا جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں حکم دیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا. (آل عمران۔ ۲۰۰)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لیے کمر بستہ رہو۔

نبی ﷺ نے عملی مظاہرہ کر کے ہمیں عبادات کی انجام دہی کا طریقہ سکھایا۔ آپؐ نے فرمایا: "اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو"، "مجھ سے اپنی عبادتوں کے طریقے سیکھ لو" اسی اصول پر آپؐ نے راہِ دعوت میں شدید تکلیفیں برداشت کیں، تاکہ اپنے بعد آنے والے تمام داعیوں سے زبانِ حال سے یہ فرما دیں "اسی طرح صبر کرو جس طرح مجھے صبر کرتے ہوئے دیکھو" اور تاکہ آپ کے عمل سے واضح ہو جائے کہ صبر کرنا اور تکلیفیں برداشت کرنا اسلام کے ان اہم اصولوں میں سے ہے جن کے ساتھ آپ تمام لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔

ممکن ہے ہجرتِ طائف کے ظاہری پہلو پر نظر رکھنے والے کو یہ وہم ہو کہ آپ وہاں ناکام ہو گئے تھے۔ یہ صورتِ حال آپ کے لیے پریشان کن تھی۔ اور وہاں پیش آنے والی آزمائشوں اور تکلیفوں سے آپ بڑے دل گرفتہ ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے ربیعہ کے بیٹوں کے باغ میں جب کچھ اطمینان نصیب ہوا تو آپ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ان پریشانیوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا تھا اور صبر کرتے ہوئے اور بارگاہِ الٰہی میں اجر کی امید میں ان شدائد کے تلخ گھونٹ لیے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ اس بات پر قادر تھے کہ اگر چاہتے تو ان اوباشوں سے جنہوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائی تھیں اور ان سرداروں سے جنہوں نے انہیں آپ کے خلاف بھڑکایا تھا اور آپ کی دعوت

کو سختی سے رد کر دیا تھا، انتقام لے سکتے تھے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں چاہا۔

اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ پر کوئی ایسا وقت بھی آیا ہے جو معرکۂ احد سے زیادہ سخت ہو؟ آپ نے فرمایا:

"مجھے تمہاری قوم سے بارہا تکلیفیں پہنچی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ سخت وقت میرے لیے یوم العقبہ (مراد طائف) کا تھا، جب میں ابن عبدیالیل بن عبد کلال کے پاس گیا اور اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کی، مگر اس نے اسے قبول نہیں کیا۔ میں غم زدہ حالت میں جدھر منہ اٹھا ادھر چل پڑا۔ قرن الثعالب پہنچ کر مجھے ہوش آیا۔ نگاہ اوپر اٹھائی تو دیکھا کہ ایک ابر میرے اوپر سایہ کیے ہوئے تھا۔ پھر دیکھا کہ اس میں جبرئیل ہیں۔ انہوں نے پکار کر مجھ سے کہا: "اللہ عزوجل نے وہ سب کچھ سن لیا ہے جو آپ کی قوم نے آپ سے کہا ہے اور جو کچھ آپ کی دعوت کا جواب دیا ہے۔ یہ پہاڑوں کا فرشتہ اس نے بھیجا ہے تاکہ آپ جو چاہیں اسے حکم دیں۔" پھر پہاڑوں کے فرشتے نے پکار کر مجھے سلام کیا، اس کے بعد مجھ سے کہا: "اے محمد! اللہ نے آپ کی دعوت پر آپ کی قوم کا جواب سن لیا ہے۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں۔ مجھے آپ کے رب نے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ جو حکم چاہیں دیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو میں ان پر دونوں طرف کے پہاڑوں کو ملا کر ڈھانک دوں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا: "نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی پشتوں سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے۔"

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اس عمل سے اپنے اصحاب اور اپنے بعد اپنی امت کو اس چیز کی تعلیم دے رہے تھے کہ وہ پیش آنے والی تکلیفوں پر صبر کریں۔ اس طرح آپ انہیں اللہ کی راہ میں تمام شدائد و مصائب پر صبر کا فن سکھا رہے تھے۔

ممکن ہے کوئی شخص کہے کہ اگر یہ بات ہے کہ تو پھر زبان پر حرفِ شکوہ لانے کا کیا موقع اور اس دعا کا کیا مطلب جس سے آپ کی دعوتی جدوجہد کے بے نتیجہ ہونے اور اذیت و عذاب سے دوچار ہونے پر آپ کی پریشانی اور دل گرفتگی کا اظہار ہوتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف اللہ سے شکوہ کرنا عبادت اور اس کے سامنے عاجزی و فر

اختیار کرنا گڑگڑانا تقریب و طاعت ہے۔ آزمائشوں اور مصیبتوں کی بہت سی حکمتیں ہیں۔ ان کی سب سے اہم حکمت یہ ہے کہ ان میں مبتلا ہونے والا شخص اللہ کی چوکھٹ پر اپنا سر رکھتا ہے اور اس کی بندگی کا لباس زیب تن کرتا ہے۔ اس لیے تکلیفوں پر صبر اور اللہ سے شکوہ کرنے میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے ذریعے ہمیں دونوں چیزوں کی تعلیم دی ہے۔ آزمائشوں پر صبر کرکے آپ نے ہمیں سکھایا ہے کہ یہی تمام مسلمانوں اور خاص طور پر داعیانِ کرام کا وتیرہ ہونا چاہیے، اور بارگاہِ الٰہی میں پناہ لے کر اور عاجزی و فروتنی اختیار کرکے آپ نے ہمیں سکھایا ہے کہ بندگی کا طریقہ اور اس کے تقاضے کیا ہوتے ہیں؟!

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نفسِ انسانی خواہ کتنا ہی بلند ہو جائے، لیکن بہر حال وہ اپنی انسانیت کے دائرہ سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ احساس و شعور انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ نعمتوں اور آسائشوں کی لذت کا احساس اور عذاب کی تکلیف کا احساس۔ وہ مجبور ہے کہ اوّل الذکر کی طرف مائل ہو اور مؤخر الذکر سے گھبرائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اگرچہ خود کو اپنے رب کی راہ میں ہر طرح کی تکلیف اور عذاب سہنے کے لیے تیار کر رہے تھے لیکن بہر حال آپ انسان تھے۔ آپ کو مصیبت پر تکلیف کا اور نعمت پر لذت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے باوجود آپ محض اپنے رب کی رضاجوئی اور اس کی بندگی کے حق کی ادائی کے لیے نعمت کی لذتوں پر عذاب کی تکلیفوں کو ترجیح دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان ثواب کا مستحق ہوتا ہے اور اسی سے اس کے مکلف ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

۲۔ تکالیف و شدائد پر الٰہی الطاف و عنایات:

آں حضرت ﷺ کے، اپنی قوم کے ساتھ جو معاملات پیش آئے ان میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعض مواقع پر بہت سخت تکلیفیں اٹھائیں۔ تاہم ایسے ہر موقعے پر کوئی ایسی چیز بھی ظہور پذیر ہوتی تھی جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس اذیت کا جواب ہوتی تھی۔ تاکہ اس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کی دل جوئی ہو اور تکلیف اور پریشانی کے نتیجے میں آپ پر مایوسی طاری نہ ہونے پائے۔

آں حضرت ﷺ کی اس ہجرت طائف میں جہاں تکلیف دہ عذاب کے مناظر دکھائی دیتے ہیں: جسمانی اذیت کا عذاب اور ناکامی کا عذاب جس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، وہیں آپ کو اذیتیں دینے اور جان کے درپے ہونے والوں کی کم عقلی اور زیادتی کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے واضح رد اور ان کی نادانی اور درشتی پر اس کی جانب سے معذرت بھی سامنے آتی ہے۔ اس کا اظہار عیسائی غلام عداس کی صورت میں ہوتا ہے جو آپ کی خدمت میں انگور کا ایک طبق لے کر حاضر ہوا۔ اور جب آپ نے اسے اپنے نبی ہونے کی خبر دی تو آپؐ کے سر، ہاتھوں اور پیروں کو چومنے لگا۔

ان اوباشوں کی اذیتوں پر معذرت کی مصطفیٰ صادق رافعیؒ نے بہت اچھی منظر نگاری کی ہے۔ انہوں نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

"اس واقعے میں تقدیرِ الٰہی کے اسرار و رموز عجیب و غریب ہیں!..

خیر، عظمت اور احترام آگے بڑھے اور شر، حماقت اور بے ادبی کے رویے پر معذرت کرنے لگے۔ اور دشمنی کی باتوں کے بعد محبت کا اظہار ہونے لگا۔

ربیعہ کے دونوں بیٹے اسلام کے شدید دشمنوں میں سے تھے۔ یہ لوگ قریش کے ان سرداروں میں سے تھے جو نبی ﷺ کے چچا جناب ابوطالب کے پاس یہ مطالبہ لے کر گئے تھے کہ وہ آپ کو باز رکھیں یا آپ کی مدافعت سے کنارہ کش ہو جائیں، ورنہ وہ لوگ ان دونوں کے خلاف جنگ برپا کر دیں گے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ کوئی ایک فریق ہلاک نہ ہو جائے۔ لیکن ان کی حیوانی سرشت انسانی قدر سے بدل گئی جس کے ساتھ یہ دین آیا ہے۔ اس لیے کہ دین کا مستقبل فکر سے وابستہ ہے نہ کہ سرشت سے۔

عیسائیت اسلام سے معانقہ اور اس کی تعظیم و تکریم کرنے لگی۔ اس لیے کہ دو صحیح مذاہب کے درمیان وہی رشتہ ہے جو دو حقیقی بھائیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اخوت کا رشتہ خون سے پہچانا جاتا ہے تو دین کا رشتہ عقل ہے۔

پھر اس واقعے میں تقدیر کے اسرار و رموز کی تکمیل رسیلے، ذائقہ دار اور میٹھے انگور کے خوشے سے ہوئی۔ انگور کا خوشہ اس عظیم اسلامی اجتماعیت کا رمز تھا جس کے ارکان انگور کے دانوں کی طرح باہم پیوست تھے۔[19]

---

19 وحی القلم ۲/ ۳۰

۳۔ مسلمان کا قائدِ دعوت کے ساتھ مثالی رویہ:

حضرت زید بن حارثہؓ رسول اللہ ﷺ کو اوباشوں کے پتھروں سے بچانے کے لیے پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے تھے، یہاں تک کہ ان کا سر کئی جگہوں سے پھٹ گیا۔ ان کا یہ عمل نمونہ ہے کہ ایک مسلمان کو قائدِ دعوت کے سلسلے میں کس رویہ کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے عمل سے یہ اسوہ پیش کیا کہ مسلمان کو اپنے قائد کی حمایت و نصرت اور اس کی مدافعت کے لیے ہمہ وقت تیار رہنا چاہیے خواہ اس راہ میں اسے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کر دینی پڑے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے لیے تمام صحابہ کا یہی حال تھا۔ آج آپ کی ذات گرامی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے، اس لیے اس طریقے سے آپ کا دفاع ممکن نہیں جس طرح صحابہ کرام کرتے تھے۔ لیکن دوسرے طریقے سے ایسا کرنا ممکن ہے اور وہ یہ کہ دعوت اسلامی کی راہ میں آنے والی آزمائشوں اور تکلیفوں سے ہم اپنے پہلو نہ بچائیں اور اس جہد و مشقت کا کچھ حصہ ہم بھی برداشت کریں جس سے نبی ﷺ دوچار ہوئے تھے۔

ہر زمانے میں اسلامی دعوت کی قیادت کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ لوگ راہِ دعوت میں نبی ﷺ کے جانشین ہوتے ہیں۔ تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کے مخلص سپاہی بنیں، ان کے گرد حلقہ بنا کر ان کا دفاع کریں اور ان پر اپنی جان اور مال نچھاور کریں جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کرتے تھے۔

۴۔ جنوں کی حضورؐ سے ملاقات اور ان کا قبول اسلام:

ابن اسحاق نے جنوں کے ایک گروہ کے، آں حضرت ﷺ سے قرآن سننے کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ دلیل ہے اس بات پر کہ جن ایک وجود رکھتے ہیں، وہ مکلف ہیں، اور یہ کہ ان میں سے بعض لوگ ایمان لائے اور بعض ایمان نہیں لائے اور کفر کی روش پر قائم رہے۔ یہ دلالت قطعیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے، اس لیے کہ قرآن نے قطعی اور صریح نصوص میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً سورۂ جن کی ابتدائی آیات یا سورۂ احقاف کی یہ آیات:

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ـ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تک۔ (آیات: ۲۹-۳۱)

اس واقعہ کو ابن اسحاقؒ اور ابن ہشامؒ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں اسی سے ملتا جلتا واقعہ دوسری تفصیل سے مذکور ہے۔ صحیح بخاری کی روایت جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

آں حضرت ﷺ ایک موقعے پر اپنے اصحاب کے ایک گروہ کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں شیاطین (جن) آسمان سے خبریں حاصل نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ آسمان سے قریب ہوتے تو ان پر شہاب ثاقب برسائے جاتے تھے۔ انہوں نے باہم رائے مشورہ کیا کہ آخر آسمان سے خبریں حاصل کرنے کے سلسلے میں ہماری راہ میں کیوں رکاوٹ ڈال دی گئی ہے اور کیوں ہم پر شہاب ثاقب برسائے جاتے ہیں؟ ضرور کوئی نہ کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے، روئے زمین پر چہار جانب گھوم پھر کر دیکھنا چاہیے کہ وہ مخصوص واقعہ کیا ہے؟ وہ سب تحقیق حال کے لیے روئے زمین میں ہر طرف پھیل گئے۔ ان میں سے جو لوگ تہامہ کی طرف گئے تھے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو مقام نخلہ میں پایا۔ آپؐ نے بازارِ عکاظ جاتے ہوئے وہاں قیام کیا تھا۔ اس وقت آپؐ صحابہ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ جب انہوں نے آپ کو قرآن پڑھتے دیکھا تو اس کو غور سے سنا، پھر کہنے لگے: یہ ہے وہ خاص چیز جس کی وجہ سے آسمان سے خبریں حاصل کرنے کے سلسلے میں ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالی گئی ہے۔ پھر وہ اپنی قوم میں واپس گئے اور وہاں خبر دی: اے ہماری قوم کے لوگو۔ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کی خبر دی اور سورۂ جن کی ابتدائی آیات نازل کیں۔" [۲۰]

امام مسلمؒ اور امام ترمذیؒ نے بھی انہی الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے، البتہ اس کے شروع میں یہ اضافہ ہے: "رسول اللہ ﷺ نے نہ تو جنوں کے سامنے قرآن پڑھ کر سنایا تھا اور نہ انہیں

۲۰ صحیح بخاری ۶/ ۷۳

دیکھا تھا۔"

علامہ ابن حجرؒ نے فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ نے شروع کا یہ جملہ عمداً حذف کر دیا ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے نبی ﷺ کے جنوں کے سامنے قرآن پڑھنے کا اثبات کیا ہے، اس لیے وہ حضرت ابن عباسؓ کی نفی پر مقدم ہے۔ امام مسلمؒ نے بھی اس جانب اشارہ کیا ہے، اسی لیے انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی مذکورہ بالا روایت نقل کرنے کے بعد حضرت ابن مسعودؓ سے مروی نبی ﷺ کی یہ حدیث بیان کی ہے کہ "میرے پاس جنوں کا ایک ہرکارہ آیا۔ میں اس کے ساتھ جنوں کے پاس گیا اور ان کے سامنے قرآن پڑھ کر سنایا" ان دونوں روایتوں کے درمیان جمع و تطبیق کی صورت یہ ہے کہ انہیں دو واقعات پر محمول کیا جائے۔ [۲۱]

مسلم، بخاری اور ترمذی کی نقل کردہ یہ روایت ابن اسحاقؒ کی روایت سے دو پہلوؤں سے مختلف ہے۔

اول یہ کہ ابن اسحاق کی روایت میں اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ آں حضرت ﷺ نماز میں صحابہ کی امامت کر رہے تھے، بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ تنہا نماز ادا کر رہے تھے جب کہ دیگر روایات میں صراحت ہے کہ آپ نماز میں صحابہ کی امامت کر رہے تھے۔

دوم یہ کہ ابن اسحاق کی روایت میں نماز فجر کی تخصیص نہیں ہے جب کہ دیگر روایات صراحت کرتی ہیں کہ آپؐ نماز فجر ادا کر رہے تھے۔

رہی ابن اسحاق کی روایت تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ لیکن دوسری روایت میں دو پہلوؤں سے اشکال وارد ہوتا ہے۔

ایک یہ کہ یہ بات معلوم ہے کہ نبی ﷺ کے ساتھ سفر طائف اور وہاں سے واپسی میں حضرت زید بن حارثہؓ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پھر یہ بات کیونکر درست ہو سکتی ہے کہ آپ نے صحابہ کے ایک گروہ کی امامت فرمائی۔

دوسرے یہ کہ پانچ نمازوں کی مشروعیت اسراء و معراج کے موقعے پر ہوئی ہے اور معراج کا واقعہ بیشتر محققین کے نزدیک سفر طائف کے بعد پیش آیا ہے۔ پھر یہ بات کیونکر درست

۲۱ فتح الباری ۸/ ۶۷۳

ہو سکتی ہے کہ آپ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے؟

پہلے اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ واپسی میں جب آپ نخلہ کے مقام پر پہنچے ہوں جو کہ مکہ سے بہت قریب ہے تو وہاں بعض صحابہ سے آپ کی ملاقات ہو گئی ہو اور آپ نے ان کے ساتھ نماز فجر ادا کی ہو۔

رہا دوسرا اشکال تو اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جنوں کے آں حضرت ﷺ سے قرآن سننے کا واقعہ ایک سے زائد مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ کی روایت حضرت ابن عباسؓ نے کی اور دوسری مرتبہ وہ نمازوں کی فرضیت کے بعد پیش آیا۔ اس کی روایت حضرت ابن مسعودؓ نے کی۔ دونوں واقعات صحیح ہیں۔ جمہور محققین کی یہی رائے ہے۔ [۲۲] یہ توجیہ اس صورت میں کی گئی ہے جب واقعہ اسراء و معراج کو ہجرت طائف کے بعد مانا جائے۔ لیکن اگر اسے ہجرت طائف سے قبل تسلیم کر لیا جائے تو کوئی اشکال نہیں پیدا ہوتا۔

اس تفصیل کے بعد ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ جنات کے وجود پر ایمان لائے اور اس بات پر کہ وہ ایک زندہ مخلوق ہیں۔ اور اللہ عزوجل نے انہیں اپنی عبادت کا اسی طرح مکلف بنایا ہے جس طرح ہمیں مکلف کیا ہے۔ وہ ہمارے حواس کی گرفت میں اس لیے نہیں آتے کیونکہ اللہ عزوجل نے ان کے وجود کو ہماری آنکھوں میں پائی جانے والی قوت بینائی سے ماورا رکھا ہے۔ ہماری آنکھیں صرف مخصوص قسم کی موجودات کو محدود فاصلے سے اور متعین شرائط کے ساتھ دیکھ سکتی ہیں۔

اس مخلوق کا وجود چونکہ کتاب و سنت کی یقینی اور متواتر خبروں سے ثابت ہے اور یہ چیز دین کے ناگزیر عقائد میں سے ہے، اس لیے تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جنوں کے وجود کے انکار یا اس میں شک سے ارتداد اور بے دینی لازم آتی ہے، اس لیے کہ ان کا انکار ایک ایسی چیز کا انکار ہے جو دین کے ناگزیر عقائد میں سے ہے، ساتھ ہی ان کے انکار سے اللہ اور اس کے رسول سے حاصل ہونے والی سچی اور متواتر خبر کی تکذیب ہوتی ہے۔

چاہیے کہ عقل و دانش کا حامل کوئی شخص غفلت اور جہالت کے مظاہر کا شکار نہ ہو اور دعویٰ نہ کرنے لگے کہ وہ صرف اسی چیز پر ایمان لائے گا جو سائنس سے مطابقت رکھتی ہو۔ چنانچہ

---

۲۲ دیکھیے عیون الاثر، ابن سید الناس ۱/۱۱۸، فتح الباری ۸/۴۷۳

وہ فخریہ اس بات کا اظہار کرنے لگے کہ وہ جنوں کے وجود کا قائل نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے نہ تو جنوں کو دیکھا اور نہ اسے ان کا احساس ہوا ہے۔

یہ چیز بالکل بدیہی ہے کہ اس قسم کے دعویٰ سے (جو درحقیقت جہالت کے مترادف ہے) بہت سی یقینی موجودات کا انکار لازم آتا ہے۔ محض ایک وجہ سے اور وہ یہ کہ انہیں دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ مشہور سائنٹفک اصول ہے کہ "کسی چیز کے عدم احساس سے اس کا عدم وجود لازم نہیں آتا" یعنی اگر کوئی چیز جسے تم تلاش کر رہے ہو، تمہیں نظر نہ آ رہی ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔

۵۔ حادثہ طائف سے حضور کے اعتماد اور قوتِ ارادی میں اضافہ ہوا:

نبی ﷺ کے ساتھ آپ کے سفر طائف میں جو صورت حال پیش آئی اور اس موقعے پر آپ کو جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں، ان کا آپ کے دل پر کیا اثر ہوا؟

اس سوال کا جواب آں حضرت ﷺ کے اس ارشاد میں ملتا ہے جو آپ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ حضرت زید نے جب تعجب کے ساتھ آپؐ سے دریافت کیا: "اے اللہ کے رسول آپ کیسے مکہ واپس جائیں گے جب کہ وہاں کے لوگ آپ کو نکال چکے ہیں؟" تو آپ نے پورے اعتماد اور اطمینان سے جواب دیا:

"اے زید جو حالات تم دیکھ رہے ہو ان سے نکلنے کے لیے اللہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی و ناصر اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے"

معلوم ہوا کہ مکہ میں شدید ایذا و تعذیب جھیلنے کے بعد طائف میں جس تکلیف دہ صورت حال سے آپ دوچار ہوئے اس کا اللہ تعالیٰ پر آپ کے اعتماد و یقین یا آپ کے اندرون میں مثبت قوت ارادی پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

اللہ کی قسم یہ کسی انسان کی عزیمت نہیں تھی جسے زائد قوت برداشت یا قوت ارادی عطا کی گئی ہو، بلکہ یہ نبوت کا یقین تھا جو آں حضرت ﷺ کے دل میں راسخ تھا۔ آپ جانتے تھے کہ آپ اپنے رب کے حکم کو نافذ کر رہے ہیں اور ٹھیک اسی راہ پر گامزن ہیں جس پر چلنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک

پہنچا کر رہے گا۔ اس نے ہر چیز کا ایک وقت متعین کر رکھا ہے۔

اس معاملے میں ہمارے لیے تعلیم و تذکیر کا پہلو یہ ہے کہ جب تک ہم اللہ پر ایمان اور اس کی توفیق کی راہ پر چل رہے ہوں، دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والی آزمائشیں اور رکاوٹیں ہمیں اس راہ سے پھیرنے نہ پائیں اور ہم میں سستی اور تن آسانی نہ پیدا ہونے پائے۔ جو شخص اللہ سے قوت حاصل کر رہا ہو اس کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ مایوسی اور سستی کو کچھ اہمیت نہ دے۔ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کام کا حکم دیا ہے تو اس میں شک نہیں کہ وہی مدد بھی کرنے والا ہے۔

پست ہمتی، سستی اور مایوسی ان دوسری راہوں اور اصولوں کے درمیان پیش آنے والی رکاوٹوں اور آزمائشوں کے سبب پیدا ہوتی ہے جن کا اللہ عزوجل نے حکم نہیں دیا ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں کام کرنے والے اپنی مخصوص قوتِ کار اور اپنی ذاتی جدوجہد پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور معلوم ہے کہ یہ سب مخصوص انسانی دائرے میں محدود ہوتا ہے۔ اس لیے فطری بات ہے کہ محدود انسانی قوت کے پیمانے کو دیکھتے ہوئے طویل آزمائشوں، تکلیفوں اور پریشانیوں کے سبب قوتِ کار اور منصوبہ بندی مایوسی اور پست ہمتی کا شکار ہو جائے۔

معجزۂ اسراء و معراج

اسراء سے مراد مسجد حرام (مکہ) سے مسجد اقصیٰ (قدس) تک کا وہ سفر ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سرفراز فرمایا تھا۔ اور معراج سے مراد اس کے بعد کا سفر ہے جس میں آپ کو عالم بالا میں مختلف آسمانی طبقات میں لے جایا گیا، پھر اتنی بلندی پر پہنچایا گیا جہاں ملائکہ، انسانوں اور جنوں غرض تمام مخلوقات کا علم ختم ہو جاتا ہے۔ یہ سب صرف ایک رات میں ہوا۔ آں حضرت ﷺ کو یہ الٰہی اعزاز کب حاصل ہوا؟ آپ کی بعثت کے دسویں سال یا اس کے بعد؟ اس کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ ابن سعد نے اپنی کتاب الطبقات الکبریٰ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ واقعہ ہجرت سے اٹھارہ مہینے پہلے پیش آیا۔

جمہور مسلمانوں کا خیال ہے کہ آپ کا یہ سفر جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اسی لیے یہ واقعہ آپ کے ان نمایاں معجزات میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سرفراز فرمایا تھا۔

اس واقعے کو بخاری و مسلم نے تفصیل سے نقل کیا ہے:

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک براق کے ذریعے لے جایا گیا۔ یہ سواری کا ایک جانور تھا جو گدھے سے بڑا اور خچر سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس کا ہر قدم تا حدِ نظر پڑتا تھا۔ آپ مسجد اقصیٰ پہنچے تو وہاں دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر جبرئیل نے آپ کے سامنے دو پیالے پیش کیے۔ ایک میں شراب اور دوسرے میں دودھ تھا۔ آپ نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا۔ جبرئیل نے مبارک باد دی کہ آپ فطرت کی راہ پاگئے۔ پھر آپ کو آسمان کی طرف لے جایا گیا۔ آپ پہلے، دوسرے، تیسرے اسی طرح تمام آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد آپ کو سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا، وہاں اللہ تعالیٰ نے آپ کو شرف ہم کلامی بخشا۔ اس موقع

پر دن اور رات میں مسلمانوں پر پانچ نمازیں فرض کی گئیں جو اصل میں پچاس نمازیں تھیں۔ [۲۳]

اگلے دن صبح رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کے سامنے، جو کچھ دیکھا تھا بیان کیا تو مشرکین دوسرے لوگوں کو اکٹھا کرنے لگے، تاکہ یہ دلچسپ خبر تمام اطراف میں پھیل جائے اور وہ آپ کا مذاق اڑائیں۔ ان میں سے بعض لوگوں نے آپ کو چیلنج کیا کہ اگر آپ واقعی بیت المقدس گئے ہیں اور وہاں نماز ادا کی ہے تو وہاں کا نقشہ بیان کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ جب وہاں تشریف لے گئے تھے تو آپ کو خیال بھی نہ آیا تھا کہ اس کے اطراف کی چیزوں کو خوب غور سے دیکھ لیں اور اس کا نقشہ اور ستونوں کی تعداد ذہن میں محفوظ کر لیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے وہاں کا نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اور آپ نے ان کے سوالات کے مطابق ایک ایک چیز اس طرح بیان کی گویا بیت المقدس سامنے ہے اور آپ دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "جب قریش نے مجھے جھٹلایا (اور میرا امتحان لینے کے لیے مطالبہ کیا کہ اگر میں بیت المقدس گیا ہوں تو وہاں کا نقشہ بیان کروں) تو اللہ تعالیٰ نے میری نگاہوں کے سامنے بیت المقدس کر دیا اور میں حجر میں کھڑے ہو کر اس کی نشانیاں ایک ایک کرکے اس طرح بیان کرنے لگا گویا میں اسے دیکھ رہا ہوں۔"

بعض مشرکین حضرت ابو بکرؓ کے پاس پہنچے اور ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی یہ باتیں بیان کیں۔ انہیں امید تھی کہ وہ ان باتوں کو ناممکن قرار دیں گے اور آپ کو جھٹلا دیں گے۔ لیکن انہوں نے فرمایا: "اگر واقعی محمد ﷺ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہوگا۔ میں تو اس سے بھی مشکل اور بعید چیز پر ان کی تصدیق کرتا ہوں۔"

جس رات میں یہ واقعہ پیش آیا اس کی صبح جبرئیل تشریف لائے اور رسول اللہ ﷺ کو نمازوں کے اوقات بتائے اور ان کی ادائیگی کا طریقہ سکھایا۔ نماز کی مشروعیت سے قبل آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح دو رکعت صبح اور دو رکعت شام کو ادا فرماتے تھے۔

---

۲۳ واقعہ اسراء و معراج کو تفصیل سے جاننے کے لیے صحیح مسلم، صحیح بخاری یا سنت صحیحہ کے کسی دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کیجیے اور 'معراج ابن عباس' جیسی کتاب پر قطعاً اعتماد نہ کیجیے، اس لیے کہ وہ جھوٹ اور بے بنیاد باتوں سے پُر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کا اس کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔

دروس و نتائج

ا۔ رسول اور معجزات ۔ ایک اہم نکتہ :

بعض محققین نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ کی تصویر کشی میں اس قدر مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ وہ عام انسانی زندگی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں خارقِ عادت امور اور معجزات نہیں پائے جاتے تھے۔ بلکہ آپؐ ان کا انکار کرتے تھے، ان کی پروا نہیں کرتے تھے اور ان کا مطالبہ کرنے والوں کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ معجزات اور خوارق آپ کی شان کے منافی ہیں اور آپ معجزات دکھانے پر قادر نہیں ہیں۔

اپنے اس دعویٰ پر یہ لوگ اس طرح کی آیات سے استدلال کرتے ہیں:

قُلْ اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ (الانعام۔۱۰۹)

ان سے کہو کہ نشانیاں تو اللہ کے اختیار میں ہیں۔

ایسی آیات سے قاری یا سامع کو گمان ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کی سیرت طیبہ ان معجزات اور نشانیوں سے بالکل خالی تھی جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ عموماً اپنے سچے انبیاء کی تائید فرماتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ نظریہ کہاں سے پیدا ہوا؟ اس سلسلے میں جب ہم غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ اصل میں یہ بعض مستشرقین اور غیر مسلم محققین گوستاف لوبون، اوگسٹ کانٹ، ھیوم اور گولڈ زیہر وغیرہ کا پیش کردہ نظریہ ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس نظریے کی اساس اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا معجزات کے خالق پر ایمان نہیں ہے۔

اگر اللہ عزوجل پر ایمان دل میں راسخ ہو جائے تو پھر ہر چیز پر ایمان آسان ہو جائے گا اور دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں بچے گی جس کو حقیقت میں معجزہ قرار دیا جا سکے۔

پھر عالم اسلام کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان سے اس نظریے کو کچھ مسلمانوں نے اختیار کیا۔ ان لوگوں نے اپنی تمام کوششیں اور تمام علوم ان بیرونی لوگوں کے افکار کا پرچار کرنے کے لیے وقف کر دیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یورپ کو حاصل ہونے والی سائنسی ترقی اور نشاۃ ثانیہ کے مظاہر کی چمک دمک نے انہیں اپنے دام میں اسیر بنا لیا تھا اور ان کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ ان

مسلمانوں میں سے شیخ محمد عبدہ، محمد فرید وجدی اور حسین ہیکل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پھر شکوک و شبہات پیدا کرنے والوں اور فکری یلغار کے علم برداروں نے غور کیا تو انہوں نے پایا کہ مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے اور ان پر فکری یلغار کرنے کے لیے خود ان مسلمانوں کے اقوال میں ایسی چیزیں ہیں جو ان کے لیے نئے میدان اور نئے آفاق وا کرتی ہیں۔ اور انہیں پرانے وسائل ـــ یعنی اسلامی عقیدے کے خلاف براہ راست جنگ اور دلوں میں الحادی افکار کی ترویج کے وسائل ـــ اختیار کرنے سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے بعض مخصوص اوصاف مثلاً شجاعت، عبقریت اور قیادت وغیرہ کو تعریف و تحسین کے انداز پر رواج دینا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی وہ آپ کی عام زندگی کی تصویر بڑھا چڑھا کر اس طرح پیش کرنے لگے کہ وہ عقل کے ادراک سے ماوراء معجزات اور خارق عادت چیزوں سے پرے معلوم ہو۔ تاکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ مسلمانوں کے ذہنوں میں نبی ﷺ کی ایک نئی تصویر راسخ کر سکیں، جو ایک عبقری، ایک قائد یا ایک ہیرو کی تصویر تو ہو لیکن کسی حال میں بھی نبی اور رسول کی تصویر نہ ہو۔ اس لیے کہ عبقریت اور ہیرو شپ جیسے القاب کو رواج دینے سے نبوت کے تمام حقائق جس میں وحی، غیبیات اور خوارق وغیرہ شامل ہیں، اساطیر و خرافات Mythology قرار پا جائیں گے۔ ان القاب کے رواج پا جانے کے بعد فطری طور پر یہی تصور قائم ہوگا کہ رسول ﷺ کے گرد مختلف لوگوں اور قوموں کے کثرت سے اکٹھا ہونے، آپ کے پرچم تلے آنے اور آپ کی دعوت کی اتباع کرنے کا سبب محض آپ کی عبقریت سے متاثر ہونا اور آپ کی زندگی میں قائدانہ خصوصیات کا پایا جانا تھا۔ دیکھیے! ان کا یہ مقصد ان کے اس عمل سے واضح ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کا ایک نیا نام Mohammadens وضع کیا ہے۔

لیکن اگر ہم منطقی اور معروضی طریقے پر حضرت محمد ﷺ کے معاملے، پیغام اور دعوت کی حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں تو اس کے سامنے یہ تخیل اور تصور کہیں ٹک نہیں سکتا۔ اس حقیقت پر ہم تین پہلوؤں سے روشنی ڈالتے ہیں:

اول: اگر ہم وحی کے مظہر میں غور کریں جو کہ آں حضرت ﷺ کی حیات طیبہ میں بہت نمایاں ہے (اس پر گزشتہ صفحات میں بہت تفصیل سے بحث آچکی ہے) تو دیکھیں گے کہ آپ

کی زندگی کا نمایاں ترین وصف بلا شک و شبہ نبوت ہے۔ اور نبوت کا شمار ان غیبی حقائق میں ہوتا ہے جو ہمارے محسوس پیمانوں کے ماتحت نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ خارقِ عادت معجزہ کا مفہوم آں حضرت ﷺ کی مبارک ہستی کی اصل میں موجود ہے، اس لیے آپ کی ذات سے معجزات و خوارق کے صدور کا انکار اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ خود نبوت کے مفہوم کو کالعدم نہ قرار دے دیا جائے اور اسے آپ کی زندگی سے خارج نہ کر دیا جائے۔ اور یہ چیز بدیہی طور پر خود دین کے انکار کے مساوی ہے۔ اگرچہ بعض مستشرق محققین نے اس نتیجے کی صراحت نہیں کی ہے اور انہوں نے رسول ﷺ کی ذہانت، عبقریت، شجاعت اور حکمتِ عملی کے تذکرے پر اکتفا کیا ہے، لیکن ان کا مقصد مقدمات وضع کرنا تھا۔ ان مقدمات کو تسلیم کرنے کے بعد نتیجہ تو خود بخود نکل آئے گا۔

بہت سے محققین اس نتیجے کو اپنے دلوں میں چھپائے نہ رکھ سکے، چنانچہ انہوں نے اس کی صراحت کر دی ہے۔ مثلاً شبلی شمیل کہ اس نے مذہب پر ایمان کو ناممکن الوقوع معجزے پر ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ [24]

اور یہ بات اچھی طرح واضح ہے کہ اگر دین کی اصل ہی مشکوک ہو جائے یا اس کا انکار کر دیا جائے تو معجزات کی جزئیات کے انکار یا اثبات کا مسئلہ ہی باقی نہیں رہے گا۔

دوم: اگر ہم آں حضرت ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور حالاتِ زندگی میں غور و تدبر کریں تو دیکھیں گے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر بہت سے معجزات ظاہر کیے تھے جنہیں تسلیم کرنے سے مفر نہیں اور جن کا انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایسی صحیح اور متواتر سندوں سے منقول ہیں جو فکر اور عقل کو قطعیت اور یقین کے درجے تک لے جاتی ہیں۔

مثال کے طور پر آپ کی مبارک انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہو جانا۔ اس واقعے کا تذکرہ امام بخاریؒ نے کتاب الوضوء میں، امام مسلمؒ نے کتاب الفضائل میں، امام مالکؒ نے موطا کی کتاب الطہارۃ میں اور دیگر ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں مختلف سندوں سے کیا ہے۔ زرقانیؒ نے قرطبیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے: ”آں حضرت ﷺ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹ پڑنے کا

[24] ڈاکٹر شبلی شمیل نے یہ بات بوکنز کی کتاب (جس میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی تشریح کی گئی ہے) کے عربی ترجمہ کے مقدمہ میں کہی ہے۔

واقعہ متعدد مواقع پر بہت بڑی جمعیت کے سامنے پیش آیا ہے اور بہت سی سندوں سے مروی ہے۔ان کے مجموعے سے معنوی تواتر کی بنا پر علم قطعی حاصل ہوتا ہے۔[۲۵]

یا مثلاً مشرکین کے مطالبے پر عہد نبوی میں چاند کے دو ٹکڑے ہو جانا۔اس روایت کو امام بخاریؒ نے کتاب احادیث الانبیاء میں، امام مسلمؒ نے کتاب صفۃ القیامۃ میں اور دیگر علمائے حدیث نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"اس سلسلے میں صحیح سندوں کے ساتھ متواتر احادیث مروی ہیں...اس چیز پر تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ واقعہ نبی ﷺ کے زمانے میں پیش آیا تھا۔اور یہ آپ کے روشن معجزات میں سے ہے۔[۲۶]

اسی طرح اسراء و معراج کا واقعہ بھی معجزہ ہے جس کے بارے میں ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔اس کے وقوع پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔اس کے ثبوت کی قطعیت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس پر جمہور مسلمانوں کا اجماع ہے کہ یہ آپ کے نمایاں ترین معجزات میں سے ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ لوگ جو رسول ﷺ کے لیے صفتِ عبقریت — صرف صفت عبقریت — کو رواج دینے سے نہیں تھکتے اور آپ کی حیاتِ طیبہ سے معجزات و خوارق کو الگ کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، وہ ان متواتر احادیث سے جو صحت کے معاملے میں قطعیت کے درجے تک پہنچی ہوئی ہیں، تجاہل برتتے ہیں اور ان کا، تائید یا تردید کسی مقصد سے تذکرہ نہیں کرتے۔گویا کتب احادیث میں ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، حالانکہ ان میں سے ہر واقعہ دس سے زائد سندوں سے مروی ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس تجاہل کا سبب اس پیچیدہ اشکال سے راہِ فرار اختیار کرنا ہے جو ان احادیث میں غور کرتے وقت ان کے سامنے آئے گا۔اس لیے کہ ان کے ذریعے اس نظریے کی کلیۃً تردید ہو جاتی ہے جو ان کے دماغ میں سمایا ہوا ہے۔[۲۷]

۲۵ دیکھیے موطا پر زرقانی کی شرح ۶۵/۱ ۲۶ دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۲۶۱/۴

۲۷ ان لوگوں میں سے ایک "حیاۃ محمد" کے مصنف بھی ہیں۔انہوں نے اس مضمون کی احادیث کے نتائج سے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش میں عجیب و غریب باتیں کہی ہیں تاکہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ان کے خیالی نظریہ کی "شفافیت" متاثر نہ ہونے پائے۔

سوم: معجزہ ایک ایسا لفظ ہے جس میں، غور و تدبر کرنے پر کوئی ذاتی معنی نہیں پائے جاتے، بلکہ اس سے محض اس کا نسبی مفہوم مراد ہوتا ہے۔لوگوں کی اصطلاح میں معجزہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو غیر معروف، غیر مروّج اور عادت سے خارج ہو۔ہر معروف اور مروّج چیز میں زمانہ گزرنے اور ثقافت اور عقل و شعور میں تبدیلی اور علوم میں ارتقاء کے ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ایک چیز جو کچھ زمانہ قبل تک معجزہ تھی، آج معروف اور مروّج ہو گئی ہے اور ایک چیز جو تہذیب و تمدن کے ماحول میں معروف و مروّج ہوتی ہے، غیر مہذب اور غیر متمدن لوگوں کے درمیان معجزہ میں بدل جاتی ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے جو ہر صاحبِ عقل کی سمجھ میں آجانے والی ہے کہ ہر چیز خواہ وہ معروف اور مروّج ہو یا غیر معروف اور غیر مروّج، اپنی اصل میں معجزہ ہے۔

سیارے معجزہ ہیں، افلاک کی حرکت معجزہ ہے، قانون کشش معجزہ ہے، جسم انسانی میں نظامِ اعصاب معجزہ ہے، نظامِ دورانِ خون معجزہ ہے، روح معجزہ ہے، بلکہ انسان کا پورا وجود معجزہ ہے۔فرانسیسی سائنسداں شاتوبریان کا یہ قول کتنا دقیق ہے کہ انسان مابعد الطبیعیاتی حیوان Metaphysic Animal ہے۔یعنی ایسا حیوان ہے جس کی حقیقت پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔لیکن چونکہ انسان ان چیزوں سے طویل عرصے سے مانوس ہے اور وہ برابر اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں اس لیے ان کا معجزہ ہونا وہ فراموش کیے ہوئے ہے۔اور اپنی جہالت اور غرورِ نفس کی بنا پر یہ گمان کرتا ہے کہ معجزہ صرف وہ چیز ہے جو مالوف اور معتاد کے برخلاف ہو...پھر اپنے اس گمان کو چیزوں پر ایمان اور ان کے انکار کی کسوٹی قرار دیتا ہے۔انسان نے تمدن اور سائنس کے میدان میں خواہ کتنی ترقی کر لی ہو لیکن وہ اس عجیب و غریب جہل میں مبتلا ہے۔

انسان اگر تھوڑا سا بھی غور کرے تو اس پر بخوبی واضح ہو جائے گا کہ جس معبود نے اس پوری کائنات کا معجزہ تخلیق کیا ہے اس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے کہ اس میں کسی دوسرے معجزے کا اضافہ کر دے، یا اس کائنات میں اس نے جو نظام قائم کیے ہیں ان میں کچھ تبدیلی کر دے۔انگریز مستشرق ولیم جونز نے غور و فکر کے بعد یہی بات کہی ہے:

"جس ہستی نے دنیا کو پیدا کیا ہے وہ اس بات سے عاجز نہیں ہے کہ اس میں سے کوئی چیز کم کر دے یا کسی چیز کا اضافہ کر دے، یہ کہنا آسان ہے کہ یہ چیز عقلی طور پر ناقابل

تصور ہے۔ لیکن یہ چیز اتنی ناقابلِ تصور نہیں ہے جتنا خود اس دنیا کا وجود۔"

یعنی اگر اس دنیا کا وجود نہ ہوتا اور اس وقت کسی ایسے شخص سے جو معجزات و خوارق کا منکر ہوتا اور ان کے وجود کا قائل نہ ہوتا، کہا جاتا: "ایسی ایسی خصوصیات کی ایک دنیا وجود میں آنے والی ہے" تو وہ فوراً بول اٹھتا ایسا ہونا ناقابل تصور ہے۔" اور اس کا یہ انکار اس سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوتا جتنی شدت سے وہ معجزے کا انکار کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کو اللہ سبحانہ کی جانب سے عطا کردہ معجزات کے بارے میں ہر مسلمان کو یہ چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔

۲۔ واقعہ معراج۔ حضور کی تکریم اور تجدیدِ عزیمت کا مظہر:

رسول اللہ ﷺ نے قریش کی جانب سے طرح طرح کی آزمائشیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ سب سے آخر میں آپ کو ان کی جانب سے ہجرت طائف کے موقعے پر تکلیف پہنچی جس کا بیان گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس وقت آپ نے ربیعہ کے بیٹوں کے باغ کے سائے میں آرام کرنے کے بعد اپنے رب سے جو دعا و مناجات کی تھی اس کے ذریعے ان جذبات و احساسات کا اظہار ہوتا ہے جو ہر بشر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی کمزوری کا احساس اور مددگار کی ضرورت۔ یہ انسان کی عبودیت الٰہی کا مظہر ہے۔ آپ کی اس التجا میں بارگاہ الٰہی میں شکوہ اور اس سے عافیت اور مدد کی شدید طلب کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ شاید آپ کو اندیشہ ہوا کہ جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں کہیں وہ اس وجہ سے تو نہیں ہیں کہ کسی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ سے ناراض ہو گیا ہے۔ اسی لیے آپ نے اپنی دعا میں یہ بھی عرض کیا: "اگر تو مجھ سے ناراض نہیں ہے تو پھر مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں۔"

اس کے بعد اسراء و معراج کا واقعہ پیش آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کی عزت و تکریم اور آپ کی عزیمت اور ثابت قدمی کی تجدید کا مظہر تھا۔ نیز یہ اس بات کی دلیل تھی کہ آں حضرت ﷺ کو اپنی قوم کی جانب سے جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ اللہ نے آپ کو چھوڑ دیا ہے، یا وہ آپ سے ناراض ہو گیا ہے بلکہ جو لوگ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور اللہ ان سے محبت کرتا ہے ان کے ساتھ یہ سنت الٰہی ہے۔ اور یہی ہر زمانے میں دعوتِ اسلامی کی سنت

۳۔ واقعہ اسراء سے مستنبط معانی:

بیت المقدس تک آں حضرت ﷺ کے سفر اور وہاں سے ساتوں آسمانوں میں آپ کی تشریف آوری کے درمیان زمانی تعلق سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ اس گھر کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظمت اور تقدس حاصل ہے۔ اس سے اس کا بھی واضح ثبوت ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم اور حضرت محمد بن عبداللہ علیہما الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات کے درمیان گہرا تعلق پایا جاتا ہے اور یہ کہ تمام انبیاء کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی دین کے ساتھ مبعوث کیا تھا۔

اس سے اس بات کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہر زمانے میں اور ہر آن اس ارضِ مقدس کی حفاظت اور بیرونی لوگوں اور دشمنانِ دین کے ناپاک ارادوں سے اس کی مدافعت کی کوشش کرنی چاہیے۔ گویا حکمتِ الٰہی اس زمانے کے مسلمانوں کو ہوشیار کر رہی ہے کہ اس مقدس سرزمین پر یہودی جارحیت کے سامنے کمزوری، بزدلی اور پست ہمتی کا مظاہرہ نہ کریں اور اسے ان کے ناپاک تسلط سے آزاد کر کے اس پر اہل ایمان کا قبضہ بحال کر دیں۔

کیا خبر، شاید اس عظیم واقعہ سے جذبہ پاکر صلاح الدین ایوبیؒ نے بے مثال شجاعت کا مظاہرہ کیا ہو اور اس مقدس خطے سے صلیبی حملوں کو روکنے کے سلسلے میں تمام کوششیں صرف کی ہوں اور انہیں ناکام و نامراد الٹے پاؤں واپس ہونے پر مجبور کر دیا ہو۔

۴۔ اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا ایک لطیف اشارہ:

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کی خدمت میں دو پیالے پیش کیے۔ ان میں سے ایک دودھ کا تھا اور دوسرا شراب کا۔ آپؐ نے دودھ کا پیالہ اٹھا لیا۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یعنی ایسا دین ہے جو اپنے عقیدے اور تمام احکام میں فطرت انسانی کے حقیقی تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جو انسان کی حقیقی فطرت سے ٹکراتی ہو۔ اگر فطرت ایک جسم ہوتی تو دین اسلام اس کا موزوں لباس ہوتا۔

یہ ہے اس چیز کا راز کہ یہ دین کیوں تیزی سے پھیلتا ہے اور لوگ اسے قبول کرنے کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھتے ہیں؟! اس لیے کہ انسان خواہ تہذیب و تمدن کے کتنے ہی مدارج طے کر لے اور اسے کتنی ہی مادّی آسائش حاصل ہو جائے لیکن وہ اپنی فطرت کے تقاضوں کی تکمیل

اور فطرت سے میل نہ کھانے والے تکلفات اور پیچیدگیوں کے طوق سے آزادی حاصل کرنے کی جانب مائل رہتا ہے۔ اور اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو فطرتِ انسانی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہل ہے۔

۵۔ اسراء اور معراج جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہوئے تھے:

اسراء اور معراج روح اور جسم دونوں کے ساتھ ہوئے تھے۔ اس پر متقدمین اور متاخرین تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے:

"صحیح بات یہ ہے جس کے اکثر لوگ، بیشتر علمائے سلف اور عام متاخرین فقہاء، محدثین اور متکلمین قائل ہیں کہ واقعہ اسراء آں حضرت ﷺ کے جسم اطہر کے ساتھ پیش آیا تھا۔ تمام آثار اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اور ان کے ظاہری مفہوم کو اس وقت تک ترک نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ کوئی دلیل نہ ہو۔ اور انہیں ظاہر پر محمول کرنا محال بھی نہیں ہے کہ تاویل کی ضرورت ہو۔" [۲۸]

علامہ ابن حجرؒ نے شرح بخاری میں لکھا ہے:

"اسراء اور معراج ایک ہی رات میں، بیداری کی حالت میں، آں حضرت ﷺ کے جسم اور روح دونوں کے ساتھ پیش آئے، جمہور علمائے حدیث، فقہاء اور متکلمین اسی کے قائل ہیں۔ صحیح روایات کا ظاہری مفہوم اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کو ترک کرنا مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ عقلی طور پر ایسا ہونا محال نہیں ہے کہ تاویل کی ضرورت ہو۔" [۲۹]

اسراء و معراج کے جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہونے کے پختہ دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ مشرکینِ قریش نے اس خبر کو بہت اہمیت دی تھی۔ اس پر تعجب کا اظہار کیا تھا اور فوراً اس کو جھٹلا دیا تھا۔ اگر یہ محض خواب کی بات ہوتی اور آں حضرت ﷺ نے ان کے سامنے محض ایک خواب کی حیثیت سے اس کی خبر دی ہوتی تو ان لوگوں کی جانب سے کسی تعجب، حیرت یا

۲۸ شرح نووی بر صحیح مسلم ۲/۳۹۰
۲۹ فتح الباری شرح صحیح بخاری ۷/۱۳۶-۱۳۷

تردید و تکذیب کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ اس لیے کہ خواب میں دکھائی دینے والی چیزیں حدود سے ماورا ہوتی ہیں۔ ایسے خواب مسلمان اور کافر سب دیکھ سکتے ہیں۔ اگر معاملہ یہ ہوتا تو وہ لوگ آپ کو آزمانے اور چیلنج کرنے کے مقصد سے، آپ سے بیت المقدس کا نقشہ اور اس کے دروازوں اور ستونوں کی تعداد نہ دریافت کرتے۔ رہا یہ سوال کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ اور عقل اس کا کیونکر تصور کرسکتی ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معجزہ ایسے ہی ہوا جیسے کائنات اور زندگی کے دیگر معجزات میں سے ہر معجزہ رونما ہوتا ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کائنات کے تمام مظاہر اپنی حقیقت کے اعتبار سے معجزہ ہیں۔ تو جس طرح عقل انہیں بہت آسانی سے تسلیم کرلیتی ہے اسی طرح اس معجزے کو بھی اسے بآسانی تسلیم کرلینا چاہیے۔

۶۔ "معراج ابن عباس"۔ موضوع روایات کا مجموعہ:

واقعہ اسراء و معراج کی تفصیلات جاننے کی کوشش میں "معراج ابن عباس" جیسی کتابوں سے دور رہنا چاہیے۔ یہ کتاب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اس میں ایسی موضوع احادیث ہیں جن کی کوئی اصل ہے نہ کوئی سند۔ کسی باطل پرست نے ان روایات کو اپنی جانب سے گھڑ کر حضرت ابن عباسؓ سے منسوب کردیا ہے۔ ہر تعلیم یافتہ بلکہ ہر صاحبِ عقل انسان جانتا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اس سے بری ہیں۔ انہوں نے معراجِ رسول کے موضوع پر کوئی کتاب تصنیف نہیں کی۔ بلکہ تصنیف و تالیف کی تحریک عہد اموی کے اواخر میں برپا ہوئی ہے۔

جب بدی کے علم برداروں کو اس کتاب کا علم ہوا اور انہوں نے اس میں رسول اللہ ﷺ سے منسوب ایسی جھوٹی باتیں پائیں جو بہت سے مسلمانوں کا ایمان متزلزل کرسکتی ہیں تو وہ اس کتاب کو رواج دینے اور اس کی تعریف و تحسین کرنے لگے۔ (ان لوگوں میں سے ایک ڈاکٹر لوِیس عوض ہیں اور تم کیا جانو کہ ڈاکٹر لوِیس عوض کون ہیں؟) یہ حضرت دیگر لوگوں سے قبل، بخوبی جانتے ہیں کہ اس کتاب کا انتساب حضرت ابن عباسؓ کی جانب غلط ہے اور اس میں درج احادیث باطل ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک جھوٹ اس وقت سچ میں بدل جاتا ہے جب وہ ایسی چیزوں پر مشتمل ہو جن سے مسلمانوں کے افکار پراگندہ ہو جائیں اور دین میں التباس پیدا ہو جائے۔

قبائل سے حضور ﷺ کی ملاقات اور انصار کے قبولِ اسلام کا آغاز

نبی ﷺ، اس پوری مدت میں، ہر سال ایام حج میں ان قبائل سے ملاقات کرتے تھے جو بیت اللہ الحرام کی زیارت کرنے کے لیے آتے تھے، اور ان کے سامنے کتاب اللہ کی تلاوت کرتے اور انہیں توحید کی دعوت دیتے تھے، لیکن کوئی آپ کی دعوت قبول نہ کرتا تھا۔

ابن سعد نے اپنی طبقات میں لکھا ہے:

”رسول اللہ ﷺ ہر سال حج کے موقعے پر، اسی طرح عکاظ، مجنۃ اور ذوالمجاز کے میلوں میں، ہر قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے اور قبیلہ والوں سے فرماتے کہ وہ آپ کی حمایت کریں، تاکہ آپ اپنے رب کا پیغام پہنچا سکیں۔ اس کی جزا میں وہ جنت سے بہرہ ور ہوں گے۔ لیکن کوئی آپ کی مدد کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ آپ ان سے فرماتے تھے ”لوگو، کہو: کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، کامیاب ہو جاؤ گے، عرب کا اقتدار تمہارے ہاتھوں میں ہوگا اور عجم تمہارے زیر نگیں ہوں گے، اور اگر تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں تم بادشاہ ہوگے“ آپ کے پیچھے پیچھے ابولہب ہوتا جو کہتا: ”اس کی بات نہ ماننا یہ گم راہ اور جھوٹا ہے“ چنانچہ لوگ اللہ کے رسول کی دعوت کو ٹھکرا دیتے اور آپ کو تکلیف پہنچاتے۔“ [۳۰]

ابن اسحاق نے زہری کے حوالے سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ بنی عامر بن صعصعہ

---

۳۰ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۱/ ۲۰۰-۲۰۱۔ ابن اسحاق نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام ۱/ ۴۲۳

کے پڑاؤ پر تشریف لے گئے، انہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی اور ان سے اپنی حمایت کا مطالبہ کیا۔ ان میں سے ایک شخص بحیرہ بن فراس نے کہا: ”اللہ کی قسم اگر قریش کے اس جوان کو میں اپنے ساتھ لے لوں تو اس کے ذریعے سے تمام عرب کو کھا جاؤں گا“، پھر اس نے آں حضرت ﷺ سے کہا: ”اگر ہم آپ کے کام میں آپ کا ساتھ دیں اور اللہ آپ کو مخالفین پر غالب کردے تو کیا آپ کے بعد حکومت ہماری ہوگی؟“ آپؐ نے فرمایا: ”یہ معاملہ تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ وہ جسے چاہے گا حکومت عطا کردے گا“ اس پر وہ بولا: ”تو کیا ہم آپ کی خاطر اپنے گلے عربوں کا نشانہ بننے کے لیے پیش کردیں اور جب اللہ آپ کو غلبہ عطا کردے تو اقتدار ہماری جگہ دوسروں کو ملے؟ جایئے، ہمیں آپ کی ضرورت نہیں۔“ [۳۱]

بعثت کے گیارہویں سال، زمانۂ حج میں آں حضرت ﷺ معمول کے مطابق قبائل سے ملاقات کے لیے نکلے۔ عقبہ کے قریب آپ کی ملاقات قبیلہ خزرج کے ایک گروہ [۳۲] سے ہوگئی جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے خیر مقدر کر رکھا تھا (عقبہ کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ اس سے مراد منیٰ اور مکہ کے درمیان وہ جگہ ہے جہاں سے جمرۃ العقبہ کی کنکریاں ماری جاتی ہیں) اس موقعے پر آپ کی ان سے یہ گفتگو ہوئی۔

حضور	:	تم لوگ کون ہو؟
ارکان قبیلہ	:	خزرج کے چند افراد
حضور	:	کیا یہود کے موالی ہو؟
ارکان قبیلہ	:	ہاں
حضور	:	کیا آپ لوگ بیٹھیں گے کہ میں آپ سے کچھ بات کروں؟
ارکان قبیلہ	:	کیوں نہیں، ضرور

چنانچہ وہ لوگ آں حضرت ﷺ کے پاس بیٹھ گئے، آپ نے انہیں اللہ عزوجل کی طرف دعوت دی، ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور انہیں قرآن سنایا۔

---

۳۱ سیرت ابن ہشام ۱/ ۴۲۵، تاریخ طبری ۲/ ۳۵۰

۳۲ اس گروہ میں چھ افراد تھے: اسعد بن زرارہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، اور جابر بن عبداللہ۔

ان لوگوں کے قبول اسلام پر تیار ہو جانے کا ایک سبب یہ تھا کہ ان کے علاقے میں یہود رہتے تھے جو اہل کتاب اور حامل علم تھے، چنانچہ جب ان کے اور یہود کے درمیان خصومت یا جنگ ہوتی تو وہ یہود کہتے تھے کہ عنقریب ایک نبی آنے والا ہے، ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تم کو اس طرح ہلاک کریں گے جیسے عاد و ارم ہلاک کیے گئے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں سے گفتگو کی اور انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے آپس میں کہا:

"بھائیو، اللہ کی قسم، جان لو کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد کے ڈراوے یہودی تمہیں دیا کرتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے سبقت لے جائیں۔"

پھر انہوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپ سے عرض کیا:

"ہم نے اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہ ہوگی جس میں ہم سے زیادہ باہمی عداوت پائی جاتی ہو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے ان کو جمع کر دے۔ ہم ان کے پاس واپس جاتے ہیں اور آپ کے معاملے کی طرف انہیں دعوت دیتے ہیں اور یہ دین ان کے سامنے پیش کرتے ہیں جسے ہم نے قبول کیا ہے۔ اگر اللہ نے ان کو آپ پر جمع کر دیا تو کوئی شخص آپ سے زیادہ طاقت ور نہ ہوگا۔"

پھر وہ لوگ واپس چلے گئے اور آئندہ سال حج میں ملنے کا وعدہ کر گئے۔ ۳۳

پہلی بیعت عقبہ

اس سال مدینہ میں اسلام پھیلا۔ اگلے سال حج کے موقعے پر انصار میں سے بارہ آدمی مکہ آئے اور آں حضرت ﷺ سے اسی عقبہ کے مقام پر ملے جہاں گذشتہ سال آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس موقعے پر آں حضرت ﷺ نے وہ بیعت لی جو 'بیعت نساء' کے نام سے مشہور ہے۔ (یعنی یہ بیعت ان دفعات پر مشتمل تھی جن پر آپ عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے، یعنی آپ

۳۳ ابن اسحاق نے یہ روایت عاصم بن عمر سے اور انہوں نے اپنی قوم کے بڑے بوڑھوں سے روایت کی ہے۔ نیز دیکھیے سیرت ابن ہشام ۱/۳۲۸

نے ان سے قتال و جہاد پر بیعت نہیں کی تھی۔ اصلاً بیعتِ نساء وہ بیعت ہے جو آپؐ نے فتح مکہ کے دوسرے دن کوہ صفا پر مردوں سے بیعت کر چکنے کے بعد عورتوں سے کی تھی) جو لوگ اس بیعت میں شریک تھے ان میں سے یہ افراد بھی تھے: اسعد بن زرارہ، رافع بن مالک، عبادہ بن الصامت، ابوالہیثم بن التیہان۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ نے اس بیعت کا واقعہ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم بارہ آدمی تھے۔ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آؤ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے، چوری نہ کرو گے، زنا نہ کرو گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لاؤ گے (یعنی کسی پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ گے) اور کسی اچھے کام میں میری نافرمانی نہ کرو گے، تم میں سے جس نے اس عہد کو پورا کیا اس کا اجر اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے گا۔ اور جس نے ان ممنوع کاموں میں سے کسی کا ارتکاب کیا اور اسے اس کی سزا دنیا ہی میں دے دی گئی تو وہ اس کا کفارہ ہو گی اور اگر اللہ نے اس پر پردہ ڈالے رکھا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، چاہے سزا دے چاہے معاف کرے۔"

حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں: "ان دفعات پر ہم نے آپؐ سے بیعت کی۔" ۳۴

جب ان لوگوں نے واپس ہونے کا ارادہ کیا تو آں حضرت ﷺ نے ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو بھیجا تاکہ ان کو قرآن کی تعلیم دیں، اسلام سکھائیں اور ان کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں۔ چنانچہ وہ "مقرئ مدینہ" کہلاتے تھے۔

دروس و نصائح

۱۔ نبی ﷺ کی جدوجہد کیوں کر ثمر بار ہونے لگی؟

یہاں غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے بعثت کے بعد کئی سال تک جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کے مزاج میں کیونکر تبدیلی ہونے لگی؟

۳۴ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب وفود الانصار و بیعۃ العقبہ، صحیح مسلم، کتاب الحدود۔ اس بیعت میں حضرت عبادہؓ کے شریک ہونے کے سلسلے میں طویل کلام کیا گیا ہے۔ اس کی تحقیق کے لیے دیکھیے فتح الباری میں اس حدیث کی تشریح۔

صبر پھل دینے لگا، جدوجہد بار آور ہونے لگی، دعوت کی کھیتی گدرانے اور اپنے تنے پر کھڑی ہونے لگی، تاکہ اس کے نتائج اور ثمرات ظاہر ہونے لگیں۔

لیکن دعوت کے ثمرات اور اس کے خوش آئند نتائج میں غور و خوض سے قبل، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ نبی کریم ﷺ نے مختلف قسم کی شدید تکلیفوں اور اذیتوں پر کیونکر صبر عظیم کا مظاہرہ فرمایا؟

ہم نے دیکھا کہ نبی ﷺ صرف اپنی قوم قریش تک ہی دعوت نہیں پہنچاتے تھے جو کہ آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں اور اذیتیں پہنچانے میں کچھ کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ بلکہ آپ حج کے موقع پر مختلف اطراف و جہات سے مکہ آنے والے قبائل کے پاس تشریف لے جاتے تھے، اپنے آپ کو ایک رہنما کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش کرتے تھے، انہیں دین کی قیمتی متاع اور توحید کے سرمایہ کی طرف دعوت دیتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہتا تھا۔ امام احمدؒ اور اصحاب سنن نے روایت کیا ہے اور حاکمؒ نے بھی اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ زمانۂ حج میں لوگوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے اور ان سے فرماتے تھے: "کیا کوئی ہے جو مجھے اپنی حمایت میں لے لے اور مجھے اپنے علاقے میں لے چلے، کیونکہ قریش نے مجھے اللہ کے پیغامات پہنچانے سے روک دیا ہے۔" ۳۵

گیارہ سال تک رسول ﷺ (میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں) ایسی زندگی گزارتے رہے جس میں کوئی راحت تھی نہ چین و سکون۔ ہر لحہ قریش آپ کو قتل کرنے کے منصوبے بناتے اور طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچاتے، لیکن اس سے آپ کی عزیمت میں کوئی کمی نہ آئی اور آپ کی قوت اور جدوجہد کمزور نہیں پڑی۔

گیارہ سال تک رسول اللہ ﷺ اپنی قوم، پڑوسیوں اور اردگرد کے تمام گروہوں اور قبیلوں کے درمیان زبردست اجنبیت کا شکار رہے۔ لیکن آپ پر مایوسی طاری ہوئی نہ پریشان ہوئے، اور نہ اپنے رب سے آپ کی انسیت میں کچھ فرق آیا۔

خدائے واحد کی راہ میں جدوجہد اور صبر پیہم کے گیارہ سال وہ قیمت تھی جس کی ادائگی ضروری تھی اور وہ راستہ تھا جس سے گزر کر اسلام کے سیل رواں کو مشرق و مغرب میں پھیل

۳۵ فتح الباری ۷/۱۵۶، زادالمعاد ۲/۵۰، مزید دیکھیے الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد ۲۰/۶۹

تھا۔ اس کے سامنے روم کی طاقت کو پامال ہونا اور فارس کی عظمت کو خاک میں ملنا تھا، اور مختلف نظاموں اور تہذیبوں کی قدروں کو فنا ہونا تھا۔

اللہ عزوجل کے لیے بہت آسان تھا کہ جدوجہد، صبر، مشقت اور پریشانی کی قیمت وصول کیے بغیر اسلامی معاشرے کی بنیادیں قائم کردے۔ لیکن بندوں کے معاملے میں اللہ کی سنت یہ نہیں ہے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ جس طرح ان میں اجباری طور پر اس کی عبودیت کی صفت پائی جاتی ہے اسی طرح وہ اختیاری طور پر بھی اس کی عبادت گزاری کریں۔ اور اس کی عبادت گزاری بغیر جدوجہد کے ممکن نہیں۔ اور بغیر تکلیفیں جھیلے یا اس کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کیے سچے مومن اور منافق کے درمیان امتیاز نہیں ہوسکتا۔ یہ بات قرین انصاف نہیں ہے کہ انسان مشقت تو کچھ نہ اٹھائے لیکن فائدے خوب حاصل کرے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو چیزوں کا مکلف ٹھہرایا ہے:

۱۔ اسلامی شریعت کو نافذ اور اسلامی معاشرے کو قائم کرے۔

۲۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کانٹوں سے بھرا، تکلیف دہ اور ناہموار راستہ اختیار کرے۔

اب ہم غور کریں گے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو گیارہ سال گزر جانے کے بعد اس کے کیا ثمرات حاصل ہوئے؟ ان کا کیا مزاج تھا؟ اور ان میں کیونکر اضافہ ہوا؟

۲۔ دعوت کے اثرات دور دراز علاقے میں ظاہر ہونے کی حکمت:

آں حضرت ﷺ اگرچہ مستقل اپنی قوم کے درمیان رہے اور ان کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا رہا، لیکن آپ کی دعوت کے متوقع نتائج قوم سے باہر دور دراز علاقے میں ظاہر ہوئے۔ کیوں؟

ہم نے اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی روشن حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اسلامی دعوت ایسا راستہ اختیار کرے کہ کسی شخص کے لیے اس کے مزاج اور سرچشمے میں شک و شبہ کرنے کی گنجائش نہ رہے، اس پر ایمان لانا آسان ہوجائے اور اس کے اور دیگر دعوتوں کے درمیان کچھ التباس نہ رہ جائے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ امی تھے، لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے۔ اسی لیے آپ کو ایسی ان پڑھ قوم میں بھیجا گیا تھا جس نے کسی تہذیب سے استفادہ کیا تھا نہ کسی مخصوص تمدن یا ثقافت سے آگہی حاصل کی تھی۔ اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اخلاق حسنہ، امانت و دیانت اور صدق و صفا کا نمونہ بنایا تھا۔

اسی لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ آپ کے اولین مددگار دوسری قوم اور دوسرے ماحول کے لوگ ہوں تاکہ کسی شخص کو یہ گمان نہ ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت درحقیقت ایک قومی دعوت تھی جس میں آپ کی قوم کی خواہشات اور آپ کے ماحول نے رنگ آمیزی کی تھی۔ حقیقت میں یہ ایک زبردست دلیل ہے جس سے غور و فکر کرنے والے پر یہ چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دعوتِ نبوی اور اس کے احوال کو ذاتِ الٰہی ہر چہار جانب سے گھیرے ہوئے تھی، تاکہ اس میں کہیں بھی کوئی ایسا شگاف نہ رہ جائے جس سے شکوک و شبہات پیدا کرنے یا فکری یلغار کرنے والا کوئی شخص نشانہ لگا سکے۔

یہی بات ایک غیر مسلم محقق نے کہی ہے۔ حاضر العالم الاسلامی کے مصنف نے "دینہ" کا یہ قول نقل کیا ہے:

"یہ مستشرقین جنہوں نے خالص یورپی اسلوب میں نبی (ﷺ) کی سیرت کا تنقیدی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی، تین چوتھائی صدی تک اپنے دعوی کے مطابق بحث و تحقیق اور تفتیش و تدقیق میں لگے رہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام مسلمان محققین نے متفقہ طور پر اپنے نبی کی سیرت جس انداز سے بیان کی ہے اسے باطل قرار دے دیں۔ ان سے توقع قائم کی گئی تھی کہ ان طویل "تحقیقات" کے نتیجے میں وہ سیرت نبوی کے سلسلے میں طے شدہ آراء کی عمارت ڈھادیں گے اور مشہور روایات کو جھٹلا دیں گے۔ لیکن کیا وہ اس میں کامیاب ہو سکے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ معمولی سی بھی کسی ایسی چیز کا اثبات نہ کر سکے جو نئی ہو۔ بلکہ اگر ہم ان جدید آراء کو بنظر غائر دیکھیں جنہیں ان مستشرقین نے پیش کیا ہے خواہ وہ فرانسیسی ہوں یا انگریز، جرمن ہوں یا بلجیکی یا ہالینڈی، تو ہم ان میں خلط مبحث اور تضاد پائیں گے۔ ان میں سے ایک کوئی بات کہتا ہے تو دوسرا اس کی تردید کرنے لگتا ہے۔"[۳۶]

۳۔ دعوت اسلامی کے لیے سرزمین مدینہ ہموار ہونے کے مظاہر:

انصار کے قبول اسلام کے آغاز کی جو کیفیت گزشتہ سطور میں بیان کی گئی ہے اس میں

۳۶ حاضر العالم الاسلامی ۱/ ۳۳

غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل نے مدینہ کی زندگی اور وہاں کے ماحول کو اسلامی دعوت کے لیے ہموار کر دیا تھا اور اہل مدینہ کے دلوں میں اس دین کو قبول کرنے کے لیے نفسیاتی آمادگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نفسیاتی آمادگی کے کیا مظاہر تھے؟

مدینہ منورہ کی آبادی ایسے افراد کا مجموعہ تھی جن میں کچھ اس کے اصلی باشندے تھے یعنی مشرکین عرب اور کچھ جزیرۃ العرب کے اطراف سے نقل مکانی کر کے وہاں بس گئے تھے یعنی یہود۔ مشرکین دو بڑے قبیلوں میں منقسم تھے: ایک اوس اور دوسرا خزرج۔ یہود کے تین قبیلے تھے: بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع۔ یہود نے اپنی عادت کے مطابق اوس اور خزرج کے قبیلوں کے درمیان بغض و کینہ کے بیج بونے کی کافی کوشش کی، جس کے نتیجے میں ان کے درمیان پے درپے متعدد جنگیں ہوئیں اور ان کا زبردست جانی نقصان ہوا۔ محمد بن عبدالوہاب نے اپنی کتاب مختصر سیرۃ الرسول میں لکھا ہے کہ "ان کے درمیان ایک سو بیس سال تک جنگ جاری رہی۔"[۳۷]

اس طویل مخاصمت کے دوران اوس اور خزرج میں سے ہر ایک نے یہود کے کسی قبیلے سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے۔ چنانچہ قبیلہ اوس نے بنو قریظہ کو اور خزرج نے بنو نضیر اور بنو قینقاع کو حلیف بنالیا۔ ان قبائل کے درمیان کئی خونریز معرکے برپا ہوئے جن میں سے آخری معرکہ یوم بعاث ہجرت سے چند سال قبل پیش آیا تھا۔ اس معرکے میں دونوں قبیلوں کے اکثر بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے۔

اس اثناء میں عرب اور یہود کے درمیان جب بھی کچھ کشیدگی پیدا ہوتی تو یہود عربوں کو دھمکی دیتے تھے کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ جب وہ آئے گا تو ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تم کو ایسا ماریں گے جیسے عاد و ارم مارے گئے تھے۔

ان حالات نے اہل مدینہ کو اس دین کا منتظر بنا دیا تھا اور انہوں نے اس سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں کہ شاید اس کی برکت سے ان کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو جائے، ان کا شیرازہ یکجا ہو جائے اور ان کے درمیان سے اختلاف و انتشار کے اسباب ختم ہو جائیں۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ "یہ حالات پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ اس طرح اس کے رسول کی مدینہ ہجرت کی راہ ہموار ہو جائے، اور مدینہ وہ مرکز بن جائے جہاں سے اسلام کی لہریں اٹھ کر روئے زمین کے گوشے گوشے میں پہنچ جائیں۔"[۳۸]

۳۷ مختصر سیرۃ الرسول ص: ۱۲۴ ۳۸ زاد المعاد ۲/ ۵۰ طبع الحلبی

۴۔ بیعت کے بعد مدینہ کے مسلمانوں کی ذمہ داریاں:

پہلی بیعت عقبہ کے موقعے پر مدینہ کے متعدد بڑے سرداروں نے اسلام قبول کرلیا تھا — جیسا کہ گذشتہ سطور میں ذکر کیا گیا — ان کے اسلام قبول کرنے کی کیا صورت تھی؟ اور اسلام قبول کرتے ہی ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوگئیں؟

ہم نے دیکھا کہ ان کے اسلام قبول کرنے کا مطلب محض زبان سے کلمہ شہادت کے دو بول کی ادائیگی نہ تھا۔ بلکہ وہ زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق سے عبارت تھا۔ پھر اس کے ساتھ وہ اس بیعت کے بھی پابند ہوگئے تھے جو رسول اللہ ﷺ نے ان سے لی تھی کہ وہ اسلام کے نظاموں، اس کے اخلاق اور اس کے عام اصول و مبادی کو قبول کرکے اپنی زندگی کو اسلامی رنگ میں رنگ دیں گے۔ آپؐ نے ان سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گے اور کسی اچھے کام میں، جس کا رسول اللہ ﷺ حکم دیں گے، وہ آپ کی نافرمانی نہ کریں گے۔

یہ ہیں اسلامی معاشرے کی وہ اہم بنیادیں جنہیں قائم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تھی۔ آپ کا کام یہ نہ تھا کہ بس لوگوں کو کلمہ شہادت کی تلقین کردیں، پھر انہیں چھوڑ دیں کہ وہ اسے اپنے منہ سے دہراتے رہیں، لیکن اپنے انحرافات، سرکشی اور مفاسد پر قائم رہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسان جب کلمہ شہادت کا اقرار کرلے، حلال کو حلال جانے، حرام کو حرام سمجھے اور فرائض پر ایمان لے آئے تو اس پر مسلمان کا اطلاق ہونے لگتا ہے، لیکن چونکہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق انسانی معاشرہ قائم کرنے، اس کے نظاموں اور اصول و مبادی کو بروئے کار لانے اور تمام معاملات میں حاکمیت کو صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے لیے خاص کرنے کا واحد ذریعہ ہے اس لیے جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان پایا جائے گا، ضروری ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر بھی ایمان ہو اور اس کی شریعت اور دستور کی اتباع کو بھی لازم سمجھا جائے۔

بعض لوگ وہ ہیں جن کے ذہن خود ساختہ نظاموں اور قوانین کے اسیر ہوگئے ہیں، لیکن وہ علانیہ اسلام کو ترک کردینے اور اس سے بے تعلق ہو جانے کا اظہار بھی کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا

رویہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ وہ اس کائنات کے خالق و مالک کے ساتھ ایسا معاملہ روا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو لین دین اور بارگیننگ (Bargaining) کے معاملہ کے مشابہ ہے۔

ان کی بارگیننگ یہ ہے کہ انہوں نے معاشرے کے مظاہر کو اپنے اور اسلام کے درمیان تقسیم کررکھا ہے۔ کچھ مظاہر تو وہ ہیں جن میں اسلام کا حکم اور اس کی مرضی چلتی ہے، مثلاً مساجد کا نظام اور تمام مظاہر عبادات، لیکن جہاں تک اس کے دیگر نظاموں، قوانین اور اخلاق کا تعلق ہے ان میں حسب مرضی انہیں تبدیلی کرنے کا پورا اختیار ہے۔

وہ سرکش لوگ جو اپنے ہی جیسے انسانوں کے معبود بنے بیٹھے تھے اور جنہوں نے پیغمبروں کی دعوت کو جھٹلایا تھا، اگر انہیں دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں اس دلچسپ حل کی خبر ہو جاتی اور وہ جان لیتے کہ اسے قبول کرکے انہیں نہ تو اپنی حاکمیت سے دست بردار ہونا پڑے گا اور نہ اپنے قوانین اور ضابطوں میں سے کسی چیز کو چھوڑنا پڑے گا تو وہ اس کے دائرے میں داخل ہونے اور اس کے سامنے خود سپردگی کا اظہار کرنے میں ذرا بھی سستی نہ دکھاتے اور زبان پر ایک کلمہ دہراتے رہنے اور چند مراسم ادا کرلینے پر بخوشی تیار ہو جاتے۔ لیکن انہیں بخوبی معلوم تھا کہ یہ دین سب سے پہلے ایک ایسے نئے نظام میں داخل ہونے کا مکلّف بناتا ہے جس میں قانون سازی کا اختیار صرف اللہ واحد کو ہے اور صرف اسی کا حکم چلتا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی۔ اور دعوت اسلامی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے۔

اسلام محض چند کلمات کا نام نہیں ہے جنہیں زبان سے دہرالیا جائے۔ اسی طرح وہ محض چند مراسم عبادات کا نام نہیں ہے جنہیں ادا کرنے سے اس کی تکمیل ہو جاتی ہو۔ یہ حقیقت درج ذیل آیت میں بیان ہوئی ہے:

> اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۔ (النساء: ۶۰)

اے نبی تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں۔ مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف

رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہِ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

۵۔ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے:

اس میں شک نہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ دعوتِ دین کی ذمہ داری سرانجام دے رہے تھے۔ وہ تمام انسانوں کی طرف بھیجے گئے اللہ کے رسول تھے۔ ان پر لازم تھا کہ اس کی دعوت اس کے بندوں تک پہنچائیں۔

لیکن جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوں کیا ان پر بھی اس دعوت کو عام کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟

اس سوال کا جواب ہمیں رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ملتا ہے۔ آپ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مدینہ کے ان بارہ نقباء کے ساتھ بھیجا کہ اہل مدینہ کو اسلام کی طرف دعوت دیں، انہیں قرآن پڑھنا سکھائیں، اس کے احکام بتائیں اور نماز کی تعلیم دیں۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے، انہیں قرآن سکھانے اور ان تک اللہ کے احکام پہنچانے لگے۔ آدمی ان کے پاس اس حال میں آتا کہ اس کے ہاتھ میں نیزہ ہوتا اور اس کی نیت انہیں قتل کرنے کی ہوتی، لیکن جوں ہی وہ اس کے سامنے کتاب اللہ کی کچھ آیتوں کی تلاوت کرتے اور اسلام کے بعض احکام بیان کرتے وہ نیزہ زمین پر ڈال دیتا، اسلام قبول کرکے اور شرک سے توبہ کرکے ان کا ہم نشیں بن جاتا اور قرآن اور اسلامی احکام سیکھنے لگتا۔ اس طرح اسلام مدینہ کے تمام گھروں میں پہنچ گیا اور وہاں کے باشندوں کے درمیان صرف اسی کا چرچا ہونے لگا۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ مصعب بن عمیرؓ کون تھے؟

یہ مکہ میں سب سے زیادہ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے اور قیمتی اور زرق برق پوشاک زیب تن کرنے والے نوجوان تھے۔ لیکن جب یہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تو اپنی عیش و تنعم کی زندگی تج دی اور رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر دعوت اسلامی کی راہ پر گامزن ہوگئے، ہر طرح کی تکلیف برداشت کی، ہر قسم کا عذاب انگیز کیا، یہاں تک کہ غزوۂ احد میں جام شہادت

نوش کرلیا۔ اس وقت ان کے پاس صرف ایک ہی کپڑا تھا۔ لوگوں نے اس کے ساتھ ان کی تکفین کرنی چاہی تو جب وہ ان کا سر ڈھکتے تھے تو پیر کھل جاتے تھے اور پیر ڈھکتے تھے تو سر باہر نکل جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ ان کی نوجوانی کی عیش و عشرت کی زندگی کو یاد کرکے رو پڑے، پھر فرمایا: "سر ڈھک دو اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دو۔"[۳۹]

دعوت اسلامی کا کام صرف انبیاء اور رسولوں کے ساتھ خاص نہیں ہے اور نہ ان کے خلفاء اور وارثین یعنی علماء کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ اسلام کی دعوت خود اسلام کی حقیقت کی ایک ناقابل تقسیم اکائی ہے۔ اس کی ذمہ داری سرانجام دینا ہر مسلمان پر لازم ہے جس سے اس کو مفر نہیں، خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو، کوئی بھی کام کرتا ہو اور کسی بھی پیشے سے وابستہ ہو۔ دعوت کی حقیقت بس یہ ہے کہ نیکیوں کا حکم دیا جائے اور برائیوں سے روکا جائے (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) اس میں جہاد کی تمام صورتیں شامل ہیں۔ اور یہ بات پوشیدہ نہیں کہ جہاد اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے اور اس کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی معاشرے میں "مذہبی شخصیات" کی اصطلاح کا کوئی مفہوم نہیں ہے کہ اس کا اطلاق مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ پر کیا جائے۔ اس لیے کہ جو شخص بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ اس دین کی راہ میں جہاد کرنے پر اللہ اور اس کے رسول سے بیعت کرتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، عالم ہو یا جاہل، کسی بھی حالت میں ہو اور کوئی بھی پیشہ اختیار کیے ہوئے ہو۔ گویا تمام مسلمان اس دین کے مردان کار ہیں۔ اللہ نے جنت کے بدلے ان سے ان کی جان اور مال خرید لیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کے دین کی اقامت اور اس کی شریعت کی حمایت کی راہ میں لگائے رہتے ہیں۔

اس کا مطلب علماء کی خدمات کا انکار نہیں ہے۔ وہ بحث و تحقیق اور اجتہاد کرتے ہیں، مسلمانوں کو دین کے احکام و مسائل سے روشناس کراتے ہیں، زندگی میں درپیش مشکلات کا ابدی شریعت کے نصوص کی روشنی میں حل پیش کرتے ہیں۔ ان کی یہ خدمات قابل قدر ہیں لیکن ان کا اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

۳۹ صحیح مسلم ۳/ ۴۸، نیز دیکھئے الاصابہ، ابن حجر ۳/ ۴۰۳

دوسری بیعتِ عقبہ

اگلے سال حج کے موقعے پر حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ واپس آئے تو ان کے ساتھ مدینہ کے اسلام قبول کرنے والوں کی بڑی تعداد تھی۔ یہ لوگ اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے اپنی قوم کے مشرکین کے ساتھ حج کے لئے نکلے تھے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ ہم ایام تشریق کے بیچ والے روز عقبہ میں آپ سے رات میں ملاقات کریں۔ جب ہم حج سے فارغ ہوئے اور وہ رات آئی تو ہم اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ اپنے پڑاؤ پر سوئے۔ یہاں تک کہ جب ایک تہائی رات گزر گئی تو آپؐ سے ملنے کے لیے خفیہ طور پر، بلی کی طرح دبے پاؤں وہاں سے نکلے، عقبہ کے پاس ایک گھاٹی میں سب لوگ اکٹھا ہوئے۔ اس وقت ہم ۷۳ مرد تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں تھیں: نسیبہ بنت کعب اور اسماء بنت عمرو بن عدی۔"

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: "ہم لوگ گھاٹی میں اکٹھا ہو کر رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرنے لگے۔ آپ اپنے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ تشریف لائے۔ لوگوں نے آپ سے گفتگو کی اور عرض کیا" آپ اپنے لیے اور اپنے رب کے لیے جو عہد ہم سے لینا چاہیں لے لیں" رسول اللہ ﷺ نے جوابی تقریر فرمائی۔ آپ نے قرآن کی تلاوت کی، اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام کی طرف رغبت دلائی، پھر فرمایا: "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حمایت و حفاظت کرو گے جس طرح خود اپنے بال بچوں کی کرتے ہو۔"

براء بن معرورؓ نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کیا: "جی ہاں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ ہم آپ کی ہر اس چیز سے حفاظت کریں گے جس

سے ہم خود اپنی جان اور اپنی آل اولاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس اے اللہ کے رسول ہم سے بیعت لیجئے۔ ہم جنگ آزما لوگ ہیں۔ ہم نے اپنے باپ دادا سے اس کو وراثت میں پایا ہے۔"

بیچ میں بات کاٹ کر ابوالہیثم بن التیہانؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول، ہمارے اور دوسرے لوگوں (یعنی یہود) کے درمیان حلیفانہ تعلقات ہیں جن کو اب ہم کاٹ دینے والے ہیں، اس کے بعد کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ جب اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم میں واپس تشریف لے جائیں؟"

رسول اللہ ﷺ نے مسکرا کر جواب دیا: "نہیں، بلکہ اب تمہارا خون میرا خون ہے اور تمہاری عزت کی پامالی میری عزت کی پامالی ہے۔ میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو۔ جس سے تمہاری لڑائی اس سے میری لڑائی اور جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح۔"

اس موقعے پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اپنے اندر سے مجھ کو بارہ نقیب منتخب کر کے دو جو اپنے اپنے قبیلے کے ذمہ دار ہوں" اس ارشاد کے مطابق سب نے بارہ نقیب تجویز کر دیئے: نو خزرج میں سے اور تین اوس میں سے۔ ان نقیبوں سے آپؐ نے فرمایا: تم لوگ اپنی قوم کے اسی طرح کفیل ہو جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کفیل تھے اور میں اپنی قوم کا کفیل ہوں۔"

رسول اللہ ﷺ کے دست مبارک پر سب سے پہلے حضرت براء بن معرورؓ نے، پھر دوسرے لوگوں نے بیعت کی۔

جب ہم سب رسول اللہ ﷺ سے بیعت کر چکے تو آپؐ نے فرمایا: اب تم لوگ اپنی قیام گاہوں کی طرف واپس چلے جاؤ۔"

اس موقعے پر حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہؓ نے کہا: "اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم کل اپنی تلواروں کے ساتھ اہل منیٰ پر حملہ کر دیں" آں حضرت ﷺ نے جواب دیا: "ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ ابھی تم لوگ اپنے پڑاؤ پر واپس جاؤ۔"

ہم اپنی قیام گاہوں پر واپس آ کر سو گئے۔ (اسی رات قریش کو اس ملاقات کی بھنک لگ گئی) صبح ان کے سر برآوردہ لوگ ہمارے پڑاؤ پر آئے اور کہنے لگے: "اے گروہ خزرج، ہمیں خبر ملی ہے کہ تم ہمارے اس آدمی (یعنی رسول اللہ) سے ملے ہو اور تمہارا ارادہ اسے ہمارے یہاں

سے نکال لے جانے کا ہے اور تم اس سے ہمارے خلاف جنگ کی بیعت کر رہے ہو۔ اللہ کی قسم عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہیں ہے جس سے لڑنا ہمیں تمہارے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ ناگوار ہو۔"

اس پر ہماری قوم میں سے جو لوگ مشرک تھے انہوں نے اٹھ کر بحلف کہا: "ایسا نہیں ہوا ہے اور ہمیں اس کا کوئی علم نہیں" یہ بات کہنے میں وہ سچے تھے کیونکہ واقعی انہیں اس کا علم نہ تھا۔ اور ہم لوگ ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں دیکھتے رہے۔"

(قریش کو ان جوابات سے اطمینان نہ ہوا۔ وہ برابر ٹوہ میں لگے رہے) یہاں تک کہ جب لوگ منیٰ سے اپنے اپنے علاقوں کی طرف کوچ کر گئے تب انہیں پتا چلا کہ واقعی یہ معاملہ ہوا ہے۔ انہوں نے ہمارا پیچھا کیا، یہاں تک کہ سعد بن عبادہؓ اور منذر بن عمروؓ کو اذاخر[۴۰] میں جالیا۔ یہ دونوں نقیب تھے۔ منذر تو ان سے بچ نکلے لیکن سعد کو انہوں نے پکڑ لیا۔ ان کے ہاتھ کجاوہ کی ڈوری کے ذریعے گردن سے باندھ دیے اور ان کو مارتے پیٹتے اور سر کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے مکہ لے گئے (ان کے سر میں بہت بال تھے)

حضرت سعدؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم میں ان کے ہاتھوں میں گرفتار تھا اور وہ مجھے گھسیٹ رہے تھے کہ ان میں سے ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھ سے کہا "بندۂ خدا۔ کیا تیرے اور قریش کے کسی شخص کے درمیان جوار (پناہ) کا کوئی تعلق اور کوئی عہد نہیں ہے؟" میں نے کہا: "ہاں کیوں نہیں، واللہ میں اپنے علاقے میں جبیر بن مطعم اور حارث بن امیہ کے تاجروں کو پناہ دیتا رہا ہوں اور کسی کو ان پر ظلم کرنے نہیں دیا ہے" اس نے کہا: "تو ان کا نام لے کر دہائی دو" چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔" مطعم بن عدی اور حارث بن امیہ کو پتا چلا تو آئے اور انہوں نے حضرت سعدؓ کو ان لوگوں سے چھڑا لیا۔

ابن ہشام کا بیان ہے: "جب اللہ نے اپنے رسول کو قتال کی اجازت دے دی اس وقت آپ نے اپنے اصحاب سے جو بیعت لی اس کی شرائط پہلی بیعتِ عقبہ کی شرائط سے زائد تھیں۔ پہلی بیعت عقبہ کو "بیعت النساء" کہتے ہیں، اس لیے کہ اس وقت تک اللہ نے اپنے رسول کو جنگ کی اجازت نہیں دی تھی۔ پھر جب آپ کو اس کی اجازت مل گئی تو آپ نے اپنے اصحاب

---

[۴۰] اذاخر مکہ سے قریب ایک مقام ہے۔

گورے اور کالے تمام لوگوں سے جنگ پر بیعت لی، اور اس عہد کو پورا کرنے پر ان سے جنت کا وعدہ کیا۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے ہم سے جنگ کی بیعت لی۔ اور عہد لیا کہ ہم ہر حال میں سمع وطاعت کا مظاہرہ کریں گے، چاہے ہم تکلیف میں ہوں یا فراخی میں، کوئی حکم ہمیں پسند ہو یا ناگوار ہو، چاہے ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے۔ اور ہم کسی معاملے میں اس کے اہل لوگوں سے جھگڑا نہیں کریں گے اور حق بات کہیں گے، خواہ کہیں بھی ہوں۔ اور اللہ کے معاملے میں کسی شخص کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔"

جنگ کی اجازت کے سلسلے میں سب سے پہلے سورۂ حج کی یہ آیات نازل ہوئیں:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ، الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ، وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ، وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ، إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الحج:۳۹-۴۰)[۴۱]

اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے، صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے" اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔ اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس (کے دین) کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقت ور اور زبردست ہے۔

دروس ونصائح

۱۔ دونوں بیعتوں میں فرق:

عقبہ کی یہ دوسری بیعت اپنے جوہر میں پہلی بیعت کے مثل ہے۔ ہر ایک میں رسول اللہ

---

[۴۱] سیرت ابن ہشام، مسند احمد، طبری، تمام لوگوں نے اس سلسلے میں ابن اسحاق پر اعتماد کیا ہے جنہوں نے اسے معبد بن کعب بن مالک سے روایت کیا ہے۔

ﷺ کے روبرو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کیا گیا اور اللہ کے دین کے لیے سمع و طاعت اور اخلاص اور اس کے رسول کے احکام کی بجاآوری پر عہد و میثاق لیا گیا۔ لیکن ان دونوں بیعتوں کے درمیان دو اہم فرق نظر آتے ہیں جن پر غور کرنے اور ان کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلا فرق: یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اہل مدینہ میں سے بیعت کرنے والوں کی تعداد بارہ تھی جب کہ دوسری بیعت کے موقعے پر ان کی تعداد ستر سے زائد ہو گئی تھی جن میں دو عورتیں بھی تھیں۔

پہلے سال وہ بارہ افراد لوٹے۔ ان کے ساتھ حضرت مصعب بن عمیرؓ بھی تھے— تو ان میں سے ہر ایک اپنے آپ میں مگن نہیں رہا اور اپنے گھر میں نہیں بیٹھ رہا، بلکہ اس نے اپنے ارد گرد کے مردوں اور عورتوں کو اسلام کا مژدہ سنایا، ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی، اس کے احکام کی وضاحت اور اسلامی نظام کی تشریح کی۔ اس طرح ان کی کوششوں سے اس سال مدینہ میں اسلام بہت تیزی سے پھیلا، یہاں تک کہ کوئی گھر نہیں بچا جس میں اسلام نہ پہنچ گیا ہو۔ وہ ہمہ وقت ان کی گفتگو کا موضوع بن گیا اور وہ اس کی خصوصیات اور احکام جاننے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر زمانے میں اور ہر جگہ یہی ہر مسلمان کا مشن ہونا چاہیے۔

دوسرا فرق: یہ ہے کہ پہلی بیعت جن دفعات پر مشتمل تھی ان میں جہاد بالقوۃ کی جانب کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، جب کہ دوسری بیعت میں نہ صرف اشارہ موجود ہے بلکہ یہ صراحت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا دفاع کرنے کے لیے جہاد کرنا ہوگا اور اس کے دین کی طرف دعوت دینے کے لیے تمام وسائل اختیار کرنے ہوں گے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ پہلی مرتبہ بیعت کرنے والے رسول اللہ ﷺ سے یہ وعدہ کر کے اپنے گھروں کو لوٹے تھے کہ وہ اگلے سال پھر اسی جگہ ملیں گے، تاکہ زیادہ بڑی تعداد میں مسلمانوں کو لے کر آئیں اور اس وقت آپ سے عہد اور بیعت کی تجدید کریں۔ اس وقت قتال پر بیعت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اولاً ابھی اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی، ثانیاً بیعت کرنے والوں نے ایک سال کے بعد دوبارہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

گویا پہلی بیعت ایک عارضی بیعت تھی جس میں تمام دفعات شامل نہیں تھیں، اس میں صرف وہی دفعات تھیں جن پر آں حضرت ﷺ بعد میں عورتوں سے بیعت لیا کرتے تھے، اس

لیے وہ 'بیعۃ النساء' کے نام سے مشہور ہوئی۔

رہی دوسری بیعت جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت فرمائی تھی، تو وہ ان تمام اصول و مبادی پر مشتمل تھی جن کی مشروعیت کی تکمیل ہجرتِ مدینہ کے بعد ہوئی تھی۔ ان میں سر فہرست جہاد اور بذریعہ قوت دعوتِ اسلامی کا دفاع تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اگرچہ اس حکم کو مشروع نہیں کیا تھا لیکن اس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو بتا دیا تھا کہ مستقبل میں اس کی مشروعیت ہونے والی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قتال کی مشروعیت صحیح قول کے مطابق آں حضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے بعد ہوئی۔ ابن ہشام کے بیان سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جہاد کی مشروعیت ہجرت سے قبل دوسری بیعتِ عقبہ کے موقعے پر ہوئی، لیکن یہ شبہ صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اس بیعت کی دفعات میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس وقت قتال کی مشروعیت پر دلالت کرے۔ نبی ﷺ نے اس وقت اہلِ مدینہ سے جہاد کا عہد، مستقبل کے پیش نظر، جب آپ مدینہ ان کے پاس ہجرت کر جائیں، لیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت عباس بن عبادہؓ نے بیعت کے بعد عرض کیا: "اللہ کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم کل اپنی تلواروں کے ساتھ اہل منیٰ پر حملہ کر دیں" تو رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: "ہمیں اس کا حکم نہیں دیا گیا ہے، تم لوگ اپنے پڑاؤ پر واپس جاؤ۔"

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جہاد اور اس کی مشروعیت سے متعلق سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ. (الحج۔۳۹)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

ترمذی اور نسائی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "جب نبی ﷺ کو مکہ سے نکال دیا گیا تو حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. یہ لوگ ہلاک ہو کر رہیں گے۔" حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ

لقدیر" ابو بکرؓ نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں جان گیا کہ اب عنقریب جنگ ہونے والی ہے۔" ۴۲

جہاد بالقوۃ کی مشروعیت اتنے عرصے تک کیوں مؤخر رہی؟ اس کی متعدد حکمتیں تھیں:

۱۔ مناسب بات یہ تھی کہ قتال سے پہلے اسلام کا تعارف ہو، اس کی طرف دعوت دی جائے، اس کی حقانیت پر دلائل و براہین قائم کیے جائیں، اس کے فہم کے راستے میں جو مشکلات ہوں انہیں حل کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ راہِ جہاد کے اولین مراحل ہیں۔ اس لیے ان کی انجام دہی فرض کفایہ ہے اور اس کی ذمہ داری میں تمام مسلمان شریک ہیں۔

۲۔ اپنے بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا تھا کہ وہ ان پر قتال کا بار اس وقت تک نہ ڈالے جب تک کہ کوئی علاقہ دارالاسلام نہ بن جائے، جس کی حیثیت قلعہ کی ہو جہاں وہ پناہ لے سکیں — مدینہ منورہ پہلا دارالاسلام بن گیا تب انہیں اس کا حکم دیا گیا۔

۲۔ جہاد — مشروعیت اور مراحل:

جہاد کا تذکرہ آگیا ہے اور آئندہ صفحات میں بھی اس سے متعلق تفصیلی بحثیں آئیں گی، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں تھوڑا سا توقف کریں تاکہ جہاد اور اس کی مشروعیت اور مراحل سے متعلق صحیح تصور سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

جہاد کے موضوع پر گفتگو سے ماضی میں فکری یلغار کرنے والوں کو بہت دلچسپی رہی ہے اور اب بھی ہے۔ اس کے ذریعے وہ چاہتے ہیں کہ حق اور باطل گڈمڈ ہو کر رہ جائیں۔ اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اس دین حنیف کے قلعے میں شگاف پڑ جائیں، لوگ اس کے بارے میں شکوک میں مبتلا ہو جائیں اور اس کی نیک نامی پر حرف آجائے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ ان لوگوں نے اپنا پورا زور خاص طور پر صرف جہاد ہی پر کیوں صرف کیا ہے؟ آپ کا تعجب رفع ہو جائے گا اگر آپ جان لیں کہ اسلام کا سب سے اہم اور اس کے دشمنوں کی نظر میں سب سے خطرناک رکن یہی "جہاد" ہے۔ اس کا نام آتے ہی ان پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور وہ دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کا یہ رکن اگر مسلمانوں

۴۲ النسائی ۲/۵۲، تفسیر ابن کثیر ۳/۲۲۴

کے دلوں میں بیدار ہو جائے اور اسے ان کی زندگی میں اثر و نفوذ حاصل ہو جائے تو کوئی بھی طاقت، خواہ وہ کتنی ہی زبردست ہو، اسلامی غلبہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لیے اسلامی مد کو روکنے کے لیے کوئی بھی کام انجام دینے کا آغاز خاص طور سے اسی نقطہ سے ہونا چاہیے۔

یہاں ہم پہلے یہ واضح کریں گے کہ اسلام میں جہاد کا مفہوم اور اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کے مراحل کیا ہیں؟ پھر اس چیز کی وضاحت کی کوشش کریں گے کہ اس کے مفہوم میں کیا مغالطے شامل ہو گئے ہیں؟ اور کھینچ تان کر اس کی بے جا طور پر کیا تقسیمیں کر لی گئی ہیں؟

"جہاد" کا مطلب ہے اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرنا۔ قتال کے ذریعے جدوجہد اس کی ایک قسم ہے۔ رہا اس کا مقصد تو وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آجائے اور صحیح اسلامی حکومت تشکیل پا جائے۔

آغازِ اسلام میں جہاد — جیسا کہ ہم جانتے ہیں — پُرامن دعوت اور اس کی راہ میں آنے والی آزمائشوں اور تکلیفوں میں جمے رہنے تک محدود تھا۔ پھر ہجرت کے آغاز سے اس میں دفاعی جنگ بھی شامل ہو گئی یعنی ہر طاقت کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

اس کے بعد ان تمام لوگوں سے جنگ کا پہلو بھی اس میں شامل ہو گیا جو اسلامی معاشرہ کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔ ملحدین، بت پرست اور مشرکین سے اسلام سے کم پر کوئی بات نہیں کی گئی۔ اس لیے کہ صحیح اسلامی معاشرہ اور الحاد یا بت پرستی کے درمیان موافقت اور ہم آہنگی ممکن نہ تھی۔ رہے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) تو ان کا اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت کے ماتحت رہنا کافی سمجھا گیا۔ ان پر بس یہ لازم کیا گیا کہ وہ حکومت کو "جزیہ" ادا کرتے رہیں جس طرح مسلمان زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔*

اس آخری مرحلے میں آکر اسلام میں جہاد کے حکم میں ٹھہراؤ آگیا۔ ہر زمانے کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ جب ان کے پاس طاقت ہو اور وہ ضروری سازوسامان سے لیس ہوں

☆ اس سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ جزیہ کی وہی حیثیت ہے جو زکوٰۃ کی ہے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے لیے لازم ایک مالی عبادت ہے۔ اس کے بموجب انہیں ضرورت سے زائد اپنے مال کے ایک سال گزر جانے پر اس کا ڈھائی فیصد نکالنا ہوتا ہے۔ جب کہ جزیہ اسلامی حکومت اپنے ماتحت رہنے والے اہل کتاب سے ان کی حفاظت کے بدل کے طور پر وصول کرتی ہے۔ اس کی رقم متعین ہوتی ہے۔ (مترجم)

تو جہاد کریں۔ اسی مرحلے کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبہ۔ ۱۲۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جنگ کرو ان منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

اور اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا ہوں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ نہ کہہ دیں۔ جب وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیں تو ان کے مال اور جانیں محفوظ ہو جائیں گی، ان پر کوئی ناروا ظلم نہ ہوگا اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔" ۴۳

اس سے واضح ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کو دفاعی جنگ اور اقدامی جنگ میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ جہاد کی مشروعیت کا دارومدار نہ دفاع برائے دفاع پر ہے نہ اقدام برائے اقدام پر۔ جہاد کا دارومدار اس ضرورت پر ہے کہ اسلامی معاشرے کو کامل شکل میں تمام اسلامی اصول ومبادی اور نظاموں کے ساتھ قائم کیا جائے۔ اب چاہے اس کے لیے اقدام کرنا پڑے یا دفاع، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

رہا شروع دفاعی قتال مثلاً مسلمان کا اپنے مال، آبرو، جائیداد یا جان کا دفاع کرنا تو یہ قتال کی ایک دوسری قسم ہے جس کا اصطلاحی جہاد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے "قتال صائل" (ظالم سے قتال) کہا جاتا ہے۔ فقہاء نے کتبِ فقہ میں اس کا مستقل باب قائم کیا ہے۔ آج کل کے بیشتر محققین اس میں اور جہاد میں (جس سے ہم یہاں بحث کر رہے ہیں) خلطِ مبحث کردیتے ہیں۔ یہ ہے اسلامی شریعت میں جہاد کے مفہوم اور مقصد کا خلاصہ۔

رہے مغالطے اور تحریفات جو جہاد کے سلسلے میں کی گئی ہیں تو انہیں دو نظریات کی شکل میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ دونوں نظریات اگرچہ بظاہر باہم متضاد ہیں لیکن حقیقت میں ان دونوں کے درمیان پوری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک کے ذریعے

۴۳ بخاری ومسلم

ایک ہی نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جہاد کی مشروعیت اب باقی نہیں رہی۔

پہلا نظریہ وہ ہے جو اعلان کرتا ہے کہ اسلام صرف تلوار کے ذریعے پھیلا ہے اور نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب نے جبر واکراہ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان کے ہاتھوں اسلامی فتوحات ظلم وجبر کے نتیجے میں ہوئی ہیں۔ ان کا سبب یہ نہیں تھا کہ لوگوں کو اسلام کی حقانیت پر اطمینان ہوگیا ہو اور وہ از خود حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ہوں۔ ۴۴

رہا دوسرا نظریہ تو وہ پہلے نظریے کے بالکل برعکس ہے۔ اس کے مطابق اسلام امن و سلامتی اور محبت والفت کا دین ہے۔ اس میں جہاد کی مشروعیت صرف اس صورت میں ہے جب کھلی جارحیت کا جواب دینا مقصود ہو۔ اہل اسلام صرف اسی وقت جنگ کرتے ہیں جب انہیں اس پر مجبور کردیا جائے اور ان سے مبارزت طلبی کی جائے۔

باوجود یہ کہ یہ دونوں نظریے باہم متضاد ہیں — جیسا کہ ہم نے ذکر کیا — لیکن فکری یلغار کرنے والے ان دونوں کے ذریعے ایک خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں، جو ان دونوں مفروضوں میں سے ہر ایک سے مطلوب ہے۔ یہ بات کچھ تفصیل کی متقاضی ہے۔

پہلے انہوں نے اس بات کی خوب تشہیر کی اور اسے خوب رواج دیا کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو دوسروں پر ظلم ڈھاتا اور ان سے نفرت کرتا ہے، پھر انتظار کیا یہاں تک کہ یہ افواہ برگ وبار لانے لگی اور مسلمانوں نے اس پر ردعمل کا اظہار کرنا اور یہ کہنا شروع کردیا کہ اسلام اس الزام سے بری ہے۔

اسی اثناء میں جب کہ مسلمان اس بے بنیاد نظریے کا رد کرنے میں لگے ہوئے تھے، انہی مشککین میں سے کچھ لوگ اٹھے اور انہوں نے "طویل اور معروضی علم و تحقیق کے بعد اسلام کا دفاع کرنے" کا ڈھونگ رچایا۔ انہوں نے اس الزام کو رد کرتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ "اسلام تیر و تفنگ اور ظلم وجبر کا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ محبت اور امن وسلامتی کا مذہب ہے۔ اس میں جہاد کھلی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے علاوہ اور کسی صورت میں مشروع نہیں ہے۔ اہل اسلام کو، جہاں تک امن کا قیام ممکن ہو، جنگ کی ترغیب نہیں دی جاتی۔"

۴۴ یہ نظریہ وان دلوٹن کا پیش کردہ ہے، ملاحظہ کیجئے اس کی کتاب کا عربی ترجمہ السیادۃ العربیہ مترجمہ ... مطبعہ طبع النہضۃ المصریۃ

سادہ لوح مسلمانوں نے، جو اوّل الذکر نارواالزام سے شدید دل گرفتہ تھے، اس "شاندار دفاع پر خوب تالیاں پیٹیں۔ ان حالات میں جب کہ وہ پہلے الزام کا جواب دینے کی تیاری کر رہے تھے، موخر الذکر نظریہ انہیں بہت پسند آیا۔ وہ بڑھ بڑھ کر اس کی تائید و توثیق کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے دلیلیں پیش کرنے لگے کہ اسلام ویسا ہی ہے جیسا یہ حضرت کہہ رہے ہیں۔ وہ امن و سلامتی اور صلح کل کا مذہب ہے۔ وہ دوسروں سے اس وقت تک تعرض نہیں کرتا جب تک کہ وہ اس کے گھر پر دھاوانہ بول دیں اور اسے خوابِ غفلت سے بیدار نہ کردیں۔

ان سادہ لوح مسلمانوں سے یہ بات فراموش ہوگئی کہ جن لوگوں نے پہلی افواہ اڑائی تھی، پھر دوسرے الزام کا پروپیگنڈا کیا تھا، وہ خفیہ طریقے پر یہی نتیجہ اور یہی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ ایسی باتیں کہی جائیں اور ایسے مختلف آزمودہ وسائل و ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے آخر کار مسلمانوں کے ذہنوں سے جہاد کا تصور محو ہوجائے اور ان کے دلوں میں عظمت و سربلندی کا جذبہ سرد پڑ جائے۔

یہاں ہم اس کا ایک ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہمارے دوست استاذ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنی کتاب "آثار الحرب فی الفقه الاسلامی" میں معروف انگریز مستشرق "اندرسن" سے ہونے والی اپنی ایک گفتگو نقل کی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"اہل مغرب اور خاص طور پر انگریز ڈرتے ہیں کہ کہیں مسلمانوں کے درمیان سے جہاد کا تصور نہ ابھر آئے۔ اگر ایسا ہوگیا تو ان کا شیرازہ متحد ہو جائے گا اور وہ اپنے دشمنوں کا پوری پامردی سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔ اسی لیے وہ جہاد کے منسوخ ہونے کے نظریے کو رواج دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے دل ایمان سے خالی ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کتنا مبنی برحق ہے:

فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ (محمد۔ ۲۰)

مگر جب ایک پختہ سورت نازل کردی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔

جمعہ ۳ر جون ۱۹۶۰ء کی شام انگریز مستشرق اندرسن سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس موضوع پر ان کی رائے جاننی چاہی۔ انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں یہ کہا کروں: جہاد آج کے زمانے میں فرض نہیں ہے اس لیے کہ فقہی اصول ہے "زمانہ بدلنے کے ساتھ احکام بھی بدل جاتے ہیں" ان کی رائے میں جہاد جدید بین الاقوامی حالات سے، جب کہ مسلمان عالمی تنظیموں اور بین الاقوامی معاہدات سے جڑے ہوئے ہیں، میل نہیں کھاتا۔ جہاد ہی کی وجہ سے لوگ اسلام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ آزادی اور روشن خیالی کا ماحول ایسی فکر کو قبول نہیں کرتا جسے طاقت کے ذریعے نافذ کیا جائے۔[۴۵]

۳۔ دوسری بیعتِ عقبہ۔ ہجرتِ مدینہ کی تمہید:

اب ہم پھر دوسری بیعت عقبہ کے موضوع پر آتے ہیں:

مشرکین مکہ کو کسی طرح اس بیعت کی سن گن لگ گئی اور انہیں معلوم ہوگیا کہ نبی ﷺ اور مدینہ کے اسلام قبول کرنے والوں کے درمیان کیا طے پایا ہے۔ اس میں ضرور اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی مصلحت تھی۔

شاید اس کی حکمت یہ تھی کہ نبی ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے اسباب فراہم ہوجائیں۔ آگے یہ بات آئے گی کہ مشرکین تک یہ خبر پہنچنے کے بعد ہی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے تنگی پیدا کرنا شروع کردیا تھا اور آپ کو قتل کرنے یا آپ سے نجات حاصل کرنے پر یک رائے ہوگئے تھے۔

بہرحال دوسری بیعت عقبہ آں حضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کی تمہید تھی۔

---

[۴۵] آثار الحرب فی الفقه الاسلامی ص: ۵۹ (حاشیہ)

صحابہ کو ہجرتِ مدینہ کی اجازت

ابن سعد نے اپنی کتاب "الطبقات" میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: "جب مدینہ کے ستر مسلمان رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے واپس ہوئے تو آپ کو بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت کے اسباب مہیا کر دیے تھے۔ ایسی قوم کو آپ کا ہم نوا بنا دیا تھا جو جنگ جو، سامان جنگ سے لیس اور دوسروں کی مدد کرنے والے تھے۔ ادھر جب مشرکین کو اندیشہ ہوا کہ مسلمان اب ہاتھ سے نکل جائیں گے تو انہوں نے ان کا عرصۂ حیات تنگ کرنا شروع کر دیا، انہیں طرح طرح سے ستانے، تکلیفیں پہنچانے اور اہانت و تذلیل کرنے لگے۔ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی شکایت کی اور مکہ سے ہجرت کر کے کہیں اور چلے جانے کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے تمہارے مقامِ ہجرت کی خبر دے دی گئی ہے، وہ یثرب ہے۔ تم میں سے جو چاہے وہاں جا سکتا ہے" چنانچہ صحابہ ہجرت کی تیاریاں کرنے لگے۔ ایک دوسرے سے رائے و مشورہ لینے اور مدد کرنے لگے۔ اور خفیہ طریقے سے نکلنے لگے۔ مدینہ پہنچنے والے سب سے پہلے صحابی حضرت ابو سلمہ بن عبدالاسدؓ تھے۔ ان کے بعد حضرت عامر بن ربیعہؓ اپنی بیوی حضرت لیلیٰ بنت ابی حثمہؓ کے ساتھ پہنچے۔ یہ مدینہ پہنچنے والی سب سے پہلی (ہودج نشیں [۴۶]) خاتون تھیں۔ پھر صحابہ جماعتوں کی شکل میں مدینہ پہنچنے لگے۔ وہ انصار کے گھروں میں اترے۔ انصار نے اپنے گھروں میں انہیں پناہ دی اور ان کی مدد اور غم خواری کی۔" [۴۷]

تمام صحابہ نے خفیہ طریقے سے ہجرت کی، سوائے حضرت عمر بن الخطابؓ کے، کہ وہ علی الاعلان نکلے۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ سے روایت ہے کہ "جب حضرت عمر بن الخطابؓ

۴۶ روایت میں 'ظعینہ' کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "ہودج میں سفر کرنے والی عورت"

۴۷ طبقات ابن سعد: ۱/۲۱۰-۲۱۱، تاریخ طبری: ۱/۳۶۷

ہجرت کا ارادہ کیا تو گردن میں تلوار لٹکائی، کندھے پر کمان ڈالی، ہاتھ میں چند تیر لیے، کمر میں نیزہ لگایا اور خانہ کعبہ کی طرف گئے۔ اس کے صحن میں اس وقت قریش کے بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ سات مرتبہ خانہ کعبہ کا طواف کیا، پھر مقام ابراہیم پر آکر نماز پڑھی، اس کے بعد ایک جگہ کھڑے ہو کر فرمایا: "چہرے بدشکل ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان دشمنوں کی ناک نیچی کر کے رہے گا۔ جو شخص بھی چاہتا ہو کہ اس کی ماں اس پر روئے، اس کے بچے یتیم ہو جائیں اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے وہ مجھ سے اس وادی کے بعد آکر ملے۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "کسی نے ان کا پیچھا کرنے کی جرأت نہیں کی۔ صرف کچھ کمزور قسم کے لوگ ان کے پاس گئے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں جو کچھ بتانا تھا بتایا، پھر مدینہ کی راہ لی۔" [۴۸]

اس کے بعد ہجرت کرنے والے مسلمانوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ اور مکہ میں رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کے علاوہ صرف وہی باقی بچا جسے ہجرت سے روکنے کے لیے قید کر لیا گیا ہو اور اذیتیں پہنچائی جا رہی ہوں یا مریض ہو یا کسی اور معذوری سے نہ جا سکتا ہو۔

دروس ونصائح

۱۔ ہجرت — راہ دین میں مسلمانوں کی ایک نئی آزمائش:

مکہ میں اصحاب رسول اللہ کی آزمائش یہ تھی کہ انہیں ایذاء و تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور وہ مشرکین کی جانب سے طرح طرح کے استہزاء و تمسخر کا سامنا کر رہے تھے۔ جب آں حضرت ﷺ نے انہیں ہجرت کی اجازت دے دی تو وہ ایک دوسری آزمائش میں مبتلا ہو گئے۔ یہ آزمائش وطن، مال، گھربار اور سامان و جائیداد چھوڑنے کی تھی۔

انہوں نے دونوں آزمائشوں کے موقعے پر اپنے دین سے وفاداری اور اپنے رب سے اخلاص کا ثبوت دیا۔ تکالیف و شدائد کا پورے صبر اور پختہ عزیمت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا تو انہوں نے وطن کو خیر باد کہا اور مال و متاع اور زمین جائیداد وہیں چھوڑ کر مدینہ کا رخ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ خفیہ

۴۸ اسد الغابۃ: ۴/۵۸

طریقے سے اور چھپ کر نکلے تھے اور اس صورت میں بھاری سامان اپنے ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے اپنی تمام چیزیں مکہ میں چھوڑ دیں، محض اس لیے کہ ان کا دین محفوظ رہے۔ اس کے بدلے انہیں ایسے بھائی ملے جو مدینہ میں انہیں پناہ دینے اور ان کی مدد کرنے کے لیے سراپا انتظار تھے۔

یہ ہے اللہ کے لیے دین خالص کر دینے والے مسلمان کا صحیح رویہ، کہ اپنا دین محفوظ رکھنے کی راہ میں وطن کی پرواہ کرے نہ مال اور جائیداد کی۔

یہ تو مکہ میں اصحاب رسول کا حال تھا۔ رہے اہل مدینہ جنہوں نے انہیں اپنے گھروں میں پناہ دی، ان کی مواسات اور غم خواری کی اور انہیں مدد دی، انہوں نے بھی اسلامی اخوت اور اللہ کے لیے محبت کا سچا نمونہ پیش کیا۔

آپ کو معلوم ہے کہ اللہ عزوجل نے دینی رشتے کو صرف نسبی رشتے سے زیادہ طاقت ور بنایا ہے۔ اسی لیے آغاز اسلام میں میراث کا استحقاق دین کے رشتے اور اللہ کی راہ میں ہجرت کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ قرابت داری اور نسب کے رشتے کی بنیاد پر میراث کا حکم اس وقت دیا گیا جب مدینہ میں اسلام مکمل صورت میں قائم ہو گیا اور مسلمانوں کا ایک طاقت ور اور مستحکم "دارالاسلام" بن گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا. (الانفال-۷۲)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔

اس ہجرت کی مشروعیت سے بعض شرعی حکم مستنبط ہوتے ہیں جنہیں ہم آگے بیان کر

۲۔ دارالحرب سے ہجرت واجب ہے

دارالحرب سے دارالاسلام کی جانب ہجرت واجب ہے۔ قرطبی نے ابن العربی سے نقل کیا ہے: "یہ ہجرت نبی ﷺ کے زمانے میں فرض تھی اور اس کی فرضیت قیامت تک باقی ہے۔ جس ہجرت کی فرضیت فتح مکہ کے بعد ختم ہو گئی ہے اس سے مراد نبی ﷺ کی خدمت میں حاضری ہے۔ اگر کوئی شخص دارالحرب میں ٹھہرا رہے گا تو وہ گنہ گار ہوگا۔" ۴۹

یہاں دارالحرب سے مراد ہر وہ جگہ ہے جہاں مسلمان کے لیے اسلامی شعائر مثلاً نماز، روزہ، جماعت، اذان اور دیگر ظاہری احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔

اس پر اس ارشاد باری سے استدلال کیا جاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ○ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ○ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا. (النساء:۹۷-۹۹)

جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔

۳۔ ہر جگہ کے مسلمانوں کی مدد فرض ہے:

جہاں تک ممکن ہو، مسلمانوں پر اپنے بھائیوں کی مدد کرنا فرض ہے، خواہ وہ دوسرے علاقوں اور ملکوں کے رہنے والے ہوں۔ علماء اور ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر مسلمان روئے زمین

۴۹ تفسیر القرطبی: ۵/۳۵۰

کے کسی حصے میں اپنے کمزور، مقید، یا مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے اور انھیں ظلم سے نجات دلانے پر قادر ہوں، اس کے باوجود ایسا نہ کریں تو وہ بہت گنہ گار ہوں گے۔

ابو بکر ابن العربیؒ فرماتے ہیں: "اگر مسلمانوں میں سے کچھ لوگ دشمنوں کے پاس قید میں ہوں یا کمزور بنالیے گئے ہوں تو ان کے ساتھ ولایت کا تعلق قائم ہے اور ان کی مدد فرض ہے۔ ہم پر لازم ہے کہ اگر ہماری تعداد قابلِ ذکر ہو تو ہم انہیں ظلم سے نجات دلانے کے لیے نکلیں، اور اگر اس سلسلے میں مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑے تو اپنا تمام مال خرچ کر دیں۔" ۵۰

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کا موالات کا تعلق صرف آپس میں ہو۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ولایت، باہمی تعاون اور اخوت و محبت کا تعلق استوار ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ کے کلام میں اس کی صراحت موجود ہے۔ ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ. (الانفال۔ ۷۳)

جو لوگ منکر حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا

ابن العربیؒ فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے کفار اور اہلِ ایمان کے درمیان ولایت کا تعلق نہیں رکھا ہے۔ اہل ایمان آپس میں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں اور کفار آپس میں ایک دوسرے کے۔ وہ اپنے مذہب کے مطابق ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور اپنے اعتقاد کے مطابق باہم معاملہ کرتے ہیں۔ ۵۱"

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی الٰہی تعلیمات کی تطبیق و تنفیذ ہی ہر زمانے اور ہر عہد میں مسلمانوں کی فتح و کامرانی کی بنیاد ہے۔ آج ہم جو یہ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں ضعف اور انتشار ہے اور ان کے دشمن ہر سمت اور ہر طرف سے ان پر چڑھ دوڑے ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انہوں نے ان الٰہی تعلیمات کو فراموش کر دیا ہے اور ان کے برعکس کام کرنے لگے ہیں۔

---

۵۰ احکام القرآن، ابن العربی: ۲/۸۷۶

۵۱ حوالہ سابق: ۲/۸۷۶

ہجرتِ رسول

صحیح احادیث اور کتب سیرت میں مروی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب دیکھا کہ یکے بعد دیگرے تمام مسلمان مدینہ ہجرت کر گئے ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہجرت کی اجازت چاہی۔ حضورؐ نے فرمایا: "ذرا ٹھہرے رہو، کیونکہ امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائے گی" حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، کیا آپ اس کی توقع رکھتے ہیں؟ فرمایا: ہاں۔ اس لیے ابو بکرؓ رُک گئے، تاکہ حضور کے ساتھ ہجرت کریں۔ اور دو اونٹنیاں لے کر ان کو پالنا شروع کر دیا۔ چار ماہ تک وہ انہیں کھلاتے پلاتے اور خوب دیکھ بھال کرتے رہے۔ ۵۲

اس اثناء میں قریش نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ حمایتی اور اصحاب دوسرے شہر میں ہو گئے ہیں، اس لیے ان لوگوں نے سوچا کہ آپؐ مکہ سے نکل کر ان کے پاس پہنچنے نہ پائیں۔ انہیں اس بات کا اندیشہ ہوا کہ آپؐ نے ان سے جنگ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

وہ سب دار الندوہ میں جمع ہوئے۔ یہ قصی بن کلاب کا گھر تھا۔ قریش کو کسی معاملے میں کوئی اجتماعی فیصلہ لینا ہوتا تو اسی گھر میں اکٹھا ہوتے تھے۔ یہاں انہوں نے باہم مشورہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے معاملے میں کیا کیا جائے؟ آخر میں وہ اس رائے پر متفق ہوئے کہ ہر قبیلے سے ایک کڑیل نوجوان منتخب کیا جائے اور اس کو ایک دھار دار تلوار دی جائے۔ یہ سب مل کر یک بارگی محمد (ﷺ) پر ٹوٹ پڑیں اور اسے قتل کر ڈالیں۔ اس طرح اس کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبد مناف کے لیے ممکن نہیں رہے گا کہ سب سے لڑ سکیں۔ اس کام کے لیے انہوں نے ایک وقت مقرر کر لیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ ﷺ کی خدمت

---

۵۲ صحیح بخاری: ۴/۲۵۵

میں حاضر ہوئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم پہنچایا اور ہدایت کی کہ آج رات اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ ۵۳

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "ہم ایک دن دوپہر میں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے میرے والد حضرت ابو بکرؓ سے کہا: "یہ رسول اللہ ﷺ منہ ڈھانکے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔" "اس وقت آپ کبھی ہمارے یہاں نہ آتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: "میرے ماں باپ ان پر قربان ہوں، ضرور کوئی بات ہے جس کی وجہ سے وہ اس وقت تشریف لائے ہیں۔" حضور نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت پا کر اندر تشریف لائے تو فرمایا: "اپنے پاس سے سب کو ہٹادو۔" حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: "یہ تو آپ ہی کے گھر کے لوگ ہیں۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے اللہ کے رسول!" تب حضور نے فرمایا: "مجھے نکلنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔" حضرت ابو بکر نے عرض کیا: "میری ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ لے لیں۔" فرمایا: "مگر قیمت دے کر لوں گا۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "ہم لوگوں نے ان دونوں کے لیے جلدی جلدی سامانِ سفر تیار کیا اور ایک تھیلے میں زادِ راہ کے طور پر ضروری چیزیں رکھ دیں۔ میری بہن اسماءؓ نے اپنے پٹکے سے ایک ٹکڑا کاٹ کر اس سے تھیلی کا منہ باندھ دیا۔ اسی لیے ان کا لقب "ذات النطاق" (پٹکے والی) پڑ گیا۔ ۵۴

پھر رسول اللہ ﷺ حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پاس تشریف لے گئے اور انھیں حکم دیا کہ وہ آپؐ کے جانے کے بعد مکہ میں رہیں اور لوگوں کی جو امانتیں آپ کے پاس تھیں انھیں لوٹانے کے بعد آئیں۔ مکہ کے کسی شخص کو اپنی کوئی چیز ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ اسے آپ کے پاس بطور امانت رکھوا دیتا تھا اس لیے کہ وہ آپ کی سچائی اور امانت داری کے قائل تھے۔

حضرت ابو بکرؓ نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ کو حکم دیا کہ دن مکہ میں گزاریں

۵۳ سیرت ابن ہشام: ۱/ ۱۵۵، طبقات ابن سعد ص: ۲۱۲

۵۴ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت اسماء نے اپنا پٹکا پھاڑ کر اس کے ایک ٹکڑے سے تھیلے کا منہ بند کیا اور دوسرے ٹکڑے سے اسے لٹکا دیا۔ اسی لیے وہ "ذات النطاقین" (دو پٹکوں والی) کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

اور لوگ ان کے بارے میں کیا کیا باتیں کرتے ہیں، ان کی ٹوہ لیتے رہیں۔ پھر رات کو ان کے پاس آ کر دن بھر کی جمع شدہ اطلاعات پہنچا دیا کریں۔ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہؓ کو حکم دیا کہ وہ دن بھر حسبِ معمول ان کی بکریاں چراتے رہیں، پھر رات گئے انہیں غار (غارِ ثور) کے پاس لا کر ان کا دودھ پلا دیا کریں۔ اپنی صاحب زادی حضرت اسماءؓ کو حکم دیا کہ ہر شام ان کے پاس حسبِ ضرورت کھانا پہنچا دیا کریں۔

ابن اسحاقؒ اور امام احمدؒ نے حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میرے والد حضرت ابو بکرؓ نکلے تو اپنا سارا مال جو پانچ چھ ہزار درہم تھا، اپنے ساتھ لے گئے۔"

حضرت اسماءؓ فرماتی ہیں: "ان کے جانے کے بعد ہمارے دادا ابو قحافہ، جو نابینا تھے (اور اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) ہمارے پاس آئے اور کہا: "اللہ کی قسم، میرا خیال ہے کہ وہ اپنی جان کے ساتھ اپنا سارا مال بھی لے گیا ہے اور تم لوگوں کو پریشانی میں ڈال گیا ہے۔" میں نے کہا: "نہیں ابا جان، وہ ہمارے لیے خیر کثیر چھوڑ گئے ہیں۔" حضرت اسماء فرماتی ہیں: "پھر میں نے کچھ پتھر لیے، انہیں گھر کے اس طاق میں رکھا جس میں والد صاحب اپنا مال رکھتے تھے، اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا، پھر دادا جان کو لے جا کر ان سے کہا: "ابا جان، اس پر ہاتھ لگا کر دیکھ لیں۔" انہوں نے اس پر ہاتھ رکھ کر کہا: "کوئی بات نہیں، اگر یہ اس نے تمہارے لیے چھوڑا ہے تو بہتر ہے، اس سے تمہارا خرچ چل جائے گا۔" حالانکہ فی الواقع ہمارے والد نے ہمارے لیے کچھ مال نہیں چھوڑا تھا، لیکن میں چاہتی تھی کہ اس ترکیب سے دادا جان کو خاموش کر دوں۔" ۵۵

جب وہ رات آئی جس میں نبی ﷺ کو ہجرت کرنی تھی تو مشرکین آپؐ کے گھر کے دروازے پر آ پہنچے اور گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے کہ نکلتے ہی آپ کو قتل کر دیں۔ آپؐ ان کے درمیان سے نکلے، لیکن اللہ نے ان کے اوپر اونگھ طاری کر دی جس سے وہ آپ کو دیکھ نہیں سکے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سلا دیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ انہیں کچھ گزند نہ پہنچے گا۔

رسول اللہ ﷺ حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ غار ثور کی طرف تشریف لے گئے، تاکہ اس میں قیام کریں۔ غالباً یہ ربیع الاول کا دوسرا دن تھا (مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء) اور آپ کی بعثت کو تیرہ

۵۵ سیرت ابن ہشام: ۱/ ۴۸۸، ترتیب مسند احمد: ۲۰/ ۲۸۲

سال گزر چکے تھے۔ آں حضرت ﷺ سے پہلے حضرت ابو بکرؓ غار میں داخل ہوئے اور ہر طرف ٹٹول ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں اس میں کوئی درندہ یا سانپ نہ ہو جو آں حضرت ﷺ کو نقصان پہنچا دے۔ جب اطمینان ہو گیا تو آپ کو اندر لے گئے۔ ان دونوں نے اس غار میں تین دن گزارے۔ رات ہوتے ہی حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ ان کے پاس آجاتے تھے اور ساتھ ہی رات گزارتے اور مکہ کی خبریں ان تک پہنچاتے تھے۔ پھر رات کے آخری پہر واپس لوٹ جاتے تھے اور مکہ میں قریش کے ساتھ صبح اس انداز سے اٹھتے تھے گویا وہیں رات گزاری ہے۔ عامر بن فہیرہؓ رات میں بکریوں کا ایک ریوڑ لے کر ان کے پاس آجاتے تھے۔ پھر جب حضرت عبداللہؓ واپس ہوتے تو ان کے پیچھے عامر بکریوں کو ہانک کر لاتے تاکہ ان کے قدموں کا کوئی نشان باقی نہ رہ جائے۔

مشرکین کو جب پتا چلا کہ نبی ﷺ نکل گئے ہیں تو وہ آپ کو تلاش کرنے کے لیے مدینہ جانے والے راستوں پر پھیل گئے۔ اور جہاں جہاں گمان ہو سکتا تھا وہاں گئے اور کونہ کونہ چھان مارا۔ یہاں تک کہ غار ثور کے دہانے پر بھی پہنچ گئے اور ان کے پیروں کی آہٹ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے سن لی۔ انہیں اتنا قریب پا کر حضرت ابو بکرؓ گھبرا گئے اور چپکے سے نبی ﷺ سے عرض کیا: "اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے پاؤں کے نیچے دیکھے تو ہمیں دیکھ لے گا" حضور نے جواب دیا: "اے ابو بکر! تمہارا کیا خیال ہے ان دو آدمیوں کے بارے میں جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے۔" [۵۶]

اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اندھا کر دیا۔ ان میں سے کسی نے اس غار کی طرف نہیں دیکھا اور نہ کسی کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ لوگ اس میں ہو سکتے ہیں۔

آں حضرت ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ نے عبداللہ بن ارقط☆ نامی ایک شخص کو، جو راستوں کا ماہر تھا، اجرت پر مقرر کیا تھا، تاکہ مدینہ جانے کے غیر معروف راستوں کی رہنمائی کرے۔ یہ شخص مشرک لیکن قابل بھروسہ آدمی تھا۔ انہوں نے دونوں اونٹنیاں اس ہدایت کے ساتھ اس کے حوالے کر دی تھیں کہ غار کے پاس آجانا۔ جب مشرکین مکہ تلاش کرتے کرتے تھک گئے اور انھیں آں حضرت ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کو پانے کی امید نہیں رہی تب عبداللہ بن ارقط

۵۶ بخاری و مسلم

☆ صحیح تلفظ اُریقط ہے جیسا کہ موسیٰ بن عقبہ، بلاذری اور ابن سعد نے لکھا ہے۔ (مترجم)

اونٹنیوں کو لے کر غار کے پاس پہنچ گیا اور وہ دونوں اس کی رہنمائی میں نکلے۔ انہوں نے مدینہ کے لیے ساحل کا راستہ اختیار کیا۔

مشرکین مکہ نے اعلانِ عام کر دیا تھا کہ جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ اور ابو بکرؓ کو پکڑ کر لائے گا اسے دونوں کی دیت یعنی سو سو اونٹ دیے جائیں گے۔

ایک روز قبیلہ بنو مدلج کے کچھ لوگ ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہی میں سراقہ بن جعشم بھی تھا۔ ایک شخص نے آکر ان سے کہا: "ابھی میں نے ساحل پر کچھ آدمی جاتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہیں" سراقہ سمجھ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں، لیکن اس نے مجلس کے دوسرے لوگوں کو ان کی تلاش میں جانے سے روکنے کے لیے کہا: "تم نے فلاں فلاں کو دیکھا ہے جو ابھی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ لوگ اپنا کھویا ہوا جانور تلاش کر رہے ہیں۔" پھر وہ اس مجلس میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد اٹھ کر اپنے گھر گیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر ان لوگوں کا پیچھا کیا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل قریب پہنچ گیا تو یکایک اس کے گھوڑے کو ٹھوکر لگی اور وہ نیچے گر پڑا۔ پھر وہ دوبارہ سوار ہو کر چلا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ نبی ﷺ کی قراءت صاف سنائی دے رہی تھی۔ حضورؐ کسی طرف مڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے، لیکن ابو بکرؓ بار بار ہر طرف مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ اتنے میں یکلخت سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئے اور وہ گر پڑا۔ اس نے گھوڑے کو ڈانٹا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جوں ہی اس کے پاؤں زمین سے نکلے آسمان میں دھوئیں کے مثل زبردست غبار چھا گیا۔ اس سے سراقہ کو یقین ہو گیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو گرفتار نہیں کر سکے گا۔ اس پر زبردست دہشت طاری ہو گئی۔ تب اس نے پکار کر امان مانگی۔

اس کی پکار پر آں حضرت ﷺ اور آپ کے رفقاء ٹھہر گئے۔ سراقہ ان کے پاس پہنچا۔ اس نے آپؐ سے معذرت کی اور درخواست کی کہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کر دیں۔ پھر اس نے زادِ راہ اور سامان کی پیش کش کی۔ آں حضرت ﷺ اور ابو بکرؓ دونوں نے فرمایا: "ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ تم بس یہ کرو کہ ہماری اطلاع کسی کو نہ دو اور کسی کو ہم تک نہ پہنچنے دو۔" اس نے کہا: ایسا ہی ہوگا۔ [۵۷]

۵۷ بخاری و مسلم۔ یہ تفصیل بخاری کے مطابق ہے۔ دیکھیے۔ ۴/۲۲۵-۲۲۶

پھر سراقہ مکہ واپس ہوگیا۔ راستے میں جو بھی حضورؐ کے تعاقب میں آتا ہوا ملتا اسے کوئی مناسب بات کہہ کر لوٹا دیتا... اس طرح جو شخص صبح دشمن بن کر قتل کی فکر میں نکلا تھا وہ شام کو پاسباں بن کر واپس ہوا اور تلاش میں سرگرداں لوگوں کو واپس پھیرتا گیا۔

حضور ﷺ کی قبا آمد

رسول اللہ ﷺ قبا پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے چند دن وہاں قیام فرمایا۔ آپ کی میزبانی کا شرف حضرت کلثوم بن ہدمؓ کو حاصل ہوا۔ اسی دوران حضرت علیؓ بھی اہل مکہ کی امانتیں واپس کرنے کے بعد حضور کی خدمت میں پہنچ گئے۔ یہاں آپ نے مسجدِ قبا کی تعمیر فرمائی۔ یہی وہ مسجد ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ. (التوبہ۔١٠٨)

جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو۔

پھر آپؐ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مسعودی[٥٨] کی روایت کے مطابق آپ مدینہ میں ١٢ ربیع الاول کو داخل ہوئے۔ انصار کو معلوم ہوا تو وہ آپ کے ارد گرد اکٹھا ہوگئے۔ ہر ایک آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ رہا تھا، تاکہ اسے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہو۔ حضور ان سے فرماتے تھے "اسے چھوڑ دو۔ یہ مامور ہے۔" (یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت چل رہی ہے اور اسی جگہ جاکر ٹھہرے گی جہاں اللہ کی طرف سے اسے حکم ہوگا) آپ کی اونٹنی مدینہ کی گلیوں کوچوں میں چلتی رہی، یہاں تک کہ ایک کھلیان[٥٩] میں جاکر ٹھہر گئی جو قبیلہ بنوالنجار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت میں تھا۔ اس کے سامنے حضرت ابوایوب انصاریؓ کا گھر پڑتا تھا۔ تب نبی ﷺ نے فرمایا: "انشاءاللہ یہی منزل ہوگی" حضرت ابوایوب حاضر ہوئے اور آپ کا سامان اتار کر اپنے گھر لے گئے۔ ابن ہشام کی روایت میں ہے کہ بنوالنجار کی بچیاں نکل آئیں اور نبی ﷺ کے تشریف لانے اور ان کی بستی میں ٹھہرنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہ گیت گانے لگیں:

---

٥٨ مروج الذہب: ٢/٢٧٩ طبع بیروت

٥٩ روایت میں 'مربد' کا لفظ آیا ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ جگہ جہاں کھجوریں خشک کی جاتی ہیں۔

نحن جوار من بنی النجار   یا حبذا محمد من جار

ہم بنی نجار کی لڑکیاں ہیں، کیا ہی اچھے ہمسائے ہیں محمد (ﷺ)

حضورؐ نے لڑکیوں سے پوچھا "کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" انہوں نے عرض کیا: ہاں۔ آپؐ نے فرمایا: "اللہ جانتا ہے کہ میرا دل بھی تمہاری محبت سے لبریز ہے"

حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں

ابو بکر بن ابی شیبہ، ابن اسحاق اور امام احمد بن حنبل نے متعدد طرق سے (جن کے الفاظ تقریباً یکساں ہیں) حضرت ابوایوبؓ کا اپنا بیان نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ میرے یہاں اترے تو آپ مکان کے نچلے حصے میں ٹھہرے اور میں اور ایوب کی ماں بالائی منزل میں رہے۔ میں نے آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے نبی، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، مجھے یہ چیز سخت ناپسند ہو رہی ہے کہ ہم اوپر رہیں اور آپ نیچے -- براہ کرم آپ بالاخانے پر تشریف لے جائیں اور وہاں قیام فرمائیں، ہم نیچے کے حصے میں رہیں گے۔ حضور نے فرمایا: اے ابوایوب، نیچے کا مکان ہمارے لیے زیادہ آرام دہ ہے اور اس میں ہمارے پاس آنے والوں کے لیے بھی سہولت ہے۔

حضرت ابوایوبؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ مکان کے نیچے کے حصے میں اور ہم بالاخانے میں رہنے لگے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ ہمارا پانی سے بھرا ایک گھڑا ٹوٹ گیا۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں پانی ٹپک کر نیچے نہ گر جائے جس سے حضور کو تکلیف ہو۔ اس لیے ہم دونوں میاں بیوی کے پاس جو ایک ہی لحاف تھا، اسی کو ہم نے پانی پر ڈال کر جلدی جلدی اسے خشک کیا۔ پھر میں ڈرتے ہوئے نیچے اترا اور حضور سے عرض کیا کہ میں ایسے بالاخانے میں نہیں رہ سکتا جس کے نیچے آپ قیام فرما ہوں۔ غرض میں نے اتنی التجا کی کہ آپ اوپر کی منزل میں رہنے پر راضی ہوگئے۔

حضرت ابوایوبؓ فرماتے ہیں: "ہم آپ کے لیے رات کا کھانا تیار کرکے بھیجتے۔ اگر کچھ کھانا بچ کر واپس آتا تو ہم دونوں میاں بیوی اندازہ لگاتے کہ کس طرف سے آپ نے کھایا ہے۔ برکت حاصل کرنے کے لیے ہم بھی اسی جگہ سے کھاتے۔ ایک رات ہم نے آپ کی خدمت

میں کھانا بھیجا۔ اس میں پیاز اور لہسن بھی شامل تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اس کھانے کو واپس کیا تو اس میں ہمیں آپ کے ہاتھ کا نشان کہیں نظر نہ آیا۔ میں گھبرا گیا۔ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول، میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ نے جو کھانا واپس کیا ہے اس میں آپ کے ہاتھ کا نشان نظر نہیں آرہا ہے۔ آپ جو بچا ہوا کھانا واپس کرتے تھے اس میں ہم دونوں میاں بیوی آپ کے ہاتھ کا نشان ڈھونڈتے تھے اور برکت حاصل کرنے کے لیے اسی جگہ سے کھاتے تھے (کیا بات ہے؟ آج آپ نے کھانا تناول نہیں فرمایا) حضورؐ نے فرمایا: اس میں مجھے اس پودے (پیاز) کی بو محسوس ہوئی۔ میں ایسا شخص ہوں جو اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ (اس لیے میں نے نہیں کھایا) تم لوگ کھا سکتے ہو۔

حضرت ابوایوب فرماتے ہیں: ہم نے اس کھانے کو کھالیا، لیکن پھر کبھی آپؐ کے کھانے میں لہسن یا پیاز شامل نہیں کی۔" [۶۰]

دروس ونصائح

۱۔ ہجرت مال، وطن اور زندگی کی ضامن ہے:

گذشتہ ایک فصل میں ہم نے مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسلام میں ہجرت کے مفہوم اور اس کی اہمیت سے بحث کی تھی۔ وہاں ہم نے کہا تھا کہ اللہ عزوجل نے دین اور عقیدے کا تقدس ہر چیز سے بڑھ کر رکھا ہے۔ اگر عقیدہ اور شعائرِ دین کو جنگ یا زوال کے چیلنج کا سامنا ہو تو زمین، وطن، مال اور جاہ کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی لیے اللہ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے کہ اگر تقاضا ہو تو عقیدہ اور اسلام کی راہ میں ہر چیز کو قربان کردیں۔

ہم نے یہ بھی لکھا تھا کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ معنوی قوتیں جو عقیدۂ سلیم اور دینِ حق کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہیں وہ مادی مفادات اور قوتوں کی محافظ ہوتی ہیں۔ جب تک امت اخلاقِ سلیمہ سے بہرہ ور اور دینِ حق پر مضبوطی سے قائم رہتی ہے اس وقت تک اس کا مادی اقتدار بھی وطن، مال اور عزت و عظمت کی صورت میں مستحکم، راسخ اور پائیدار رہتا ہے۔ لیکن جب وہ اخلاقی اعتبار سے کنگال ہو جاتی ہے اور اس کے عقیدے میں بھی استحکام و

۶۰۔ الاصابہ، ابن حجر: ۱/۴۰۵، سیرت ابن ہشام: ۱/۴۷۹، ترتیب مسند احمد: ۲۰/۲۹۲

پختگی باقی نہیں رہتی تو مذکورہ صورتوں میں پایا جانے والا اس کا مادی اقتدار بھی اضمحلال اور زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ تاریخ اس حقیقت پر سب سے بڑی دلیل ہے۔

اسی لیے اللہ عزوجل نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ اگر تقاضا ہو تو عقیدہ اور دین کی راہ میں مال اور وطن کو قربان کر دیا جائے۔ اسی طریقے سے مسلمان اپنے لیے مال، وطن اور زندگی کی ضمانت حاصل کرتے ہیں، اگرچہ پہلے مرحلے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں سے تہی دامن اور محروم ہو چکے ہیں۔

اس حقیقت پر دلیل کے لیے رسول اللہ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کافی ہے۔ ظاہر میں تو اس ہجرت کے ذریعے وطن سے دوری اور محرومی ہو رہی تھی، لیکن حقیقت میں یہ وطن کی حفاظت اور ضمانت کے لیے تھی۔ کسی چیز کی حفاظت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہر میں اس سے محرومی اور مجبوری معلوم ہوتے ہیں-- چنانچہ اس ہجرت کے چند ہی سال بعد اس دین کی بدولت جس کا آپ نے قلعہ اور حکومت قائم کی، اپنے اسی وطن میں جس سے آپ نکالے گئے تھے، اس حال میں واپس لوٹے کہ آپ کو زبردست قوت و شوکت حاصل تھی اور جن لوگوں نے قتل کرنے کے ارادے سے آپ کے مکان کا گھیرا ڈالا تھا اور آپ کا پیچھا کیا تھا، ان میں سے کوئی بھی آپ کو معمولی تکلیف بھی نہ پہنچا سکا۔

آیئے اب آں حضرت ﷺ کی ہجرت کے واقعے پر دوبارہ نظر ڈالیں اور اس سے وہ نتائج اور احکام مستنبط کریں جو ہر مسلمان کے لیے اہمیت رکھتے ہیں:

۲۔ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کے دلائل:

آں حضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس سفر میں رفاقت کے لیے صرف حضرت ابوبکرؓ کو روکے رکھا۔

اس سے علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت ابوبکرؓ سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ وہی تمام صحابہ میں سب سے زیادہ آپؐ سے قریب اور آپؐ کے بعد خلافت کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ دیگر بہت سے امور سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً آں حضرت ﷺ نے اپنے مرضِ وفات میں انہی کو نماز میں امامت کا حکم دیا اور اصرار کیا کہ ان کے علاوہ اور

کوئی امامت نہ کرے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا: "اگر میں کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر ہی کو بناتا۔" ٦١

ہم نے دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ میں یہ امتیازی صفت بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ وہ سچی رفاقت کا بہترین نمونہ تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے اپنی جان اور مال سب کچھ قربان کر رکھا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح وہ غار میں آں حضرت ﷺ سے پہلے خود داخل ہوئے، تاکہ اگر اس میں کوئی درندہ یا سانپ یا اور کوئی موذی جانور ہو تو چاہے انہیں ضرر پہنچ جائے لیکن آں حضرت ﷺ محفوظ رہیں۔ ہم نے دیکھا کہ کس طرح انہوں نے اس پُر خطر اور طویل سفر میں اپنے بیٹے، بیٹی، آزاد کردہ غلام اور چرواہے کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لگا رکھا تھا۔

میری جان کی قسم، یہ ہے وہ مثالی نمونہ جسے اللہ اور رسول پر ایمان لانے والے ہر مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد، اس کے باپ اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔" ٦٢

٣۔ حضرت عمرؓ نے علانیہ اور حضورؐ نے چھپ کر ہجرت کیوں کی؟

کسی مسلمان کے دل میں یہ خیال آسکتا ہے کہ وہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی ہجرت اور نبی ﷺ کی ہجرت کے درمیان موازنہ کرے اور یہ سوال کرے: "کیوں حضرت عمرؓ نے بلا خوف و خطر مشرکین کو چیلنج کرتے ہوئے علی الاعلان ہجرت کی اور رسول اللہ ﷺ نے جان بچا کر خفیہ طریقے سے ہجرت کی؟ کیا حضرت عمرؓ میں نبی ﷺ سے زیادہ جرأت تھی؟"

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ، یا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی بھی دوسرے مسلمان کا عمل اس کا ذاتی عمل سمجھا جائے گا۔ وہ شرعی طور پر حجت نہ ہوگا۔ اسے اختیار ہے کہ جو بھی طریقے، ذرائع اور تدابیر اسے بہتر لگیں اور اس کی جرأت اور ایمان سے میل کھائیں، انہیں اختیار کرے۔

٦١ مسلم ٧/١٠٥
٦٢ بخاری و مسلم

لیکن جہاں تک رسول اللہ ﷺ کا معاملہ ہے آپ شریعت کے پابند ہیں۔ یعنی دین سے متعلق آپ کے تمام اعمال ہمارے لیے شریعت و قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے اقوال، افعال، اوصاف اور تقریر☆ کے مجموعے کو سنت کہا جاتا ہے، جو مصادر شریعت کا دوسرا مصدر ہے۔ اگر آپؐ نے بھی ویسا ہی کیا ہوتا جیسا حضرت عمرؓ نے کیا تو لوگوں کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہی واجب ہے... اور خوف کے وقت احتیاط ملحوظ رکھنا، پیش بندی کرنا اور خفیہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں اپنی شریعت اسباب و مسبّبات کے تقاضوں پر قائم کی ہے، اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ اللہ کی مشیت اور ارادہ ہی سے انجام پاتا ہے۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے وہ تمام مادی وسائل و ذرائع اور طریقے اختیار کیے جو اس قسم کے کام میں انسانی عقل میں آسکتے تھے۔ آپؐ نے اس سلسلے میں ہر تدبیر کو اہمیت دی اور اسے اختیار کیا۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ کو اپنے گھر اس حال میں چھوڑا کہ وہ آپ کے بستر پر لیٹ گئے اور آپ کی چادر اوڑھ لی۔ اطمینان کر لینے کے بعد ایک مشرک سے مدد لی کہ وہ آپ کو ایسے ذیلی راستوں سے لے جائے جن کی طرف دشمنوں کا ذہن ہی نہ جا سکے۔ غار میں تین دن چھپے رہے۔ اسی طرح کی دیگر احتیاطیں اور تدابیر اختیار کیں جو عقل میں آسکتی تھیں۔ آپ کے ان اعمال سے واضح ہوگیا کہ اللہ عزوجل پر ایمان اور مادی اسباب و ذرائع اختیار کرنے میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی عظیم الشان حکمت سے انہیں اسباب بنایا ہے۔

آں حضرت ﷺ کے ان تدابیر کو اختیار کرنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ آپ کو اپنی جان کا اندیشہ تھا، یا یہ شک تھا کہ کہیں مدینہ پہنچنے سے قبل مشرکین آپ کو گرفتار نہ کر لیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام مادی اسباب اور تدابیر اختیار کر لینے کے بعد آپ نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا۔ جس وقت مشرکین اس غار کے ارد گرد منڈلا رہے تھے جس میں رسول اللہ ﷺ اپنے رفیق سفر حضرت ابو بکرؓ کے ساتھ چھپے ہوئے تھے، اور وہ اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی اپنے قدموں کی طرف دیکھتا تو آپؐ کو دیکھ لیتا، اس صورت حال میں حضرت ابو بکرؓ گھبرا گئے، لیکن آپؐ نے انہیں اطمینان دلایا اور فرمایا: "اے ابو بکر تمہارا کیا خیال ہے ان دو کے

☆ حضورؐ کے سامنے کسی صحابی نے کوئی بات کہی ہو یا کوئی کام کیا ہو اور آپؐ نے اس پر سکوت فرمایا ہو، اسے تقریر کہتے ہیں۔ (مترجم)

بارے میں جن کے ساتھ تیسرا اللہ ہے "اگر آپ کا بھروسہ ان تدابیر اور احتیاطوں پر ہوتا تو اس موقعے پر آپ کو بھی کچھ خوف اور اندیشہ ضرور دامن گیر ہو جاتا۔

معلوم ہوا کہ اس موقعے پر آپؐ نے جو تدابیر اختیار کیں ان کے ذریعے ایک شرعی ذمہ داری ادا کی۔ جب آپ ان کی انجام دہی سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ سے لو لگائی اور اس کی حمایت و تائید پر بھروسہ کیا، تاکہ مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ہر کام میں بھروسہ صرف اللہ عزوجل پر کرنا چاہیے، لیکن یہ اسباب کو اہمیت دینے اور انہیں اختیار کرنے کے منافی نہیں ہے۔

اس کی سب سے نمایاں دلیل یہ بھی ہے کہ جب سراقہ نے قتل کے ارادے سے آپ کا پیچھا کیا اور آپ کے بہت قریب پہنچ گیا، اس وقت اگر آپ کا بھروسہ ان زبردست تیاریوں اور تدابیر پر ہوتا تو اس دشمن کو قریب آتا دیکھ کر ضرور آپ پر کچھ خوف طاری ہو جاتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ آپ قرآن کی تلاوت اور اپنے رب سے مناجات میں مستغرق رہے۔ اس لیے کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس اللہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا ہے وہی لوگوں سے آپ کی حفاظت کرے گا اور ان کے شر سے بچائے گا، جیسا کہ اس نے اپنی کتاب میں وعدہ کیا ہے۔

۴۔ مشرکین مکہ کے دو متضاد رویے:

نبی ﷺ کے پاس اہل مکہ کی جو امانتیں رکھی ہوئی تھیں ان کی ادائیگی کے لیے حضرت علیؓ رک گئے تھے۔ یہ ایک واضح دلیل ہے اس بات کی کہ مشرکین کتنے عجیب و غریب تضاد میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو وہ آپ کو جھٹلاتے تھے اور جادوگر یا شعبدہ باز کہتے تھے، لیکن دوسری طرف اپنے اردگرد کسی کو امانت اور سچائی میں آپؐ سے بڑھ کر نہ پاتے تھے، اسی لیے اپنا ضروری سامان اور مال جس کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا، آپ ہی کے پاس رکھواتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا کفر اس وجہ سے نہیں تھا کہ انہیں آپ کی صداقت پر شبہ تھا، بلکہ اس کا حقیقی سبب یہ تھا کہ وہ گھمنڈ میں مبتلا تھے، اپنے کو اس حق سے بالاتر سمجھتے تھے جسے لے کر آپؐ تشریف لائے تھے، اور آپ کی اتباع کرنے کی صورت میں انہیں اپنی لیڈری چھن جانے اور بالادستی
ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

۵۔ راہِ دعوت میں نوجوانوں کی ذمہ داری:

حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ مکہ اور غار ثور کے درمیان برابر رابطہ بنائے رہے۔ وہ اہل مکہ کے درمیان رہ کر خبروں کی ٹوہ میں رہتے اور انہیں رسول اللہ ﷺ اور اپنے والد تک پہنچاتے۔ ان کی بہن حضرت اسماءؓ نے بڑے اہتمام اور توجہ سے زاد راہ تیار کیا اور سفر کے دوران کام آنے والا ضروری سامان تیار کرنے میں مدد کی۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مسلم نوجوان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اللہ عزوجل کے راستے میں، اساسیات اسلام کی تنفیذ کی راہ میں اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے کیا ذمہ داری سرانجام دینی ضروری ہے۔ انسان کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اپنی ذات تک محدود اور اپنی عبادات میں منہمک رہے، بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنی تمام صلاحیتیں، سرگرمیاں اسلام کی راہ میں جدوجہد کے لیے وقف کر دے۔ یہ ہے وہ امتیازی کردار جو ہر زمانے اور ہر عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی زندگی میں نوجوانوں سے مطلوب ہے۔

نبی ﷺ کے اردگرد، دعوت اور جہاد کے مرحلے میں جو لوگ تھے ان کا جائزہ لیں تو آپ پائیں گے کہ ان کی عظیم اکثریت ایسے جوانوں پر مشتمل تھی جن کی عمریں جوانی کے پہلے مرحلے سے متجاوز نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسلام کی حمایت و نصرت اور اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں اور قوتیں وقف کر دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

۶۔ سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں دھنس جانے کا معجزہ:

رسول اللہ ﷺ کا پیچھا کرتے ہوئے سراقہ اور اس کے گھوڑے کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کے بارے میں ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ وہ آپؐ کا ایک معجزہ تھا۔ اس کی صحت روایت پر تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے جن میں سرفہرست امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ ہیں۔ اس لیے آں حضرت ﷺ کے دیگر معجزات، جن کا گذشتہ صفحات میں تذکرہ ہو چکا ہے ان کی فہرست میں اس کا بھی اضافہ کر لینا چاہیے۔

۷۔ ایک دوسرا معجزہ:

آں حضرت ﷺ کے واقعۂ ہجرت میں ایک بہت نمایاں معجزہ یہ تھا کہ جب آپ اپنے

گھر سے نکلے تو جو مشرکین گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور آپ کو قتل کرنے کے لیے آپ کے نکلنے کے منتظر تھے، ان کی آنکھوں پر نیند نے ڈیرہ جما لیا، چنانچہ آپ کے نکلنے کا ان میں سے کسی کو احساس تک نہ ہو سکا۔ مزید لطف کی بات یہ تھی کہ آپؐ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے گزرے تھے۔ اس وقت آپ قرآن کی یہ آیت پڑھ رہے تھے:

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ

(یٰس۔ ۹)

ہم نے ایک دیوار ان کے آگے کھڑی کر دی ہے اور ایک دیوار ان کے پیچھے۔ ہم نے انہیں ڈھانک دیا ہے۔ انہیں اب کچھ نہیں سوجھتا۔

یہ معجزہ ایک اعلان کے ہم معنی تھا جو اس وقت تو ان مشرکین کے لیے تھا لیکن اس کا خطاب ہر عہد اور ہر زمانے کے لوگوں سے ہے۔ وہ یہ کہ رسول اور آپؐ کے اصحاب دین کی راہ میں ایک عرصے سے، ان کے ہاتھوں جو طرح طرح کے مظالم اور تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ ان کی نصرت و حمایت سے دست بردار ہو گیا ہے اور کامیابی کی منزل ان سے بہت دور ہے۔ مشرکین اور تمام دشمنانِ دین کو موجودہ صورت حال میں خوشیاں نہیں منانی چاہئیں، اس لیے کہ اللہ کی مدد بہت قریب ہے اور اس کے وسائل و ذرائع کا مشاہدہ تقریباً ہر لمحہ ہو رہا ہے۔

۸۔ محبتِ رسول کا مثالی نمونہ:

مدینہ منورہ نے جس طرح رسول اللہ ﷺ کا پر جوش استقبال کیا اس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہاں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے دلوں میں آپ کی کتنی شدید محبت موجزن تھی۔ وہ روزانہ مدینہ سے باہر نکل کر چلچلاتی دھوپ میں آپ کا انتظار کرتے۔ یہاں تک کہ جب دن ڈھل جاتا اور آپؐ نہیں پہنچتے تو اگلی صبح انتظار کے لیے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ انہیں دکھائی دیے، ان کے جذبات قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ ان کی زبانوں پر خوشی کے نغمے اور ترانے جاری تھے۔ آپ نے بھی ان سے ایسی ہی محبت کا اظہار فرمایا۔ قبیلہ بنو النجار کی بچیاں جب آپ کے ارد گرد اکٹھا ہو کر، آپ کی تشریف آوری پر خوشی کے گیت

گا رہی تھیں تو آپ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "کیا تم سب مجھ سے محبت کرتی ہو؟ اللہ کی قسم میرا دل بھی تمہاری محبت سے لبریز ہے۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا مطلب محض آپ کی اتباع نہیں ہے، بلکہ آپ سے محبت آپ کی اتباع کی اساس اور اس کا محرک ہے۔ اگر دل میں جذباتی محبت نہ ہو تو کوئی ایسا محرک نہ ہوگا جو اتباع پر آمادہ کرے۔

وہ لوگ راہ راست پر نہیں ہیں جن کا گمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے محبت کا مطلب آپ کی اتباع و اقتدا کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ انہوں نے یہ فراموش کر دیا کہ اقتدا کسی محرک اور عامل کے بغیر ممکن نہیں، اور اتباع کی تحریک ایسی قلبی محبت سے ہوتی ہے جو احساسات کو برانگیختہ کر دے اور جذبات کو بھڑکا دے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اللہ پر ایمان کا پیمانہ یہ قرار دیا کہ انسان کا دل آپؐ کی محبت سے لبریز ہو اور آپ سے اس کی محبت بیٹے، باپ اور تمام انسانوں سے محبت پر غالب ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ رسول سے محبت باپ بیٹے کی محبت کی جنس سے ہے، یعنی دونوں کا سرچشمہ دل اور جذبات ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو دونوں کے درمیان موازنہ درست نہ ہوتا۔

۹۔ آثارِ رسول سے "تبرک" اور "توسل" مشروع ہے:

حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں آں حضرت ﷺ کے قیام کے دوران جو کچھ پیش آیا اس سے ہمارے سامنے آپؐ کے اصحاب کی آپ سے محبت کا ایک دوسرا مظہر سامنے آتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جس برتن میں کھانا تناول فرماتے تھے اسے واپس کرتے تو بچے ہوئے کھانے میں حضرت ابوایوبؓ اور ان کی بیوی آپ کی انگلیوں کے نشانات تلاش کرتے تھے اور برکت کے حصول کے لیے اسی جگہ سے کھاتے تھے جہاں سے آپؐ نے کھایا تھا۔ اس واقعے پر غور کریں تو اس سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے آثار سے برکت حاصل کرنا مشروع اور ثابت شدہ امر ہے۔

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے ایسی بہت سی روایتیں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام برکت حاصل کرنے اور شفا پانے کے لیے یا دیگر مقاصد سے، نبی ﷺ کے آثار سے عقیدت کا اظہار مختلف شکلوں میں کرتے تھے۔

مثلاً امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ایک شیشی میں نبی ﷺ کے کچھ بال محفوظ رکھے تھے۔ جب کسی صحابی کی آنکھ آجاتی یا اسے کوئی دوسری تکلیف ہوتی تو وہ ان کی خدمت میں ایک برتن میں تھوڑا سا پانی بھیجتا تھا، وہ اس میں آپؐ کے بال ڈبو کر پانی واپس کردیتیں اور وہ صحابی اسے پی لیتا تھا۔ اس سے صحابہ کا مقصد اس بال کے وسیلے سے برکت حاصل کرنا اور مرض سے شفا پانا ہوتا تھا۔ ۶۳

اسی طرح امام مسلمؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ آں حضرت ﷺ حضرت ام سلیمؓ کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں بستر پر سو جاتے تھے۔ ایک دن آپؐ تشریف لے گئے۔ وہ گھر میں نہیں تھیں۔ آپؐ سو گئے۔ حضرت ام سلیمؓ کہیں سے آئیں تو دیکھا کہ آپ پسینے میں شرابور ہیں اور آپ کا پسینہ بستر پر چمڑے کے ایک ٹکڑے میں اکٹھا ہو رہا ہے۔ انہوں نے فوراً اپنی صندوقچی کھولی اور اس میں سے چھوٹی چھوٹی شیشیاں نکال کر ان میں پسینہ اکٹھا کرنے لگیں۔ نبی ﷺ کی آنکھ کھل گئی تو آپ نے فرمایا: "ام سلیم، یہ کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول۔ اس کے ذریعے ہم اپنے بچوں کے لیے برکت چاہتے ہیں" آپؐ نے فرمایا" ٹھیک ہے" ۶۴

صحیحین میں کچھ ایسی روایتیں بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آں حضرت ﷺ وضو کرتے تھے تو صحابہ بچا ہوا پانی لینے کے لیے دوڑ پڑتے تھے۔ اسی طرح وہ آپؐ کے بہت سے آثار مثلاً لباس اور پانی پینے کے پیالے وغیرہ سے برکت حاصل کرتے تھے۔ ۶۵

---

۶۳ بخاری، کتاب اللباس، باب ما یذکر فی الشیب

۶۴ مسلم، کتاب الفضائل، باب طیب عرقه ﷺ

۶۵ شیخ ناصر الدین البانی کا خیال ہے کہ "اس قسم کی احادیث کا آج کے زمانے میں کوئی فائدہ نہیں۔" یہ بات انہوں نے اس مجموعہ احادیث پر تنقید کرتے ہوئے کہی ہے جسے استاذ محمد المنتصر الکتانی نے کلیۃ الشریعۃ کے طلبہ کے لیے تیار کیا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک خطرناک بات ہے اور کسی مسلمان کو اسے زبان پر لانا زیب نہیں دیتا۔ رسول اللہ ﷺ کے تمام اقوال، افعال اور تقریرات (خاموش تائیدات) تشریع ہیں اور تشریع قیامت تک

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تو جب آپ کے مادّی آثار کا وسیلہ اختیار کرنے کی یہ حیثیت ہے تو اللہ عزوجل کے نزدیک آپ کے مقام و مرتبہ اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا وسیلہ اختیار کرنا کیونکر صحیح نہ ہوگا؟

یہاں یہ وہم نہیں ہونا چاہیے کہ ہم وسیلہ اختیار کرنے کو برکت حاصل کرنے پر قیاس کر رہے ہیں، اور یہ کہ یہ مسئلہ محض قیاسی ہے۔ اس لیے کہ "توسل" اور "تبرک" دونوں الفاظ کا ایک ہی مفہوم ہے۔ یعنی جس ذات کا وسیلہ اختیار کیا جا رہا ہے اس کے واسطے سے خیر و برکت چاہی جائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آں حضرت ﷺ کی جاہ و عظمت کا وسیلہ اختیار کیا جائے یا آپؐ کے آثار، باقی ماندہ چیزوں اور ملبوسات کو وسیلہ بنایا جائے۔ یہ سب جزئیات ہیں جو ایک جامع نوع میں داخل ہیں اور وہ ہے مطلق وسیلہ اختیار کرنا، جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ اور تمام جزئی صورتیں ایک قاعدہ کی رو سے، جسے علماء اصول "تنقیح مناط" کہتے ہیں، عموم نص کے تحت آجاتی ہیں۔

واقعہ ہجرت کے بارے میں اس قدر تبصرے پر ہم اکتفا کرتے ہیں۔ آئندہ صفحات میں ان عظیم الشان کاموں کا تذکرہ کریں گے جنہیں آں حضرت ﷺ نے مدینہ منورہ کے نئے معاشرے میں انجام دیا۔

کے لیے ہے الا یہ کہ وہ قرآن یا سنت صحیحہ سے منسوخ ہو۔ تشریع کا ایک اہم فائدہ اور دلالت یہ ہے کہ اس سے ایک حکم معلوم ہوتا ہے اور اس کے مطابق عقیدہ رکھنا جائز ہے۔ یہ ثابت شدہ اور صحیح احادیث کتاب اللہ سے منسوخ ہیں نہ انہی جیسی دیگر احادیث سے، اس لیے ان کا تشریعی مفہوم قیامت تک کے لیے ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے آثار سے برکت حاصل کرنے اور وسیلہ اختیار کرنے میں کوئی اور مانع نہیں ہے چہ جائیکہ آپ کی ذات گرامی اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ کے عظیم مقام کا وسیلہ اختیار کیا جائے۔ یہ چیز رہتی دنیا تک لیے ثابت شدہ اور مشروع ہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ آج کے زمانے میں ان احادیث سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

غالب گمان یہ ہے کہ شیخ البانی کی نظر میں ان احادیث کے بے فائدہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ وہ "وسیلہ" کے بارے میں ان کے مخصوص مسلک سے ٹکراتی ہیں۔ لیکن محض یہ بات ان کے منسوخ اور بے فائدہ قرار پانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

باب چہارم

نئے معاشرے کی بنیادیں

- پہلی بنیاد: مسجد کی تعمیر
- دوسری بنیاد: مسلمانوں کے درمیان مواخات
- تیسری بنیاد: مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاہدہ

نئے معاشرے کی بنیادیں

رسول اللہ ﷺ کی ہجرت مدینہ سے اس وقت روئے زمین پر سب سے پہلا "دارالاسلام" وجود میں آیا۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ اسلامی حکومت اپنے بانی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں قائم ہونے والی ہے۔

اسی لیے رسول ﷺ نے مدینہ پہنچ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس حکومت کی اہم بنیادیں استوار کیں۔ یہ بنیادیں درج ذیل تین کاموں کی صورت میں ظاہر ہوئیں:

اول: مسجد کی تعمیر

دوم: عام مسلمانوں اور خاص طور پر مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات۔

سوم: دستور کی تدوین، جس سے مسلمانوں کے باہمی تعلقات متعین ہوئے اور غیر مسلموں کے ساتھ عام طور پر اور یہود کے ساتھ خاص طور پر ان کے تعلقات کی وضاحت ہوئی۔

سطور ذیل میں ہم ان تینوں بنیادوں پر روشنی ڈالیں گے۔

پہلی بنیاد: مسجد کی تعمیر

پیچھے ہم بیان کر چکے ہیں کہ آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی جس جگہ بیٹھی تھی وہ انصار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت میں تھی۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ نے رسول ﷺ کی ہجرت مدینہ سے قبل ہی اس جگہ کو جائے نماز بنا لیا تھا اور صحابہ کے ساتھ وہاں نماز ادا کرتے تھے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس جگہ مسجد تعمیر کی جائے۔ آپؐ نے دونوں بچوں کو جو حضرت اسعد بن زرارہؓ کی کفالت میں تھے، بلایا اور ان سے اس زمین کی خریداری کے سلسلے میں

گفتگو کی۔ انہوں نے عرض کیا: "ہم اسے آپ کو ہبہ کر رہے ہیں اے اللہ کے رسول" آں حضرت ﷺ نے اسے بلا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا اور دس دینار میں اسے ان بچوں سے خرید لیا۔[1]

اس زمین میں غرقد اور کھجور کے درخت اور بعض مشرکین کی پرانی قبریں تھیں۔ رسول ﷺ کے حکم سے قبریں کھود کر ہموار کر دی گئیں اور درخت کاٹ کر انہیں مسجد کے قبلے کی جانب ترتیب سے لگا دیا گیا، مسجد کی لمبائی سو ہاتھ اور چوڑائی اتنی ہی تھی یا اس سے کچھ کم رکھی گئی۔ پھر کچی اینٹوں سے اس کی تعمیر کی گئی، رسول اللہ ﷺ نے مسجد کی تعمیر میں صحابہ کا ہاتھ بٹایا۔ آپؐ ان کے ساتھ خود بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ مسجد کا قبلہ بیت المقدس کی جانب رکھا گیا۔ کھجور کے تنوں سے اس کے کھمبے اور اس کی ٹہنیوں سے چھت بنائی گئی۔ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہ ہم اس کی باقاعدہ چھت تیار کر دیں؟" آپؐ نے فرمایا: "لکڑیوں اور گھاس پھوس سے تیار کیا گیا ویسا ہی چھپر رہنے دو جیسا موسیٰ کے لیے بنایا گیا تھا"[2] مسجد کا فرش ریت اور کنکریوں کا ہی رہنے دیا گیا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ "جوں ہی نماز کا وقت ہوتا آں حضرت ﷺ نماز ادا کرتے تھے۔ شروع میں آپ بکریوں کے احاطے میں نماز ادا کرتے تھے۔ پھر آپؐ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ آپؐ نے قبیلہ بنو النجار کے لوگوں کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: "اے بنو النجار! اپنی یہ زمین میرے ہاتھ فروخت کر دو" انہوں نے عرض کیا: "نہیں اللہ کی قسم! ہم اس کی قیمت نہیں لیں گے۔ ہم تو اللہ سے اس کے اجر کے طالب ہیں" حضرت انسؓ فرماتے ہیں: 'اس زمین کا جو حال تھا وہ میں بتاتا ہوں۔ اس کے ایک حصے میں مشرکین کی کچھ قبریں تھیں۔ ایک حصہ ناہموار تھا اور ایک حصے میں کھجور کے درخت

[1] بخاری ۴/۲۵۸، طبقات ابن سعد ۲/۴، اعلام الساجد فی احکام المساجد للزرکشی ص: ۲۲۳ اور دیگر کتب سیرت۔ بخاری میں یہ مذکور نہیں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اس زمین کو دس دینار میں خریدا تھا۔ فتح الباری میں ابن حجرؒ نے موسیٰ بن عقبہؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اس زمین کو ان بچوں سے دس دینار میں خریدا تھا۔ واقدی نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ یہ قیمت حضرت ابو بکرؓ نے حضور کی طرف سے ادا کی تھی۔

[2] طبقات ابن سعد ۲/۵

تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے قبریں کھود کر برابر کر دی گئیں۔ نشیب و فراز کو ہموار کر دیا گیا اور درختوں کو کاٹ کر مسجد کے قبلہ کی جانب ترتیب سے لگا دیا گیا اور دونوں جانب پتھر چن دیے گئے۔ صحابہ رجز پڑھتے ہوئے پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کا ساتھ دیتے تھے۔ آپؐ کی زبان مبارک پر اس وقت یہ کلمات تھے:

اللهم لا خير الا خير الآخرة   فانصر الانصار والمهاجرة [3]

اے اللہ اصل خیر تو آخرت کا ہے۔ تو انصار اور مہاجرین کی مدد فرما۔

مسجد نبوی اسی شکل میں بغیر کسی زیادتی یا تبدیلی کے حضرت ابو بکرؓ کی خلافت تک رہی۔ پھر حضرت عمرؓ نے اس میں بعض اصلاحات کیں۔ لیکن اس کی تعمیر عہد نبوی کی طرح کچی اینٹوں اور کھجور کی ٹہنیوں سے کی اور ستون لکڑی کے ہی رہنے دیے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں اس میں بڑی تبدیلی کی۔ انہوں نے اس کی دیواریں منقش پتھروں اور گچ سے کھڑی کروائیں۔[4]

دروس و نتائج

گذشتہ تفصیل سے چند اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں، جنہیں ہم سطور ذیل میں باختصار بیان کرتے ہیں:

۱۔ اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت میں مسجد کی اہمیت:

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچنے اور وہاں قیام کرنے کے فوراً بعد اس جانب توجہ فرمائی کہ وہاں کے مسلمانوں -انصار و مہاجرین- پر مشتمل ایک راسخ اور مستحکم اسلامی معاشرہ قائم ہو جائے۔ چنانچہ اس سلسلے کے پہلے اقدام کے طور پر آپ نے مسجد تعمیر کروائی۔

اس میں کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ مسجد کی تعمیر اسلامی معاشرے کی تاسیس کی اوّلین اور اہم بنیاد ہے۔ اسلامی معاشرے کو اسی صورت میں رسوخ اور استحکام مل سکتا ہے جب وہ اسلام کے نظام، عقیدہ اور آداب کا التزام کرے۔ اور یہ سب چیزیں مسجد کی

[3] بخاری ۱/۱۱۱

[4] اعلام الساجد: ۲۲۴-۲۲۵

روح اور اس کے نظام سے وجود میں آتی ہیں۔

اسلام کے نظام اور آداب کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان، ان کے مختلف احوال اور معاملات میں مساوات و عدل کی روح پروان چڑھے۔ اور یہ تعلق اپنی اعلیٰ شکل میں مسجد ہی میں نشو و نما پاتا ہے۔ مسلمان جب تک روزانہ متعدد مرتبہ اللہ کے گھر میں باہم اس طرح نہ ملیں کہ ان کے درمیان جاہ، مال اور حیثیت کا فرق اٹھ چکا ہو، اس وقت تک ان کے درمیان باہم الفت و محبت اور اخوت کی روح نہیں پیدا ہو سکتی۔

اسلام کے نظام اور آداب کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان، ان کے احوال اور معاملات میں مساوات و عدل کی روح پروان چڑھے۔ لیکن یہ روح اس وقت تک پروان نہیں چڑھ سکتی جب تک کہ مسلمان روزانہ اس حال میں باہم نہ ملیں کہ وہ اللہ عزوجل کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوں، اللہ کی عبودیت ان کے درمیان قدرِ مشترک ہو اور سب ایک ہی رب کی لو لگائے ہوں۔ اگر ہر مسلمان اپنے گھر میں رہ کر اللہ کی عبادت کر لے اور نماز پڑھ لیا کرے اور اجتماعی طور پر عبادت کی کوئی صورت نہ ہو تو معاشرے میں عدل و مساوات کا تصور خود غرضی، تعلّی اور انانیت کے جذبات پر ہرگز غالب نہیں آسکتا۔

اسلام کے نظام اور آداب کا تقاضا ہے کہ مسلمان مستحکم وحدت کے سانچے میں ڈھل جائیں اور اللہ کی رسی یعنی اس کا حکم اور شریعت انہیں متحد کیے رہے۔ لیکن اگر معاشرے کے مختلف گوشوں میں ایسی مسجدیں قائم نہیں ہوں گی جن میں اکٹھا ہو کر مسلمان اللہ کے احکام اور اس کی شریعت جان سکیں تاکہ علم و معرفت کے ساتھ انہیں مضبوطی سے تھامے رہیں تو ان کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی اور بہت جلد خواہشاتِ نفس ان میں تفرقہ ڈال دیں گی۔

مسلمانوں کے معاشرہ اور ان کی نئی حکومت میں انہی تصورات کو قائم اور رائج کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر فرمائی۔

۲۔ نابالغ بچوں اور یتیموں کے ساتھ معاملہ کا حکم:

حنفیہ نے اس حدیث سے نابالغ کا اپنے مال پر تصرف صحیح ہونے پر استدلال کیا ہے۔[۵]

---

۵ اعلام الساجد ص: ۲۲۳

وجہِ استدلال یہ ہے کہ نبی ﷺ نے دو یتیم بچوں سے معاملہ کر کے ان کا کھلیان خریدا۔ اگر اپنے مال میں ان کا تصرف صحیح نہ ہوتا تو آپ ان سے نہ خریدتے۔

جمہور فقہاء کا خیال ہے کہ نابالغ کا اپنے مال میں تصرف صحیح نہیں ہے۔ ان کی دلیل قرآن کی یہ آیت ہے:

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ أَشُدَّهٗ (الانعام۔ ۱۵۲)

اور مالِ یتیم کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد کو پہنچ جائے۔

کھلیان خریدنے والی مذکورہ بالا حدیث کی دو توجیہیں کی گئی ہیں:

اول: یہ کہ ابن عیینہ کی روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے ان دونوں کے چچا سے جن کی پرورش اور کفالت میں وہ لوگ تھے، گفتگو کی تھی اور انہی کے واسطے سے ان بچوں سے وہ زمین خریدی تھی۔[۶] اس لیے یہ روایت حنفیہ کی دلیل نہیں بن سکتی۔

دوم: یہ کہ اس قسم کے معاملات میں نبی ﷺ کی ولایت معتبر ہے۔ آپ نے ان دونوں سے زمین کا معاملہ ایک فرد ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کے عام ولی کی حیثیت سے کیا تھا۔

۳۔ پرانی قبروں کو ہموار کر کے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا جواز:

امام نوویؒ نے اس حدیث کے ضمن میں فرمایا ہے: "اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پرانی قبروں کو کھود کر زمین ہموار کر دینا جائز ہے اور یہ کہ اگر وہ مٹی ہٹادی جائے جس میں لاشوں کے خون و پیپ کی آمیزش ہو گئی ہو تو وہاں نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اگر وہاں کی زمین پاک کر لی گئی ہو تو اس جگہ مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین میں مردوں کو دفن کیا گیا ہو پھر اس پر ایک عرصہ بیت گیا ہو، اس کی فروخت جائز ہے اور اس کی ملکیت کا حق اس کے مالک کو، اور اگر اس نے وقف نہ کیا ہو تو اس کے بعد اس کے ورثاء کو حاصل رہتا ہے۔[۷]

---

۶ فتح الباری بشرح صحیح البخاری ۸/۱۷۵

۷ اعلام الساجد ص: ۲۳۶

علمائے سیرت نے لکھا ہے کہ کھلیان کی یہ قبریں بہت پرانی اور بوسیدہ تھیں، اس لیے ان میں پیپ اور خون ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود انہیں کھول کر ان کے بقایا کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

کسی زمین میں بنی ہوئی پرانی قبروں کو کھود کر، زمین ہموار کر کے وہاں مسجد تعمیر کرنے کا جواز اسی صورت میں ہے کہ وہ وقف نہ ہو۔ لیکن اگر اسے قبرستان یا کسی دوسرے مقصد سے وقف کیا گیا ہے تو اس کے علاوہ دوسرے کام میں لانا جائز نہیں۔

۴۔ مساجد میں پلاسٹر کرنے اور نقش و نگار بنانے کا حکم:

کیا مسجد کی تعمیر میں پتھر یا دیگر ایسی چیزیں استعمال کی جاسکتی ہیں جن سے اس کی مضبوطی میں اضافہ ہو جائے اور اس کی چھت اور عمود پختہ ہو جائیں؟ اور کیا اس میں نقش و نگار بنانا اور اس کی تزئین کرنا جائز ہے؟

جہاں تک اول الذکر چیز کا سوال ہے تو تمام علماء نے اسے نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر از سر نو فرمائی تھی۔ اس کام کو اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے انجام نہیں دیا تھا لیکن آپ کا نہ کرنا اس کے ناجائز ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اس حکمت میں مخل ہو جس کی بنا پر مساجد کی تعمیر کا حکم دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے شعائر اللہ کی تعظیم اور اہتمام کا مزید اظہار ہوتا ہے۔ علماء نے اس سلسلے میں اس ارشاد باری سے بھی استدلال کیا ہے:

إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ...... (التوبہ۔۱۸)

اللہ کی مسجدوں کے آباد کار (مجاور و خادم) تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں......

اور مساجد کی آباد کاری ان کی خوب صورت اور پختہ تعمیر اور ان کے حسن انتظام سے ہو سکتی ہے۔

رہا مسجد میں نقش و نگار بنانا اور اس کی خوب تزئین کرنا تو اس کی کراہت پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ بعض نے اسے مکروہ تحریمی اور بعض نے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے۔ دونوں گروہوں

کے علماء اس بات پر تو متفق ہیں کہ مسجد کی تعمیر کے لیے وقف مال کو نقش و نگار بنانے اور تزئین کرنے پر خرچ کرنا حرام ہے۔ ان کا اختلاف صرف اس صورت میں ہے جب کہ خود صاحب مال اپنے مال کو اس مصرف میں لگائے۔ علامہ زرکشی نے امام بغویؒ کا یہ فتویٰ نقل کیا ہے کہ "وقف کے مال سے مسجد میں نقش و نگار بنانا جائز نہیں۔ اگر متولی ایسا کرے گا تو اس پر تاوان لازم ہو گا۔ اور اگر خود صاحب مال ایسا کرے تو یہ مکروہ ہے اس لیے کہ اس سے نمازیوں کی توجہ میں خلل پڑتا ہے۔"[۸]

مسجد کی مضبوطی کے لیے کام کرنا اور اس میں نقش و نگار بنانا دونوں میں واضح فرق ہے۔ اول الذکر میں۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ کوئی ایسی چیز نہیں جو اس حکمت میں خلل انداز ہو جس کی بنا پر مسجد کی تعمیر کا حکم دیا گیا ہے، جب کہ مؤخر الذکر عمل اس حکمت میں مخل ہوتا ہے، اس لیے کہ اس سے نمازیوں کے دل خشوع اور تدبر سے ہٹتے ہیں اور دنیا کے مظاہر میں لگ جاتے ہیں، جب کہ مسجد میں آنے کا مقصد دنیوی تصورات سے فرار اختیار کرنا اور اس کی زینتوں اور دل فریبیوں سے ذہن کو خالی کرنا ہوتا ہے۔

اسی پہلو کی جانب حضرت عمرؓ نے توجہ دلائی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا تو فرمایا: "اسے ایسا بنادو کہ لوگ بارش سے محفوظ رہیں۔ اسے لال پیلا مت کرو، ورنہ لوگ فتنے میں پڑ جائیں گے۔

کیا مسجد میں قبلہ کی سمت قرآن کی کوئی آیت لکھنا بھی ممنوع نقش و نگار میں داخل ہے یا اس کی اجازت ہے؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ علامہ زرکشیؒ نے اپنی کتاب "اعلام الساجد" میں لکھا ہے:

"مسجد میں قبلہ کی سمت قرآن کی کوئی آیت یا اس کا کوئی جزء لکھنا مکروہ ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: "بعض علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی میں ایسا کیا تھا اور کسی نے اس پر ان کی نکیر نہیں کی تھی۔"[۹]

۸۔ یہ شوافع کے نزدیک ہے۔ احناف اور دیگر فقہاء نے، اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو اس کی اجازت دی ہے۔

۹۔ اعلام الساجد ص ۲۲۷

گزشتہ تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ مساجد کی تعمیر و تزئین کا اہتمام کرنے والے بہت سے لوگوں کا عمل صحیح نہیں ہے۔ وہ طرح طرح سے ان کی تزئین کرنے اور نقش و نگار بنانے اور شان و شوکت کے مختلف مظاہر سے انہیں آراستہ کرنے میں خوب محنت کرتے ہیں اور ایسی مساجد تیار کرتے ہیں کہ ان میں جانے والے کے دل میں اللہ عزوجل کے سامنے عاجزی و فروتنی کا ذرا بھی احساس پیدا نہیں ہوتا، بلکہ انہیں دیکھ کر فنِ تعمیر اور عربی فنِ تزئین کی ترقی پر فخر کا احساس ابھرتا ہے جس کا وہ مساجد زبانِ حال سے اظہار کرتی ہیں۔

سادہ لوح مسلمانوں کے ساتھ اس شیطانی کھلواڑ کا ایک بھیانک نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ غریب لوگ دنیوی حرص و طمع کے مظاہر سے فرار کی کوئی راہ نہیں پاتے ہیں۔ پہلے مساجد میں ایسا ماحول ملتا تھا کہ غریب اپنی غربت بھول جاتا تھا اور اس کا دل دنیا اور اس کی رنگینیوں سے نکل کر آخرت اور اس کے فضل کی جستجو میں لگ جاتا تھا۔ لیکن اب ان مساجد کی بناوٹ ایسی ہوتی ہے جو انہیں دنیا کی رنگینیوں کی یاد دلاتی ہے جن سے وہ محروم ہیں اور ان میں غربت اور بدحالی کا احساس پیدا کرتی ہے۔

ہائے افسوس! مسلمانوں کا یہ کیا حال ہو گیا ہے کہ انہوں نے اسلام کے حقائق سے روگردانی اختیار کر لی ہے اور ایسے جھوٹے مظاہر میں منہمک ہو گئے ہیں جن کے اوپر دین کا لبادہ پڑا ہوا ہے لیکن اندرون میں دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں اور خواہشاتِ نفس کے ساتھ موجود ہے۔

دوسری بنیاد: مسلمانوں کے درمیان مواخات

پھر رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرائی۔ آپ نے انہیں حق اور مواسات کے معاملے میں بھائی بھائی قرار دیا اور انہیں ایک دوسرے کا وارث بنایا۔ اس طرح ان کے درمیان اسلامی اخوت کا رشتہ نسبی رشتے سے زیادہ طاقت ور قرار پایا۔

آپ نے جعفر بن ابی طالبؓ اور معاذ بن جبلؓ کو، حمزہ بن عبد المطلبؓ اور زید بن حارثہؓ کو، ابو بکر صدیقؓ اور خارجہ بن زہیرؓ کو، عمر بن الخطابؓ اور عتبان بن مالکؓ کو، عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور سعد بن الربیعؓ کو، اسی طرح دیگر صحابہ کو بھائی بھائی بنا دیا۔ [1]

پھر نبی ﷺ نے اس اخوت کے دائرے کو وسیع کر کے تمام صحابہ کو اس میں شامل کر لیا اور ان کے درمیان اخوت اور موالات کا تعلق قرار دیا، جیسا کہ ہم آگے ذکر کریں گے۔

یہ اخوت مادی بنیادوں پر بھی قائم تھی۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ غزوۂ بدر تک اس اخوت کے حقوق نسبی رشتے کے حقوق پر مقدم رہے۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ
(الانفال۔۷۵)

مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں۔ یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس آیت نے پہلے کے حکم کو منسوخ کر دیا، میراث کے معاملے میں اسلامی اخوت کا اثر ختم اور نسبی رشتہ مؤثر ہو گیا اور تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے سیرت ابن ہشام ۱/ ۵۰۴، طبقات ابن سعد ۳/ ۲

امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ''مہاجرین جب مدینہ آئے اور نبی ﷺ نے ان کے اور انصار کے درمیان مواخات کرائی تو انصاری کا وارث اس کے رشتہ داروں کے بجائے مہاجر ہوتا تھا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ. النساء۔ ۳۳ (اور ہم نے ہر اس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور قریبی رشتہ دار چھوڑیں) تو گذشتہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اسی آیت میں آگے ہے: وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ (اب رہے وہ لوگ جن سے تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انہیں دو) یعنی ان کی مدد کرو، انہیں مالی تعاون دو اور ان کی خیر خواہی کرو۔ اس طرح اسلامی اخوت کی بنیاد پر میراث کا حکم ختم ہو گیا۔[1]

دروس و نتائج

یہ ہے وہ دوسری بنیاد جسے رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرے کی تعمیر اور اسلامی حکومت کے قیام کے لیے استوار کیا۔ اس بنیاد کی اہمیت کا اظہار درج ذیل پہلوؤں میں ہوتا ہے:

۱۔ امت کی وحدت اور نظم و قانون کی تشکیل میں مواخات کا کردار:

کوئی بھی حکومت صرف امت کی وحدت اور تعاونِ باہمی کی بنیاد پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔ اور افرادِ امت کے درمیان اتحاد و تعاون ممکن نہیں اگر اخوتِ باہمی کا محرک موجود نہ ہو اور وہ ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے ہوں۔ کوئی بھی جماعت جس کے افراد کے درمیان محبت و اخوت کا حقیقی رشتہ مفقود ہو کسی اصول پر متحد نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک امت یا جماعت میں فی الواقع اتحاد نہ ہو اس کے ذریعے کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔

اخوتِ باہمی کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے پہلے کوئی عقیدہ ہو جس پر سب یکجا ہوں اور اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ دو الگ الگ اور متضاد فکر یا عقیدے پر ایمان رکھنے والے اشخاص کے درمیان اخوت پایا جانا محض خام خیالی اور وہم ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ فکر یا عقیدہ آدمی کو عملی زندگی میں ایک مخصوص کردار کا حامل بناتا ہو۔

---

[1] بخاری، کتاب التفسیر ۵/۱۷۸

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے دلوں کو ایک کرنے کے لیے اخوت کی بنیاد اسلامی عقیدے کو بنایا جسے آپؐ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لے کر تشریف لائے تھے اور جو تمام انسانوں کو صرف اللہ عزوجل کی بندگی کی صف میں رکھتا ہے اور ان کے درمیان کسی طرح کا فرق و امتیاز نہیں کرتا سوائے تقویٰ اور عمل صالح کے امتیاز کے۔ ایسے افراد کے درمیان باہم اخوت، تعاون اور ایثار کی قائم ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی جن کا شیرازہ مختلف عقائد اور افکار نے منتشر کر رکھا ہو اور ان میں سے ہر شخص اپنی اپنی انانیت، خود غرضی اور خواہشات نفس کا مالک ہو۔

۲۔ عدل کا قیام صرف افراد کے درمیان اخوت و محبت کی بنیاد پر ممکن ہے:

معاشرہ، خواہ کوئی بھی ہو، افراد کے بکھرے ہوئے اور پراگندہ مجموعے سے صرف ایک چیز میں مختلف ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس معاشرے کے افراد کے درمیان زندگی کے تمام میدانوں اور تمام ضروریات میں ایک دوسرے کا تعاون اور مدد کرنے کا اصول پایا جاتا ہے۔ اگر یہ اصول ان کے درمیان عدل و مساوات کی میزان پر قائم ہو تو وہ معاشرہ عدل پرور اور پاکیزہ ہو گا اور اگر اس کی بنیاد ظلم و جبر پر ہو تو وہ معاشرہ ظالم اور غیر متوازن ہو گا۔

اگر پاکیزہ معاشرہ زندگی اور روزی کے وسائل سے استفادہ کے معاملے میں عدل کی بنیاد پر قائم ہو تو اس عدل کی شفافیت اور صحیح طریقہ پر اس کی تنفیذ کی کیا ضمانت ہے؟

اس کی اولین فطری ضمانت اس معاشرے کے افراد کے درمیان پائی جانے والی اخوت اور محبت ہے۔ پھر دوسری ضمانت اقتدار اور قانون کی حکمرانی ہے۔

اگر معاشرے کے افراد کے درمیان اخوت و محبت مفقود ہو تو اقتدار وقت کے لیے ان کے درمیان عدل کے اصولوں کا نفاذ کسی بھی صورت میں ممکن نہیں۔ بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ یہ اصول ان افراد کے درمیان بغض و نفرت کا ذریعہ بن جائیں۔ اور بغض و نفرت کی صورت میں ظلم اور زیادتی کی بدترین شکلیں ظاہر ہوتی ہیں۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کو اس عدلِ اجتماعی کے اصولوں کی بنیاد بنایا جس کے نفاذ پر دنیا کا سب سے عظیم اور بے مثال معاشرتی نظام وجود میں آیا۔ اس عدل کے اصولوں نے بعد میں ترقی کر کے لازمی شرعی احکام و قوانین کی شکل

اختیار کرلی، لیکن یہ سب اسی اولین بنیاد یعنی اسلامی اخوت پر قائم تھے۔ اگر یہ عظیم اخوت نہ ہوتی جو خود اسلامی عقیدے کی حقیقت پر وجود میں آئی تھی تو اسلامی معاشرے کو تقویت پہنچانے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں ان اصولوں کا کوئی عملی اور مثبت اثر نہ ہوتا۔

۳۔ مواخات کا حقیقی مفہوم اور اس کے اثرات

رسول ﷺ نے اپنے اصحاب کے درمیان جو اخوت قائم کی تھی وہ محض ایک نعرہ نہیں
تھا جو ان کی زبانوں پر جاری ہو گیا ہو، بلکہ ایک عملی حقیقت تھی جس کا زندگی کے حقائق اور انصار
و مہاجرین کے درمیان قائم تعلقات کے تمام پہلوؤں سے گہرا تعلق تھا۔

اسی لیے نبی ﷺ نے اس اخوت کو ایک ذمہ داری کی حیثیت دے دی تھی۔ اس ذمہ
داری کو ان صحابہ نے بحسن و خوبی انجام دیا۔ اس کی ایک دلیل انصاری صحابی حضرت سعد بن
الربیعؓ کا عمل ہے۔ رسول ﷺ نے ان کے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے درمیان
مواخات کرائی تھی۔ حضرت سعدؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سامنے پیش کش کی کہ وہ
ان کے گھر، بیویوں اور مال میں سے برابر برابر تقسیم کرلیں، لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ان کا
شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انہیں مدینہ کے بازار کا راستہ بتادیں تاکہ وہ وہاں جاکر کچھ کما سکیں۔
یہ انصار میں سے صرف حضرت سعد بن الربیعؓ ہی کا معاملہ نہ تھا جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے بلکہ یہی
عام صحابہ کا حال تھا کہ وہ ایک دوسرے کا بھرپور تعاون کرتے تھے۔ خاص طور پر مکہ سے جو
صحابہ ہجرت کرکے مدینہ آئے اور نبی ﷺ نے ان کے اور انصار کے درمیان مواخات کرائی
اس کے بعد تو انصار نے مہاجرین کی بھرپور مدد کی۔

اسی لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حق میراث کو نسب و قرابت کے بجائے اس اخوت سے
وابستہ کردیا۔ اس قانون کی ایک حکمت یہ تھی کہ اسلامی اخوت مسلمانوں کے ذہنوں میں ایک
محسوس حقیقت کے طور پر جلوہ گر ہو اور وہ بخوبی جان لیں کہ مسلمانوں کے درمیان پایا جانے والا
باہمی اخوت و محبت کا یہ رشتہ محض نعرہ اور زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے جس
کے معاشرے میں ایسے محسوس نتائج ظاہر ہوتے ہیں جن سے عدل اجتماعی کے نظام کی اہم ا
لازمی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

پھر اس اخوت کی بنیاد پر ایک دوسرے کا وارث ہونے کا حکم بعد میں کیوں منسوخ ہو گیا؟ اس کی حکمت یہ ہے کہ میراث کا جو نظام آخر میں قائم ہوا وہ بھی درحقیقت اسلامی اخوت پر مبنی تھا، اس لیے اس کے بموجب دو مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ابتدائی زمانے میں انصار اور مہاجرین دونوں پر ایک دوسرے کا تعاون، مدد اور ہمدردی و غم خواری کرنے کی مخصوص ذمہ داری عائد ہوئی تھی۔ مہاجرین مکہ میں اپنے اہل و عیال، گھربار اور مال و جائیداد چھوڑ کر، مدینہ اپنے انصار بھائیوں کے پاس مہمان بن کر آئے تھے۔ اس وقت رسول ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان جو مواخات کرائی تھی وہ اس ذمہ داری کو سرانجام دینے کی ضمانت تھی۔ اس ذمہ داری کا تقاضا تھا کہ ان کے درمیان قائم کردہ یہ اخوت اپنی حقیقت اور تاثیر کے لحاظ سے صرف رشتہ داری کی اخوت سے زیادہ قوی ہو۔

بعد میں جب مہاجرین کو مدینہ میں استقرار نصیب ہو گیا، اسلام کو استحکام مل گیا۔ اور مدینہ کے نئے معاشرے میں اسلامی روح رچ بس گئی، اس وقت مناسب معلوم ہوا کہ اس سانچے کو ختم کردیا جائے جس میں مہاجرین و انصار کے درمیان مخصوص تعلقات کا نظام ڈھالا گیا تھا۔ اس لیے کہ اب یہ اندیشہ باقی نہیں رہا تھا کہ عام اسلامی اخوت اور اس کے نتیجے میں عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے زیر سایہ یہ نظام انتشار اور اضمحلال کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ اب اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے درمیان نسبی رشتہ کو موثر قرار دے دیا جائے اور اس کی تاثیر دینی رشتے اور اخوت سے زائد ہو۔

مدینہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان کرائی جانے والی اس مواخات سے قبل، مکہ میں مہاجرین کے درمیان آپس میں ایک مرتبہ نبی ﷺ نے مواخات کرائی تھی۔ ابن عبدالبرؒ نے لکھا ہے: "مواخات دو مرتبہ ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ صرف مہاجرین کے درمیان۔ یہ مکہ میں ہوئی تھی۔ دوسری مرتبہ مہاجرین اور انصار کے درمیان۔ یہ دوسری مواخات مدینہ میں ہوئی تھی۔"[12]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اخوت کا مدار اور اس کی بنیاد اسلامی تعلق ہے۔ جس کی ہجرت کے بعد کے مخصوص حالات میں، جب مہاجرین اور انصار ایک جگہ اکٹھا ہوئے، تجدید اور تقویت کی گئی، حقیقت میں یہ وحدت دین اور وحدت عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہونے والی اخوت تھی جسے عملی طور پر مستحکم کردیا گیا تھا۔

---

[12] دیکھیے فتح الباری ۷/۱۹۱

تیسری بنیاد

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاہدہ

نبی ﷺ نے مدینہ پہنچنے کے بعد جو کام انجام دیے ان میں نئی حکومت کی دستوری حیثیت سے متعلق یہ سب سے اہم کام تھا۔ ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کے مدینہ پہنچے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ پورا مدینہ پرچم اسلام تلے آگیا۔ انصار میں سے ایک گھر بھی ایسا نہ بچا جس کے افراد نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ صرف قبیلہ اوس کے چند افراد اس سعادت سے محروم رہے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان معاہدہ کی ایک دستاویز تیار کی۔ اس میں یہود کو بھی شریک کیا اور ان سے بھی معاہدہ کیا۔ آپؐ نے ان کو اپنے مذہب پر قائم اور اپنے مال و جائیداد کا مالک رہنے دیا اور ان کے کچھ حقوق اور فرائض مقرر کیے۔ ابن اسحاقؒ نے اس دستاویز کو بغیر سند کے اور ابن خیثمہ [۱۳] اور امام احمد نے اپنی مسند [۱۴] میں سند کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہاں ہم اس دستاویز کا پورا متن نقل نہیں کریں گے، اس لیے کہ وہ طویل ہے۔ البتہ اس کی چند خاص دفعات کا تذکرہ کریں گے تاکہ ان کی روشنی میں مدینہ کے اسلامی معاشرے اور اس کی نوخیز ریاست کی دستوری اہمیت واضح ہو سکے۔ سطور ذیل میں ان دفعات کو اسی ترتیب سے نقل کیا جارہا ہے جس ترتیب سے وہ دستاویز معاہدہ میں درج ہیں:

۱۔ قریش اور یثرب کے مسلمان، اور جو ان کے ساتھ آملیں، اتحاد کریں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں، وہ سب دوسرے لوگوں سے الگ ایک امت ہیں۔

[۱۳] دیکھیے عیون الاثر، ابن سید الناس ۱/ ۱۹۸

[۱۴] دیکھیے مسند احمد ۲۱/ ۱۰ شرح البنا

۲۔ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے یہ مسلمان اپنے دستور کے مطابق مقتولین کی دیت اور قیدیوں کا زر فدیہ اجتماعی طور سے ادا کریں گے اور اہل ایمان کے معاملے میں انصاف و راستی کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

۳۔ اہل ایمان اپنے درمیان کسی مقروض کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے، بلکہ زر فدیہ یا دیت کی ادائیگی میں اس کی مدد کریں گے۔

۴۔ خدا ترس اہل ایمان ہر اس شخص کے خلاف ہوں گے جو غلط کام کرے، یا ظلم، گناہ، سرکشی یا اہل ایمان کے درمیان فساد پھیلانے کا ارادہ کرے۔ ان کے ہاتھ اس شخص کے خلاف متحد طور پر اٹھیں گے، خواہ وہ ان ہی میں سے کسی کا فرزند کیوں نہ ہو۔

۵۔ ایک مومن دوسرے مومن کو کسی کافر کے لیے نہ تو قتل کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا۔

۶۔ اہل ایمان کی امان ایک ہے۔ جب اللہ کے راستے میں جہاد ہو رہا ہو تو ایک مومن دوسرے مومن سے الگ صلح نہیں کرے گا۔ الا یہ کہ وہ مساوات اور انصاف کے ساتھ کی جائے۔

۷۔ اللہ کا ذمہ (تحفظ) ایک ہے۔ ان میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی کو پناہ دے دے تو اس کی پابندی سب کے لیے لازم ہے۔ اہل ایمان ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ دوسرے تمام لوگوں کے سوا۔

۸۔ ہر وہ صاحب ایمان جس نے اس معاہدے کو تسلیم کیا ہے اور وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اس کے لیے جائز نہیں کہ کسی فسادی کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو اس پر قیامت میں اللہ کی لعنت اور اس کا غضب ہوگا، اور اس دن اس سے بچنے کے لیے اس سے کوئی بدل قبول نہ کیا جائے گا۔

۹۔ مسلمانوں کی جنگوں میں ان کے ساتھ یہود بھی جنگ کے اخراجات برداشت کریں گے۔

۱۰۔ قبیلہ بنی عوف کے یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق کی حیثیت سے مل کر رہنا ہوگا۔ مسلمان اور یہود دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند رہیں گے۔ اگر ان میں سے کسی نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی اور کوئی غلط کام کیا تو اس کا وبال اس کی ذات اور اس کے

اہل وعیال سب پر آسکتا ہے۔

۱۱۔ یہود اور مسلمان دونوں اپنے مصارف زندگی کے خود کفیل ہوں گے۔ ان کے درمیان باہمی مدد کا معاہدہ ہے ہر اس شخص کے خلاف جو اس معاہدے میں شامل فریقوں میں سے کسی فریق سے جنگ کرے۔

۱۲۔ اس معاہدے کے پابند فریق باہمی اختلاف اور تنازعہ کا مقدمہ اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کے سامنے پیش کریں گے۔

۱۳۔ جو بھی مدینہ میں رہے یا باہر جائے، محفوظ رہے گا سوائے اس شخص کے جو غلط کام یا غداری کا ارتکاب کرے۔

۱۴۔ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ اس معاہدے کی پابندی کرنے اور اس کو پورا کرنے والا ہے۔ اور اللہ ہر اس شخص کا حامی ہے جو دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اللہ سے ڈرے۔

دروس ونتائج

اس دستاویز سے اسلامی معاشرے کے لیے مختلف تنظیمی احکام سے متعلق چند اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ انہیں ہم سطور ذیل میں باختصار بیان کرتے ہیں:

۱۔ اسلامی معاشرہ اول روز سے دستوری بنیادوں پر قائم ہوا:

اس دستاویز کو عصر جدید کی اصطلاح میں "دستور" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اور چونکہ اس کی حیثیت ایک اعلانیہ دستور کی ہے اس لیے اس میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو کسی جدید دستور میں ہو سکتی ہیں۔ یعنی داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر ریاست کی تنظیم کے لیے واضح کلی خطوط بیان کیے گئے اور وہ رہنما اصول وضع کیے گئے جو ایک طرف افراد ریاست کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری طرف ان سے ریاست کے دوسروں سے تعلقات کے حدود متعین ہوتے ہیں۔

یہ دستور جسے اللہ کے رسول ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعے وضع کیا تھا، اپنے اصحاب کی مدد سے اسے تحریری شکل دی تھی اور اسے مسلمانوں اور ان کے یہودی پڑوسیوں کے درمیان

متفقہ بنیاد قرار دیا تھا، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلامی معاشرہ اول روز سے مکمل دستوری بنیادوں پر قائم ہوا تھا اور اسلامی ریاست کا ماہتاب جس وقت طلوع ہوا اس وقت سے وہ ان تمام دستوری اور تنظیمی لوازم سے بہرہ ور تھی جس کی کوئی بھی ریاست ضرورت مند ہو سکتی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ یہ لوازم ایسی بنیاد فراہم کرتے ہیں جو معاشرے میں اسلامی شریعت کے احکام کی تنفیذ کے لیے ضروری ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ لوازم اتحاد امت کی فکر اور اس سے متعلق دیگر تنظیمی دفعات پر مبنی ہیں۔ کسی بھی سرزمین میں اسلام کی حکومت قائم ہو سکتی ہے نہ اس کا قانون چل سکتا ہے جب تک کہ یہ دستوری تنظیم قائم نہ ہو جسے رسول اللہ ﷺ نے تشکیل دیا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ دستوری تنظیم خود شرعی احکام کا ایک جزء ہے۔

اس وضاحت سے ان لوگوں کے دعوے باطل قرار پاتے ہیں جو اس بدیہی حقیقت سے منہ موڑ لیتے اور اپنی بصارتوں اور بصیرتوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ پھر دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام تو محض ایک دین ہے جو انسان اور اس کے رب کے درمیان تعلق پر مبنی ہے۔ ریاست کے لوازم اور دستوری تنظیم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک پرانا جال ہے جس میں فکری محاذ پر یلغار کرنے والے اور استعمار کے غلام اسلام کو قید کرنا چاہتے ہیں، تاکہ اس کی حرکیت ختم ہو جائے، وہ اسلامی معاشروں میں کوئی کام انجام نہ دے سکے اور اس کی ایسی شان باقی نہ رہ سکے جس سے وہ دیگر گم کردہ راہ معاشروں پر غلبہ حاصل کر سکے۔ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب اسلام کی حیثیت صرف ایک دین کی رہے نہ کہ ریاست کی اور وہ محض عبادات پر مشتمل ہو نہ کہ تشریعات و قوانین پر۔ اور اگر اسلام فی الواقع دین اور ریاست دونوں سے عبارت ہو تو بھی اس کے بارے میں جھوٹی باتیں گھڑ کر ریاست کو اس کے دائرے سے نکال دینا چاہیے۔

لیکن بدقسمتی سے یہ جال بہت جلد ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، یہ بات مہمل قرار پائی اور عیاں ہو گیا کہ اسے محض اندھی دشمنی میں دہرایا جا رہا ہے۔

بہرحال ان عظیم دفعات کا تجزیہ کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ خود اسلامی معاشرے کا وجود ریاست کے مکمل ڈھانچے میں ہوا اور اس کے قوانین ایسی معاشرتی تنظیم کے سانچوں میں نازل ہوئے جو تمام جہتوں اور تمام پہلوؤں سے ہم آہنگ تھے۔ یہ دستاویز اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

یہاں تشریعی احکام کی اہمیت اور قدر و قیمت پر روشنی ڈالنے کا موقع نہیں۔ یہ احکام

ایسے اجزاء ہیں کہ اگر انہیں یکجا کر دیا جائے تو ان سے ایک عظیم دستوری اور تنظیمی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے۔

۲۔ یہود کے ساتھ نبی ﷺ کا معاملہ:

اس دستاویز سے واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کا معاملہ یہود کے ساتھ کتنا مبنی بر عدل تھا۔ اگر یہود پر مکر و فریب اور غداری کا مزاج غالب نہ آگیا ہوتا تو اس بات کا امکان تھا کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان اس عادلانہ نظام کے ثمرات ظاہر ہوں۔ لیکن ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس دستاویز کی دفعات سے ان کے دل تنگ ہونے لگے اور وہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی غداریاں اور بدعہدیاں کرنے لگے۔ جن کا تذکرہ ہم انشاء اللہ آگے ان کے مقام پر تفصیل سے کریں گے۔ اس لیے مسلمانوں نے ان کے سلسلے میں جو رویہ اپنایا اس میں وہ پوری طرح حق بجانب تھے۔

۳۔ اسلامی شریعت کے چند اہم احکام کا استنباط:

اس دستاویز سے اسلامی شریعت کے چند اہم احکام کا علم ہوتا ہے۔ وہ درج ذیل ہیں:

اول: امت مسلمہ کی وحدت کی بنیاد صرف اسلام ہے:

اس کی پہلی دفعہ سے واضح ہوتا ہے کہ صرف اسلام ہی مسلمانوں کا شیرازہ یکجا رکھ سکتا اور انہیں ایک امت بنا سکتا ہے۔ اور یہ کہ ان کے درمیان پائے جانے والے تمام فوارق و امتیازات اس ہمہ گیر وحدت کے دائرے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ بات آں حضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بخوبی سمجھ میں آتی ہے: "قریش اور یثرب کے مسلمان اور جو ان کے ساتھ آملیں، اتحاد کریں اور ان کے ساتھ مل کر جہاد کریں، وہ سب دوسرے لوگوں سے الگ ایک امت ہیں" یہ پہلی بنیاد ہے جو ایک مستحکم اور پاکیزہ اسلامی معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

دوم: اسلامی معاشرہ میں کفالتِ باہمی کی اہمیت:

دوسری اور تیسری دفعات سے واضح ہے کہ اسلامی معاشرے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے

کہ مسلمانوں کے درمیان کفالتِ باہمی اور اتحاد و اتفاق کا اظہار اعلیٰ ترین شکل میں ہوتا ہے۔ وہ سب ایک دوسرے کے دنیوی اور اخروی معاملات میں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اسلامی شریعت کے عام احکام اسی ذمہ داری کی بنیاد پر قائم ہیں اور مسلمانوں کے درمیان کفالت باہمی اور اتحاد و اتفاق کے اصول کو نافذ کرنے والے طریقوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

سوم: اسلام میں مساوات کا مقام:

ساتویں دفعہ سے واضح ہے کہ مسلمانوں کے درمیان مساوات کا کتنا لحاظ رکھا گیا ہے۔ یہ محض ایک خوب صورت اور خوش نما نعرہ نہیں ہے بلکہ اسلامی معاشرے کے اہم شرعی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ اور اس کی تنفیذ انتہائی باریکی کے ساتھ اور مکمل صورت میں ضروری ہے۔ مسلمانوں کے درمیان اس مساوات کی تنفیذ کا اظہار اس دفعہ میں نبی ﷺ کے ارشاد سے ہوتا ہے: "اللہ کا ذمہ ایک ہے۔ ان میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) کوئی ادنیٰ شخص بھی کسی کو پناہ دے دے تو اس کی پابندی سب کے لیے لازم ہے" اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان خواہ کوئی بھی ہو اس کے ذمہ کا احترام کیا جائے گا۔ اگر وہ کسی کو پناہ دے دے تو وہ محفوظ رہے گا اور کوئی شخص خواہ حاکم ہو یا محکوم اس پر دست درازی نہیں کرسکتا۔ اس معاملے میں مسلمان عورت اور مسلمان مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئی بھی مسلمان عورت کسی کو پناہ دے دے تو کوئی دوسرا شخص اس پر کچھ زیادتی نہیں کرسکتا، خواہ وہ کتنے بلند مرتبہ اور اعلیٰ مقام کا مالک ہو۔ اس پر تمام علماء اور ائمہ مسالک کا اجماع ہے۔ البتہ اس کی چند شرطیں ہیں جن کا فقہاء نے تذکرہ کیا ہے، مثلاً کسی ایسے شخص کو پناہ نہ دی ہو جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، مثلاً دشمن کا جاسوس وغیرہ۔ اور جن لوگوں کو پناہ دی ہو انہیں شمار کیا جاسکتا ہو، اور پناہ کی مدت چار ماہ سے زائد نہ ہو۔[۱۵]

امام بخاریؒ و امام مسلمؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے کہ ام ہانیؓ بنت ابی طالب فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا "اے اللہ کے رسول! میرے بھائی علی کہتے ہیں کہ وہ اس شخص کو قتل کر کے رہیں گے جسے میں نے پناہ دے دی ہے۔ فلاں بن ہبیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اے ام ہانی! جسے تم نے پناہ دے دی اسے ہم نے بھی پناہ دے دی۔"

---

[۱۵] دیکھئے مغنی المحتاج ۲۳۸/۴

اس واقعے میں غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام کے زیر سایہ عورت کو کتنا بلند مقام حاصل ہے؟ اور یہ کہ جس طرح اسے مرد کی طرح تمام انسانی اور معاشرتی حقوق حاصل ہیں اس کی کسی بھی قوم میں نظیر نہیں ملتی۔

یہاں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو اسلامی شریعت میں پائی جانے والی دل کش انسانی مساوات اور اس کے روایتی مظاہر (جن کا آج جدید تہذیب کے فریفتگان نعرہ لگا رہے ہیں) کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کی مساوات دقیق اور صحیح انسانی فطرت پر قائم ہے اور اس کا فیض تمام انسانوں کو حاصل ہوتا ہے خواہ عورتیں ہوں یا مرد اور افراد ہوں یا جماعتیں۔ جب کہ تہذیب جدید میں خالص حیوانی جذبات ہیں اور ان کے پس پردہ مقصد یہ ہے کہ عورت کو وسیع پیمانے پر مرد کے لیے دل لگی اور تفریح کے سامان کی حیثیت دے دی جائے۔

چہارم: مسلمانوں کے لیے کسی دوسرے قانون سے رجوع کرنا جائز نہیں:

بارہویں دفعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عدل پرور اور فیصلہ کن چیز جس کی طرف مسلمانوں کو اپنے تمام نزاعات و اختلافات اور معاملات میں رجوع کرنا ضروری ہے وہ اللہ کی شریعت اور اس کا حکم ہے، اور یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنا ان کے لیے جائز نہیں۔ اگر وہ اپنے مسائل کا حل اس سرچشمہ سے ہٹ کر اور کہیں تلاش کریں گے تو گنہ گار ہوں گے اور اس دنیا میں شقاوت اور آخرت میں عذاب الٰہی سے دوچار ہوں گے۔

یہ چار اہم باتیں ہیں جو اس دستاویز سے معلوم ہوتی ہیں جس پر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں اسلامی حکومت قائم کی تھی اور جسے مسلمانوں کے لیے نئے معاشرے میں دستور زندگی قرار دیا تھا۔ اس دستاویز میں دیگر باتیں بھی ہیں جو غور و تدبر سے بآسانی واضح ہو جائیں گی۔

اس دستاویز کے نفاذ، اس کی دفعات سے رہنمائی اور اس کے احکام پر عمل کے ذریعے اسلامی ریاست پختہ اور مضبوط بنیاد پر قائم ہوئی، پھر پورے استحکام کے ساتھ مشرق و مغرب میں پھیل گئی اور اس نے لوگوں کے سامنے تہذیب و تمدن کے درخشاں مظاہر پیش کیے۔

باب پنجم

دفاعی جنگ کا مرحلہ

- تمہید
- غزوۂ بدر
- غزوۂ اُحد
- بنو نضیر کی جلاوطنی
- غزوۂ بنی المصطلق
- غزوۂ خندق
- جنگ کا آغاز
- یہود کی پہلی بدعہدی
- واقعۂ رجیع و بئر معونہ
- غزوۂ ذات الرقاع
- واقعۂ افک
- غزوۂ بنی قریظہ

تمہید

اس باب میں ہم نے جن غزوات کا تذکرہ کیا ہے وہ اصلاً دفاعی غزوات ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھیں گے ان میں سے ہر ایک اس سازش یا جارحیت کا جواب ہے جس کا آغاز مشرکین کی جانب سے ہوا تھا۔ اسی لیے ان کے ذریعے عہد نبوی میں اسلامی دعوت کے ایک مرحلے کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اسے اس حکم سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا جس کی بنیاد پر اسلام میں جہاد کی مشروعیت ہوئی ہے۔ دعوت کے مختلف مراحل کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہوا ہے، مثلاً خفیہ دعوت، علانیہ دعوت۔ اسی طرح کا یہ بھی ایک مرحلہ تھا۔

آخری مرحلہ، جس کے ماقبل مراحل کے ساتھ مل جانے سے مکمل اسلامی حکومت کی تشکیل ہوتی ہے، ان واقعات پر مشتمل ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد پیش آئے۔ نبی ﷺ نے اس مرحلے کی طرف اس وقت اشارہ کیا جب آپ غزوۂ بنی قریظہ سے واپس آرہے تھے۔ آپ نے فرمایا: "اب ہم ان پر حملہ کریں گے۔ وہ ہم پر حملہ نہیں کریں گے۔" (بخاری)

آئندہ سطور میں ہم دعوت اسلامی کی راہ میں پیش آنے والے اس مرحلے کے واقعات بیان کریں گے۔ ان میں سے ہم صرف انہی واقعات کا تذکرہ کریں گے جن سے کوئی حکم متعلق ہوگا یا کوئی سبق یا نصیحت حاصل ہوتی ہوگی اور غیر ضروری تفصیلات یا طویل بحث کے طالب اختلافات کے ذکر سے گریز کریں گے۔

جنگ کا آغاز

پہلا غزوہ:

پیچھے ہم بیان کرچکے ہیں کہ صحیح احادیث اور آثار کے مطابق جنگ کی مشروعیت کی ابتدا

ہجرت کے بعد ہوئی اور اس کا عملی مظاہرہ آں حضرت ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے بارہ ماہ بعد صفر کے مہینے میں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اس موقعے پر پہلی مرتبہ غزوہ کی نیت سے نکلے۔ اسے غزوۂ ودان کہتے ہیں۔ اس میں آپ کا ارادہ قریش اور بنو حمزہ سے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ بنو حمزہ نے صلح کر لی اور نبی ﷺ اور آپؐ کے اصحاب بغیر جنگ کے مدینہ لوٹ آئے۔

غزوۂ بدر

غزوۂ بدر کا سبب یہ تھا کہ نبی ﷺ کو معلوم ہوا کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان بن حرب کی نگرانی میں شام سے آ رہا ہے۔ آپ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنا جو مال مکہ میں چھوڑ آئے ہیں اس کے بدلے میں اس قافلے کا مال چھین لیں۔ کچھ مسلمان اس کے لیے فوراً تیار ہو گئے اور کچھ نہیں نکلے اس لیے کہ انہیں اس موقعے پر جنگ کی امید نہیں تھی۔ ابوسفیان نے مکہ واپس ہوتے ہوئے حالات کی ٹوہ لی تو انہیں معلوم ہوا کہ مسلمان قافلہ کا مال چھیننے کے لیے نکلنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ضمضم بن عمرو غفاری کو مکہ دوڑایا تاکہ وہ قریش کو اس کی خبر دے اور انہیں اپنے مال کی حفاظت کے لیے نکلنے پر آمادہ کرے۔ قریش کو خبر ملی تو فوراً تیار ہو گئے اور تمام لوگ جنگ کے ارادے سے نکلے۔ یہاں تک کہ قریش کے سرداروں میں سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہا۔ وہ تقریباً ایک ہزار جنگ جو تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ نکلے۔ ابھی رمضان کے صرف چند ہی دن گزرے تھے۔ ان لوگوں کی تعداد ابن اسحاق کی روایت کے مطابق تین سو چودہ تھی۔ ان کے ساتھ ستر اونٹ تھے۔ ایک اونٹ پر دو یا تین صحابہ یکے بعد دیگرے سوار ہوتے۔ انہیں قریش کے جنگ کے ارادے سے نکلنے کی مطلق خبر نہ تھی۔ دوسری طرف ابوسفیان اپنے قافلے کو بچا کر نکال لے گئے۔ انہوں نے مکہ جانے کے لیے ساحل کا راستہ اختیار کیا اور بدر کے چشمے کو اپنے بائیں جانب چھوڑ کر رفتار تیز کر دی، یہاں تک کہ اپنے قافلے اور مالِ تجارت کو خطرہ سے بچا لیا۔ نبی ﷺ کو خبر ملی کہ قریش مسلمانوں سے جنگ کے ارادے سے نکلے ہیں تو آپ نے ان مسلمانوں سے جو آپ کے ساتھ تھے، مشورہ کیا۔ مہاجرین نے اچھی گفتگو کی۔ ان کی

طرف سے ترجمانی کرتے ہوئے حضرت مقداد بن عمروؓ نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کو جس چیز کا حکم دیا ہے، اسے کر گزریے، ہم آپ کے ساتھ ہیں" لیکن نبی ﷺ اس کے بعد بھی لوگوں کی طرف دیکھتے رہے اور پھر اپنی بات دہرائی "لوگو! مجھے مشورہ دو" اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے (جو انصار میں سے تھے) عرض کیا: "شاید آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے اے اللہ کے رسول" فرمایا: "ہاں" انہوں نے عرض کیا: "ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ ہم نے گواہی دی ہے کہ آپ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور آپ سے سمع و طاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں۔ اس لیے جو کچھ آپ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے۔ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اگر آپ ہمیں لے کر سامنے سمندر پر جا پہنچیں اور اس میں اتر جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ اس میں کود جائیں گے۔"

حضرت سعدؓ کے جواب سے رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "چلو اور بشارت قبول کرو۔ اللہ نے مجھ سے دونوں گروہوں (قافلۂ تجارت اور لشکر قریش) میں سے ایک (پر غلبہ دینے) کا وعدہ کیا ہے... اللہ کی قسم! گویا میں اس وقت دیکھ رہا ہوں کہ دشمنوں میں سے کون کس جگہ قتل ہوگا۔"

پھر نبی ﷺ اپنے جاسوسوں کے ذریعے جنہیں آپ نے پھیلا دیا تھا، قریش کے حالات اور ان کی تعداد کی ٹوہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے اور ان میں مشرکین کے تمام سردار موجود ہیں۔

ابوسفیان نے قریش کو خبر بھجوائی کہ وہ قافلہ کو بچالے جانے میں کامیاب ہو گیا ہے، اس لیے وہ لوگ مکہ واپس چلے جائیں۔ لیکن ابوجہل نے آگے بڑھنے پر اصرار کیا۔ اس نے کہا "اللہ کی قسم، ہم واپس نہیں ہوں گے یہاں تک کہ میدان بدر پہنچ جائیں۔ وہاں ہم تین دن ٹھہریں گے، اونٹ ذبح کریں گے، لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، شراب پلائیں گے اور ناچ گانا ہوگا۔ عربوں کو جب اس کی خبر ہوگی اور انہیں ہمارے لشکر اور اس کی جنگی تیاریوں کی تفصیلات کا علم ہوگا تو ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔" پھر وہ اور آگے بڑھے یہاں تک کہ وادی کی دوسری جانب پڑاؤ ڈال دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے میدانِ بدر کے چشموں میں سے سب سے قریبی چشمے کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ اس پر حضرت حباب بن منذرؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ نے یہاں پڑاؤ ڈالا ہے۔ کیا اس کا اللہ نے حکم دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہم یہاں سے ذرا بھی آگے یا پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یا آپ نے اپنی صواب دید پر ایسا کیا ہے اور اس میں محض جنگی تدبیر پیش نظر ہے۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ فیصلہ میں نے جنگی حکمت عملی کے طور پر اپنی رائے سے کیا ہے۔" انہوں نے عرض کیا: پھر یہاں پڑاؤ ڈالنا مناسب نہیں۔ آپ لوگوں کو تیار ہونے کا حکم دیں۔ ہم دشمنوں کے سب سے قریب واقع چشمے کے پاس پہنچ کر وہاں پڑاؤ ڈالیں، اس کے علاوہ دوسرے کنوؤں کو برباد کر دیں، پھر اپنے کنویں پر حوض بنا کر اسے پانی سے بھر لیں۔ اس طرح جب ہم جنگ کریں گے تو ہمارے پاس پینے کے لیے پانی موجود ہوگا جب کہ دشمن اس سے محروم رہیں گے۔" رسول اللہ ﷺ نے حضرت حبابؓ کی رائے پر عمل کیا اور اپنے لشکر کے ساتھ اس جگہ پڑاؤ ڈالا جہاں کا انہوں نے مشورہ دیا تھا۔"[1]

حضرت سعد بن معاذؓ نے تجویز رکھی کہ نبی ﷺ کے لیے ایک سائبان بنا دیا جائے جس میں آپ محفوظ رہ سکیں۔ تاکہ مدینہ میں جو مسلمان رہ گئے ہیں ان کے پاس آپ بحفاظت واپس پہنچ سکیں اور انہیں آپ کی ہلاکت کا صدمہ نہ اٹھانا پڑے۔ آپؐ نے اس تجویز کو منظور فرمایا۔ پھر اپنے اصحاب کو اللہ کی تائید و نصرت کا یقین دلانے لگے۔ آپ نے زمین پر جگہ جگہ ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اس جگہ فلاں سردار قریش کا قتل ہوگا، اس جگہ فلاں مشرک مارا جائے گا۔ آپ کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور جہاں جہاں آپ نے نشان دہی فرمائی تھی وہیں ان کی لاشیں ملیں۔"[2]

۱۷ رمضان، جمعہ کی رات رسول اللہ ﷺ نے بارگاہِ الٰہی میں تضرّع کے ساتھ دعا کی

[1] ابن ہشام نے اپنی سیرت میں حضرت حباب بن منذرؓ کی یہ گفتگو ابن اسحاق سے اور انہوں نے [illegible] بنو سلمہ کے بعض لوگوں سے روایت کی ہے، اس لیے یہ روایت مجہول لوگوں سے ہوئی۔ لیکن حافظ [illegible] حجرؒ نے اپنی کتاب "الاصابہ" میں اسے عن ابن اسحاق عن یزید بن رومان عن عروۃ بن [illegible] وغیر واحد کی سند سے نقل کیا ہے۔ یہ صحیح سند ہے اور حافظ ابن حجر ثقہ ہیں۔ (دیکھئے الاصابہ ۱/ [illegible]

[2] صحیح مسلم

"اے اللہ! یہ قریش کے لوگ اپنے سامانِ غرور کے ساتھ آئے ہیں۔ یہ تیرے دشمن ہیں اور تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ اے اللہ بس اب آ جائے تیری وہ مدد جس کا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ اے اللہ کل ان کا زور توڑ دے" آں حضرت ﷺ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر پورے تضرع و خشوع کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو بکرؓ پر رقت طاری ہوگئی۔ وہ پیچھے سے آکر آپ سے چمٹ گئے اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! بشارت قبول کیجئے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرے گا" مسلمانوں نے بھی پورے اخلاص اور تضرع کے ساتھ اللہ سے دعا کی اور اس سے مدد اور فتح و کامرانی چاہی۔[3]

اگلے دن صبح مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ نبی ﷺ نے ایک مٹھی ریت لی اور شاهت الوجوه (چہرے مسخ ہو جائیں) کہتے ہوئے اسے قریش کی جانب پھینکا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ دشمن کی فوج کے ہر شخص کی آنکھ میں یہ ریت بھر گئی۔ اللہ نے مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعے فرمائی۔ انہوں نے ان کے پہلو بہ پہلو جنگ کی[4] جنگ کا خاتمہ مسلمانوں کی عظیم فتح کی صورت میں ہوا۔ اس جنگ میں مشرکین کے ستر سردار مارے گئے اور اتنے ہی قید کیے گئے۔ مسلمانوں میں سے چودہ نے جام شہادت نوش کیا۔

اس غزوہ میں جو مشرکین مارے گئے ان کی لاشیں بدر کے ایک پرانے کنویں میں ڈال دی گئیں۔ رسول اللہ ﷺ کنویں کی منڈیر پر کھڑے ہوئے اور ایک ایک کا نام لے کر پکارا: "اے فلاں، اے فلاں بن فلاں! کیا تم اس بات سے خوش ہو کہ تم نے اللہ اور اس کے رسول کی عدم اطاعت کی ہے؟ ہم سے ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ کیا تم نے بھی وہ کچھ پا لیا ہے جس کا تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا؟" حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ان لاشوں سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ یہ تو بے روح ہیں۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے یہ لوگ تم سے زیادہ

[3] ابن ہشام ۱/۲۰۵، زاد المعاد ۲/۸۷۔ غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ کے اپنے رب سے مدد مانگنے والی روایت صحیحین کی ہے۔

[4] غزوۂ بدر میں فرشتوں کے ذریعے اہل ایمان کی مدد والی حدیث صحیحین کی ہے۔

اچھی طرح سن رہے ہیں۔" ۵

نبی ﷺ نے صحابہ کرام سے قیدیوں کے معاملے میں مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے مشورہ دیا کہ فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے، اس طرح مسلمانوں کو کچھ قوت حاصل ہو جائے گی اور ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب فرمائے۔ لیکن حضرت عمر بن الخطابؓ کی رائے تھی کہ یہ لوگ کفر کے سرغنے ہیں، اس لیے انہیں قتل کر دیا جائے۔ نبی ﷺ نے ابو بکرؓ کی رائے قبول کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کیا۔ اس موقعے پر بعد میں جو آیات نازل ہوئیں ان میں رسول اللہ ﷺ کے اس فیصلے پر عتاب کیا گیا اور حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی گئی۔ ٦

وہ آیات یہ ہیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ، لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ، فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. (الانفال: ٦٧-٦٩)

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

دروس ونصائح

غزوۂ بدر الکبریٰ میں ہمارے لیے متعدد عظیم الشان دروس اور نصائح ہیں۔ اسی طرح اس میں ایسے روشن معجزات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ان اہل ایمان کو اپنی مدد اور تائید

---

۵ صحیح بخاری ۵/۸، معمولی فرق سے یہ روایت صحیح مسلم میں بھی ہے ۸/۱۶۳

٦ صحیح مسلم ۵/۱۵۷-۱۵۸

سے نوازتا ہے جو ایمان کے اصولوں کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں اور پورے اخلاص کے ساتھ دینی ذمہ داریاں سرانجام دیتے ہیں۔

ان نتائج اور دروس کو ہم سطور ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱۔ مسلمانوں کے نکلنے کا اصل محرک جنگ نہیں بلکہ تجارتی قافلہ تھا:

غزوۂ بدر کے پہلے سبب سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کے نکلنے کا اصل محرک جنگ نہیں تھا، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ قریش کا جو تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سربراہی میں شام سے واپس آرہا ہے اس پر قبضہ کر لیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کے بندوں کو اس سے زیادہ مال غنیمت اور اس سے بڑی کامیابی ملے اور وہ ایسا کام انجام دیں جو زیادہ باعثِ شرف اور اس مقصد سے، جسے ہر مسلمان کو اپنی پوری زندگی میں پیش نظر رکھنا چاہیے، زیادہ ہم آہنگ ہو۔ چنانچہ اس نے اس قافلے کو ان کی دسترس سے باہر کر دیا جس کے لیے وہ نکلے تھے، اور اس کے بدلے ایک ایسے لشکر سے ان کا آمنا سامنا کر دیا جس کی انہیں کوئی امید نہ تھی۔ اس واقعے سے دو نتیجے نکلتے ہیں:

اول: حربیوں کی مملوکہ چیزیں مسلمانوں کے لیے حلال ہیں:

اس واقعے سے پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حربیوں کی عام مملوکہ چیزیں مسلمانوں کے لیے حلال ہیں۔ ان کے لیے جائز ہے کہ ان پر قبضہ کر لیں اور انہیں اپنے تصرف میں لائیں۔ ایسی جو چیزیں ان کے زیر قبضہ آجائیں وہ ان کی ملکیت تصور کی جائیں گی۔ اس حکم پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ وہ مہاجرین جنہیں ان کے وطن اور خاندان سے نکالا گیا تھا ان کے لیے قریش کے تجارتی قافلے کو لوٹنے اور اس پر قبضہ کر لینے کے سلسلے میں ایک دوسرا عذر بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ اس طرح ان کی جو مملوکہ چیزیں مکہ میں رہ گئی تھیں اور ان پر مشرکوں نے قبضہ کر لیا تھا، ان کی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی۔

دوم: اللہ اپنے بندوں سے بلند تر کام لینا چاہتا تھا:

دوسرا نتیجہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ باوجود یہ کہ مسلمانوں کا تجارتی قافلے کو لوٹنے کے لیے

نکلنا بالکل جائز تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ اس کے مومن بندے ایسا کام انجام دیں جو اس سے بلند تر اور ان کے اس مشن سے ہم آہنگ ہو جس کے لیے انہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ ہے اللہ کے دین کی طرف دعوت، اس کی راہ میں جہاد اور اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جان و مال کی قربانی۔ اسی لیے اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ابوسفیان تو قریش کا مالِ تجارت بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا لیکن قریش کو میدانِ جنگ میں مسلمانوں کے مقابلے میں زبردست ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے نفوس کی تربیت کا جو اہتمام فرمایا تھا اس کی خوب صورت تصویر کشی اس آیتِ کریمہ سے ہوتی ہے:

وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ، وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ، وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكَافِرِيْنَ. (الانفال-۷)

یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمہیں مل جائے گا، تم چاہتے تھے کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔ مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔

۲۔ جنگ سے قبل صحابہ سے مشورہ :

جب ہم اس واقعے میں غور کرتے ہیں کہ کس طرح تجارتی قافلے کے بچ کر نکل جانے اور اسلحہ سے پوری طرح لیس عظیم لشکر کا سامنے ہونے پر رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے اور درپیش صورتِ حال میں ان سے مشورہ کیا، تو اس سے دو قانونی نتیجے نکلتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ بہت اہمیت رکھتا ہے:

اول: غیر منصوص امور میں مشورہ کی قانونی حیثیت ہے :

جب ہم آں حضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے ہر معاملے میں جو کتاب اللہ میں منصوص نہ ہو اور اس کا تعلق تدبیر اور حکمتِ عملی سے ہو، آپ مشورے کا اہتمام کرتے تھے۔ اسی وجہ سے تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایسے تمام معاملات میں جن میں کتاب یا سنت کا کوئی حکم منصوص نہ ہو، مشورے کی مستقل قانونی

حیثیت ہے جسے نظر انداز کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ رہے وہ معاملات جن میں کتاب اللہ کی کوئی نص موجود ہو یا کوئی حدیث ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے ان میں کیا فیصلہ فرمایا ہے تو ان میں مشورے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس حکم کو کالعدم کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔

دوم: جنگ اور صلح کا تعلق حکمتِ عملی سے ہے:

فرضیتِ جہاد کی مشروعیت اپنی اصل کے اعتبار سے ایک تبلیغی حکم ہے جو منسوخ ہو سکتا ہے نہ اس میں کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح صلح اور معاہدے کی مشروعیت بھی ثابت ہے۔ اس کا حکم باطل قرار دیا جا سکتا ہے نہ اسے شریعتِ اسلامی کے احکام سے خارج کرنا ممکن ہے۔ البتہ اس کی مختلف تطبیقی صورتوں کی جزئیات زمان و مکان کے احوال اور مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے متعین کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں فیصلہ کن چیز دین دار اور عدل پرور امام کی بصیرت اور احکامِ دین میں رسوخ رکھنے والے حاکم کی سیاسی حکمتِ عملی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں سے برابر مشورہ کرتا رہے اور ان کی مختلف صلاحیتوں اور آراء سے استفادہ میں کوتاہی نہ کرے۔

جب حکمراں یہ دیکھے کہ مسلمانوں کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ اپنے دشمنوں سے ابھی جنگ آزمائی نہ کریں اور مسلمانوں کے اصحابِ رائے سے باہم مشورہ اور مذاکرہ کے ذریعے اس کی رائے درست معلوم ہو تو اسے اختیار ہے کہ اگر ثابت شدہ شرعی نصوص میں سے کسی نص کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو تو وہ ان کے ساتھ صلح کر لے، یہاں تک کہ قتال و جہاد کا مناسب وقت آ جائے۔ لیکن اگر اس کے نزدیک مصلحت اور سیاسی حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہو کہ جنگ چھیڑ دی جائے اور دشمنوں پر ہلہ بول دیا جائے تو وہ اپنی رعایا کو اس پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے اور سیرتِ نبوی کے بہت سے واقعات اس پر دلیل ہیں۔ لیکن اگر دشمن مسلمانوں کے اپنے گھروں اور علاقوں پر حملہ آور ہو جائے تو اس صورت میں ان پر لازم ہے کہ خواہ کیسے ہی حالات ہوں، وہ پوری طاقت سے ان کا مقابلہ کریں۔ اس وقت جہاد تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر فرض ہو جاتا ہے، بشرط یہ کہ اس کی ضرورت ہو اور مکلف ہونے کی شرطیں

پائی جائیں۔

پھر صحیح بات جس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے، یہ ہے کہ حکمراں کو اگرچہ مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اسے قبول کرنا اس کے لیے لازم نہیں ہے۔ یعنی مسلم حکمراں کے لیے ضروری ہے کہ کسی رائے تک پہنچنے کے لیے اصحاب بصیرت کے مشوروں سے رہنمائی حاصل کرے۔ لیکن اگر اکثریت کی ایک رائے ہو اور خود اسے دوسری رائے پر شرح صدر ہو تو اس کے لیے اکثریت کی رائے قبول کرنا ضروری نہیں۔ اس سلسلے میں قرطبیؒ نے لکھا ہے:

"اگر رائیں مختلف ہوں تو مشورہ لینے والا ان میں غور کرے گا اور بحدِ امکان یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ ان میں سے کتاب و سنت سے قریب تر رائے کون سی ہے؟ پھر جس رائے کی طرف اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی کرے اس کو اختیار کرلے گا اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔"[ے]

۳۔ رسول اللہ ﷺ انصار کے جواب کے کیوں منتظر رہے؟

یقیناً اس موقعے پر ایک شخص سوال کرسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت مقدادؓ کے جواب سے پوری طرح اطمینان کیوں نہیں ہوا اور آپؐ دوسرے لوگوں (انصار) کے چہروں کی طرف کیوں دیکھتے رہے؟ یہاں تک کہ جب حضرت سعد بن معاذؓ نے اپنی بات رکھی تب آپؐ مطمئن ہوئے اور آپ کے روئے انور پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ اس معاملے میں خود انصار کی رائے جاننے کے خواہاں تھے۔ کیا وہ اپنی آراء اور فیصلوں میں خود کو صرف اس معاہدہ تک محدود رکھیں گے جو ان کے اور آں حضرت ﷺ کے درمیان طے پایا تھا؟ اس صورت میں آپؐ انہیں صرف مدینہ کے اندر ہی اپنے ساتھ جنگ کرنے اور اپنا دفاع کرنے کا پابند کرسکتے تھے جیسا کہ معاہدہ میں صراحت تھی۔ یا وہ اپنے اسلامی احساسات و جذبات پر لبیک کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے عظیم معاہدے کی پاسداری کریں گے؟ اس صورتِ حال میں نبی ﷺ کے شایانِ شان یہ تھا کہ آپ

ے الجامع لاحکام القرآن ۴/۲۵۲

ان کے معاملے میں اس معاہدے کی پابندی کریں اور انصار کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اس معاہدے کے حقوق کی انجام دہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور اس کی تمام ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

حضرت سعد بن معاذؓ کے جواب میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ہجرت مدینہ سے قبل انصار نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر جو بیعت کی تھی وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کی بیعت تھی۔ اور آپؐ کے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد آپ کے دفاع کا جو عہد کیا تھا اسے وہ اللہ کے دین اور شریعت کا دفاع ہی سمجھ رہے تھے۔ مسئلہ دستاویز معاہدہ کی متعین دفعات کا نہیں تھا جن سے ہٹ کر وہ کچھ کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے ایک عظیم الشان دستاویز پر دستخط کیے تھے جس کی ایک دفعہ یہ تھی:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ. (التوبہ۔۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔

اسی لیے حضرت سعدؓ کا جواب یہ تھا: "ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپ کی تصدیق کرچکے ہیں۔ ہم نے گواہی دی ہے کہ آپؐ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے... اس لیے جو کچھ آپؐ نے ارادہ فرمالیا ہے اسے کر گزریے" یعنی بیعتِ عقبہ میں ہم نے آپؐ سے جو معاہدہ کیا ہے اس سے بڑے معاہدے کے تحت ہم آپ کے ہم رکاب ہوں گے۔

۴۔ امام جاسوسوں کی خدمات حاصل کرسکتا ہے:

امام کے لیے جائز ہے کہ جہاد یا دوسرے کاموں میں جاسوسوں اور مخبروں سے مدد لے اور انہیں دشمنوں میں پھیلا دے۔ تاکہ مسلمانوں کو ان کے منصوبوں اور حالات کا علم ہوسکے اور وہ ان کی طاقت، سامانِ جنگ اور تعداد سے واقف ہوجائیں۔ اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جاسکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے دشمن کے حالات سے واقفیت کے مفاد سے زیادہ اہم کسی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ اس سلسلے میں رازداری، فریب دہی اور حیلہ سازی سب جائز اور درست ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے مفاد اور ان کی حفاظت کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں۔

کتب سیر میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ نے جب بدر کے قریب پڑاؤ ڈالا تو ایک صحابی کو ساتھ لے کر اطراف کا جائزہ لیا۔ آپ ایک بوڑھے عرب کے پاس پہنچے اور اس سے دریافت کیا کہ قریش اور محمد اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں وہ کیا معلومات رکھتا ہے؟ بوڑھے نے کہا: میں تم دونوں کو اس وقت تک کچھ نہ بتاؤں گا جب تک تم یہ نہ بتادو کہ تمہارا تعلق کس سے ہے؟ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: پہلے تم بتاؤ، بعد میں ہم تمہارے سوال کا جواب دیں گے۔ اس نے کہا: کیا یہ اس کے بدلے میں ہوگا؟ فرمایا: ہاں۔ بوڑھے نے جو کچھ اسے مشرکین کے بارے میں معلوم تھا اور جو کچھ اس نے نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کے بارے میں سن رکھا تھا، سب بتادیا۔ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو بولا: "اب بتاؤ تم دونوں کا تعلق کس سے ہے؟" نبی ﷺ نے جواب دیا: "ہم پانی سے ہیں" اتنا کہہ کر آپؐ پلٹ آئے اور بوڑھا یہ کہتا رہ گیا: "پانی سے" کا کیا مطلب؟ کیا عراق کے پانی سے؟

۵۔ آں حضرت ﷺ کے اعمال و تصرفات کی اقسام :

رسول اللہ ﷺ اور حضرت حباب بن منذرؓ کے درمیان لشکر کے پڑاؤ کی جگہ کے بارے میں جو گفتگو ہوئی (یہ گفتگو صحیح سند سے مروی ہے جیسا کہ پیچھے گزرا) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کے تمام اعمال و تصرفات آئینی حیثیت نہیں رکھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات آپ اپنی بشری حیثیت میں کوئی کام انجام دیتے تھے۔ آپ اسی طرح غور و تدبر کرتے تھے جس طرح دوسرے انسان کرتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے اعمال میں آپ کی اتباع ہم پر لازم نہیں۔ ہم نے دیکھا کہ اس غزوے میں آپؐ نے لشکر کے پڑاؤ کے لیے جس جگہ کا انتخاب فرمایا تھا، کس طرح حضرت حبابؓ نے اس کے بجائے دوسری جگہ پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا اور آں حضرت ﷺ نے ان کے مشورے کو قبول فرمایا۔ حضرت حبابؓ نے یہ مشورہ اس وقت دیا جب یہ تیقن حاصل کرلیا تھا کہ نبی ﷺ نے اس جگہ کا انتخاب وحیِ الٰہی سے نہیں کیا ہے۔ اس قبیل سے آں حضرت ﷺ کے بہت سے اعمال و تصرفات ہیں جو حکمت عملی کے دائرے میں آتے ہیں اور جنہیں آپؐ نے اللہ کے رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ امام اور سربراہ ریاست کی حیثیت سے انجام دیے ہیں، مثلاً آپؐ کے بہت سے عسکری فیصلے اور تدابیر۔ اس موضوع پر

فقہاء نے مفصل بحث کی ہے جسے یہاں نقل کرنا ممکن نہیں۔

٦۔ اللہ سے تضرع اور استمداد کی اہمیت :

ہم نے دیکھا ہے کہ نبی ﷺ صحابہ کو اطمینان دلا رہے تھے کہ ان کی کامیابی یقینی ہے۔ یہاں تک کہ زمین میں مختلف جگہوں کی طرف اشارہ کرکے فرمارہے تھے کہ "یہاں فلاں کا قتل ہوگا، یہاں فلاں مارا جائے گا" اور ویسا ہی ہوا جیسا کہ آپؐ نے خبر دی تھی، اور ٹھیک انہی جگہوں پر ان لوگوں کا قتل ہوا جہاں آپ نے اشارہ کیا تھا، جیسا کہ صحیح حدیث میں مذکور ہے۔

اس کے ساتھ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آپ جمعہ کی پوری رات، اس سائبان میں جو آپ کے لیے بنایا گیا تھا، تضرع کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں مصروف رہے۔ آپؐ اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا کر اللہ عزوجل سے دعا کرتے رہے کہ "تونے جس مدد کا وعدہ کیا ہے اسے پورا کر" آپ پر اتنی بے خودی طاری تھی کہ ردا گر گر پڑتی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ پر رقت طاری ہوگئی اور وہ آپ سے چمٹ کر کہنے لگے: "بس کیجئے اے اللہ کے رسول! اللہ ضرور اپنا وعدہ پورا کرکے رہے گا۔" سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ جنگ میں فتح کے بارے میں اس درجہ مطمئن تھے کہ آپؐ نے پہلے ہی یہ فرمادیا تھا کہ "گویا میں دشمنوں کے ہلاک ہونے کی جگہوں کو دیکھ رہا ہوں" اور آپ نے بعض دشمنوں کی جائے قتل کی نشان دہی بھی فرمادی تھی، تو پھر یہ تضرع کیوں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی ﷺ کو فتح و کامرانی کے بارے میں اس درجہ اطمینان اور اتنا پختہ یقین اس لیے تھا کیونکہ آپؐ اللہ کے اس وعدے کو برحق جانتے تھے جو اس نے اپنے رسولوں سے کیا تھا اور یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ آپ کو اس معرکے میں کامیابی ملنے کی وحی کردی گئی ہو۔

رہا تضرع اور دعا میں استغراق اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلانا تو یہ بندگی کا وظیفہ ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اور یہی ہر حال میں کامیابی کی کلید ہے۔

خواہ کتنے ہی اسباب و وسائل فراہم ہوں لیکن کامیابی محض اللہ کی تائید و توفیق سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اللہ ہم سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ ہم طبعاً اور اختیاری طور پر اس کے

بندے بن جائیں۔ کوئی شخص عبودیت کی صفت سے بڑھ کر کسی اور صفت کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل نہیں کرسکتا۔ اور کوئی انسان کسی واسطے سے بارگاہِ الٰہی میں قبولیتِ دعا کا اس طرح مستحق نہیں بنتا جس طرح وہ اس کی جناب میں عبودیت کا لبادہ اوڑھ کر اس کا استحقاق حاصل کرتا ہے۔

انسان کو اس زندگی میں جن طرح طرح کے مصائب اور مشکلات کا خطرہ در پیش رہتا ہے یا وہ ان کا شکار ہوتا ہے وہ در حقیقت ایسے اسباب و عوامل ہیں جو اسے اس کی بندگی کی یاد دلاتے رہتے ہیں اور اس کی امیدوں اور افکار کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عظمت اور اس کی روشن قدرت کی جانب مائل کرتے ہیں، تاکہ وہ اس کی جانب سبقت کرے، اس کے سامنے اپنا ضعف اور اپنی عبودیت رکھے اور ہر فتنہ اور مصیبت میں اس کی پناہ لے۔ اگر انسان اپنی زندگی میں اس حقیقت کا ادراک کرلے اور اپنے رویے کو اس کے رنگ میں رنگ لے تو وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے جہاں تک پہنچنے کا اللہ نے اپنے تمام بندوں کو حکم دیا ہے۔

یہ عبودیت — نبی ﷺ کی طویل دعاء، شدید تضرع اور فتح و کامرانی کے لیے اپنے رب سے مناجات جس کے دل کش مظاہر تھے — وہ قیمت ہے جس کی ادائیگی پر آں حضرت ﷺ اس معرکہ میں اللہ تعالیٰ کی عظیم تائید کے مستحق ٹھہرے۔ درج ذیل آیتِ کریمہ میں اس کی صراحت ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ

(الانفال۔ ۹)

اور یاد کرو وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔

چونکہ آں حضرت ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی یہ عبودیت انجام دی تھی اس لیے آپ کو فتح و کامرانی پر پورا یقین تھا اور آپ مطمئن تھے کہ جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں ہوگا۔ پھر اس عبودیت (جو نبی ﷺ کے کردار میں جلوہ گر ہوئی) کے مظہر اور اس کے نتائج کا موازنہ اس سرکشی اور گھمنڈ کے مظہر سے کیجیے جس کا اظہار ابوجہل کے رویے سے ہوا۔ جب اس سے کہا گیا کہ تجارتی قافلہ بچ کر نکل گیا ہے، اس لیے اب ہم لوگوں کو واپس ہو جانا چاہیے تو اس نے جواب دیا: "ہم واپس نہیں ہوں گے، یہاں تک کہ میدان بدر پہنچ جائیں۔ وہاں ہم اونٹ ذبح کریں گے، لوگوں کو کھانا کھلائیں گے، شراب پلائیں گے اور ناچ گانا ہوگا۔ عربوں کو جب اس کی خبر

ہوگی اور انہیں ہمارے لشکر اور اس کی جنگی تیاریوں کی تفصیلات کا علم ہوگا تو ان پر ہماری دھاک بیٹھ جائے گی۔"

اس سرکشی اور گھمنڈ کے نتائج میں غور کیجیے ...

اللہ کے لیے عبودیت اور خضوع کا نتیجہ ایسی پائیدار عزت اور بلند عظمت کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے سامنے پوری دنیا نے اپنی جبینِ نیاز خم کردی۔ اور دوسری طرف سرکشی اور جھوٹے غرور کا حشر یہ ہوا کہ جہاں شراب و شباب اور رنگ و مستی کے منصوبے بنے تھے وہاں ذلت و نامرادی کا مقبرہ بن گیا۔ اس کائنات میں جب بھی اللہ کے لیے خالص عبودیت اور جھوٹے غرور اور سرکشی کا ٹکراؤ ہوتا ہے تو اللہ کی اسی سنت کا ظہور ہوتا ہے۔

۷۔ فرشتوں کے ذریعے مدد

غزوۂ بدر میں مومنین صادقین کے لیے اللہ کی تائید و نصرت کا ایک عظیم الشان معجزہ ظاہر ہوا۔ اللہ نے اس میں مسلمانوں کی مدد فرشتوں کے ذریعے فرمائی جنہوں نے ان کے ساتھ جنگ کی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کتاب اللہ اور سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کو سائبان میں ایک موقعے پر جھپکی آگئی۔ پھر بیدار ہوئے تو فرمایا: "خوش خبری ہے اے ابوبکر! اللہ کی مدد آگئی۔ یہ جبرئیل ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام تھامے بڑھتے چلے آرہے ہیں۔" امام بخاری نے بھی ملتے جلتے الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے۔[۸]

بعض لوگوں کا وہم ہے کہ ارشادِ باری تعالیٰ میں "ملائکہ" سے مراد روحانی مدد، معنوی قوت یا اسی طرح کی کوئی غیر مادی چیز ہے۔ اس وہم کے باطل ہونے کی واضح ترین قطعی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کی ایک متعین تعداد (ایک ہزار) بیان کی ہے:

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (الانفال۔ ۹)

جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے در پے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔

تعداد و کمیت کے لوازم میں سے ہے اور یہ صرف مادی اور محسوس چیزوں ہی میں ممکن ہے۔

۸۔ بخاری کے الفاظ یہ ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "یہ جبرئیل ہیں جو اپنے گھوڑے کی لگام تھامے اور ہتھیاروں سے لیس ہیں۔" صحیح بخاری ۵/ ۱۴

معلوم ہوا کہ ملائکہ کی متعین تعداد کا بیان متعدد روشن حکمتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے سب سے اہم حکمت یہ ہے کہ آیت کی من مانی تاویل کا راستہ بند کر دیا جائے اور "ملائکہ" کو "معنوی قوت" کے مفہوم میں لینے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

لیکن یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ ملائکہ کا جنگ کے لیے بھیجا جانا محض مسلمانوں کے اطمینانِ قلب اور سامان جنگ اور تعداد کے لحاظ سے اپنے سے تین گنا بڑے لشکر کے مقابلے میں پہلی جنگ کے موقعے پر تضرع کے ساتھ اللہ سے استمداد کی حسّی مقبولیت کا مظہر تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مدد کرنے والی صرف اللہ سبحانہ کی ذات ہے اور ملائکہ کا اس میں کوئی ذاتی کردار نہیں تھا۔ اس حقیقت کو اللہ سبحانہ نے نزول ملائکہ کی علت بیان کرتے ہوئے یوں واشگاف کیا ہے:

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهٖ قُلُوْبُكُمْ، وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (الانفال-۱۰)

یہ بات اللہ نے تمہیں صرف اس لیے بتادی کہ تمہیں خوش خبری ہو اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، ورنہ مدد تو جب بھی ہوتی ہے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ یقیناً اللہ زبردست اور دانا ہے۔

۸۔ مردوں کی برزخی زندگی:

جب مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈال دیا گیا تو رسول اللہ ﷺ اس کی منڈیر پر کھڑے ہوئے اور انہیں پکار کر ان سے کچھ باتیں کہیں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: کہ مردے تو سنتے نہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ "یہ تم سے زیادہ سن رہے ہیں۔" یہ واضح دلیل ہے اس بات کی کہ مردوں کی ایک مخصوص روحانی زندگی ہوتی ہے جس کی حقیقت اور کیفیت سے ہم واقف نہیں، اور یہ کہ مردوں کی ارواح ان کے جسموں کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ اسی سے قبر کے عذاب اور اس کی نعمتوں کا مفہوم سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن ان سب چیزوں کے ایسے پیمانے ہیں جو ہماری عقلوں اور دنیوی ادراکات سے پرے ہیں، اس لیے کہ ان کا تعلق عالم ملکوت سے ہے جو ہمارے مشاہدات اور عقلی اور مادی تجربات سے دور ہیں۔ اس لیے ان پر ایمان کا طریقہ یہ ہے کہ اگر وہ صحیح اور مستند طرق سے ہم تک پہنچے ہیں تو انہیں جوں کا توں تسلیم کر لیں۔

۹۔ قیدیوں سے متعلق مشورہ اور اس سے حاصل ہونے والے اہم نتائج:

اس غزوہ میں جو کفار قید ہوئے اللہ کے رسول نے ان کے بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ مشورے کے نتیجے میں طے پایا کہ ان سے فدیہ میں مال لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اس موقعے پر نازل ہونے والی آیات میں یہ فیصلہ کرنے پر نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کی ملامت کی گئی۔ اس واقعے سے چند اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں:

اول: نبی ﷺ اجتہاد کرتے تھے:

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل تھا۔ جن لوگوں کا یہ نقطہ نظر ہے یعنی جمہور علمائے اصول، انہوں نے اسی واقعے سے استدلال کیا ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ آں حضرت ﷺ اجتہاد کرتے تھے تو اس سے مستنبط ہونے والی یہ بات بھی صحیح ہے کہ آپ کا اجتہاد صحیح بھی ہوسکتا تھا اور اس میں غلطی کا بھی امکان تھا، اگرچہ وہ غلطی باقی نہ رہتی بلکہ قرآن کی کوئی آیت نازل کر کے اس غلطی کی اصلاح کر دی جاتی تھی۔ اگر اس موقعے پر کوئی آیت نازل نہ ہوئی ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کا اجتہاد برحق ہے۔

شارح اللمع فرماتے ہیں: "نبی ﷺ سے غلطی کا صدور ممکن تھا لیکن اس پر قائم نہیں رہ سکتے تھے، بلکہ فوراً آپؐ کو متنبہ کر دیا جاتا تھا" ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں: "ہمارے بعض اصحاب کا خیال ہے کہ آں حضرت ﷺ سے غلطی کا صدور ممکن نہ تھا۔ یہ بات صحیح نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ. التوبہ-۴۳ (اے نبی اللہ تمہیں معاف کرے، تم نے کیوں انہیں رخصت دے دی) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ سے غلطی سرزد ہوگئی تھی۔[9]

اسنویؒ نے المنہاج کی شرح میں لکھا ہے: "آمدیؒ اور ابن الحاجبؒ کے نزدیک مسلک مختار یہ ہے کہ نبی ﷺ سے غلطی کا صدور ممکن ہے، لیکن وہ اس پر قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ آمدیؒ نے ہمارے اکثر اصحاب، حنابلہ اور اصحاب الحدیث کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔"[10]

---

[9] دیکھیے شرح اللمع، ابواسحاق شیرازی ص ۸۲۴

[10] شرح المنہاج، اسنوی ۴/۵۳۷

امام بیضاویؒ نے آیت مَاكَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى .... الآیة (الانفال۔۶۷) کی تفسیر میں لکھا ہے: "یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء علیہم السلام اجتہاد کرتے ہیں اور یہ کہ ان کے اجتہاد میں غلطی ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس پر قائم نہیں رہتے۔"

بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کی طرف غلطی کی نسبت کو بہت بڑی بات سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ غلطی گناہ یا انحراف کے مترادف ہے جو عصمتِ انبیاء کے منافی ہے۔ حالانکہ غلطی سے مراد بس یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کا اجتہاد علم الٰہی میں محفوظ امر کے مطابق نہیں ہے اور یہ چیز آپ کی عصمت کے منافی نہیں بلکہ اس پر آپ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اجر کے مستحق ہوں گے۔ اور اس پر تمام لوگ آپ کی اتباع کے مکلف ہیں جب تک کہ وحی کے ذریعے آپ کو دوسرا حکم نہ بتادیا جائے۔ معلوم ہوا کہ آں حضرت ﷺ کا وہ اجتہاد جس کے بارے میں کوئی وحی نازل نہ ہوئی ہو اس کے دو پہلو ہیں۔ اس کا ایک پہلو انسانوں سے متعلق ہے اور دوسرے کا تعلق علم الٰہی سے ہے۔

اوّل الذکر پہلو سے آپ کے اجتہاد کو کسی بھی طور پر مبنی بر خطا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس لیے کہ لوگ آپ کی اتباع کے ہر حال میں اسی طرح مکلف ہیں جس طرح وہ آپ کے بعد آنے والے تمام مجتہدین کی اتباع کے مکلف ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس علم الٰہی میں محفوظ مخفی امر سے واقفیت کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ رہا دوسرا پہلو یعنی علم الٰہی کے تعلق سے آپ کا اجتہاد تو اس میں صحت اور غلطی دونوں کا احتمال ہے، اس لیے کہ ممکن ہے وہ علم الٰہی میں محفوظ امر کے موافق ہو یا موافق نہ ہو۔ کمال مطلق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ آں حضرت ﷺ مدارج کمال طے کرتے رہتے تھے۔ جو مراحل آپ طے کر چکے تھے وہ بعد میں آنے والے مراحل کے مقابلے میں ناقص اور کوتاہ معلوم ہوتے تھے۔ اس پر آپ اللہ سے اسی طرح استغفار کرتے تھے جس طرح ہم گناہوں پر استغفار کرتے ہیں۔ اور فرماتے تھے: "میرے دل پر بھی غبار چھا جاتا ہے چنانچہ میں ہر دن رات ستر مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔"

دوم: مالِ غنیمت کے حصول کے موقع پر الٰہی تربیت

جس طرح غزوۂ بدر مسلمانوں کے لیے اللہ کی راہ میں قربانی اور جنگ کا اولین تجربہ

جب کہ اس وقت وہ کمزور اور تعداد میں کم تھے۔ اسی طرح وہ جنگ کے بعد اموالِ غنیمت حاصل ہونے کا بھی اولین تجربہ تھا جب کہ وہ غریب اور ضرورت مند تھے۔ حکمتِ الٰہی نے کمزوری کے ساتھ جنگ کے تجربے میں ان کی مدد اس طرح کی کہ فتح و کامرانی پر دلالت کرنے والے خوارق کے ذریعے ان کے دلوں کو استقامت عطا فرمائی اور ان کے نفوس کو اطمینان دلایا، جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا گیا۔

پھر حکمتِ الٰہی نے ضرورت اور فقر کی موجودگی میں اموالِ غنیمت کے حصول کے تجربے کے دوران بروقت دقیق تربیتی وسائل کے ذریعے ان کی رہنمائی کی۔ اس تجربے کا اثر اس غزوہ کے بعد دو مواقع پر ظاہر ہوا۔ پہلا موقع وہ تھا جب مشرکین کو شکست ہوئی تھی اور وہ اپنے اموال اور سامانِ جنگ چھوڑ کر الٹے پیر بھاگ گئے تھے اور ان پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس وقت ان اموال کی تقسیم کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا اور یہ اختلاف اس حد تک بڑھا کہ باہم لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی۔ اس وقت تک جنگ میں حصہ لینے والوں کے درمیان اموالِ غنیمت کی تقسیم کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔ اس لیے صحابہ نے نبی ﷺ سے اس سلسلے میں دریافت کیا اور اپنے اختلاف میں آپ سے فیصلہ چاہا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ، فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ. (الانفال:۱-۲)

تم سے انفال کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو "یہ انفال تو اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو" سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے رب پر اعتماد کرتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ ان آیتوں میں ان کے سوال کا جواب نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ ان کی توجہ اس پورے معاملے سے دوسری طرف پھیر دی گئی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ مالِ غنیمت کا

استحقاق ان میں سے کسی کو نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے۔ ان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ اس اختلاف کو رفع کریں جو ان کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے ان پر عمل کریں اور جن کاموں سے روکا ہے ان سے بچیں۔ رہا مال اور متاع دنیا تو ان کے سلسلے میں وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔ جب مسلمانوں نے ان آیتوں سے رہنمائی حاصل کی اور اس چیز سے اپنی نگاہیں پھیر لیں جس کی وجہ سے ان کے درمیان اختلاف ابھر آیا تھا تو دوسری آیات نازل ہوئیں جن میں جنگ کرنے والوں کے درمیان اموال غنیمت کی تقسیم کا طریقہ بتایا گیا تھا۔ یہ ان کی تربیت کا بہترین طریقہ تھا۔

دوسرا موقع اس وقت کا ہے جب نبی ﷺ نے قیدیوں کے معاملے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا تھا۔ اس معاملے میں صحابہ کے دل اس بات پر مطمئن تھے کہ ان قیدیوں سے فدیہ میں مال لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اس رائے کا سبب رحم دلی اور قیدیوں کے ساتھ نرمی تھی کہ شاید وہ کفر اور سرکشی سے باز آجائیں اور اللہ پر ایمان لے آئیں، اور یہ خیال تھا کہ فدیہ میں حاصل ہونے والے مال سے اس مال کی کچھ تلافی ہو جائے گی جو مہاجرین مکہ میں چھوڑ آئے ہیں، اور اس کے ذریعے انہیں اپنے دنیاوی معاملات کی درستگی میں مدد ملے گی۔ یہ رائے جس پر رسول اللہ ﷺ کا دل بھی مطمئن ہو گیا تھا، اس سے اپنے اصحاب کے ساتھ آپ کی غایت درجہ شفقت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ آپ کی شفقت ہی تھی جس کی وجہ سے بدر کی طرف نکلتے ہوئے جب آپؐ نے مہاجرین کے چہروں پر فقر و احتیاج کے آثار دیکھے تو ان کے سلسلے میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور عرض کیا: "اے اللہ یہ پیادہ ہیں ان کے لیے سواری کا انتظام کر دے۔ اے اللہ یہ ننگے بدن ہیں، انہیں پہننے کے لیے کپڑے دے دے۔ یہ بھوکے ہیں انہیں آسودہ کر دے۔" [۱۱]

لیکن حکمت الٰہی کا منشا یہ نہیں ہوا کہ مسلمان اپنے ان اہم معاملات میں جو صرف دینی نقطہ نظر کی بنیاد پر قائم ہیں، فیصلہ کرنے کے لیے مال و دولت کے نظریہ کو مکمل یا جزئی طور پر پیمانہ بنالیں، خواہ حالات کتنے ہی سخت اور ناساعد ہوں۔ اس لیے کہ اس بات کا امکان تھا کہ اپنی نوعیت کے اولین تجربہ کے وقت اگر انہیں اس نظریے کو اختیار کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جاتا تو یہ نظریہ ایک عام قاعدہ کی شکل اختیار کر لیتا اور اس قسم کے احکام میں مادی نقطہ نظر

[۱۱] ابوداؤد بحوالہ جمع الفوائد ۲/۹۰

غالب آجاتا۔ حالانکہ ان احکام کو اتنا بلند رہنا چاہیے کہ دنیاوی اغراض میں سے کوئی چیز اس تک نہ پہنچ سکے۔ جو شخص دنیا کے پیچھے چند قدم چل لے اور اس کا ذائقہ اس کے منہ کو لگ جائے اس کے لیے بہت دشوار ہے کہ اس سے بے تعلق ہو جائے اور منہ کی لگی کو چھوڑ دے۔

امام مسلمؒ نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دینے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؐ اور ابوبکرؓ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بتائیے آپ اور آپ کے دوست کیوں رو رہے ہیں؟ اگر کوئی ایسا سبب ہو جس پر مجھے بھی رونا چاہیے تو میں بھی روؤں۔ اور اگر کوئی ایسا سبب نہیں ہے تو بھی آپ دونوں کے رونے کی وجہ سے میں بھی رونی صورت بنالوں۔" رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تمہارے ساتھیوں نے مجھے قیدیوں سے فدیہ میں مال لے کر انہیں چھوڑ دینے کا جو مشورہ دیا تھا اس پر رو رہا ہوں" پھر آپؐ نے قریب کے ایک درخت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "اس مشورے کے سبب ان پر نازل ہونے والا عذاب اس درخت سے بھی زیادہ قریب آگیا تھا۔" اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ حَتَّىٰ يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۚ تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ لَوْلَا كِتَابٌ مِنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ [۱۲] (الانفال: ۶۷-۶۹)

کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے۔ اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی۔ پس جو کچھ تم نے مال حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ وہ حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ یقیناً اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

[۱۲] صحیح مسلم ۵/۱۵۸

یہود کی پہلی بدعہدی

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: "(غزوۂ بدر کے بعد) رسول اللہ ﷺ نے یہودی قبیلہ بنو قینقاع کو ان کے بازار میں جمع کیا اور فرمایا: "اے گروہ یہود! ڈرو کہ کہیں اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ نہ کرے اور تمہیں بھی ویسی ہی سزا نہ دے جیسی قریش کو دی۔ اسلام قبول کر لو کیونکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا نبی ہوں۔ اس کا تذکرہ تم اپنی کتابوں میں پاتے ہو اور اللہ نے تم سے اس کا عہد لیا ہے" انہوں نے جواب دیا: "اے محمد! کیا ہمیں اپنی قوم کی طرح سمجھ رکھا ہے۔ تمہارا سابقہ اب تک ایسی قوم سے رہا ہے جو جنگ سے بالکل ناآشنا تھی اس لیے تمہیں فتح حاصل ہو گئی۔ اس سے اپنے بارے میں دھوکے میں نہ پڑو۔ اللہ کی قسم! اگر ہم سے معاملہ پڑے گا تو دیکھ لو گے کہ ہم کتنے جنگ آزما لوگ ہیں۔"

ابن ہشام نے ابو عوانہ سے روایت کیا ہے کہ "عرب کی ایک عورت اپنے سامانِ تجارت[13] کے ساتھ آئی۔ اسے بنو قینقاع کے بازار میں بیچا۔ پھر ایک رنگ ریز کی دکان پر گئی۔ وہاں بیٹھے لوگوں نے اس سے چہرہ کھولنے کو کہا۔ اس نے انکار کیا۔ دوکان کے مالک رنگ ریز نے (چپکے سے) اس کے کپڑے کا ایک کنارہ لے کر اس کی پیٹھ پر باندھ دیا۔ جب وہ عورت کھڑی ہوئی تو اس کا ستر کھل گیا۔ اس پر وہ لوگ ہنسنے لگے۔ عورت نے شور مچایا۔ ایک مسلمان یہ دیکھ کر غیرت سے بپھر گیا۔ اس نے اس رنگ ریز کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ وہ رنگ ریز یہودی تھا۔ جواب میں یہود نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ وہاں موجود مسلمانوں نے یہود کے خلاف دوسرے مسلمانوں کو مدد کے لیے پکارا۔ اس طرح مسلمانوں اور یہود بنو قینقاع کے درمیان ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ... پہلے یہودی تھے جنہوں نے اس معاہدہ کو توڑ ڈالا جو ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان

[13] روایت میں "جلب" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ سامان جسے بیچنے کے لیے بازار لے جایا جا

تھا۔[14] طبری اور واقدی کی روایت کے مطابق یہ وسط شوال ۲ھ کا واقعہ ہے۔[15]

رسول اللہ ﷺ ایک مدت تک ان کا محاصرہ کیے رہے۔ بالآخر وہ اس بات پر راضی ہو گئے کہ آپؐ ان کے حق میں جو فیصلہ کریں گے وہ انہیں منظور ہوگا۔ مشہور منافق عبداللہ بن ابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی: "اے محمد! میرے حلیفوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجیے" رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اس نے دوبارہ یہی بات کہی، مگر آپ اس سے منہ پھیرے رہے۔ اس نے آپ کی زرہ کا گریبان پکڑ لیا۔ آپ نے فرمایا: "مجھے چھوڑ دو۔" اس کے اس رویے سے آپ غضبناک ہو گئے اور آپ کے روئے انور کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے پھر فرمایا: "تمہارا برا ہو۔ مجھے چھوڑ دو۔" اس نے کہا: اللہ کی قسم! میں اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ میرے حلیفوں کے ساتھ اچھا معاملہ نہ کریں۔ یہ تین سو زرہ پوش اور چار سو بغیر زرہ کے لوگ ہیں، جنہوں نے ہر کس و ناکس سے میری حفاظت کی ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ ایک ہی دن ان کے سر قلم کر دیں۔ اللہ کی قسم، مجھے تو ڈر ہے کہ اس حرکت سے آپ مصیبتوں کا شکار نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ٹھیک ہے تمہارے کہنے سے میں انہیں چھوڑے دے رہا ہوں۔" آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ اب وہ مدینہ میں نہ رہیں۔ وہاں سے اور کہیں چلے جائیں۔ وہ لوگ اذرعات، جو شام کے علاقے میں ہے، چلے گئے۔ اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنی بقیہ زندگی وہیں گزاری۔

عبداللہ بن ابی کی طرح حضرت عبادہ بن صامتؓ کے بھی ان یہودیوں سے حلیفانہ تعلقات تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: "میں اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے ولایت کا تعلق رکھتا ہوں اور ان کفار کے حلیفانہ تعلق اور ولایت سے دست بردار ہوتا ہوں۔"

ان دونوں کے رویوں پر یہ آیات نازل ہوئیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ فَتَرَى الَّذِينَ

[14] سیرت ابن ہشام ۲/۴۷

[15] طبری ۲/۴۸۰، طبقات ابن سعد ۲/۶۷

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ

(المائدہ:۵۱-۵۲)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے وہ انہی میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں، کہتے ہیں "ہمیں ڈر لگتا ہے کہ کہیں ہم کسی مصیبت کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔" مگر بعید نہیں کہ اللہ جب تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اپنے اس نفاق پر جسے یہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں، نادم ہوں گے۔

دروس ونصائح

اس واقعہ سے بحیثیت مجموعی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہود کی فطرت میں غداری اور بدعہدی کس حد تک رچی بسی ہے۔ وہ جن لوگوں کا بھی پڑوس اختیار کرتے ہیں اور جن لوگوں کے ساتھ رہتے بستے ہیں، ان کے خلاف سازشیں رچنے اور مکر و فریب کا تانا بانا بنے بغیر انہیں چین نہیں آتا۔ اس کے لیے اسباب و وسائل فراہم کرنے کی ان میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس واقعہ کے تفصیلی مطالعے سے ہمیں چند دروس حاصل ہوتے اور چند اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ جن کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ مسلمان عورت کا حجاب اور اس کے حدود:

ہم نے دیکھا کہ اس واقعے کا سبب یہ تھا کہ ایک مسلمان عرب خاتون اپنے کسی کام سے یہود کے بازار میں گئی تو انہوں نے اس کا چہرہ کھلوانے کی کوشش کی۔ یہ سبب ابن ہشام نے بیان کیا ہے۔ دیگر اصحاب سیر نے نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کو فتح مل گئی تو یہود ان

سے جلنے لگے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو چیلنج دیتے ہوئے کہا: "اللہ کی قسم! اگر ہم سے جنگ کا معاملہ پیش آیا تو دیکھ لو گے کہ ہم کتنے جنگ آزما لوگ ہیں" ان دونوں اسباب میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اغلب یہ ہے کہ دونوں اسباب بیک وقت وقوع پذیر ہوئے ہوں اور ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی تکمیل کی ہو۔ اس لیے کہ یہ چیز بعید ہے کہ ان کے چہروں پر اور ان کی باتوں میں بدعہدی کے آثار ظاہر ہوتے ہی رسول اللہ ﷺ ان سے معاہدہ توڑ دیں بلکہ ضرور انہوں نے اس کے ساتھ ہی کوئی ایسا کام کیا ہوگا جس سے مسلمانوں کی توہین ہوئی ہوگی، جیسا کہ ابن ہشام نے روایت کیا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پردہ جو اسلام میں عورت کے لیے مشروع ہے، اس میں چہرہ بھی شامل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کوئی ضرورت نہ تھی کہ یہ عورت راستے میں اپنا چہرہ ڈھک کر نکلتی۔ اور اگر اس کا اپنا چہرہ ڈھکنا کسی دینی حکم کی بجا آوری میں نہ ہوتا تو یہود یہ حرکت کرنے پر آمادہ نہ ہوتے، اس لیے کہ اس حرکت سے ان کا مقصد اس عورت کے دینی شعور کو برانگیختہ کرنا تھا جو اس کے سراپا سے عیاں تھا۔

ممکن ہے یہ بات کہی جائے کہ اس واقعے میں جسے صرف ابن ہشام نے روایت کیا ہے، کچھ کمزوری ہے، اس لیے اس قسم کے حکم پر اس کی دلالت قوی نہ ہوگی۔ لیکن یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی تائید دیگر بہت سی صحیح احادیث سے ہوتی ہے جن میں طعن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

مثلاً امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ عورت کے لباسِ احرام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں: "عورت نہ چہرہ ڈھکے گی، نہ برقع اوڑھے گی، اور نہ ورس اور زعفران میں رنگے ہوئے کپڑے پہنے گی۔"[16]

امام مالکؒ نے نافعؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے تھے: "احرام باندھنے والی عورت نہ نقاب اوڑھے گی نہ دستانے پہنے گی۔"[16 الف]

حج کا احرام باندھتے وقت عورت کو برقع یا نقاب اوڑھنے سے منع کرنے کا کیا مطلب ہے؟

[16] صحیح بخاری ۳/۱۴۶ باب ما یلبس المحرم من الثیاب

[16 الف] مؤطا امام مالک ۱/۳۲۸

اور یہ نہی صرف عورت کے ساتھ خصوص کیوں ہے؟ یقیناً نہی کا سبب یہ ہے کہ اس وقت مسلمان عورت عام حالات میں برقع اوڑھتی یا اپنے چہرے پر نقاب ڈالتی تھی، اس لیے اس حکم کا تقاضا ہوا کہ حج کے دنوں میں اسے مستثنیٰ کر دیا جائے۔

امام مسلمؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کو جب ان کے شوہر نے طلاق دے دی تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ ام شریکؓ کے گھر میں عدت گزاریں۔ پھر بعد میں انہیں کہلا بھیجا کہ ام شریکؓ کے گھر میں میرے اصحاب آتے جاتے ہیں، اس لیے اپنے چچازاد بھائی ابن ام مکتومؓ کے گھر میں عدت گزار لو۔ وہ نابینا ہیں، وہاں رہتے ہوئے اگر کبھی اپنا دوپٹہ رکھ دو گی تو ان کی نگاہ تم پر نہ پڑے گی۔

ان احادیث کا بیان تو اس پہلو سے ہے کہ عورت کا اپنے چہرہ اور جسم کے بقیہ حصوں کو اجنبی مردوں سے چھپانا واجب ہے۔

رہی یہ بات کہ مردوں کا ان چیزوں کو دیکھنا حرام ہے تو اس پر بھی بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں۔

مثلاً امام ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت بریدہؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا: "اے علی! ایک بار کسی پر تمہاری نگاہ پڑ جائے تو پلٹ کر دوبارہ نہ دیکھو۔ پہلی بار تو دیکھ سکتے ہو مگر دوسری بار دیکھنے کا تمہیں حق نہیں۔"

امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے (حجۃ الوداع کے موقع پر) یوم النحر میں فضل بن عباسؓ کو سواری پر اپنے پیچھے بٹھالیا۔ (آگے روایت میں قبیلۂ خثعم کی ایک خوب صورت عورت کا تذکرہ ہے۔ پھر مذکور ہے کہ) فضلؓ اس عورت کی طرف دیکھنے لگے۔ نبی ﷺ نے ان کی ٹھوڑی پکڑی اور ان کا چہرہ دوسری طرف کر دیا۔

ان احادیث میں دو ممانعتیں یکجا ہیں۔ عورت کو منع کیا گیا کہ وہ اپنا چہرہ یا جسم کا کوئی اور حصہ اجنبیوں کے سامنے کھولے اور مرد کو منع کیا گیا کہ وہ ان میں سے کسی چیز کی طرف دیکھے۔ یہ بھرپور اور مکمل دلیل ہے اس بات کی کہ عورت کا چہرہ اجنبیوں کے حق میں پردہ ہے۔ صرف مخصوص حالات میں اسے کھولنے کی اجازت ہے مثلاً علاج و معالجہ، تحصیل علم اور گواہی وغیرہ کی ضرورت سے۔

بعض ائمہ کا مسلک ہے کہ عورت کا چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں پردے میں شامل نہیں ہیں، اس لیے انہیں چھپانا ضروری نہیں ہے۔ انہوں نے گذشتہ احادیث کو جو برخلاف مفہوم پر دلالت کرتی ہیں، وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کیا ہے۔ لیکن اس بات پر سب لوگوں کا اتفاق ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کی طرف بنظر شہوت دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اور یہ کہ جب ماحول بگڑ گیا ہو اور اس کی طرف نگاہ اٹھانے والے اکثر لوگ فاسق ہوں جو اسے بری نظروں سے دیکھتے ہوں تو عورت کا اپنے چہرہ کو بھی ڈھکنا واجب ہے۔

آج کے مسلمانوں کا جو حال ہو گیا ہے اور ان میں فسق و فجور، بدطینتی اور بداخلاقی جس حد تک عام ہو گئی ہے اس کے بارے میں غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ ان حالات میں عورت کا چہرہ کھولنے کے جواز کی بات کہنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔ یہ عظیم انحطاط جس کا آج اسلامی معاشرہ شکار ہے، اس کا تقاضا ہے کہ عورت اپنی سلامتی اور تحفظ کی ضمانت کے لیے چلنے پھرنے میں مزید احتیاط برتے اور اس کے لیے مناسب اسباب و وسائل اختیار کرنے کی پوری کوشش کرے۔ یہاں تک کہ مسلمان خطرات کو پار کر جائیں اور اپنے معاملات کو خود نپٹانے اور بحران کو خود حل کر لینے پر قادر ہو جائیں۔

مختصر الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ دین کے معاملے میں رخصتوں اور سہولتوں پر عمل کے خواہاں رہتے ہیں، وہ عموماً جادۂ اعتدال پر قائم نہیں رہ پاتے اور اصل فرائض سے بے پروا ہو جاتے ہیں الّا یہ کہ معاشرے میں کوئی ایسی پاکیزہ دینی لہر پائی جائے جو ان رخصتوں کو عام اسلامی نہج پر کنٹرول کرے اور راہِ صواب سے منحرف ہونے اور جائز حدود سے تجاوز کرنے سے روکے۔

بعض لوگوں کا عجیب و غریب معاملہ ہے کہ وہ صرف تخفیف، تسہیل اور فرائض سے پہلو تہی کے لیے یہ قاعدہ پیش کرتے ہیں کہ "زمانہ بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں" لیکن جب معاملہ اس کے برعکس ہو تو یہ قاعدہ انہیں مطلق نہیں یاد رہتا۔ ایسے کسی موقعے پر ان کی زبان سے یہ نہیں سنا گیا کہ زمانہ بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔ مثلاً وہ یہ نہیں کہتے کہ آج کا زمانہ جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ عورت ضرور اپنا چہرہ ڈھکے۔ آج قدم قدم پر لغزشوں کے امکانات پائے جاتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ عورت چلنے پھرنے میں مزید احتیاط برتے اور دیکھے کہ اس کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے

مسلمانوں کے لیے مطلوبہ اسلامی معاشرہ قائم کردے۔

۲۔ مسلمانوں سے یہود کا کینہ و بغض:

یہ واقعہ جس کا یہود قینقاع کی جانب سے مظاہرہ ہوا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف بغض و نفرت کے جذبات پوشیدہ تھے، لیکن ہجرت مدینہ کے بعد تین سال تک اس کا اظہار کیوں نہیں ہوا؟ اور کیوں یہود نفرت کو اپنے سینوں میں چھپائے رہے اور اپنی سازش کو زیر زمین رکھا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بدر میں مسلمانوں کی فتح نے ان کے جذبات برانگیختہ کردیے اور دلوں میں مدفون نفرت و عداوت کو بھڑکا دیا۔ اس کی انہیں بالکل توقع نہ تھی۔ لیکن ان کی توقع کے برخلاف جب مسلمان فتح مند ہوگئے تو وہ اپنے بغض اور کینہ پر قابو نہ رکھ سکے اور اپنے اس اقدام کے ذریعے اس کا اظہار کردیا۔ مسلمانوں کے خلاف ان کی نفرت اور بغض کا کھلا اظہار ان کی ان باتوں اور تبصروں سے ہوتا تھا جو انہوں نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی فتح کے بعد کیے۔

ابن جریرؒ نے روایت کیا ہے کہ جب مسلمان بدر سے واپس ہوئے تو مدینہ کے ایک یہودی مالک بن صیف نے بعض مسلمانوں سے کہا:

"تم نے قریش کی ایک جماعت پر جسے فن جنگ سے آگاہی نہیں ہے، فتح پائی ہے، اس سے اپنے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ اگر ہم نے تم سے جنگ کا پختہ ارادہ کرلیا تو ہمارے مقابلے میں تم ٹک نہیں سکتے۔"

اگر یہود نے ان معاہدوں کا احترام کیا ہوتا جو ان کے اور مسلمانوں کے درمیان طے پائے تھے تو مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی نہ ان سے کوئی ایسی بات کہتا جس سے انہیں اپنی اہانت محسوس ہوتی اور نہ کوئی ایسا کام کرتا جس سے وہ پریشانی اور مشقت میں پڑ جاتے۔ لیکن وہ تو آمادۂ شر رہے۔ چنانچہ اس کا وبال انہی کے سر گیا۔

۳۔ اسلام میں منافق کے ساتھ معاملہ:

اس واقعے کے بعد عبداللہ بن ابی نے جس شکل میں یہود کا دفاع کیا اس سے اس شخص

نفاق کا معاملہ کچھ بھی مخفی نہیں رہتا۔ اس کے اس رویے سے واضح ہوگیا کہ وہ اسلام کا محض دکھاوا کررہا تھا اور نہ اپنے دل کی گہرائیوں میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے شر چھپائے ہوئے تھا۔

لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ بحیثیت ایک مسلمان معاملہ کیا۔ آپ نے اس کی دی ہوئی پناہ کو توڑا نہ اس کے ساتھ مشرک، مرتد یا جھوٹے مسلمان کا سا معاملہ کیا بلکہ اصرار کے ساتھ اس نے جس چیز کا مطالبہ کیا اسے پورا کردیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ منافق کے ساتھ اس دنیا میں مسلمان جیسا معاملہ کیا جائے گا۔ اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ خواہ اس کا نفاق بالکل کھلا ہوا اور قطعی ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلامی احکام بحیثیت مجموعی دو پہلو رکھتے ہیں۔ ان کا ایک پہلو اس دنیا سے متعلق ہے، اسے مسلمانوں کو اپنے معاشروں میں اور اپنے درمیان نافذ کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے اور خلیفہ یا سربراہ مملکت اس کی نگرانی کرتا ہے۔ دوسرے پہلو کا تعلق آخرت سے ہے۔ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔

جہاں تک اول الذکر پہلو کا تعلق ہے تو اس کی بنیاد مادی اور محسوس دلائل پر ہوتی ہے۔ احکام کے نتائج اسی کے بموجب مستنبط کیے جاتے ہیں۔ اس پہلو میں وجدانی دلائل اور استنباطی قرائن کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

رہا دوسرا پہلو تو وہ دلوں میں جاگزیں اور سینوں میں پوشیدہ جذبہ و احساس پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اس قاعدے کا اظہار رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "یہاں تو ہم تم لوگوں کی گرفت صرف ان اعمال پر کریں گے جن کا تمہاری طرف سے اظہار ہوگا۔" بخاری و مسلم نے ایک دوسری حدیث روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"تم لوگ اپنے خصومات لے کر میرے پاس آتے ہو۔ اس کا امکان ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنے فریق کے مقابلے میں اپنی دلیل پیش کرنے میں زیادہ چرب زبان ہو اور میں اس کی باتیں سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ لہٰذا اگر میں کسی شخص کو اس کے بھائی کا حق دے دوں تو وہ اس میں سے کچھ نہ

لے۔ وہ اس کے لیے آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔"

اس قاعدہ کی مشروعیت کی حکمت یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان عدل وانصاف قائم رہے اور کسی کو اس سے کھلواڑ کرنے اور اسے پامال کرنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ اس کا امکان تھا کہ بعض حکام صرف وجدانی اور استنباطی دلائل کا سہارا لے کر بعض لوگوں کو ناحق پریشان کرتے۔

اس شرعی قاعدے پر عمل کرنے کے مقصد سے ہی اللہ کے رسول ﷺ باوجودیکہ وحیِ الٰہی کے ذریعے منافقین کے بہت سے احوال اور ان کے دلوں کے اسرار سے واقف تھے، لیکن عام شرعی احکام میں بغیر کسی تفریق کے ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کرتے تھے۔

یہ اس چیز کے منافی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو منافقین سے ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے اور ان کی سرگرمیوں پر پوری نظر رکھنی چاہیے۔ یہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ مسلمانوں کی بدیہی ذمہ داریوں میں سے ہے۔

۴۔ غیر مسلموں سے موالات اور اسلام میں اس کا حکم:

جب ہم اس واقعے کے قانونی نتیجے یعنی اس کے بعد بطور تبصرہ نازل ہونے والی قرآنی آیات میں غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ غیر مسلم کو اپنا ولی بنائے، یعنی اس کو اپنا دوست بنائے اور ان دونوں کے درمیان ولایت وتعاون کا تعلق ہو۔

اس کا شمار ان اسلامی احکام میں ہوتا ہے جن کے سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس موضوع پر قرآن کی بکثرت آیات میں صراحت موجود ہے۔ اور اس پر زور دینے والی احادیث نبوی معنوی تواتر کے درجے تک پہنچی ہوئی ہیں۔ ان دلائل کو یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ وہ معروف اور واضح ہیں۔

اس حکم سے صرف ایک حالت مستثنیٰ ہے۔ اور وہ یہ کہ مسلمان اپنی شدید کمزوری کی وجہ سے اس موالات پر مجبور ہوں۔ صرف اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی رخصت دی ہے۔ فرمایا:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ، وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ

مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ، اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً. (آل عمران۔ ۲۸)

مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ غیر مسلموں سے موالات سے روکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے نفرت کرنے اور کینہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کو اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ کسی شخص سے نفرت کرے۔ محض اللہ کے لیے کسی شخص سے بغض رکھنا، اور اس سے نفرت کرنا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر کا سرچشمہ کوئی ایسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔ اس کے سبب مسلمان اس کے کرنے والے سے بغض رکھتا ہے۔ جب کہ موخر الذکر کا مرجع اس شخص کے اعمال و تصرفات سے قطع نظر اس کی اپنی ذات ہوتی ہے، اس لیے اس سے اسلام میں روکا گیا ہے۔

اور اللہ کے لیے بغض درحقیقت نافرمان یا کافر (جو بغض کا مستحق ہے) پر شفقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ مومن سے مطلوب رویہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی تمام لوگوں کے لیے پسند کرے۔ اور مومن کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روز قیامت کے عذاب سے چھٹکارا دلا دے اور اس کے لیے ابدی سعادت کی ضمانت فراہم کر دے۔ مسلمان نافرمانوں اور کافروں سے بغض رکھتا ہے اس لیے کہ وہ جب دیکھتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ابدی شقاوت اور آخرت میں عذاب الٰہی کا مستحق بنا رکھا ہے تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہوتا ہے اور اسے غیرت آتی ہے۔ اور یہ بالکل عیاں ہے کہ اس چیز کا نفرت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے، جس طرح کہ باپ اپنے بیٹے پر اور بھائی اپنے بھائی پر اس کے فائدے اور بھلائی کے لیے غصے کا اظہار کرتا ہے تو اسے نفرت نہیں کہتے۔

یہ چیز بسا اوقات کافروں کے معاملے میں سختی کی مشروعیت کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سختی بسا اوقات اصلاح کا واحد ذریعہ اور شفقت و رحمت کا ناگزیر نتیجہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

فقسا لیزدجروا ومن یک راحما   فلیقس احیانا علی من یرحم

سختی کرو تاکہ وہ لوگ باز آجائیں۔ رحم دل شخص کو کبھی کبھی سختی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ کافروں سے موالات سے روکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ روا رکھنے میں کوتاہی کی جائے اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان طے پانے والے معاہدات کا احترام نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ عدل و انصاف کو ہر حال میں نافذ ہونا چاہیے اور اللہ کے لیے بغض اور نفرت کو ایک دن بھی عدل و انصاف کے اصولوں کی تنفیذ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى. (المائدہ:۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

مقصود یہ وضاحت ہے کہ مسلمان دوسروں سے الگ ایک امت ہیں، جیسا کہ "میثاق مدینہ" (جس کی ہم گذشتہ صفحات میں تشریح کرچکے ہیں) میں صراحت ہے۔ اور جب ایسا ہے تو ان کی دوستی اور بھائی چارگی کو صرف انہی کے درمیان محصور رہنا چاہیے۔ رہے دوسرے تمام لوگ تو ان کے ساتھ ان کا معاملہ عدل و انصاف، خیر کی خواہش، اور رشد و صلاح کی دعا کی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔

غزوۂ اُحد

غزوۂ احد کا سبب یہ تھا کہ قریش کے جو سردار غزوۂ بدر میں قتل ہونے سے بچ گئے تھے انہوں نے بدر کے اپنے مقتولین کا انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ طے پایا کہ ابوسفیان کی سربراہی میں جو تجارتی قافلہ واپس آیا ہے اس کا مال رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے ایک طاقت ور فوج تیار کرنے میں صرف کردیا جائے۔ قریش کے تمام لوگ اس پر رضامند ہوگئے۔ ان کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی شامل ہوگئے جنہیں "احابیش" کہا جاتا تھا۔ انہوں نے بڑی تعداد میں عورتوں کو بھی فوج میں شامل کرلیا تاکہ جب مسلمان حملہ آور ہوں تو وہ مردوں کو فرار ہونے سے روکیں۔ جب وہ لوگ مکہ سے نکلے تو ان کے جنگ بازوں کی تعداد تین ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ آپؐ نے انہیں اختیار دیا کہ چاہیں تو مکے سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کریں اور چاہیں تو مدینہ ہی میں ٹھہر کر ان کا انتظار کریں۔ اگر وہ لوگ مدینہ پر حملہ کریں تبھی ان سے جنگ کریں۔ مسلمانوں میں سے بعض بزرگوں کی رائے مدینہ سے باہر نکلنے کی نہیں تھی۔ عبداللہ بن ابی کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن بہت سے صحابہ جو غزوۂ بدر میں شرکت کا شرف حاصل نہیں کرسکے تھے، مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! ہمیں باہر نکل کر اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ یہ نہ سوچیں کہ ہم ڈر گئے ہیں اور کمزور ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ برابر اپنی رائے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ بھی اس پر رضامند ہوگئے۔ آپ گھر کے اندر تشریف لے گئے، زرہ پہنی اور ہتھیار سنبھالے۔ اب جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے نکلنے پر اصرار کیا تھا انہیں احساس ہوا کہ آپؐ محض ان کے اصرار کی وجہ سے خلاف مرضی نکلنے پر تیار ہوئے ہیں۔ اس پر انہیں ندامت ہوئی۔ آپؐ باہر تشریف لائے تو

انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ہم نے آپ کو خلاف مرضی نکلنے پر مجبور کیا۔ ہمیں اس کا حق نہیں۔ اگر آپ کی مرضی شہر ہی میں رُکنے کی ہے تو ایسا ہی کیجیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نبی کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر جنگ سے پہلے انہیں اتار دے۔" [۱۷]

نبی ﷺ ایک ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے نکلے۔ یہ شنبہ کا دن اور شوال کی سات تاریخ تھی اور آپ کی ہجرت کو بتیس مہینے گزرے تھے۔ [۱۸] یہاں تک کہ جب وہ لوگ مدینہ اور احد کے درمیان پہنچے تو عبداللہ بن ابی نے ایک تہائی فوج کے ساتھ، جن میں عام طور پر اس کے پیروکار اور حامی تھے، پسپائی اختیار کرلی اور یہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ واپس چلا گیا کہ "(محمد ﷺ نے) میری رائے نہیں مانی اور بچوں اور بے حیثیت لوگوں کی رائے قبول کرلی۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیں؟"

حضرت عبداللہ بن حرامؓ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے گئے اور انہیں اللہ کی قسم دلائی کہ اپنے نبی کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ لیکن ان لوگوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ ان کے سردار نے کہا "اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ جنگ ہو کر رہے گی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ رہتے" امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ ان کا ساتھ چھوڑ دینے والوں کے بارے میں مسلمانوں میں اختلاف ہوا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ ہم ان سے جنگ کریں گے، اور بعض نے کہا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس پر یہ آیت اتری:

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ وَاللَّهُ أَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوا ۚ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ. (النساء۔۸۸) [۱۹]

پھر یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں تمہارے درمیان دو رائیں پائی جاتی ہیں، حالانکہ جو برائیاں انہوں نے کمائی ہیں ان کی بدولت اللہ انہیں الٹا پھیر چکا ہے۔

۱۷ اسے ابن اسحاق اور امام احمد نے روایت کیا ہے۔ طبری کی روایت بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ سیرت ابن ہشام ۲/۶۲، تاریخ طبری ۲/۵۰۰، ترتیب مسند احمد ۲۲/۵۲

۱۸ طبقات ابن سعد ۳/۸۷، سیرت ابن ہشام ۲/۶۳

۱۹ صحیح بخاری ۵/۳۱

بعض صحابہ نے یہ تجویز رکھی کہ اس موقعے پر یہود سے مدد لے لینی چاہیے، اس لیے کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان یہ معاہدہ ہو چکا ہے کہ وہ وقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ہم اہل شرک کے خلاف اہل شرک سے مدد نہیں لیں گے۔" [۲۰]

نبی ﷺ نے صحابہ کے ساتھ احد کی گھاٹی میں مورچہ بندی کی۔ ان کی تعداد سات سو سے متجاوز نہ تھی۔ آپؐ نے ان کی پشت احد کی جانب اور چہرہ مدینہ کی جانب رکھا۔ اور پہاڑ پر مسلمانوں کی پشت کی حفاظت کے لیے پچاس تیر اندازوں کو مقرر کیا، ان کا سردار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ کو بنایا اور ان سے تاکید کے ساتھ فرمایا:

"جہاں تمہیں متعین کیا گیا ہے وہیں ڈٹے رہو اور ہماری پشت کی حفاظت کرو۔ اگر تم دیکھو کہ ہمیں فتح حاصل ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر دیکھو کہ ہمیں شکست ہو رہی ہے اور ہمیں قتل کیا جارہا ہے تو بھی ہماری مدد کے لیے یہاں سے نہ ہٹنا۔" [۲۱]

رافع بن خُدیج اور سمرہ بن جندبؓ دونوں نے اصرار کیا کہ وہ نبی ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی عمر پندرہ سال تھی۔ نبی ﷺ نے کم عمر ہونے کی بنا پر انہیں واپس کردیا۔ کسی نے کہا: "اے اللہ کے رسول! رافع تو تیر انداز ہے" آپؐ نے انہیں اجازت دے دی۔ سمرہ بن جندبؓ کو معلوم ہوا تو انہوں نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی: "اللہ کی قسم! میں رافع کو پچھاڑ سکتا ہوں" آپ نے انہیں بھی اجازت دے دی۔

نبی ﷺ نے ایک تلوار ہاتھ میں لی اور فرمایا: "اس تلوار کا حق کون ادا کرے گا؟" حضرت ابودجانہؓ آگے بڑھے اور عرض کیا: "میں اس کا حق ادا کروں گا۔" آپؐ نے وہ تلوار انہیں عنایت فرمادی۔ حضرت ابودجانہؓ نے ایک سرخ رومال نکال کر سر پر باندھا (ایسا وہ اس وقت کرتے تھے جب زندگی کے آخری لمحے تک لڑنے کا ارادہ ظاہر کرنا چاہتے تھے) پھر صفوں کے درمیان اکڑ کر چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: "اللہ تعالیٰ کو یہ چال ناپسند ہے۔ لیکن اس

۲۰ طبقات ابن سعد ۳/۸۰، ابن اسحاق کی روایت بھی اسی کے مثل ہے ۲/۶۵

۲۱ ابن سعد ۳/۸۰، ابن ہشام کے الفاظ بھی اس سے ملتے جلتے ہیں اور امام بخاری نے بھی اسی کے مثل روایت کی ہے۔ ۵/۲۹

موقعے پر پسند ہے"۲۲ پھر آں حضرت ﷺ نے جھنڈا حضرت مصعب بن عمیرؓ کو دیا۔ اس جنگ میں مشرکین کے میمنہ (دائیں دستہ) کی قیادت خالد بن ولید اور میسرہ (بائیں دستہ) کی قیادت عکرمہ بن ابی جہل کر رہے تھے۔

لوگ گتھم گتھا ہوگئے۔ جنگ بھڑکنے لگی۔ مسلمان مشرکوں کو بے تکان قتل کرنے لگے۔ دعوت مبارزت دینے اور لڑنے والوں میں حضرت ابودجانہؓ، حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ اور حضرت مصعب بن عمیرؓ آگے آگے تھے۔

حضرت مصعب بن عمیرؓ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوگئے تو جھنڈا حضرت علی بن ابی طالبؓ نے سنبھال لیا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ مشرکین شکست کھا کر بھاگنے لگے۔ وہ پلٹ کر کچھ دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔ ان کی عورتیں انہیں برا بھلا کہتی اور بددعائیں دیتی تھیں۔ مسلمان ان کا پیچھا کر کے انہیں قتل کرنے اور مال غنیمت لوٹنے لگے۔ پہاڑ پر جو تیر انداز تعینات تھے ان کے درمیان وہاں سے ہٹنے کے سلسلے میں اختلاف ہوا۔ ان میں سے بیشتر، یہ سوچ کر کہ اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے، وہاں سے اتر گئے اور دوسرے صحابہ کے ساتھ مال غنیمت لوٹنے لگے، لیکن ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ وہیں جمے رہے۔ انہوں نے کہا کہ "اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں یہیں رہنے کا حکم دیا تھا۔ میں اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔" خالد بن ولید نے دیکھا کہ پہاڑ کا وہ درّہ خالی ہے اور وہاں بس چند لوگ رہ گئے ہیں تو وہ اپنے شہ سوار دستہ کے ساتھ پلٹ آئے۔ انہیں پیچھے سے عکرمہ بھی آگئے۔ ان لوگوں نے باقی رہ جانے والے تیر اندازوں پر حملہ کر دیا۔ اور ان کے سردار کو شہید کر دیا اور مسلمانوں پر ان کے عقب سے حملہ کر دیا۔ ۲۳

اس اچانک صورت حال پر مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ان کے دلوں پر رعب طاری ہوگیا۔ وہ بغیر پہچانے اندھا دھند ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ مشرکوں نے مسلمانوں کو زبردست جانی نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچ گئے۔ آپ کو بھی کئی پتھر

۲۲ ابن ہشام ۱/ ۲۳۳، امام مسلم نے بھی حماد بن سلمہ کی سند سے اسی کے مثل روایت کی ہے لیکن اس میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نہیں ہے۔ (دیکھئے صحیح مسلم ۷/ ۱۵)

۲۳ طبقات ابن سعد ۳/ ۸۳، امام بخاری نے یہ روایت حضرت براءؓ سے کتاب الجہاد میں نقل کی ہے ۵/ ۲۸

لگے جس سے آپ کے ایک پہلو میں چوٹیں آئیں۔ آپ کا دانت (رباعیہ = کچلی کے برابر کا دانت) ٹوٹ گیا اور چہرۂ مبارک زخمی ہوگیا۔ آپؐ چہرے سے خون پونچھتے جاتے تھے اور فرماتے تھے: "وہ قوم کیونکر فلاح پا سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرہ کو خون آلود کیا، حالانکہ وہ انہیں ان کے رب کی طرف دعوت دیتا ہے" حضرت فاطمہؓ نے آ کر دیکھا کہ چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علیؓ سپر سے پانی ڈالتے تھے اور حضرت فاطمہؓ دھوتی تھیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ خون تھم نہیں رہا ہے تو چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا اور اسے جلا کر اس کی راکھ زخم پر رکھ دی جس سے خون بہنا فوراً بند ہوگیا۔ ۲۴

اسی اثناء میں لوگوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے ہیں۔ اس افواہ سے بعض مسلمانوں کے دلوں پر شدید دہشت اور بدحواسی چھا گئی، اور کمزور ایمان کے لوگ کہنے لگے: "اب لڑ کر کیا کریں جب رسول اللہ ﷺ شہید کر دیے گئے" اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے۔ مسلمانوں کی یہ بدحواسی دیکھ کر حضرت انس بن النضرؓ نے انہیں پکارا: "رسول اللہ کے بعد اب تمہارے زندہ رہنے سے کیا فائدہ؟" پھر بعض منافقین اور کمزور ایمان والے مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: "اے اللہ! جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس سے میں براءت ظاہر کرتا ہوں اور تجھ سے معذرت کا خواہاں ہوں۔" پھر اپنی تلوار کے ساتھ مشرکین پر ٹوٹ پڑے اور لڑتے رہے، یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔" ۲۵

اس نازک موقع پر رسول اللہ ﷺ کے گرد جو صحابہ تھے ان کی جانب سے قربانی اور جاں نثاری کے بڑے دل آویز مناظر دیکھنے میں آئے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر اپنی جانیں نچھاور کر دیں اور ان میں سے بیشتر لوگ شہید ہوگئے۔

امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ احد میں جب مسلمان شکست کھا کر نبی ﷺ کے پاس سے منتشر ہوگئے تو اس وقت حضرت ابوطلحہؓ آپ کی خدمت میں موجود تھے۔ انہوں نے چمڑے کے ایک سپر سے آپؐ پر اوٹ کر رکھی تھی۔ حضرت ابوطلحہؓ ماہر تیر انداز تھے۔ نبی ﷺ کبھی گردن اٹھا کر دشمن فوج کی طرف دیکھتے تو وہ عرض کرتے: "میرے ماں باپ آپؐ پر قربان،

۲۴ امام بخاری اور امام مسلم نے یہ روایت ملتے جلتے الفاظ میں نقل کی ہے۔

۲۵ بخاری و مسلم

آپ گردن نہ اٹھائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی تیر ادھر سے آکر آپ کو لگ جائے، اس کے لیے میرا سینہ حاضر ہے۔" ۲۶

حضرت ابودجانہؓ رسول اللہ ﷺ پر جھک کر سپر بن گئے۔ اب جو تیر ادھر آتے تھے وہ ان کی پیٹھ میں لگتے تھے، وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ حضرت زیاد بن سکنؓ نے بھی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے خود کو سپر بنالیا تھا۔ وہ اور ان کے ساتھ پانچ دیگر (انصاری) صحابہ ایک ایک کرکے شہید ہوگئے۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق ان میں سے آخر میں حضرت عمارہ بن یزید بن سکنؓ نے جان جان آفریں کے حوالے کی۔ جب وہ زخموں سے چور ہوگئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسے میرے قریب لاؤ" لوگ اٹھا کر لائے۔ انہوں نے آپؐ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اسی حالت میں روح پرواز کر گئی۔

پھر دونوں طرف کے لوگوں نے جنگ روک دی اور مشرکین واپسی کے ارادے سے ایک طرف سمٹ گئے۔ وہ فتح کے نشے سے چور تھے۔ دوسری طرف مسلمان اپنے مقتولین کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ ان میں حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ، حضرت یمانؓ، حضرت انس بن النضرؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ اور دیگر بہت سے صحابہ تھے۔ نبی ﷺ اپنے چچا کی شہادت سے بہت دل گرفتہ ہوئے۔ ان کا مثلہ کردیا گیا تھا، پیٹ چیر دیا گیا تھا اور ناک کان کاٹ لیے گئے تھے۔ نبی ﷺ دو دو مقتولین کو ایک کپڑے میں لپیٹتے پھر دریافت فرماتے: "ان میں سے کس کو قرآن زیادہ یاد تھا؟" ان میں سے جس کی نشان دہی کی جاتی اسے قبر میں اتارنے میں مقدم رکھتے۔ آپؐ نے فرمایا: "میں قیامت کے دن ان سب کا گواہ رہوں گا۔" پھر آپ نے ان سب کو جوں کا توں دفن کرنے کا حکم دیا۔ نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور نہ انہیں غسل دیا گیا۔" ۲۷

یہود اور منافقین مسلمانوں کی مصیبت پر خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی مسلمانوں سے کہنے لگے: "اگر تم لوگ ہماری بات مانتے تو تم میں سے ایک شخص بھی قتل نہ ہوتا۔ وہ ان سے سوال کرنے لگے کہ تمہیں یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فتح حاصل ہوکر رہے گی پھر اس جنگ میں شکست کا منہ کیوں دیکھنا پڑا؟! اس پر سورۂ آل عمران کی چند آیات نازل ہوئیں جن میں یہود اور منافقین کی شرانگیز باتوں پر تبصرہ کیا گیا تھا اور جو

۲۶ بخاری ۵/۳۳ ۲۷ بخاری ۵/۴۹

غزوۂ احد میں پیش آیا اس کی حکمت بیان کی گئی تھی۔ ان میں سے چند آیات کا ترجمہ درج ذیل ہے:

(اے پیغمبر! مسلمانوں کے سامنے اس موقع کا ذکر کرو) جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور (احد کے میدان میں) مسلمانوں کو جنگ کے لیے جابجا مامور کر رہے تھے۔ اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور وہ نہایت باخبر ہے۔

یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہوگئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا، حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہٰذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

اے نبی! یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے: "کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟--- بے شک اگر تم صبر کرو، خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لیے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔ (اور یہ مدد وہ تمہیں اس لیے دے گا) تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔

(اے پیغمبر) فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔ اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے۔ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ (۱۲۱-۱۲۹)

دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لیے لایا گیا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی

(راستی کے) گواہ ہوں۔ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور وہ اس آزمائش کے ذریعے سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے، حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کے خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے! مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اسے آنکھوں دیکھ لیا۔

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ (۱۳۹-۱۴۴)

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا، کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا۔ اور وہ رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیے تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لیے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب

ہیں کہ "اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے" ان سے کہو "(کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں" دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ "اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے" ان سے کہہ دو کہ "اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے" اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔ اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔ ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگراں ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہرحال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔ (۱۵۲-۱۵۸)

اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے: یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی! ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لیے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا: "آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا

کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو" تو کہنے لگے: "اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے" یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے گئے اور مارے گئے ان کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ "اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔" ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے اسے ٹال کر دکھادینا (۱۶۵-۱۶۸)

رسول اللہ ﷺ احد سے شنبہ کی شام واپس ہوئے۔ وہ رات آپؐ نے صحابہ کے ساتھ مدینہ میں گزاری۔ مسلمانوں نے اپنے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ اگلے دن صبح کی نماز کے بعد ہی رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا کہ "رسول اللہ ﷺ دشمن کا پیچھا کرنے کا حکم دے رہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ ہمارے ساتھ صرف وہی نکلے جو کل جنگ میں شریک رہا ہے" رسول اللہ ﷺ نے جھنڈا منگوایا (وہ اسی حالت میں بندھا ہوا تھا، ابھی اسے کھولا نہ گیا تھا) اور اسے حضرت علی بن ابی طالبؓ کو تھمادیا۔ مسلمان اس حالت میں نکلے کہ کوئی زخمی تھا، کوئی کمزور اور کوئی زخم خوردہ، انہوں نے مدینہ سے دس میل کے فاصلے پر حمراء الاسد نامی ایک جگہ پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں انہوں نے خوب آگ جلائی جو بہت دور سے دکھائی دیتی تھی۔ اس سے ان کی بہت بڑی تعداد کا وہم ہوتا تھا۔

مسلمانوں کی فوج کے پاس سے معبد خزاعی کا گزر ہوا (اس وقت وہ مشرک تھے) پھر وہاں سے آگے بڑھ کر وہ مشرکوں کے پاس سے گزرے۔ اس وقت وہ لوگ جنگ احد میں حاصل ہونے والی فتح کے جشن میں خوشی و مسرت کے شادیانے بجارہے تھے اور رنگ و مستی میں تھے۔ بعض لوگ یہ رائے پیش کررہے تھے کہ مدینہ واپس جاکر مسلمانوں کا بالکل خاتمہ کردیا جائے۔ اور صفوان بن امیہ انہیں ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ ابوسفیان نے معبد کو دیکھا تو دریافت کیا: "اے معبد! کیا خبر لائے ہو؟" اس نے جواب دیا: "تمہارا برا ہو۔ محمد اپنے اصحاب کے ساتھ تمہارا پیچھا کرنے کے مقصد سے نکلے ہیں۔ ان کے ساتھ اتنی بڑی فوج ہے جتنی بڑی میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھی۔ تمہارے خلاف ان کا خون کھول رہا ہے۔ تم پر انہیں اتنا طیش اور غصہ ہے

جتنا میں نے کبھی کسی میں نہیں دیکھا۔" اس طرح اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے دلوں میں مسلمانوں کا زبردست رعب ڈال دیا اور وہ جلدی جلدی سامان سمیٹ کر مکہ روانہ ہوگئے۔ نبی ﷺ نے حمراء الاسد میں تین دن (دوشنبہ، سہ شنبہ اور چہار شنبہ) قیام فرمایا پھر مدینہ لوٹ آئے۔ ۲۸

دروس و نصائح

غزوۂ احد چند ایسے دروس پر مشتمل ہے جو ہر زمانے میں مسلمانوں کے لیے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس صورت میں یہ غزوہ پیش آیا اس میں حکمت یہ تھی کہ اس سے ایک عملی اور تطبیقی درس حاصل ہو اور مسلمان جان لیں کہ دشمن کے ساتھ اپنے معرکوں میں کس طرح فتح و نصرت سے بہرہ مند ہوا جاسکتا ہے؟ اور کس طرح شکست و ہزیمت کے مواقع سے بچا جاسکتا ہے؟ سطور ذیل میں ہم ان عظیم دروس کا تذکرہ اور ان میں پوشیدہ عبرت و نصیحت کے پہلوؤں میں غور کرتے ہیں:

۱۔ مشورہ کی اہمیت اور اس کے حدود:

یہاں بھی وہ اصول نمایاں ہوتا ہے جس کا رسول اللہ ﷺ نے خود کو پابند کر رکھا تھا۔ اور وہ ہے ہر قابلِ مشورہ اور لائقِ تحقیق معاملے میں اپنے اصحاب کے ساتھ مشورے کا التزام۔ لیکن اس موقع پر مشورہ اور غزوۂ بدر سے ذرا قبل ہونے والے مشورے کے درمیان ایک فرق ہے اور وہ یہ کہ جن صحابہ نے مدینہ سے باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کرنے کی تجویز رکھی تھی۔ آں حضرت ﷺ نے زرہ پہننے اور جنگ کے لیے تیار ہوجانے کے بعد ان کی تجویز کی تائید و موافقت سے رجوع نہیں فرمایا، باوجودیکہ وہ بعد میں اپنی اس رائے پر شرمندہ ہوئے، اس سے رجوع کرلیا اور آمادگی ظاہر کی کہ اگر آں حضرت ﷺ کی رائے مدینہ میں ٹھہر کر مقابلہ کرنے کی ہے تو وہ بھی تیار ہیں۔

شاید اس میں عظیم حکمت یہ تھی کہ نبی ﷺ کے جنگ کے لیے تیار ہوجانے اور اپنی قوم اور اپنے اصحاب کے درمیان زرہ پہن کر اور ہتھیار زیب تن کرکے آجانے کے بعد اس معاملہ

۲۸ ملاحظہ کیجئے طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام اور تاریخ طبری

میں بحث ان حدود سے خارج ایک شی، تھی جن کا مشاورت باہمی کا اصول تقاضا کرتا ہے، خاص طور سے جنگی معاملات میں جن میں مشورے کے ساتھ پختہ ارادہ، مستقل مزاجی اور عزیمت کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ مدینے سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے لیے تیار ہو کر آنے کے بعد پھر آں حضرت ﷺ کا اس سے پیچھے ہٹ جانے کا یہ مطلب نکالا جاسکتا تھا کہ آپ کے ارادہ میں کمزوری اور اضطراب ہے اور یہ چیز اکثر خوف اور بے جا احتیاط کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، جن کا رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے ان کی بات کا جواب ایسے جملے سے دیا جو پختہ عزم اور ارادہ سے بھرپور تھا۔ آپ نے لوگوں کے شور و شغب اور ایک دوسرے کی ملامت کی طرف توجہ دیے بغیر فرمایا: "نبی کو زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر جنگ سے پہلے انہیں اتار دے"

۲۔ اس غزوہ میں منافقین کے رویہ کا اظہار اور اس کا سبب :

اس غزوہ میں منافقین کا ایک نمایاں کردار تھا... اور کیوں نہ ہوتا؟ یہ غزوہ متعدد حکمتوں اور مصالح پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک اہم مقصد یہ تھا کہ اہل ایمان کو منافقین سے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے۔ اس کے پس پردہ بہت سے فوائد تھے جو بعد میں مسلمانوں کو حاصل ہوئے۔

ہم نے دیکھا کہ جب رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلے تو کس طرح عبداللہ بن ابی نے اپنے تین سو حمایتیوں کے ہمراہ ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ بظاہر اس نے یہ بتائی کہ نبی ﷺ نے ناتجربہ کار نوجوانوں کی رائے تو قبول کر لی لیکن اس جیسے بزرگوں اور عقل مندوں کی رائے کی طرف التفات نہیں کیا۔ لیکن حقیقت میں اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جنگ میں شریک ہونا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو جنگ کے خطرات اور اس کے برے انجام سے دوچار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ منافقین کی یہی سب سے نمایاں صفت ہوتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی بدولت جتنے فائدے ممکن ہوں، حاصل کر لیں۔ لیکن اس کی وجہ سے انہیں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے اور کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ اسلام پر انہیں قائم رکھنے میں دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز محرک بنتی ہے۔ یا تو وہ اس کے ذریعے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں یا مصیبتوں اور آزمائشوں سے بچنا چاہتے ہیں۔

۳۔ جنگ میں غیر مسلموں سے مدد لینے کا حکم :

اس غزوہ میں باوجود یہ کہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی لیکن نبی ﷺ غیر مسلموں سے مدد لینے پر رضامند نہیں ہوئے۔ ابن سعد نے طبقات میں یہ روایت نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "ہم اہل شرک کے خلاف اہل شرک سے مدد نہیں لیں گے" ۲۹ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ ایک شخص غزوہ بدر کے موقع پر آں حضرت ﷺ کے ساتھ جنگ کرنے کے ارادے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے اس سے دریافت کیا: "کیا تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: تو واپس ہو جاؤ، میں ہرگز کسی مشرک سے مدد نہیں لے سکتا۔"

اس بنا پر جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ جنگ میں کفار سے مدد لینی جائز نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "اگر کسی کافر کے بارے میں امام کا یہ خیال ہو کہ وہ صائب الرائے اور مسلمانوں کے معاملے میں امانت دار ہے، اور اس سے جنگ میں مدد لینے کی واقعی ضرورت ہو تو اس کی مدد لینی جائز ہے ورنہ نہیں۔" ۳۰

شاید یہی بات قواعد اور دلائل سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ آں حضرت ﷺ کے بارے میں مروی ہے کہ آپؐ نے غزوۂ حنین کے موقع پر صفوان بن امیہ کی مدد قبول کی تھی۔ یہ مسئلہ حکمت عملی کے دائرہ میں آتا ہے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کے عمل اور غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں آپ کے عمل دونوں میں فرق کو ہم ان شاء اللہ کسی مناسب موقع پر واضح کریں گے۔

۴۔ اللہ کی راہ میں جہاد اور شوق شہادت کا راز :

غزوۂ احد کے موقع پر سمرہ بن جندبؓ اور رافع بن خدیجؓ کا واقعہ قابلِ غور ہے۔ یہ دونوں بچے تھے اور ان کی عمر پندرہ سال سے متجاوز نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ

۲۹ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں نے جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہونے کی پیش کش کی تھی وہ یہود تھے، پھر کیسے رسول اللہ ﷺ نے انہیں اہل شرک قرار دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان پر شرک کا اطلاق اس اصطلاحی معنی میں نہیں ہے جس میں وہ بت پرستوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ شرک کا ایک عمومی معنی ہے جو قدر مشترک سمجھا جاتا ہے اور وہ تمام کافروں پر صادق آتا ہے۔

۳۰ ملاحظہ کیجیے مغنی المحتاج ۴/۲۲۱

کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو قسمیں دے دے کر جنگ میں شریک ہونے کے لیے آپ سے اجازت چاہی۔ کیسی جنگ؟ ایسی جنگ جس میں موت کو گلے لگانا پڑسکتا ہے، جس میں دونوں فریقوں کے درمیان کوئی برابری نہیں تھی۔ ایک طرف مسلمان تھے جن کی تعداد سات سو سے زیادہ نہ تھی اور دوسری طرف مشرکین تھے جن کی تعداد تین ہزار سے متجاوز تھی اور وہ سامانِ جنگ سے بھی لیس تھے۔

واقعی کتنی عجیب بات ہے کہ فکری محاذ پر حملہ کرنے والے بعض لوگ اس قسم کے مظہر پر آتے ہیں تو اس کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب ایک ایسی قوم تھے جو ہمیشہ جنگوں کے سایہ میں پروان چڑھے تھے۔ اور انہی کے ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی اس لیے خواہ وہ بوڑھے ہوں یا جوان یا بچے، جنگ کو ایک عام اور معمولی چیز کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اس سے کچھ زیادہ خوف نہیں محسوس کرتے تھے۔

یقیناً یہ تجزیہ کرنے والے یہ بات کہتے ہوئے عجیب وغریب اصرار کے ساتھ اس حقیقت سے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ اسی موقعے پر عبداللہ بن ابی جیسے لوگ نتائجِ جنگ کے خوف کے دباؤ اور جان کی حفاظت کی خواہش میں اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور اسی موقعے پر کچھ دوسرے لوگ موسم گرما کی تپش میں مدینہ کے سایے، پھل اور پانی کو ترجیح دیتے ہیں اور جنگ میں نکلنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اعلان سے اعراض کرتے ہوئے کہتے ہیں: "گرمی میں نہ نکلو"۔ یہی نہیں بلکہ یہ لوگ اس حقیقت سے بھی اپنی نگاہیں چرا لیتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہونے اور مشرکین کے ان سے کئی گنا زیادہ ہونے کے باوجود مشرکین کو غزوۂ بدر میں ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا اور ان کے دلوں میں رعب بیٹھ گیا، حالانکہ یہ وہی عرب تھے جو جنگوں کے سائے میں پروان چڑھے تھے، جنگ جن کی گھٹی میں پڑی تھی اور جو اس راہ میں پیش آنے والی تمام تکلیفیں ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے۔

کسی بھی انصاف پسند کے لیے اس نتیجے سے راہِ فرار اختیار کرنا بہت مشکل ہے جو اس واقعے سے بدیہی طور پر نکلتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس عمر کے بچوں کی جانب سے موت کے منہ میں جانے کے اقدام کا راز وہ عظیم ایمان ہے جو دل میں راسخ ہو گیا تھا اور جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ سے شدید محبت پیدا ہو گئی تھی۔ جہاں بھی ایمان ہوگا اور جہاں بھی یہ محبت ہوگی وہاں

ایسے ہی اقدام اور ایسی ہی بہادری کا مظاہرہ ہوگا۔ اور جہاں ایمان کمزور اور دل میں محبت کا جذبہ سرد ہوگا وہاں اقدام پسپائی سے اور بہادری سستی اور نامردی سے بدل جائے گی۔

۵۔ رسول اللہ ﷺ کی عسکری مہارت اور نبوی فراست :

رسول اللہ ﷺ صحابہ کی صفوں کو ترتیب دیتے ہیں، ان کے فوجی دستوں کو منظم کرتے ہیں، مسلمانوں کی پشت کو محفوظ کرنے کے لیے ضروری اقدام کرتے ہیں، تیر اندازوں کو حکم دیتے ہیں کہ ان کے جنگجو ساتھیوں کا چاہے جو حال ہو لیکن وہ آپؐ سے ہدایات پائے بغیر اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ ان باتوں میں غور کریں تو ایک نمایاں حقیقت عیاں ہوتی ہے اور ایک دوسرا اہم مظہر سامنے آتا ہے۔

نمایاں حقیقت تو یہ ہے کہ جنگوں میں آں حضرت ﷺ کی قیادت عسکری مہارت سے متصف تھی۔ آپؐ فنونِ جنگ کے ماہرین اور اس کی بہترین منصوبہ بندی کرنے والوں میں سر فہرست تھے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں آپ کو نادرِ روزگار عبقریت سے نوازا تھا۔ لیکن اس موقعے پر ہم کہیں گے کہ یہ عبقریت اور مہارت آپ کی نبوت اور آسمانی رسالت کی بنا پر تھی۔ نبوت اور رسالت سے مشرف ہونے کا ہی تقاضا ہوا کہ آپؐ فنونِ جنگ اور دیگر میدانوں میں عبقری اور ماہر ہوں۔ جس طرح کہ اس کا یہ تقاضا ہوا کہ آپ معصوم اور ہر طرح کے انحراف اور لغزش سے محفوظ رہیں۔ اس موضوع پر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں تفصیل سے اظہار خیال کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اسے دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

رہا مظہر جو صحابہ کے لیے عام طور پر اور تیر اندازوں کے لیے خاص طور پر آں حضرت ﷺ کی دقیق ہدایات میں غور کرنے والے کے سامنے آتا ہے، تو اس کا اس واقعے سے گہرا تعلق ہے جو بعد میں پیش آیا، یعنی بعض تیر اندازوں نے آں حضرت ﷺ کی ان ہدایات پر عمل نہیں کیا۔ گویا نبی ﷺ نے فراست نبوی یا وحی الٰہی کے ذریعے اس چیز کو محسوس کر لیا تھا کہ بعد میں کیا پیش آنے والا ہے، اسی لیے تاکید کے ساتھ انہیں احکام اور ہدایات دی تھیں۔ گویا آپؐ اپنے اصحاب کو ان کے دشمن۔ نفس اور اس کی خواہشات اور دولت اور مالِ غنیمت کی حرص۔ کے ساتھ کشتی لڑا رہے تھے۔ اور کشتی کا نتیجہ خواہ جو بھی ہو لیکن اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے اور

بسا اوقات سلبی نتیجے سے ایجابی نتیجے کے مقابلے میں زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۶۔ حالتِ جنگ کے علاوہ اترا کر اور اکڑ کر چلنا مکروہ ہے۔:

حضرت ابودجانہؓ جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے تلوار، اس کا حق ادا کرنے کے وعدے کے ساتھ لی، اسے لے کر صفوں کے درمیان اکڑتے ہوئے چلے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ان کی نکیر نہیں کی، بلکہ فرمایا: "یہ چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، مگر اس جیسے موقع پر پسند ہے۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ تکبر کے وہ تمام مظاہر جو عام حالات میں حرام ہیں، ان کی حرمت حالتِ جنگ میں زائل ہو جاتی ہے۔ مثلاً تکبر کا ایک حرام مظہر یہ ہے کہ مسلمان زمین پر اترا کر اور اکڑ کر چلے، لیکن یہ چیز میدانِ جنگ میں پسندیدہ ہے۔ اسی طرح تکبر کا ایک حرام مظہر یہ بھی ہے کہ گھروں کو سونے چاندی سے آراستہ کیا جائے یا سونے چاندی کے برتن اور پیالے استعمال کیے جائیں، لیکن جنگ کے آلات اور اسلحوں کو چاندی سے مزین کرنا ممنوع نہیں ہے۔ اس موقعے پر جو چیز تکبر کا مظہر ہے وہ در حقیقت دشمنوں کے مقابلے میں اسلام کی عظمت و شوکت پر فخر ہے۔ پھر یہ نفسیاتی جنگ کا ایک حربہ بھی ہے جس کی اہمیت مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔

۷۔ رسول کی اطاعت اور نافرمانی کے نتائج:

اس غزوہ میں جتنی دیر مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان جنگ جاری رہی اس میں غور کریں تو اس مدت کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

پہلا حصہ: اس میں مسلمان انہی جگہوں پر جمے رہے جہاں انہیں تعینات کیا گیا تھا۔ اور انہی ہدایات کی پابندی کرتے رہے جو انہیں اپنے سپہ سالار آں حضرت ﷺ کی جانب سے ملی تھیں۔ اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ فتح و کامرانی نے مسلمانوں کے قدم چومے اور مشرکوں کے حصے میں شکست و ہزیمت لکھ دی گئی۔ تین ہزار جنگجوؤں کے دلوں پر رعب طاری ہو گیا، ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے۔ اس حصہ پر قرآن کی درج ذیل آیت کریمہ کے ذریعے تبصرہ کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ. (آل عمران۔ ۱۵۲)

اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔

دوسرا حصہ: اس میں مسلمان مشرکین کا پیچھا کرنے لگے تاکہ ان کے پاس جو کچھ ملے اس پر قبضہ کر لیں اور مالِ غنیمت حاصل کر لیں۔ اس وقت پہاڑ پر جو تیر انداز تعینات تھے انہوں نے اپنے بھائیوں کو دیکھا کہ وہ بھاگنے والے دشمنوں کا پیچھا کر رہے ہیں اور مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر ان میں سے بعض لوگوں کی دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ان کے ساتھ وہ بھی مالِ غنیمت میں شریک ہوں۔ اس خواہش نے ان کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے انہیں جو ہدایات ملی تھیں ان پر عمل کا وقت ختم ہو گیا۔ اب وہ ان کی پابندی سے آزاد ہیں اور انہیں اپنی جگہیں چھوڑنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی اجازت کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ان کے اس اجتہاد کی، ان کے بعض ساتھیوں نے جن میں سر فہرست ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیرؓ تھے، مخالفت کی۔ لیکن یہ لوگ نہ مانے اور پہاڑ سے اتر کر مالِ غنیمت لوٹنے میں اپنے بھائیوں کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کا کیا نتیجہ ہوا؟

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین کے دلوں میں جو رعب بیٹھ گیا تھا اس کی جگہ از سر نو شجاعت نے لے لی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد بن ولید جو پیٹھ پھیر کر بھاگ رہا تھا، اس کے سامنے حیلہ و مکر کے راستے کھل گئے۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا تو مورچہ بند پہاڑ کو جنگ بازوں اور محافظوں سے خالی پایا۔ فوراً اس کے دماغ میں ایک عسکری تدبیر بجلی کی طرح کوند گئی۔ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوم کر پہاڑ تک پہنچا۔ اس طرح مشرکین کے اس دستے نے وہاں موجود محافظوں کو قتل کر دیا اور مسلمانوں پر پیچھے سے تیر اندازی کر کے انہیں زبردست نقصان پہنچایا۔ اس مرتبہ رعب مسلمانوں کے دلوں پر طاری ہو گیا۔ معرکے کے اس حصے پر قرآن کی درج ذیل آیت کریمہ میں تبصرہ کیا گیا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ، مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ. ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ. (آل عمران۔ ۱۵۲)

مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔

دیکھیے، اس غلطی کا وبال کتنا بھیانک اور اس کا نتیجہ کتنا عام تھا۔

مسلمانوں کی فوج میں چند افراد کی غلطی کا خمیازہ تمام مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ یہاں تک کہ اس کے نتائج سے اللہ کے رسول ﷺ بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ یہی اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ اس سنت کو روبہ عمل آنے سے یہ چیز بھی نہیں روک سکی کہ رسول اللہ ﷺ اس فوج میں موجود تھے اور آپ تمام مخلوق میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب تھے۔

غور کیجیے کہ ان افراد کی غلطی کا ان نوع بنوع غلطیوں سے کیا تناسب ہے جن کا آج مسلمان ارتکاب کر رہے ہیں اور جو ہماری عمومی اور مخصوص زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں غور کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ کا کتنا لطف و کرم ہے کہ وہ ان کی بداعمالیوں، نافرمانیوں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائگی سے پہلوتہی اور شیرازہ بندی سے اجتناب پر انہیں ہلاک نہیں کر رہا ہے۔

جب آپ اس پر غور کریں گے تو آپ کو اس سوال کا جواب مل جائے گا جو آج بعض لوگ کرتے ہیں کہ اسلامی اقوام دیگر سرکش و نافرمان حکومتوں کے مقابلے میں کیوں مغلوب و محکوم ہیں جب کہ یہ کافر ہیں اور وہ مسلمان؟

۸۔ آں حضرت ﷺ کی خبرِ وفات عام ہو جانے میں حکمتِ الٰہی

ہم نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے اس مدت میں بہت اذیتیں اٹھائیں۔ آپ کے پہلو میں چوٹ آئی، سر زخمی ہو گیا، دانت ٹوٹ گیا اور چہرے پر بہت سا خون بہہ گیا۔ یہ سب اس غلطی کے نتائج کا ایک جزء تھا جس کا ارتکاب بعض مسلمانوں نے اپنے سالارِ لشکر کی حکم عدولی کر کے کیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کی صفوں میں رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر عام ہو جانے میں

حکمت تھی؟!

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے مسلمانوں کا تعلق اتنا گہرا تھا اور ان کے درمیان آپؐ کی موجودگی سے انہیں اتنی تقویت حاصل تھی کہ وہ آپ کی جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپؐ کے بغیر وہ اپنا شیرازہ یکجا رکھنے پر قادر ہو سکیں گے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی وفات کی بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ گویا انہوں نے اس چیز کو اپنے ذہنوں سے بالکل نکال رکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اگر آں حضرت ﷺ کی واقعی وفات کی خبر پر وہ اپنی اس غفلت سے بیدار ہوتے تو ان کا کلیجہ پھٹ جاتا اور ان کے ایمان کی بنیاد ہل جاتی، بلکہ بہت سے لوگوں کے دلوں سے ایمان کا ہی خاتمہ ہو جاتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ کی روشن حکمت یہ تھی کہ یہ افواہ عام ہو اور اس کا شمار عظیم عسکری دروس میں سے ایک درسی تجربہ میں ہو، تاکہ اس کے ذریعے مسلمان اس حقیقت کا صحیح ادراک کر لیں جسے ابھی سے ان کے دل میں جاگزیں ہونا چاہیے، اور جب وہ دیکھیں کہ رسول اللہ ﷺ ان کے درمیان موجود نہیں رہے تو الٹے پیروں نہ پھر جائیں۔

اس عظیم درس کو بیان کرنے کے لیے درج ذیل آیت نازل ہوئی جس میں بہت سے مسلمانوں کی اس کیفیت پر تبصرہ کیا گیا تھا کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شہادت کی خبر سنی تو کمزوری کا مظاہرہ کیا اور ہمت ہار بیٹھے:

> وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا، وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ. (آل عمران۔ ۱۴۴)
>
> محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔ البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔

اس درس کا مثبت اثر اس دن ظاہر ہوا جب رسول اللہ ﷺ واقعی رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

اس دن احد کی افواہ اور اس کے سبب سے نازل ہونے والی اس آیتِ قرآنی نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور انہیں حقیقت کا احساس دلایا۔ چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو غمگین دلوں کے ساتھ رخصت کیا۔ پھر اس امانت کا بار اٹھانے کی طرف متوجہ ہو گئے جسے آپؐ نے ان کے درمیان چھوڑا تھا یعنی دعوت اور جہاد فی سبیل اللہ کی امانت۔ انہوں نے اس امانت کا بار اس طرح اٹھایا کہ ان کا ایمان پختہ اور عقیدہ مستحکم تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔

۹۔ رسول اللہ ﷺ پر جاں نثاری کا سرچشمہ:

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ اصحابِ رسول ﷺ اس وقت موت کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے جب وہ آں حضرت ﷺ کے گرد اکٹھا ہو کر اپنے جسموں سے آپ کو مشرکین کے تیروں اور تلواروں سے بچا رہے تھے۔ تیروں کی زبردست بارش میں وہ یکے بعد دیگرے ڈھیر ہو رہے تھے لیکن رسول اللہ ﷺ کی جان بچانے کے شدید حریص تھے۔ اس کے علاوہ انہیں کسی چیز کی پروانہ تھی! اس عجیب و غریب قربانی کا سرچشمہ کیا تھا؟

اس کا سرچشمہ اولاً اللہ اور اس کے رسول پر ایمان، ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی محبت تھی۔ یہ دونوں چیزیں اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز قربانی کا سبب تھیں۔ مسلمان بیک وقت ان دونوں چیزوں کا ضرورت مند ہے۔ جن چیزوں پر ایمان عقیدہ کا جزء ہے ان پر ایمان کا کوئی مسلمان اس وقت تک دعویٰ نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کا دل اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے بھی لبریز نہ ہو۔ اسی لیے آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" [۳۱]

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ عزوجل نے انسان کو عقل اور دل دونوں ودیعت فرمائے ہیں۔ عقل اس لیے دی ہے تاکہ اس کے ذریعے وہ غور و فکر کرے اور جن چیزوں پر ایمان ضروری ہے، ان پر ایمان لائے۔ اور دل اس لیے عطا فرمایا ہے تاکہ جن سے اللہ نے

[۳۱] بخاری و مسلم

کرنے کا حکم دیا ہے ان سے محبت کرے اور جن سے نفرت کرنے کا حکم دیا ہے ان سے نفرت کرے۔ اگر دل میں اللہ، اس کے رسول اور نیک بندوں کی محبت نہ ہوگی تو ضرور اس میں خواہشاتِ نفس اور محرمات کی محبت گھر کر جائے گی۔ اور اگر دل میں خواہشاتِ نفس کی محبت پیدا ہو گئی تو صرف عقیدہ انسان کو قربانی و جاں نثاری کے کسی کام پر ہرگز آمادہ نہیں کر سکتا۔

اس حقیقت کا شمار ان اولیات میں ہوتا ہے جن کا ماہرین تربیت و اخلاق نے اثبات کیا ہے اور بدیہی تجربات ان پر شاہد ہیں۔ مثلاً جان جاک روسو نے لکھا ہے:

"یہ بات بارہا دہرائی گئی ہے کہ اچھا کام کرنے کی خواہش محض عقل کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ کاش اس بات کی کوئی مضبوط بنیاد ہوتی! یہ کون سی بنیاد ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اچھا کام نظام کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ لیکن کیا نظام پر ایمان میری مخصوص مسرت پر غلبہ پا سکتا ہے؟ یہ نام نہاد اصول محض الفاظ کے ساتھ کھلواڑ ہے۔ اس لیے کہ برے فعل کا ارتکاب بھی نظام سے محبت کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اس کی شکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔" [۳۲]

اسی حقیقت کی بنا پر امریکی حکومت اس چیز کو نافذ نہیں کر سکی جس پر اس کا ایمان تھا اور جس کو وہ فائدہ مند سمجھ رہی تھی۔ ۱۹۳۳ء میں اس نے شراب پر پابندی کا اعلان کیا اور مجلسوں اور کلبوں میں اس کا استعمال ممنوع قرار دیا۔ لیکن ابھی تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا کہ قانون ساز الٹے پیر پھر گئے۔ وہ اس سے محرومی برداشت نہیں کر سکے، چنانچہ انہوں نے اس قانون کو منسوخ کر دیا اور دوبارہ شراب کے جام لنڈھانے لگے۔

جب کہ اصحابِ رسول۔ جو کہ تہذیب و تمدن کے اس مرتبے پر نہیں تھے جو آج امریکیوں کو حاصل ہے اور نہ انہیں شراب کے ان نقصانات اور فوائد کا علم تھا جو انہیں معلوم ہیں، لیکن انہوں نے جوں ہی سنا کہ اللہ عزوجل نے انہیں شراب سے بچنے کا حکم دیا ہے، انہوں نے شراب کے مٹکے بہا دیے، برتن توڑ دیے اور پکار اٹھے "ہم باز آئے، اے رب ہم باز آئے!"...

ان دونوں واقعات میں فرق یہ ہے کہ یہاں دل میں ایک چیز راسخ ہو گئی تھی، اس لیے

[۳۲] اس موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب "تجربة التربية الاسلامية في ميزان البحث"

اس کی تمام خواہشات اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے تابع ہو گئی تھیں۔

یہ محبت بلکہ یہ عشق جو اصحاب رسول ﷺ کے دلوں پر متمکن ہو گیا تھا، اس کی بنا پر انہوں نے اپنے سینے رسول اللہ کی مدافعت میں سپر بنا لیے تھے اور آپؐ کی جان بچانے کے لیے موت کو گلے لگا رہے تھے۔ غزوۂ احد میں ایسے کتنے دل آویز مناظر سامنے آئے جن کے ذریعے واضح ہوا کہ جب یہ محبت کسی دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے تو اس کے کیا اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے (غزوۂ احد کے بعد) اپنے اصحاب سے فرمایا: "کون یہ دیکھ کر آئے گا کہ سعد بن الربیعؓ کا کیا حال ہے؟ وہ زندوں میں ہے یا مردوں میں؟" ایک انصاری نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول میں دیکھ کر آتا ہوں" انہوں نے جا کر دیکھا تو انہیں مقتولین کے درمیان شدید زخمی حالت میں پایا، جاں کنی کا عالم تھا۔ انہوں نے حضرت سعدؓ کو مخاطب کر کے کہا: اللہ کے رسول ﷺ نے مجھے یہ دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ زندوں میں ہیں یا مردوں میں؟ حضرت سعدؓ نے فرمایا: میں تو اب مردوں میں ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں میرا اسلام پہنچانا اور ان سے کہنا کہ سعد بن الربیع نے آپ کی خدمت میں یہ عرض کیا ہے کہ "اللہ آپ کو ہماری طرف سے اچھا بدلہ دے۔ ویسا ہی جیسا وہ کسی نبی کو اس کی امت کی طرف دے سکتا ہے" اور میری قوم کو میرا اسلام پہنچانا اور ان سے کہنا کہ سعد بن الربیع نے تم لوگوں سے کہا ہے کہ اگر دشمن تمہارے نبی تک پہنچ گئے، اس حال میں کہ تم میں ایک بھی آنکھ پھڑکتی تھی تو اللہ کی بارگاہ میں تم کوئی عذر نہ پیش کر سکو گے" انصاری صحابی کا بیان ہے کہ یہ کہتے ہی ان کی روح پرواز کر گئی۔

آج کے زمانے میں جس دن بھی مسلمانوں کے دل اس قسم کی محبت سے معمور ہو جائیں اور یہ محبت انہیں ان کی خواہشات نفس اور انانیت سے کچھ دور کر دے اور ان پر غلبہ حاصل کر لے اسی دن وہ بالکل ایک نئی مخلوق بن جائیں گے فتح و کامرانی موت کے جبڑوں سے حاصل کر لیں گے اور اپنے دشمنوں پر غلبہ پا لیں گے، خواہ اس راہ میں کتنی ہی رکاوٹیں اور مزاحمتیں ہوں۔

اگر تم سوال کرو کہ یہ محبت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ تو جان لو کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ذکر، زیادہ سے زیادہ رسول ﷺ پر درود و سلام اور زیادہ سے زیادہ اللہ کے انعامات و احسانات اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت، اخلاق اور شمائل میں غور و فکر کیا جائے۔ اور یہ سب

خشیت اور حضور قلب کے ساتھ عبادات پر استقامت اور وقتاً فوقتاً اللہ عزوجل کی طرف انابت کے بعد کیا جائے۔

۱۰۔ شہید کو غسل دیا جاتا ہے نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے:

امام بخاریؒ کی روایت پیچھے گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے مسلمان مقتولین کو خون میں لت پت دفن کرنے کا حکم دیا اور ان کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی۔ آپؐ نے ایک ایک قبر میں دو دو آدمیوں کو دفن کیا۔ اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ معرکۂ جہاد میں شہید ہونے والے کو نہ غسل دیا جاتا ہے اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے، بلکہ اسی طرح خون میں لت پت دفن کر دیا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے: "متواتر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے دس دس کے گروپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ہر گروپ میں حضرت حمزہؓ شامل تھے۔ یہاں تک کہ ان کی نماز جنازہ ستر مرتبہ پڑھائی۔ ایسی روایات ضعیف اور موضوع ہیں"[۳۳] اسی طرح علماء نے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ بوقت ضرورت ایک قبر میں ایک سے زائد میتوں کو دفن کرنا جائز ہے، لیکن بلا ضرورت جائز نہیں۔

۱۱۔ مسلمانوں کی شکست فتح سے کیسے بدل گئی؟

جب ہم رسول اللہ ﷺ کے اس اقدام پر غور کرتے ہیں کہ آپ نے مدینہ واپسی کے فوراً بعد مشرکین کا پیچھا کرنے کے لیے صحابہ کو دوبارہ نکلنے کا حکم دیا تو ہمارے سامنے معرکۂ احد کا درس پوری طرح واضح ہو جاتا ہے اور اس کے سلبی اور ایجابی دونوں نتیجے عیاں ہو جاتے ہیں۔ اور یہ چیز بالکل مبرہن ہو کر اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ اس میں وہم کی بالکل گنجائش نہیں رہتی کہ فتح و کامرانی ہمیشہ صبر، صالح قائد کے احکام کی تعمیل اور خالص دینی مقصد کو پیش نظر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے جوں ہی لوگوں میں دشمن کا پیچھا کرنے کے لیے دوبارہ نکلنے

۳۳۔ ملاحظہ کیجیے مغنی المحتاج ۱/۳۴۹

کا اعلان کیا فوراً وہ لوگ جو گذشتہ دن آپ کے ساتھ تھے، اکٹھا ہو گئے، باوجودیکہ وہ مجروح اور زخموں سے چور تھے۔ ان میں سے کسی نے گھر پہنچ کر ابھی آرام بھی نہیں کیا تھا یا اپنے جسم کی پراگندگی کا ابھی جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا۔ لیکن نفیر ہوتے ہی وہ رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں ان مشرکین کا پیچھا کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے جن کے دماغوں میں فتح کا نشہ سمایا ہوا تھا اور اس کا شعلہ ابھی سرد نہیں ہوا تھا۔ اس مرتبہ ان کے ساتھ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس کے دل میں مالِ غنیمت کی طمع ہو یا کوئی دوسری دنیوی غرض موجود ہو، بلکہ سب لوگ خون آلود جراحتوں اور تکلیف دہ زخموں کے ساتھ فتح کے آرزومند یا اللہ کی راہ میں شہادت کے متمنی تھے۔

اس کا کیا نتیجہ ہوا؟

نہ فتح کا نشہ یا کامیابی و کامرانی کی لذت مشرکین کے حوصلے بلند کر سکی ہے تاکہ وہ اپنی کامیابی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور فریقِ مخالف پر غلبہ حاصل کر سکیں، اور نہ شکست کا اثر اور کاری زخموں کی تکلیفیں مسلمانوں کو اقدام کرنے اور فتح و کامرانی سے بہرہ ور ہونے سے روک سکیں۔

ایسا کیونکر ممکن ہو سکا؟ ایسا ایک خارقِ عادت الٰہی نشانی کے ذریعے ممکن ہو سکا جس کے ذریعے مسلمانوں کے لیے درس و موعظت کی تکمیل ہو گئی۔ اچانک مشرکین کے دلوں پر رعب طاری ہو گیا اور وہ ویسا ہی تصور کرنے لگے جیسا ان کے ایک ساتھی نے انہیں خبر دی تھی جس نے مسلمانوں کو کچھ فاصلے سے دیکھا تھا کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اس مرتبہ ان کے درمیان موت کے پروانے تقسیم کرنے کے ارادے سے آ رہے ہیں۔ ان مشرکوں کا رخ مدینہ کی طرف تھا مگر دل میں یہ خیال آتے ہی وہ الٹے پیر پھر گئے اور بغیر ادھر ادھر دیکھے تیزی سے مکہ کا قصد کیا۔

رہا یہ امر کہ ان کے دلوں پر مسلمانوں کے بارے میں یہ عجیب و غریب رعب کیونکر طاری ہو گیا جب کہ کچھ ہی عرصہ پہلے انہوں نے مسلمانوں کی شوکت توڑ دی تھی اور انہیں بری طرح قتل کیا تھا، تو اس کا سبب مشیتِ الٰہی تھی جس نے اس پورے واقعہ کو مسلمانوں کے لیے ایک بلیغ درس بنا دیا جس میں بیک وقت ایجابی اور سلبی دونوں مظہر موجود تھے۔

اخیر میں غزوۂ احد کے درس و موعظت کی تکمیل کرتے ہوئے یہ آیات نازل ہوئیں:

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ، لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ. اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ. فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ.

(آل عمران: ۳:۱۷۲-۱۷۴)

جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا۔ ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ "تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو۔" تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ "ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے" آخرکار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے۔ ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔

واقعۂ رجیع و بئرِ معونہ

غزوۂ احد کے کچھ عرصہ بعد دو ایسے واقعات پیش آئے جن کی ابتدائی اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ اور وہ ہیں واقعۂ رجیع اور واقعہ بئر معونہ۔ سطور ذیل میں ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

اوّل: واقعۂ رجیع (۳ھ)

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عضل و قارہ نامی قبائل کا ایک وفد حاضر ہوا اور عرض کیا کہ ان تک اسلام کی کچھ باتیں پہنچی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگ ان کے یہاں جا کر اس دین کی تعلیمات سکھائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ان میں مرثد بن ابی مرثد، خالد بن البکیر، عاصم بن ثابت، خبیب بن عدی، زید بن الدثنہ اور عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہم تھے۔ آپؐ نے حضرت عاصم بن ثابتؓ کو ان کا سردار نامزد فرمایا۔

امام بخاریؒ نے اپنی سند سے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "یہ لوگ روانہ ہوئے یہاں تک کہ جب عسفان اور مکہ کے درمیان پہنچے تو (ان غداروں نے بدعہدی کی) انہوں نے قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ بنو لحیان کو اشارہ کیا۔ بنو لحیان نے قریب سو تیر اندازوں کے ساتھ ان کا تعاقب کیا اور انہیں ڈھونڈنے نکلے۔ ایک جگہ پہنچے تو وہاں انہیں کھجور کی ایک گٹھلی ملی۔ اسے دیکھ کر انہوں نے کہا: یہ تو یثرب کی کھجور ہے (یعنی مسلمان ادھر ہی سے گزرے ہیں) انہوں نے مسلمانوں کا اور پیچھا کیا یہاں تک کہ انہیں جا لیا۔ عاصم اور ان کے ساتھیوں کو پتا چلا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے تو انہوں نے ایک ٹیلے پر پناہ لی۔ تیر اندازوں نے آ کر انہیں گھیر لیا اور ان سے کہا: "ہم تم سے عہد کرتے ہیں۔ اتر آؤ تو کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ عاصمؓ نے کہا: "میں کسی کافر کی پناہ میں نہیں آتا" پھر دعا کی: "اے اللہ ہماری خبر اپنے نبی کو

پہنچا دے" غرض سات آدمی بشمول عاصم لڑ کر ان تیر اندازوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ تین آدمی جن میں دو خبیبؓ اور زیدؓ تھے، بچ گئے۔ ان تیر اندازوں نے انہیں امان دے دی۔

ان صحابہ نے ان لوگوں کے وعدہ پر بھروسہ کیا اور ٹیلے سے اتر آئے۔ مگر ان کافروں نے بدعہدی کی۔ انہوں نے ان کی کمانوں سے تانت نکال کر ان کی مشکیں کس دیں۔ تیسرے آدمی نے کہا: "یہ پہلی بدعہدی ہے" اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے اسے گھسیٹ کر لے جانا چاہا اور ساتھ جانے پر آمادہ کرنے کے لیے خوب پٹائی کی مگر وہ اڑے رہے تو انہیں قتل کر دیا۔

پھر ان لوگوں نے خبیبؓ اور زیدؓ کو مکہ لے جا کر بیچ دیا۔ خبیبؓ کو حارث کے بیٹوں نے خرید لیا۔ حضرت خبیبؓ نے غزوہ بدر میں ان کے باپ حارث کو قتل کیا تھا (انہیں خریدنے کا مقصد باپ کے بدلے میں انہیں قتل کرنا تھا) حضرت خبیبؓ چند دن انہی کے گھر میں قید رہے۔ پھر ان لوگوں نے انہیں قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی موقعے پر ایک دن حضرت خبیبؓ نے صفائی کے لیے حارث کی ایک بیٹی سے استرہ مانگا۔ ابھی استرہ انہی کے پاس تھا کہ اس کا ایک بچہ ان کے پاس جا پہنچا۔ انہوں نے اسے اپنی ران پر بٹھا لیا۔ بنتِ حارث نے بیان کیا کہ میں تھوڑی دیر کے لیے اپنے بچے سے غافل ہو گئی۔ اچانک خیال آیا تو دیکھا کہ وہ خبیب کے پاس ہے اور خبیب کے ہاتھ میں استرہ ہے۔ یہ دیکھ کر میں بہت گھبرا گئی۔ خبیب تاڑ گئے۔ انہوں نے کہا: "کیا تو اس بات سے ڈر رہی ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا؟ انشاء اللہ تعالیٰ میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" بنت حارث کہتی تھی: "میں نے خبیب سے بہتر کوئی قیدی نہیں دیکھا۔ میں نے انہیں انگور کا خوشہ کھاتے دیکھا ہے، حالانکہ ان دنوں مکہ میں کسی قسم کا پھل نہیں پایا جاتا تھا اور وہ بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس رزق سے تو انہیں اللہ کی طرف سے نوازا جاتا تھا" حارث کے بیٹے انہیں قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے۔ انہوں نے دو رکعت نماز پڑھنے کی اجازت مانگی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کہا: "اگر تم لوگوں کو یہ خیال نہ ہوتا کہ میں موت کے خوف سے نماز لمبی کر رہا ہوں تو میں اور دیر تک پڑھتا۔" اسی وقت سے دستور بن گیا کہ قتل سے پہلے مقتول دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔

پھر حضرت خبیبؓ نے یہ اشعار پڑھے:

ولست ابالی حین اقتل مسلما — علی ای شق کان فی الله مصرعی
وذلك فی ذات الاله وان یشا — یبارك علی اوصال شلو ممزع

(جب مجھے بحیثیت مسلمان قتل کیا جا رہا ہے تو کچھ پروا نہیں کہ کس پہلو قتل کیا جاؤں گا۔ یہ خالصتاً اللہ کے لیے ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو جسم کے ان پارہ پارہ ٹکڑوں پر برکت نازل کرے گا)

پھر عقبہ بن حارث نے آگے بڑھ کر انہیں قتل کر دیا۔ قریش نے چند آدمیوں کو بھیجا کہ حضرت عاصمؓ کے جسم کا ایک حصہ کاٹ لائیں تاکہ ان کی شناخت ہو سکے۔ حضرت عاصمؓ نے غزوۂ بدر میں قریش کے ایک سردار کو قتل کیا تھا۔ مگر اللہ نے شہد کی مکھیوں کو بھیج دیا جنہوں نے لاش پر پردہ ڈال دیا اس وجہ سے وہ لوگ لاش تک نہ پہنچ سکے اور ناکام لوٹ گئے۔" ٣٤

طبری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے امیہ کو تن تنہا قریش کی جاسوسی کے لیے بھیجا۔ وہ فرماتے ہیں: "میں لوگوں کی نگاہوں سے بچتے بچاتے اس صلیب تک پہنچا جس پر حضرت خبیبؓ کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس پر چڑھ کر میں نے بندھن کھولے۔ لاش گر پڑی۔ میں بلا تاخیر نیچے اترا اور ادھر ادھر دیکھا، مگر حضرت خبیبؓ کی لاش کہیں نظر نہ آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے زمین نگل گئی ہے۔ بعد میں بھی اس کا کچھ پتا نہ چلا۔"

ابن اسحاقؒ فرماتے ہیں: "رہے زیدؓ تو انہیں صفوان بن امیہ نے (قتل کے ارادہ سے) خریدا۔ لوگ انہیں قتل کرنے کے لیے حرم سے باہر لے گئے۔ تماشا بینوں میں ابوسفیان بھی تھا۔ اس نے کہا: "اے زید میں تم سے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں یہ پسند ہوگا کہ اس وقت محمد تمہاری جگہ ہوتے، ہم اس کی گردن اڑا دیتے اور تم اپنے گھر والوں کے درمیان ہوتے؟" انہوں نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! مجھے تو یہ پسند نہیں کہ محمد اس وقت جہاں ہیں وہیں ان کو ایک کانٹا چبھ جائے اور اس کے بدلے میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جاؤں" ابوسفیان نے کہا: "محمد کے اصحاب جتنی محبت ان سے کرتے ہیں اتنی محبت کسی سے کرتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔" ٣٥

---

٣٤ صحیح بخاری ٥/٤١
٣٥ ملاحظہ کیجیے سیرت ابن ہشام ٢/١٧٢

دوم: واقعۂ بئر معونہ (۴ھ):

قبیلہ کلاب کا سردار عامر بن مالک جو ملاعب الاسنہ کے لقب سے مشہور تھا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ وہ نہ اسلام لایا اور نہ اس سے اجتناب کا اظہار کیا۔ بلکہ عرض کیا: اے محمد! اپنے چند لوگوں کو اہل نجد کی طرف بھیج دیں۔ وہ لوگ انہیں آپ کے دین کی طرف دعوت دیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ لوگ اسے قبول کر لیں گے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "مجھے ان لوگوں کے بارے میں اہل نجد کی طرف سے ڈر ہے" عامر نے کہا: وہ میری پناہ میں رہیں گے۔ آپ انہیں بھیجیں تاکہ وہ لوگوں کو آپ کے دین کی طرف دعوت دیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب میں سے ستر بہترین مسلمانوں کو روانہ کیا۔ ابن اسحاق اور ابن کثیرؒ کی روایت کے مطابق یہ سفر کا مہینہ تھا اور غزوۂ احد کو ابھی چار ماہ ہی گزرے تھے۔ ان لوگوں نے سفر شروع کیا، یہاں تک کہ بئر معونہ پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے پڑاؤ ڈالا اور وفد کے ایک رکن حضرت حرام بن ملحانؓ کو رسول اللہ ﷺ کے مکتوب کے ساتھ قبیلے کے ایک رئیس عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ حضرت حرامؓ جب اس کے یہاں پہنچے تو اس نے مکتوب نبوی کو دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور انہیں قتل کر دیا۔ امام بخاریؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ "حضرت حرام بن ملحانؓ کو جب نیزہ کا زخم لگا اور خون کے چھینٹے ان کے چہرے پر آئے تو وہ زور سے پکار اٹھے: فزت ورب الکعبة (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)" ٣٦

پھر عامر بن طفیل نے بنو عامر کو اکسایا کہ وہ اس کے ساتھ مل کر بقیہ داعیوں کو بھی قتل کر دیں۔ ان لوگوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ ابو براء (عامر بن مالک) کے دیئے گئے امان کو نہیں توڑ سکتے۔ ان کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے بنو سلیم کے قبائل عصیہ، رعل اور ذکوان سے مدد چاہی۔ ان لوگوں نے اس کا ساتھ دیا اور جہاں مسلمان داعی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے وہیں انہیں گھیر لیا۔ جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ لوگ ان کی جان کے درپے ہیں تو تلواریں لے کر ان سے لڑنے لگے اور لڑتے لڑتے تمام مسلمان شہید ہو گئے۔

داعیوں کے قافلے میں دو افراد (جن میں سے ایک حضرت عمرو بن امیہ الضمریؓ تھے)

---

٣٦ صحیح بخاری ٥/٤٣

اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ انہیں اس حادثے کی اطلاع بعد میں ملی۔ وہ وہاں پہنچے تو اپنے بھائیوں کی مدافعت میں وہ بھی لڑنے لگے۔ حضرت عمرؓ کے رفیق تو لڑتے ہوئے شہید ہو گئے لیکن وہ بچ نکلے۔ انہوں نے مدینہ کا رخ کیا۔ راستے میں انہیں دو مشرک ملے جنہیں انہوں نے قبیلہ بنی عامر سے سمجھ کر قتل کر دیا۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آپ کو پورا واقعہ سنایا تو پتہ چلا کہ ان دونوں کا تعلق قبیلہ بنی کلاب سے تھا اور نبی ﷺ نے انہیں امان دے دی تھی۔ آں حضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: "تم نے ایسے لوگوں کو قتل کیا ہے جن کا میں ضرور خوں بہا ادا کروں گا۔"

نبی ﷺ کو اپنے اصحاب میں سے ان نیک داعیوں کی شہادت سے بہت صدمہ ہوا۔ آپ ایک ماہ تک صبح کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے رہے اور بنو سلیم کے قبائل رعل، ذکوان، بنی لحیان اور عصیہ پر بددعا کرتے رہے۔ ۳۷

دروس ونصائح

ان دو افسوس ناک واقعات سے متعدد اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ ان کا خلاصہ ہم سطور ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ دعوت کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے:

واقعہ رجیع اور واقعہ بئر معونہ دونوں سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی طرف دعوت دینے اور لوگوں کو اس کی حقیقت اور احکام سے واقف کرانے کی ذمہ داری میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔ دعوت کا کام صرف انبیاء اور رسولوں یا صرف ان کے جانشینوں اور علماء ہی کے ذمہ نہیں ہے۔

اس فریضہ دعوت کی انجام دہی کتنی اہمیت رکھتی ہے اس کا اندازہ محض اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نبی ﷺ نے ستر نوجوان قراء کو، جو آپ کے بہترین اصحاب میں سے تھے، اس

---

۳۷ دیکھیے سیرت ابن ہشام ۲/۱۷۳، رسول اللہ ﷺ کے دعائے قنوت پڑھنے اور قبائل سلیم پر بددعا کرنے کی روایت بخاری اور مسلم نے بھی نقل کی ہے۔

کام کے لیے بھیجا، حالانکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اسی مقصد سے بھیجے گئے چھ صحابہ شہید کر دیے گئے تھے۔ نبی ﷺ کو ان صحابہ کے بارے میں بھی اسی طرح کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ جب عامر بن مالک نے آپ کے سامنے لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دینے کے لیے ایک وفد بھیجنے کی تجویز رکھی تو آپ نے اپنے اسی خدشے کا اظہار فرمایا۔ لیکن آپ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری کی انجام دہی کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور آپ کا خیال تھا کہ اگر اس ذمہ داری کی ادائیگی اس طرح کے خطرات کو انگیز کیے اور اس کے برے نتائج کو برداشت کیے بغیر ممکن نہیں تو آپ اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کی دعوت کو عام کرنے کی راہ میں جو کچھ مقدر ہوا سے آپ خندہ پیشانی سے گوارا کر لیں گے۔

۲۔ فریضۂ دعوت کی انجام دہی کے لیے دار الکفر میں قیام جائز ہے:

اس کتاب کے پہلے باب میں ہم نے بیان کیا تھا کہ اگر مسلمان کے لیے دار الکفر یا دار الحرب میں اپنے دین پر علانیہ عمل ممکن نہ ہو تو وہاں اس کے لیے ٹھہرنا جائز نہیں، اور اگر دین پر علانیہ عمل ممکن ہو تو بھی وہاں ٹھہرنا مکروہ ہے۔ آں حضرت ﷺ کی سیرت کے اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ دار الکفر میں اس کا ٹھہرنا وہاں دعوت اسلامی کا فریضہ انجام دینے کی غرض سے ہو۔ یہ جہاد کی ایک قسم ہے جس کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر بطور فرض کفایہ عائد ہوتی ہے۔ یعنی اگر بعض مسلمان اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دے دیں تو بقیہ مسلمانوں سے یہ ساقط ہو جائے گی اور اگر کوئی بھی اسے انجام نہ دے تو سب لوگوں پر اس کا گناہ ہوگا۔ ۳۸

۳۔ نفس انسانی کی اسلامی تربیت:

واقعہ رجیع اور واقعہ بئر معونہ دونوں سے بخوبی واضح ہے کہ مشرکین کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنا بغض اور کتنی نفرت بھری ہوئی تھی کہ اس کی تسکین کے لیے انہوں نے بدعہدی اور غداری کا انتہائی گھناؤنا اور قابل نفریں مظاہرہ کیا۔-- اگر ہم واقعہ کے اس پہلو سے

---

۳۸ دیکھیے مغنی المحتاج ۴/۲۳۹

صرف نظر کرلیں تو ہمیں اس کا دوسرا پہلو انتہائی دل کش اور درخشاں نظر آتا ہے جس کا مظاہرہ اس بد عہدی اور نفرت کا شکار ہونے والے مسلمانوں کی جانب سے ہوا۔ دیکھئے حضرت خبیبؓ بنو حارث کے گھر میں قید اپنے قتل کے وقت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے جسمانی صفائی کے لیے استرہ مانگا تاکہ موت کو گلے لگانے سے پہلے پاک و صاف ہو جائیں۔ گھر میں ایک چھوٹا بچہ ہے جو ماں کی توجہ ہٹ جانے سے دھیرے دھیرے چل کر ان کے پاس آجاتا ہے۔ یہ لمحہ اس شخص کی نظر میں جسے زندگی پیاری ہو اور وہ انتقام کی فکر میں ہو، بھاؤ تاؤ یا غداری کے مقابلے میں غداری کا سنہرا موقع تھا۔ گھر کے تمام لوگ بھی اسی انداز سے سوچتے تھے۔ چنانچہ بچے کی ماں کو جوں ہی بچے کا خیال آیا اور اس نے اسے حضرت خبیبؓ کے پاس دیکھا، وہ بہت گھبرا گئی اور اسے یقینی موت کے پنجوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے بے چین ہو گئی۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ حضرت خبیبؓ نے بچے کو اپنے زانو پر بٹھا رکھا ہے اور اس سے ایک شفیق باپ کی طرح کھیل رہے ہیں۔ حضرت خبیب نے اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات بھانپ لیں۔ انہوں نے پورے سکون سے، جس کا مظاہرہ ایک صاحبِ ایمان اور بردبار شخص ہی سے ہو سکتا ہے، اس سے کہا: "کیا تجھے ڈر ہے کہ میں اسے قتل کر دوں گا۔ انشاء اللہ میں ایسا نہیں کروں گا۔"

دیکھیے، انسان کی اسلامی تربیت کا یہ معجزہ کیونکر رونما ہوا؟ یہ حضرت خبیبؓ اور وہ بغض و کینہ رکھنے والے مشرکین جو ظلم وزیادتی کرتے ہوئے ان کے قتل کے درپے تھے، دونوں عرب تھے۔ ایک ہی زمین پر پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ان کی طبیعتیں اور روایات یکساں تھیں۔ لیکن حضرت خبیبؓ مشرف باسلام ہوئے تو ایک دوسرے انسان بن گئے، جب کہ وہ مشرکین اپنی گمراہیوں میں غلطاں رہے، جس کی بنا پر ان کی طبیعتوں میں وحشی پن اور بد عہدی برقرار رہی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کے ذریعے انسانی طبیعت میں کتنی عظیم تبدیلی رونما ہو جاتی ہے اور کتنا عظیم انقلاب آجاتا ہے؟!!

۴۔ قیدی کا دشمن کی امان قبول کرنے سے انکار جائز ہے:

گزشتہ تفصیل سے استدلال کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دشمن کی قید میں چلا جائے تو

اسے اختیار ہے کہ اس کی امان قبول کرنے سے انکار کر دے اور اپنی ذات پر کسی کافر کا حکم نہ چلنے دینے کے لیے اپنے آپ پر اس کو قابو نہ دے، خواہ اسے قتل کر دیا جائے، جیسا کہ حضرت عاصمؓ نے کیا۔ اور چاہے تو رخصت پر عمل کرتے ہوئے اس کی امان قبول کرلے اور نجات کی امید رکھتے ہوئے اس کا انتظار کرے، جیسا کہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ نے کیا۔

لیکن اگر قیدی بھاگ سکتا ہو تو صحیح رائے یہ ہے کہ اسے ایسا ضرور کرنا چاہیے، خواہ حالتِ قید میں رہتے ہوئے اس کے لیے دین پر علانیہ عمل ممکن ہو۔ اس لیے کہ کفار کے ہاتھ میں قیدی مجبور محض اور ذلیل رہتا ہے، اس لیے اس پر واجب ہے کہ اپنے آپ کو قید کی ذلت و رسوائی سے نجات دلائے۔[۳۹]

۵۔ دل میں نبی ﷺ سے محبت کا اثر:

حضرت زید بن الدثنہؓ نے اپنی شہادت سے ذرا پہلے ابوسفیان کو جو جواب دیا تھا اس میں غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے لیے کتنی محبت موجزن تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ محبت ان اہم اسباب میں سے ہے جنہوں نے ان کے نزدیک اللہ کے دین کے راستے میں اور اس کے رسول کے دفاع کے لیے ہر طرح کی جانی و مالی قربانی کو پسندیدہ بنا دیا تھا۔ کوئی مسلمان اپنے ایمان کے کتنے ہی اعلیٰ مرتبے پر پہنچ جائے لیکن رسول اللہ ﷺ کے لیے ایسی محبت کے بغیر اس کا ایمان ناقص ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی صراحت آں حضرت ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں فرما دی ہے:

> "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اولاد اور تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔"[۴۰]

۶۔ ولی کی کرامت برحق ہے:

حضرت خبیبؓ کے ساتھ مکہ کے زمانۂ اسیری میں جو الٰہی نوازشیں ہوئیں ان سے ثابت

---

۳۹ ملاحظہ کیجئے نہایۃ المحتاج للرملی ۸/۷۸

۴۰ بخاری و مسلم

ہوتا ہے کہ جو کچھ نبی کے ذریعے بطورِ معجزہ ممکن ہے وہ سب کسی ولی کے ذریعے بطور کرامت ظاہر ہو سکتا ہے۔ البتہ دونوں کے درمیان بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ نبی کا معجزہ چیلنج اور دعوئ نبوت کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن اولیاء اور صالحین کی کرامت کے ساتھ کسی قسم کا چیلنج نہیں ہوتا۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مسلک ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت انعام واکرام کا وہ معاملہ ہے جو اللہ نے حضرت خبیبؓ کے ساتھ ان کی شہادت سے ذرا قبل فرمایا تھا۔ یہ چیز اس صحیح حدیث سے ثابت ہے جسے امام بخاریؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔

۷۔ مومن نوجوانوں پر غداروں کو غلبہ دینے کی حکمت:

بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ مومن نوجوان جو اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی تعمیل میں نکلے تھے، ان پر ان غداروں کو غلبہ دینے کی کیا حکمت تھی؟ اللہ نے خود انہیں ان کے دشمنوں پر کیوں نہیں غالب کر دیا؟

اس سوال کا جواب ہم ایک سے زائد بار دے چکے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے ذمے دو کام کیے ہیں (۱) اسلامی معاشرے کا قیام (۲) اور خاردار اور ناہموار راستے پر چل کر اس کے لیے جدوجہد۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے، صادقین منافقین سے الگ ہو جائیں اور اللہ ان میں سے گواہوں کو منتخب کر لے اور اس "معاملہ" کا عملی مفہوم نمایاں ہو کر سامنے آ جائے جو اس نے اپنے اہل ایمان بندوں سے کیا ہے اور جس کی صراحت اس آیت میں موجود ہے:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ. (التوبہ۔۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔

یہ معاہدہ جن دفعات پر مشتمل ہے اگر ان پر عمل نہ ہو تو اس کی دستاویز پر دستخط کرنے کا کیا حاصل؟ اور اس دستخط کی کیا حیثیت ہے کہ اس کے نتیجے میں یہ معاہدہ کرنے والا جنت اور ابدی سعادت سے بہرہ ور ہو؟

دشواری دراصل اس شخص کے دماغ میں پیدا ہوتی ہے جو اس دنیائے فانی کی قدر اس کی حقیقی قدر و قیمت سے زیادہ کرتا ہے، اور جتنی اہمیت کی وہ مستحق ہے اس سے زیادہ اسے اہمیت دیتا ہے، اس کے بالمقابل اخروی زندگی سے اس کا تعلق کمزور ہوتا ہے۔ یہ دل میں اللہ پر ایمان بالکل نہ ہونے یا کمزور ہونے کی نشانی ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی موقع پر جان یا مال کی قربانی پیش کر سکیں گے۔ رہے سچے اہل ایمان تو ان کے بارے میں اس چیز کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے نزدیک دنیاوی زندگی کی لذت اس سے کہیں کم ہے کہ وہ مسلمان کو اللہ تعالیٰ کے کسی معمولی حکم پر عمل کرنے سے روک دے۔ ان کے نزدیک جان کی قربانی دنیا کی قید سے آخرت کی نعمتوں تک سفر کا نام ہے۔ کتنا مبارک ہے یہ مقصد جو اس دنیاوی زندگی میں ہر مسلمان کی آرزو ہے۔

اس احساس کا واضح اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے جو حضرت خبیبؓ نے اپنی شہادت کے وقت پڑھے تھے۔ خاص طور سے آخری شعر، جو یہ ہے:

ولست بمبد للعدو تخشعا   ولا جزعا انی الی اللہ مرجعی

(میں دشمن کے سامنے کسی خوف اور گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔ میں تو اللہ کی طرف واپس جانے والا ہوں)

بنو نضیر کی جلاوطنی

بنو نضیر کی جلاوطنی کا واقعہ ماہ ربیع الاول ۴ھ میں پیش آیا۔

ابن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ شنبہ کے دن نکلے۔ آپؐ نے مسجد قبا میں مہاجرین اور انصار کے ساتھ نماز ادا کی، پھر بنو نضیر کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے بات چیت کی کہ بنو کلاب کے ان دو آدمیوں کی دیت ادا کرنے میں تعاون کریں جنہیں عمرو بن امیہ الضمریؓ نے (غلطی سے) قتل کر دیا تھا۔ ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے امان دے رکھی تھی اور بنو نضیر اور بنو عامر کے درمیان حلیفانہ تعلقات تھے جیسا کہ ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر نے بیان کیا ہے۔ بنو نضیر نے جواب دیا: "ابو القاسم، جیسا آپ چاہتے ہیں ہم ویسا ہی کریں گے" پھر ان لوگوں نے آپس میں خفیہ طریقے سے رائے مشورہ کر کے بدعہدی کا ارادہ کیا۔ اسی قبیلے کے ایک شخص عمرو بن جحاش نے کہا: "میں گھر کی چھت پر چڑھ جاتا ہوں، وہاں سے ایک بڑا پتھر گرا دوں گا" اس وقت رسول اللہ ﷺ ایک گھر کی دیوار کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔

ابن سعد کی روایت میں یہ بھی ہے کہ "بنو نضیر ہی کے ایک یہودی سلام بن مشکم نے ان سے کہا: "ایسا نہ کرو۔ اللہ کی قسم! اسے (یعنی نبی ﷺ کو) ضرور تمہارے ارادوں کی خبر ہو جائے گی اور یہ اس عہد کی بھی خلاف ورزی ہے جو ہمارے اور اس کے درمیان ہے۔" [۱]

رسول اللہ ﷺ کو ان کے ارادۂ شر کی خبر ہوگئی۔ آپ وہاں سے تیزی سے اٹھے، گویا کوئی ضرورت درپیش ہے اور مدینہ کا رخ کیا۔ آپ کے بعد صحابہ بھی وہاں سے اٹھ کر آگئے۔ انہوں نے آپؐ سے عرض کیا: "آپؐ تشریف لے آئے، ہمیں احساس بھی نہ ہوا" آپؐ نے فرمایا "یہود نے بدعہدی کا ارادہ کیا تھا۔ اللہ نے مجھے اس کی خبر دے دی۔ اس لیے میں وہاں سے اٹھ آیا۔"

[۱] طبقات ابن سعد ۹۹/۳

پھر رسول ﷺ نے ان لوگوں کو کہلا بھیجا کہ "میرے شہر سے نکل جاؤ، اس لیے کہ تم لوگوں نے بدعہدی کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں تمہیں دس روز کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہاں دکھائی دیا تو اس کی گردن مار دی جائے گی۔"

وہ لوگ وہاں سے نکل کر کہیں اور چلے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ لیکن عبد اللہ بن ابی نے انہیں کہلا بھیجا کہ "اپنے گھروں سے نہ نکلو اور قلعہ بند ہو جاؤ۔ میرے ساتھ میری قوم اور دوسرے قبیلوں کے دو ہزار آدمی ہیں جو تمہاری طرف سے لڑیں گے۔" یہ دیکھ کر بنو نضیر نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ بدل دیا اور اپنے قلعوں میں محصور ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے جنگ کرنے کے لیے صحابہ کرام کو تیاری کرنے اور ان کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔

پھر رسول اللہ ﷺ صحابہ کے ساتھ ان کی طرف گئے۔ یہود نے مقابلے کے لیے اپنے قلعوں میں تیر اور پتھر اکٹھا کر لیے تھے۔ ابن ابی نے اس موقع پر انہیں دھوکہ دیا اور ان سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا۔ نبی ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے کھجور کے درختوں کو کاٹنے اور تلف کر دینے کا حکم دیا۔ [۲]

ان لوگوں نے پکار کر کہا: "اے محمد! تم لوگوں کو فساد سے روکتے تھے اور جو لوگ ایسا کرتے تھے ان کی مذمت کیا کرتے تھے۔ پھر اب خود کیوں کھجور کے درختوں کو کاٹ اور جلا رہے ہو؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ (الحشر۔۵)

تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا اور (اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا) تاکہ فاسقوں کو ذلیل و خوار کرے۔

ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کش کی کہ آپؐ کی مرضی کے مطابق وہ مدینہ سے نکل جائیں گے۔ مگر آپؐ نے فرمایا: "آج کے دن میں اس پیش کش کو صرف اسی صورت میں قبول کروں گا کہ تم لوگ بس اپنی جان بچا کر یہاں سے چلے جاؤ۔ اپنے اموال میں

[۲] بخاری و مسلم

سے صرف اتنا لے جاسکتے ہو جو تمہارے اونٹوں پر چلا جائے، لیکن ہتھیار لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔" یہود نے یہ شرط تسلیم کرلی۔ وہ اپنا جو کچھ سامان اونٹوں پر لاد سکے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ "ان میں سے بعض لوگوں نے اپنے دروازوں کی چوکھٹیں تک اکھاڑ کر اپنے اونٹوں پر باندھ لیں اور ساتھ لے گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ خیبر اور کچھ شام چلے گئے۔ صرف دو یہودیوں کو اسلام قبول کرنے کی توفیق ہوئی۔ ایک عمرو بن جحاش کے چچازاد بھائی یامین بن عمیر بن کعبؓ اور دوسرا ابو سعد بن وہبؓ۔ وہ اپنے اموال کے مالک بنے رہے۔" ۴۳

بنو نضیر جو مال چھوڑ کر گئے اسے رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اولین کے درمیان تقسیم کردیا۔ اس میں سے انصار کو کچھ بھی نہ دیا، سوائے دو افراد کے کہ ان کی غربت کی وجہ سے آپ نے ان کا بھی حصہ لگایا، اور وہ تھے حضرت سہل بن حنیفؓ اور ابودجانہ سماک بن خرشہؓ۔ بنو نضیر کی جائیداد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص تھی۔ بلاذری نے فتوح البلدان میں بیان ہے کہ "آں حضرت ﷺ ان کی زمین میں کھجوروں کے نیچے کھیتی کراتے تھے۔ اس سے آپ کے اہل و عیال کے لیے سال بھر کا غلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ اس سے جو زائد ہوتا وہ آپ جنگ کے لیے گھوڑے اور اسلحہ خریدنے میں خرچ کرتے تھے۔" ۴۴ بنو نضیر کے بارے میں سورۂ حشر مکمل نازل ہوئی۔ ان کے اموال کی تقسیم کے سلسلے میں آں حضرت ﷺ نے جو حکمت عملی اختیار کی اس پر بطور تبصرہ یہ آیات نازل ہوئیں:

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (الحشر: ۶-۷)

اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے وہ ایسے مال

۴۳ ملاحظہ کیجیے طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام، تاریخ طبری اور تفسیر ابن کثیر (تفسیر سورۂ حشر)

۴۴ عیون الاثر ۲/۵۱

نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے ہوں۔ بلکہ اللہ اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے تسلط عطا فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ بھی اللہ بستیوں کے لوگوں سے اپنے رسول کی طرف پلٹا دے وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے، تاکہ وہ تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔ جو کچھ رسول تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے وہ تم کو روک دے اس سے رک جاؤ۔ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

دروس و نصائح

یہ یہود کے دلوں میں راسخ غداری اور بدعہدی کے مزاج کی دوسری مثال ہے۔ اس سے پہلے ہم یہود بنی قینقاع کے ناپسندیدہ اقدام کی صورت میں ان کی بدعہدی کی ایک اور تصویر دیکھ چکے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی بے شمار واقعات کے ذریعے تصدیق ہو چکی ہے۔ یہی راز ہے اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کیوں لعنت فرمائی ہے جس کا بیان درج ذیل آیت باری میں موجود ہے:

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (المائدہ: ۷۸)

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ بن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔

اس واقعے سے متعدد بلیغ دروس اور اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں جو شریعت اسلامی کے بہت سے احکام سے متعلق ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۔ آں حضرت ﷺ کے ذریعے ظاہر ہونے والا ایک خارقِ عادت امر

یہود جو ارادۂ شر اپنے دلوں میں رکھتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس کی "خبر" دے کر اس کا انکشاف کردیا۔ یہ ان بہت سے خوارق میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بعثت سے قبل اور اس کے بعد نوازا تھا۔ یہ چیز ہماری توجہ کی طالب ہے، تاکہ آں حضرت ﷺ

کی نبوت اور رسالت پر ہمارا ایمان مزید پختہ ہو اور ہم اس بات کا یقین کرلیں کہ آپ کی شخصیت کا نبوی پہلو ہی آپؐ کے وجود اور دیگر شخصی اوصاف کی اوّلین اساس ہے۔

سیرت اور فقہ السیرۃ کے موضوع پر لکھنے والے بعض لوگوں نے اس واقعے کو یوں تعبیر کیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے یہود کے ارادۂ شر کو اپنے رسول ﷺ پر الہام کردیا۔" لفظ "الہام" تمام انسانوں کے درمیان مشترک معنی پر دلالت کرتا ہے۔ اشارات و قرائن کے واسطے سے الہام کا حاسہ ایک فطری حاسہ ہے جو تمام انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ کسی گروہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ لیکن لفظ "خبر الٰہی" جس کا استعمال اصحاب سیر نے کیا ہے، ایسے مفہوم پر دلالت کرتا ہے جو نبوت کے امتیازات اور خصائص میں سے ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس امتیازی خصوصیت کی بنا پر نبی ﷺ کو یہود کی غداری کا احساس ہوگیا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کیا ہوا وہ قطعی وعدہ پورا کردیا جس کا تذکرہ اس آیت میں ہے: وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. المائدہ:۶۷ (اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے)۔

جب معاملہ یہ ہو تو ذو معنی تعبیر کیوں اختیار کی جائے؟ یہ تو آں حضرت ﷺ کے معجزات کے انکار کا ایک مظہر ہے۔ اور گذشتہ صفحات میں یہ بات گزر چکی ہے کہ آں حضرت ﷺ کے معجزات کے قطعی تواتر سے ثابت ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص ان کا انکار کرتا ہے تو اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ آپؐ کی نبوت پر اس کا ایمان کمزور ہے۔

۲۔ مصلحت متقاضی ہو تو دشمن کے پھل دار درختوں کو تلف کرنا جائز ہے:

بنو نضیر کے کھجور کے باغوں کو کاٹا اور جلایا جانا بالاتفاق ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے چند درختوں کو تلف کردیا تھا، پھر بقیہ کو چھوڑ دیا تھا۔ قرآن نے نبی ﷺ کے اس اقدام کی تصویب کی اور یہ آیت نازل ہوئی:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُولِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ. (الحشر-۵)

تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔

علماء نے اس سے اس پر استدلال کیا ہے کہ دشمن کے درختوں کو تلف کرنے یا نہ کر

کے بارے میں حکم شرعی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ دشمن پر غلبہ پانے کے لیے حکمران یا سپہ سالار کے نزدیک کیا چیز قرینِ مصلحت ہے۔ گویا یہ مسئلہ "حکمتِ عملی" کے قبیل سے ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ کا مقصد اس عمل سے۔ یعنی کھجور کے کچھ درختوں کو کاٹنے اور بقیہ کو چھوڑ دینے سے۔ مصلحت کا حصول تھا۔ اس طرح آپ اپنے بعد آنے والے حکمرانوں کی رہنمائی کررہے تھے کہ مصلحت متقاضی ہو تو وہ بھی اس طرح کے کام انجام دے سکتے ہیں۔

یہی توجیہ امام شافعیؒ نے حضرت ابو بکرؓ کے اس عمل کی فرمائی ہے کہ انہوں نے جب حضرت خالد بن الولیدؓ کو طلیحہ اور بنو تمیم کی طرف بھیجا تھا تو ان کے کھجور کے باغات کو جلانے اور کاٹنے کا حکم دیا تھا، حالانکہ شام کی جنگوں کے موقع پر وہ خود اس کام سے منع کرچکے تھے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"(شام کی جنگوں میں) حضرت ابو بکرؓ نے کسی پھل دار درخت کو کاٹنے سے منع کیا تھا۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ پیشین گوئی سن رکھی تھی کہ شام کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوں گے۔ چنانچہ جب ان کے لیے دونوں صورتیں جائز تھیں، خواہ درخت کاٹنے کا حکم دیں یا اس سے منع کردیں، تو انہوں نے مسلمانوں کے مفاد کو دیکھتے ہوئے انہیں نہ کاٹنے کا حکم دیا۔" [۴۵]

اگر مصلحت متقاضی ہو تو کفار کے درختوں کو کاٹا اور جلایا جاسکتا ہے۔ یہی نافع مولی ابن عمر، مالک، ثوری، ابو حنیفہ، شافعی، احمد، اسحاق رحمہم اللہ اور جمہور فقہاء کا مسلک ہے۔ لیکن لیث بن سعد، ابو ثور اور اوزاعی سے اس کا عدمِ جواز منقول ہے۔ [۴۶]

۳۔ اموالِ غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ائمہ کے مسالک:

ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جو مالِ غنیمت مسلمانوں کو ان کے دشمنوں سے جنگ کے

---

[۴۵] الام ۷/۳۲۴، مزید دیکھیے اس موضوع پر راقم کی کتاب ضوابط المصلحة في الشريعة الاسلامية ص:۱۷۰-۱۷۱

[۴۶] دیکھیے صحیح مسلم کی شرح نووی ۱۲/۵۰

بغیر حاصل ہو (جسے فئی کہتے ہیں) اسے امام ان کاموں میں خرچ کر سکتا ہے جن میں خرچ کرنا وہ قرینِ مصلحت سمجھے، اس کو فوج کے درمیان تقسیم کرنا ضروری نہیں جس طرح کہ جنگ کے بعد حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس پر وہ اس طریقے سے استدلال کرتے ہیں جو آں حضرت ﷺ نے فئی بنی نضیر کے سلسلے میں اختیار فرمایا۔ آپؐ نے اس مال کو صرف مہاجرین کے درمیان تقسیم فرمایا اور اس کی تصویب میں قرآن کی درج بالا دو آیتیں نازل ہوئیں۔

البتہ جو اراضی مسلمانوں کو دشمنوں سے جنگ کے نتیجے میں حاصل ہوں ان کی تقسیم کے سلسلے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ زمین کو مطلق تقسیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کی پیداوار مسلمانوں کے مصالح کے لیے وقف ہوگی۔ لیکن اگر حکمراں کی رائے مصلحت کی بنا پر اسے تقسیم کرنے کی ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ حنفیہ کا بھی تقریباً یہی مسلک ہے۔

امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ اگر جنگ کے نتیجے میں زمین حاصل ہوئی ہے تو جس طرح جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے دوسرے اموالِ غنیمت کی تقسیم ضروری ہے اسی طرح اسے بھی تقسیم کرنا ضروری ہے۔ امام احمدؒ کا بھی ظاہر مسلک یہی ہے۔

امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے بنو نضیر کے اموال کو فوج کے درمیان تقسیم نہیں فرمایا، اس کا سبب یہ تھا کہ دشمن سے جنگ نہیں ہوئی تھی۔ آیت میں یہ علت منصوص ہے:

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ (الحشر۔۶)

اور جو مال اللہ نے ان کے قبضے سے نکال کر اپنے رسول کی طرف پلٹا دیے وہ ایسے مال نہیں ہیں جن پر تم نے اپنے گھوڑے اور اونٹ دوڑائے۔

اگر اراضی فئی کو تقسیم نہ کیے جانے کے جواز کی علت یہی ہے تو اس سے واضح ہے کہ جب یہ علت نہیں پائی جائے گی تو یہ حکم بھی عائد نہیں ہوگا اور اموالِ غنیمت کی تقسیم کا منصوص حکم نافذ ہوگا، خواہ اراضی کا معاملہ ہو یا کسی اور چیز کا۔

امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ نے اپنے مسلک پر بہت سی دلیلیں دی ہیں۔ ان کی سب

اہم دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے فتح عراق کے بعد اس کی زمینیں تقسیم نہیں کی تھیں اور ان کی پیداوار کو مسلمانوں کی خوش حالی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس موضوع پر یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

اس بحث میں جو چیز ہمارے لیے لائق توجہ ہے وہ سورۂ حشر کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں مذکور علت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بنو نضیر کے مالِ فئی کو بعض مخصوص لوگوں کے درمیان تقسیم فرمایا۔ اس کی علت اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر۔۷)

تاکہ وہ تمہارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس علت سے اشارہ ملتا ہے کہ مالی معاملات میں اسلامی شریعت کی پالیسی فی الجملہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ مصادرِ شریعت میں مختلف اقتصادی اور مالی معاملات سے متعلق جو احکام مذکور ہیں ان کا مقصد ایک ایسے عدل پرور معاشرے کا قیام ہے جس میں لوگوں کے طبقات اور گروہ ایک دوسرے سے قریب ہوں اور ان کے درمیان دوریاں پیدا کرنے والے ان اسباب کا خاتمہ ہو جو بسا اوقات ان کے درمیان ظاہر ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے عدل و مساوات کی رفتار سست پڑتی اور ان کا نفاذ متاثر ہوتا ہے۔

اگر مالی معاملات سے متعلق اسلامی شریعت کے احکام اور اس کے مخصوص نظام نافذ ہوں مثلاً نظامِ زکوٰۃ کا احیاء ہو، سود پر پابندی عائد کی جائے اور ذخیرہ اندوزی کے مختلف مظاہر کا خاتمہ ہو تو تمام انسان خوش حالی کی زندگی گزاریں گے۔ یہ تو ممکن ہے کہ ان کے درمیان وسائلِ رزق میں تفاوت ہو لیکن سب لوگ خود کفیل ہوں گے، ان میں سے کوئی دوسرے پر بوجھ نہ بنے گا اور سب ایک دوسرے کے تعاون سے زندگی گزاریں گے۔

یہاں یہ جاننا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس دنیا میں اپنی شریعت کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ ایسا معاشرہ قائم ہو تو اس کے لیے کچھ متعین وسائل و اسباب کی بھی نشان دہی کی ہے اور ہمیں انہیں اختیار کرنے اور ان سے تجاوز نہ کرنے کا پابند بنایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقصد اور وسیلہ دونوں کی بیک وقت تعیین فرما دی ہے۔ اس لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ "اسلام کا مقصد عدلِ اجتماعی کا قیام ہے، اس کے لیے ہم جو چاہیں اسباب اور ذرائع اختیار کریں" بلکہ یہ

مقصد اور وسیلہ دونوں کے معاملے میں حد سے تجاوز شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جو مقصد متعین کیا ہے وہ صرف اسی وسیلے کو اختیار کرنے سے شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جسے اس نے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے مقرر کیا ہے۔ تاریخ اس کی سب سے بڑی دلیل اور واقعات و حقائق اس کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔

مناسب ہے کہ آپ مکمل سورۂ حشر کا دوبارہ مطالعہ کریں۔ تاکہ غور کر سکیں کہ اس پورے واقعے اور اس کے متعلقات پر اللہ تعالیٰ نے کیا تبصرہ فرمایا ہے؟ یہود اور منافقین کے بارے میں کیا بیان کیا گیا ہے؟ اور مال اور جنگ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے کیا پالیسی اختیار فرمائی ہے؟ وغیرہ۔ اس سورہ سے اس واقعہ اور اس کے دروس و نصائح کے بارے میں بخوبی واقفیت حاصل ہو جائے گی۔

غزوۂ ذات الرقاع

اکثر علمائے سیر و مغازی کا خیال ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع ۴ھ میں بنو نضیر کی جلاوطنی کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد پیش آیا۔ لیکن امام بخاریؒ اور بعض محدثین نے اس کو راجح قرار دیا ہے کہ وہ غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ نجد کے بہت سے قبائل مسلمانوں سے بدعہدی اور غداری پر آمادہ تھے۔ اس غداری کا اظہار ان ستر مسلمانوں کے قتل سے ہوا جو اللہ کی دعوت کے لیے نکلے تھے۔ آں حضرت ﷺ نے ان کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو مدینہ کا عامل بنا کر محارب اور بنو ثعلب نامی قبائل کا رخ کیا، اور نجد میں بنو غطفان کے علاقے میں ایک جگہ جس کا نام "نخل" تھا، پڑاؤ ڈالا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان قبائل کے دلوں پر رعب ڈال دیا۔ ابن ہشام نے بیان کیا ہے کہ ان کی بڑی تعداد تھی، لیکن مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ منتشر ہوگئے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے باوجود اس غزوہ کے دوران متعدد ایسے واقعات پیش آئے جو ان میں غور کرنے اور عبرت و نصیحت کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس لیے ہم غزوہ کی دیگر تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان واقعات کو بیان کرتے ہیں۔

اول: صحیحین میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے۔ ہم چھ افراد تھے اور ہمارے درمیان ایک اونٹ تھا جس پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ چلتے چلتے ہم سب لوگوں کے پیر زخمی ہوگئے۔ میرے پیروں میں بھی جراحتیں آئیں اور ناخن گر گئے، جس کی وجہ سے ہم نے اپنے پیروں پر پٹیاں باندھ لیں۔ اسی لیے اس غزوہ کا نام "غزوۂ ذات الرقاع" پڑ گیا (عربی زبان میں پٹیوں کو رقاع کہتے ہیں) حضرت ابو موسیٰؓ نے یہ روایت بیان تو کر دی لیکن پھر اس پر نادم ہوئے۔ ان کے شاگرد بیان کرتے ہیں

کہ حضرت ابو موسیٰؓ کو یہ روایت بیان کرنے پر ندامت اس لیے ہوئی کیونکہ اس کے ذریعے ان کے عمل خیر کا افشا ہوتا تھا۔

دوم: امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے غزوہ ذات الرقاع میں صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ آپؐ نے فوج کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ آپؐ کے ساتھ صف بستہ ہوا اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ جو گروہ آپ کے ساتھ نماز کے لیے صف بستہ ہوا تھا اس کو آپؐ نے ایک رکعت نماز پڑھائی، پھر آپ کھڑے رہے اور مقتدیوں نے اپنی نماز پوری کی۔ پھر وہ لوگ وہاں سے ہٹ کر دشمن کے آمنے سامنے صف آراء ہو گئے اور دوسرا گروہ آپ کی اقتداء میں آ گیا۔ آپؐ نے انہیں دوسری رکعت پڑھائی، پھر بیٹھے رہے اور ان لوگوں نے اپنی نماز پوری کی۔ پھر آپؐ نے سلام پھیرا۔ ۴۷

سوم: امام بخاریؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ "غزوہ ذات الرقاع سے واپسی میں انہیں رسول اللہ ﷺ کی رفاقت حاصل تھی۔ راستے میں ایک وادی میں، جس میں ببول کے بہت سے درخت تھے، دوپہر ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے پڑاؤ ڈال دیا۔ صحابہ ادھر ادھر درختوں کے سایوں میں چلے گئے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ببول کے ایک درخت پر اپنی تلوار لٹکا کر اس کے نیچے استراحت فرمانے لگے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: "ہمیں نیند آ گئی۔ اچانک ہم نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیں آواز دے رہے ہیں۔ ہم آپ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں ایک بدو

۴۷ صحیح بخاری ۵/۵۳، باب غزوۃ ذات الرقاع، صحیح مسلم ۲/۲۱۴، باب صلوٰۃ الخوف۔ امام مسلمؒ نے اس کے بعد حضرت جابرؓ سے صلوٰۃ الخوف کے بارے میں ایک روایت نقل کی ہے اور وہ یہ ہے کہ "اذان دی گئی پھر آں حضرت ﷺ نے ایک گروہ کو دو رکعت نماز پڑھائی پھر وہ لوگ محاذ پر چلے گئے۔ پھر آپؐ نے دوسرے گروہ کو جو پہلے محاذ پر تھا، دو رکعت نماز پڑھائی۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ کی چار رکعتیں اور دوسروں کی دو دو رکعتیں ہوئیں۔" مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آں حضرت ﷺ نے صلوٰۃ الخوف ایک سے زائد بار پڑھائی ہے۔ ایک بار پہلے طریقے پر پڑھائی اور دوسری بار دوسرے طریقے پر۔ حدیث مسلم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر چار رکعتوں والی نماز کو پوری بھی پڑھ سکتا ہے اور قصر بھی کر سکتا ہے۔ حنفیہ کے برخلاف یہی شافعیؒ، مالکؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے۔

بیٹھا ہوا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں سو رہا تھا۔ یہ شخص یہاں آیا اور اس نے میری تلوار اتار کر سونت لی۔ اسی درمیان میری آنکھ کھل گئی۔ اس نے مجھ سے کہا: "اب تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟" میں نے جواب دیا: اللہ (یہ سن کر اس پر ہیبت طاری ہو گئی) وہ یہی شخص ہے جو بیٹھا ہوا ہے... رسول اللہ ﷺ نے اسے کوئی سزا نہیں دی۔ ۴۸

چہارم: ابن اسحاقؒ اور احمدؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوہ ذات الرقاع میں نکلے۔ اس غزوہ میں ایک مشرک عورت ماری گئی۔ اس وقت اس کا شوہر کہیں گیا ہوا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے واپس ہوئے اور دوسری طرف اس عورت کا شوہر اپنے گھر پہنچا تو (اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو مسلمانوں نے قتل کر دیا ہے) اس نے قسم کھائی کہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جب تک کہ محمد (ﷺ) کے ساتھیوں میں سے کسی ایک کا خون نہ کر دے۔ اس نے نبی ﷺ اور آپ کے اصحاب کا پیچھا کیا۔ نبی ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا۔ آپؐ نے فرمایا: آج رات کون پہرہ دے گا؟ ایک مہاجر اور ایک انصاری صحابی نے اپنی خدمات پیش کیں ۴۹۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب ایک وادی کی گھاٹی میں پہنچ چکے تھے۔ آپ نے ان دونوں سے فرمایا کہ وہ گھاٹی کے ناکے پر پہرہ دیں۔

دونوں صحابی گھاٹی کے ناکے پر پہنچ گئے۔ دونوں نے آپس میں طے کیا کہ رات کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ہر حصہ میں ان میں سے ایک آرام کرے اور دوسرا پہرہ دے۔ انصاری نے مہاجر سے پوچھا کہ تم رات کے کس حصے میں آرام کرو گے؟ ابتدائی حصہ میں یا آخری حصہ میں؟ مہاجر نے ابتدائی حصہ کے بارے میں اپنی رضامندی دی۔ وہ لیٹ کر سو گیا اور انصاری صحابی پہرہ دینے لگے۔ انہوں نے نماز کی نیت باندھ لی۔ وہ شخص (جس کی بیوی ماری گئی تھی) وہاں پہنچا تو اس نے دور سے ایک شخص کو (گھاٹی کے ناکے پر) کھڑا دیکھا۔ سمجھ گیا کہ یہی شخص پہرہ دے رہا ہے۔ اس نے نشانہ لگا کر تیر مارا جو انصاری کے بدن میں پیوست

۴۸ صحیح بخاری ۵/۵۲،۵۳،۵۴

۴۹ ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ یہ دونوں صحابی عمار بن یاسرؓ (مہاجر) اور عباد بن بشرؓ (انصاری) تھے۔

ہو گیا۔ انصاری نے تیر نکال کر پھینک دیا اور نماز پڑھتا رہا۔ اس شخص نے دوسرا تیر مارا۔ وہ بھی نشانے پر لگا۔ انصاری نے اسے بھی نکال کر پھینک دیا اور نماز جاری رکھی۔ اس شخص نے تیسرا تیر مارا۔ وہ بھی انصاری کے بدن میں آگھسا۔ اس نے اسے بھی نکال دیا۔ پھر رکوع و سجدہ کیا (اور نماز پوری کی) پھر اپنے ساتھی کو جگا کر کہا: "اٹھ بیٹھو، میں تو ہلکان ہو گیا۔" مہاجر فوراً اٹھ بیٹھا۔ جب اس تیر انداز نے وہاں دوسرا آدمی بھی دیکھا تو سمجھا کہ لشکر کو اس کی اطلاع ہو گئی ہے [50] فوراً وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مہاجر نے انصاری کو خون میں لت پت دیکھا تو کہا: سبحان اللہ! مجھے اسی وقت کیوں نہیں جگا لیا جب تمہیں پہلا تیر لگا تھا؟ انصاری نے جواب دیا: میں ایک (طویل) سورہ پڑھ رہا تھا۔ مجھے اسے ادھورا چھوڑنا اچھا نہ لگا۔ لیکن جب ایک کے بعد ایک تیر آنے لگے تو میں نے رکوع کر لیا اور پھر (نماز پوری کر کے) تمہیں خبر کی۔ اللہ کی قسم! اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے جس ناکے کی حفاظت کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اس کی حفاظت میں مجھ سے کوتاہی ہو جائے گی تو میں نماز مختصر نہ کرتا، خواہ میری جان چلی جاتی۔" [51]

پنجم: بخاریؒ اور مسلمؒ نے اپنی صحیحوں میں، ابن سعد نے اپنی طبقات میں اور ابن ہشام نے اپنی "سیرت" میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ غزوۂ ذات الرقاع میں نکلا۔ میرے پاس ایک لاغر اونٹ تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے واپس ہوئے تو میرے ساتھی (جن کے پاس اچھی سواریاں تھیں) مجھ سے آگے نکل گئے اور میں پیچھے ہوتا چلا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے پاس پہنچ کر دریافت کیا: "جابر، کیا بات ہے؟" میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اپنے اس اونٹ کی وجہ سے پیچھے ہو گیا ہوں" فرمایا: اسے بٹھاؤ! میں نے اسے بٹھا دیا اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اپنی اونٹنی بٹھا دی۔ پھر فرمایا: تمہارے ہاتھ میں جو عصا ہے، مجھے دو" میں نے اسے آپ کو تھما دیا۔ اسے لے کر آپؐ نے کئی مرتبہ اس کے بدن میں چبھویا۔ پھر فرمایا: اب سوار ہو۔ میں سوار ہو گیا۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب میرا اونٹ تیز رفتاری

[50] روایت میں "نذربہ" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کسی امر کا انکشاف ہونا، بھید کھل جانا۔

[51] احمد، طبری، ابوداؤد، ابن اسحاق

میں آپ کی اونٹنی کی برابری کرنے لگا۔ [52]

رسول اللہ ﷺ مجھ سے گفتگو کرنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "جابر! اپنا یہ اونٹ مجھے بیچو گے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اسے آپ کو ہبہ کرتا ہوں۔ فرمایا نہیں۔ میں خرید کر لوں گا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پھر آپ اس کی قیمت لگائیے۔ فرمایا: ایک درہم میں لوں گا۔ میں نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ۔ ایک درہم میں تو میرا گھاٹا ہے۔ فرمایا: "دو درہم لے لو۔" میں نے پھر بھی انکار کیا۔ اسی طرح آپ اس کی قیمت بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ ایک اوقیہ لگا دی۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ٹھیک ہے، لے لیجئے۔ فرمایا: لے لیا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: جابر! کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟ میں نے عرض کیا: ہاں اے اللہ کے رسول! فرمایا: شوہر دیدہ سے یا کنواری سے؟ عرض کیا: کنواری سے نہیں بلکہ شوہر دیدہ سے کی ہے۔ فرمایا: کسی نوعمر سے شادی کیوں نہیں کی کہ اس کے ساتھ کھیل کود کرتے؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے باپ غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے اور انہوں نے اپنے پیچھے سات لڑکیاں چھوڑی تھیں۔ اس لیے میں نے چاہا کہ ایک ایسی عورت سے شادی کروں جو انہیں سنبھال کر رکھ سکے اور ان کی دیکھ بھال کر سکے۔ فرمایا: تم نے اچھا کیا۔ انشاء اللہ اس میں خیر ہو گا۔ پھر آں حضرت ﷺ نے فرمایا: جب ہم "صرار" [53] پہنچیں گے تو وہاں اونٹ ذبح کروادیں گے اور دن بھر وہیں ٹھہریں گے۔ تمہاری بیوی کو ہم لوگوں کے واپس آنے کی خبر ہو گی تو تمہارے لیے گاؤ تکیے جھاڑ پونچھ کر ٹھیک کرے گی۔ [54] میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم ہمارے پاس گاؤ تکیے نہیں ہیں۔ فرمایا: وہ بھی ہو جائیں گے۔ جب گھر پہنچنا تو ہوشیاری سے کام کرنا۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: جب ہم صرار پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اونٹ ذبح کیے گئے۔ پورا دن ہم وہیں ٹھہرے رہے۔ جب شام ہو گئی تو آپؐ کے ساتھ ہم مدینہ میں داخل ہوئے۔

[52] روایت میں "یواهق" کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں مقابلہ کرنا۔

[53] صرار مدینہ کے مضافات میں ایک جگہ کا نام ہے۔

[54] روایت میں نمارق کا لفظ ہے جو نمرقة کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں گاؤ تکیہ۔ مطلب یہ کہ جب تمہاری بیوی کو تمہارے واپس آنے کی خبر ہو گی تو تمہارے استقبال کے لیے گھر کو صاف ستھرا کرے گی۔

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: اگلے دن صبح میں اونٹ لے کر آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اونٹ کو میں نے آپ کے گھر کے دروازے پر بٹھادیا اور خود قریب ہی مسجد میں جاکر بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نکلے تو اونٹ پر نظر پڑی۔ فرمایا: یہ کیا؟ وہاں موجود لوگوں نے کہا: اس اونٹ کو جابر لے کر آئے ہیں۔ فرمایا: کہاں ہیں؟ مجھے بلایا گیا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: بھتیجے! اپنا اونٹ لے جاؤ۔ وہ تمہارا ہے۔ پھر حضرت بلالؓ کو بلا کر فرمایا۔ جابر کو لے جاؤ اور اسے ایک اوقیہ دے دو۔ میں بلال کے ساتھ گیا۔ انہوں نے مجھے ایک اوقیہ، بلکہ اس سے کچھ زیادہ دیا۔ اللہ کی قسم! اس مال میں برابر اضافہ ہوتا رہا اور اس سے میرے پاس اتنا کچھ ہو گیا کہ میرے گھر سے دکھائی دیتا تھا۔ [۵۵]

دروس ونصائح

۱۔ اس غزوہ کا زمانۂ وقوع:

علمائے مغازی وسیر کا اتفاق ہے - جیسا کہ پیچھے ہم نے ذکر کیا - کہ غزوۂ ذات الرقاع غزوۂ خیبر سے قبل پیش آیا تھا۔ پھر ان میں سے بیشتر نے غزوۂ بنو نضیر کے بعد ۴ھ میں اس کے وقوع کو ترجیح دی ہے۔ اور بعض اصحاب سیر مثلاً ابن سعد اور ابن حبان کا خیال ہے کہ وہ ۵ھ میں پیش آیا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں صراحت کی ہے کہ غزوہ ذات الرقاع غزوۂ خیبر کے بعد پیش آیا۔ اس کے باوجود انہوں نے ترتیب میں اسے غزوۂ خیبر سے قبل ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی امام بخاری کی رائے کو ترجیح دی ہے اور اس کی دلیل یہ پیش کی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے غزوۂ ذات الرقاع میں صلوٰۃ الخوف پڑھی تھی جب کہ غزوۂ خندق میں نہیں پڑھی تھی اور نماز کا وقت نکل جانے پر اس کی قضا کی تھی۔ اسی طرح انہوں نے صحیحین کی اس روایت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا ہے کہ کس طرح غزوۂ ذات الرقاع میں چلتے چلتے ان کے قدم زخمی ہو گئے تھے اور انہوں نے ان پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔

۵۵ یہ واقعہ ان الفاظ میں ابن اسحاق نے بیان کیا ہے جیسا کہ سیرت ابن ہشام میں مذکور ہے۔ بخاری اور مسلم کے الفاظ اس سے ملتے جلتے ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ مہاجرین حبشہ میں سے ہیں۔ وہ غزوۂ خیبر کے بعد حبشہ سے واپس آئے تھے۔ ان دلائل کی روشنی میں ابن القیم کو غزوۂ ذات الرقاع کے زمانۂ وقوع کی تعیین میں دشواری ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ ذات الرقاع غالباً غزوۂ خندق کے بعد پیش آیا۔ [۵۶]

لیکن بعض قرائن ایسے ہیں جن کی بنا پر غزوہ ذات الرقاع کا غزوہ خندق سے قبل ہونا متعین ہو جاتا ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے گھر جانے کی اجازت چاہی۔ گھر جاکر انہوں نے اپنی بیوی کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔ آگے اسی حدیث میں ہے کہ حضرت جابرؓ نے رسول اللہ ﷺ اور بعض صحابہ کو کھانے کی دعوت دی۔ اسی میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت جابرؓ کی بیوی سے فرمایا: "یہ خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی کھلاؤ۔ اس لیے کہ لوگ قحط میں مبتلا ہیں" صحیحین ہی میں یہ حدیث بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ ذات الرقاع میں حضرت جابرؓ سے دریافت فرمایا: کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں اے اللہ کے رسول (پوری حدیث اوپر گزر چکی ہے) اس کا مطلب ہے کہ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر آں حضرت ﷺ کو ان کی شادی کا علم نہیں تھا۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ ذات الرقاع غزوۂ خیبر ہی نہیں بلکہ غزوۂ احزاب سے بھی قبل پیش آیا تھا۔

میرے علم میں نہیں کہ جو لوگ غزوۂ احزاب کو غزوۂ ذات الرقاع کے بعد قرار دیتے ہیں ان میں سے کسی نے اس حدیث سے استدلال کیا ہو۔ یا جن لوگوں کی رائے اس کے برعکس ہے ان میں سے کسی نے اس حدیث کی کوئی توجیہ پیش کی ہو۔ لیکن بہرحال یہ ہماری رائے کی ایک تقریباً قطعی دلیل ہے۔

رہی حافظ ابن حجرؒ کی یہ دلیل کہ آں حضرت ﷺ نے غزوۂ احزاب میں صلوٰۃ الخوف نہیں پڑھی تھی بلکہ ایک نماز کا وقت گزر جانے کے بعد اس کی قضا کی تھی تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ممکن ہے اس موقعے پر تاخیر سے نماز ادا کرنے کی وجہ یہ ہو کہ مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان اتنی شدید تیراندازی ہو رہی تھی کہ نماز ادا کرنے کا بالکل موقع نہ مل سکا۔ یا ممکن ہے

۵۶ دیکھئے فتح الباری ۷/ ۲۹۴، عیون الاثر ۲/ ۵۳، زاد المعاد ۳/ ۱۱۱

دشمن قبلہ کی سمت ہیں ہو جب کہ غزوہ ذات الرقاع میں جب صلوٰۃ الخوف پڑھی گئی تھی، دشمن قبلہ کی سمت میں نہیں تھا، یا ممکن ہے آپ نے چھوٹ جانے والی نماز کی قضا کی مشروعیت بیان کرنے کے لیے ایسا کیا ہو۔ اسی طرح حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث سے ان کے استدلال کا بہت سے علمائے سیر و مغازی نے یہ جواب دیا ہے کہ ممکن ہے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے ذات الرقاع کہہ کر کوئی اور غزوہ مراد لیا ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے: "ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں نکلے۔ ہم چھ افراد تھے۔ ہمارے درمیان ایک اونٹ تھا جس پر ہم باری باری سوار ہوتے تھے" اور غزوہ ذات الرقاع جس کے بارے میں ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں اس میں مسلمانوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، لیکن اسے یہاں نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، خاص طور پر اس صورت میں جب کہ غزوۂ احزاب اور غزوۂ ذات الرقاع دونوں کے بارے میں حضرت جابرؓ کی حدیث سے قطعی طور پر علمائے مغازی کی اختیار کردہ رائے ثابت ہو چکی ہے۔

غزوۂ خندق کے موقعے پر آں حضرت ﷺ کے نماز کو تاخیر سے ادا کرنے اور اس سے متعلق مسائل واحکام پر مفصل گفتگو ہم ان شاء اللہ مناسب موقع سے کریں گے۔

اس غزوہ میں مسلمانوں کی کسی مشرک کے ساتھ جھڑپ نہیں ہوئی— جیسا کہ اوپر ملخص جائزہ میں بیان کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اس موقعے پر چند ایسے واقعات پیش آئے جن سے اہم نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا اور ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اوپر ہم نے اس موقع کے پانچ واقعات ذکر کیے ہیں۔ اب ہم ان سے حاصل ہونے والے دروس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۲۔ اس غزوہ کی وجہ تسمیہ اور اس سے حاصل ہونے والا اہم درس:

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے اس غزوہ یا کسی دوسرے غزوہ کی وجہ تسمیہ کے بارے میں جو روایت نقل کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصحاب رسول اپنے رب کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے میں کتنی تکلیفیں اٹھاتے

تھے۔ وہ لوگ غربت کی زندگی بسر کرتے تھے ان کے پاس غزوات میں شریک ہونے اور جہاد کرنے کے لیے سواری تک نہ ہوتی تھی۔ طویل اور پُر مشقت مسافت طے کرنے کے لیے چھ چھ سات سات آدمی یکے بعد دیگرے ایک اونٹ پر سواری کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی غربت دعوت الی اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی۔ انہوں نے اس راہ میں تمام تکلیفیں برداشت کیں اور ہر طرح کی آزمائشیں جھیلیں، دشوار گزار اور کانٹوں بھری راہوں پر دیر تک چلنے کی وجہ سے ان کے قدم زخمی ہو گئے، پتھروں اور چٹانوں سے پیر ٹکرانے کی وجہ سے ان کے ناخن گر گئے اور گوشت دکھائی دینے لگا، چنانچہ وہ تکلیفوں کو انگیز کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک پٹیاں باندھتے رہے!!... اس کے باوجود انہوں نے کمزوری دکھائی نہ عاجزی و درماندگی کا مظاہرہ کیا۔ دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان کے کاندھوں پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو عظیم ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی انجام دہی کی راہ میں انہوں نے ہر طرح کی تکلیف اور پریشانی کو ہیچ جانا۔ ان کی ذات سے اس ارشاد باری کی ترجمانی ہوتی تھی:

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ. (التوبہ۔۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔

پھر آپ نے دیکھا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو اس پر ندامت ہوئی کہ جب لوگوں نے ان سے غزوۂ ذات الرقاع کی وجہ تسمیہ دریافت کی تھی تو کیوں انہوں نے یہ بات بتادی۔ انہیں اس غزوہ میں اتنی مشقت اٹھانے کا تذکرہ ناگوار ہوا اور اس پر شرمندگی ہوئی۔ اس لیے کہ اس تذکرہ سے ان کے اس عمل کا افشا ہو گیا تھا جس کا اجر وہ صرف اللہ تعالیٰ سے چاہتے تھے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ اپنے نیک اعمال اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں پہنچنے والی مشقتوں کو مخفی رکھے، اور ان میں سے کسی چیز کا اظہار نہ کرے، اِلّا یہ کہ کوئی مصلحت متقاضی ہو، مثلاً اس چیز کا حکم بیان کرنا ہو، یا اس کی اقتدا پر دوسروں کو ابھارنا ہو، یا اسی طرح کی کوئی اور مصلحت ہو۔ سلف میں سے بعض لوگوں سے ان کے

اعمال صالحہ کا جو تذکرہ منقول ہے اس کو اسی پر محمول کیا گیا ہے۔" ۵۷

۳۔ صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت اور اس کا طریقہ:

اس غزوہ میں رسول اللہ نے صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ جس طریقے سے نماز ادا کی اس کی بنیاد پر صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت ہوئی۔

صلوٰۃ الخوف کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ اس وقت کے لیے ہے جب دشمن قبلہ کی سمت میں ہو اور دوسرا طریقہ اس وقت کے لیے ہے جب دشمن قبلہ کے علاوہ کسی دوسری سمت میں ہو۔ غزوۂ ذات الرقاع میں رسول اللہ ﷺ نے دوسرا طریقہ اختیار فرمایا۔ نماز کا وقت ہوگیا تھا اور دشمن مسلمانوں کے گرد قبلہ کی سمت کے علاوہ دوسری سمتوں میں موجود تھے۔ اندیشہ تھا کہ وہ دور سے مسلمانوں کی تاک میں ہیں۔ اگر انہوں نے دیکھا کہ مسلمان سب کے سب میدان سے ہٹ کر نماز میں مشغول ہوگئے ہیں تو دھاوا بول دیں گے اور تلواروں کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو جائیں گے۔

اس لیے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کی ایک جماعت کے ساتھ نماز شروع کی اور صحابہ کی دوسری جماعت مختلف سمتوں میں دشمن پر نگاہ جمائے رہی۔ جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی نصف نماز (یعنی ایک رکعت) پوری کرلی تو مقتدی صحابہ آپ سے الگ ہوگئے اور جلدی جلدی انہوں نے دوسری رکعت پوری کرلی۔ رسول اللہ ﷺ دوسری رکعت کے شروع میں کھڑے رہے۔ نماز پوری کرکے ان لوگوں نے اپنے بھائیوں کی جگہ سنبھال لی اور وہ لوگ آکر آپ کی اقتداء میں نماز میں شامل ہوگئے، تب آپؐ نے دوسری رکعت پڑھائی جو ان لوگوں کی پہلی رکعت تھی۔ پھر ان لوگوں نے کھڑے ہوکر اپنی دوسری رکعت پوری کی اور نبی ﷺ قعدہ میں ان کا انتظار کرتے رہے۔ پھر ان لوگوں نے آپ کے ساتھ سلام پھیرا۔

صحابہ نماز کے لیے دو جماعتیں الگ الگ کرسکتے تھے۔ اس کے باوجود اس انداز سے نماز ادا کرنے کے دو اسباب ہیں:

اول: اس طریقۂ نماز سے تمام صحابہ کا رسول اللہ ﷺ کی اقتدا میں اکٹھا ہونا مقصود تھا۔ اور یہ

۵۷ دیکھئے صحیح مسلم کی شرح نووی ۱۲/ ۱۹۷-۱۹۸

ایسی فضیلت تھی کہ اگر اسے حاصل کرنا ممکن ہو تو اسے چھوڑ کر دوسرا طریقہ نہیں اختیار کیا جاسکتا۔

دوم: جہاں تک ممکن ہو ایک ہی جماعت مستحب ہے۔ بلا ضرورت لوگوں کو متعدد جماعتوں میں بانٹنا، جو یکے بعد دیگرے کسی فریضہ کو ادا کرے، مکروہ ہے۔

حضرات حنفیہ نے صرف اول الذکر سبب کو پیش نظر رکھا ہے، اسی لیے ان کی رائے ہے کہ اس طریقۂ نماز کی مشروعیت نبی ﷺ کی وفات کے بعد باقی رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اپنے نبی کی حفاظت کا خصوصی انتظام:

وہ واقعہ جس میں ایک مشرک نے رسول اللہ ﷺ کی تلوار اٹھالی تھی، جب کہ آپ ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے ... صحیح حدیث سے ثابت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل اپنے نبی کی کس حد تک نگرانی اور حفاظت فرماتا تھا۔ اس واقعے سے ان خوارق پر یقین میں بھی اضافہ ہوگا جنہیں اللہ عزوجل نے آں حضرت ﷺ کے ذریعے ظاہر کیا تھا۔ اس سے آں حضرت ﷺ کی شخصیت کے نبوی پہلو پر ایمان و یقین میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس مشرک نے نبی ﷺ کی تلوار اٹھا کر آپ پر سونت لی تھی، جب کہ آپؐ اس وقت تن تنہا اور نیند میں غرق تھے۔ اس حالت میں اس مشرک کے لیے آسان اور فطری تھا کہ تلوار کا وار کرکے آپ کا کام تمام کردے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت وہ مشرک بہت پُر اعتماد تھا اور اس سنہری موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے کہا: تمہیں مجھ سے کون بچائے گا؟ لیکن اچانک کیا ہوا کہ وہ قتل کرنے سے رک گیا؟ جو کچھ ہوا اس کا اس مشرک کو بالکل اندازہ نہیں تھا اور وہ اسے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اللہ نے آپ کی نگہبانی فرمائی اور آپ کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ مشرک کے دل پر رعب طاری ہوگیا اور اس کے بازوؤں میں لرزہ آگیا جس سے تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرگئی۔ پھر وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے باادب سر جھکائے ہوئے بیٹھ گیا۔

اس واقعہ سے سب سے اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق ہے:

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ. (المائدہ-۶۷)

اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔

"بچانے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو اپنی قوم کی طرف سے کوئی تکلیف ہی نہیں پہنچے گی۔ اس لیے کہ یہ تو بندوں کے معاملے میں اللہ کی سنت ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی ہاتھ آپ کو قتل کرنے کے ارادہ سے نہ اٹھ سکے گا، اس لیے کہ اس صورت میں اسلامی دعوت کا کام رک جائے گا جس کے لیے آپ کی بعثت ہوئی تھی۔

۵۔ صحابہ کرام کے ساتھ آں حضرت ﷺ کے حسنِ معاملہ کی ایک دل آویز مثال:

ہم نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کا واقعہ اور مدینہ واپسی کے راستے میں ان کے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان ہونے والی گفتگو نقل کی ہے، حالانکہ اس کا اس غزوہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے اس چیز کی مکمل اور دقیق تصویر کشی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا برتاؤ اپنے اصحاب کے ساتھ کیسا تھا؟ آپ کی معاشرت کتنی لطیف، آپ کی گفتگو کتنی ہلکی پھلکی اور آپ کی بات چیت کتنی دل آویز تھی اور آپ اپنے اصحاب سے کتنی شدید محبت رکھتے تھے۔

حضرت جابرؓ کے اس واقعے میں جو ہم نے گذشتہ سطور میں بیان کیا ہے جب آپ اچھی طرح غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نبی ﷺ ان آزمائشی حالات سے دل گرفتہ تھے جن سے حضرت جابرؓ بن عبداللہؓ کا گھرانہ دوچار ہوا تھا۔ ان کے والد غزوۂ احد میں شہید ہوگئے تھے اور انہوں نے اپنے پیچھے بہت سی اولادیں چھوڑی تھیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے پورے گھرانے کی کفالت اور ان بچوں کی دیکھ بھال ان کے ذمہ آگئی تھی۔ ساتھ ہی وہ تنگ حال تھے، انہیں دنیاوی عیش و آرام میسر نہ تھا۔

جب رسول اللہ ﷺ نے غزوہ سے واپسی میں محسوس کیا کہ حضرت جابرؓ کے لشکر سے پیچھے رہ جانے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس ایک ہی اونٹ ہے اور وہ بھی بہت لاغر ہے جس سے ان کی غربت و پریشان حالی کا اظہار ہو رہا ہے تو آپؐ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور قافلے سے پیچھے ہو کر ان سے جا ملے اور ان سے خوش طبعی کرتے ہوئے دل آویز اسلوب میں ان کی دل

جوئی کرنے لگے۔ اس وقت ان دونوں کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا (آں حضرت ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب اپنے اصحاب کے ساتھ کہیں جاتے تھے تو وقتاً فوقتاً ان میں سے ہر ایک کے احوال کا جائزہ لیتے تھے اور اس سے انس و محبت کی باتیں کرتے تھے۔)

آں حضرت ﷺ نے حضرت جابرؓ سے ان کا اونٹ خریدنے کی پیش کش کی۔ اس طرح آپ ان کا اکرام اور ان کی موجودہ حالت میں سدھار کے لیے کچھ تعاون کرنا چاہتے تھے۔ پھر آپؐ نے دل آویز اور شیریں اسلوب میں ان کی بیوی اور گھر کے بارے میں دریافت کیا اور انہیں اطمینان دلایا کہ وہ لوگ جب مدینہ کے قریب پہنچیں گے تو چند گھنٹے شہر کے باہر ٹھہریں گے، تاکہ اہلِ مدینہ کو ان کی واپسی کی خبر ہو جائے۔ ان کی بیوی بھی سنے تو بناؤ سنگار کر لے اور گھر کو ٹھیک ٹھاک کر کے گاؤ تکیے لگا لے۔ حضرت جابرؓ نے اسی اسلوب میں جواب دیا: "اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسول! ہمارے پاس گاؤ تکیے نہیں ہیں" آپؐ فرماتے ہیں "وہ بھی ہو جائیں گے۔"

آں حضرت ﷺ کی لطیف معاشرت، مانوس گفتگو، اپنے اصحاب کے ساتھ بات چیت میں مٹھاس بھری خوش طبعی کی یہ کتنی دل آویز تصویر ہے۔ آپ کی مجالس، غزوات اور اسفار میں ان کا مشاہدہ کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی تو ہمیں توفیق نہیں مل سکی، لیکن آپؐ کی سیرت اور آپؐ کے پاکیزہ واقعات سے ہم ان کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کو پڑھ اور سن کر ہمارے اندر آپؐ کے دیدار، آپ کی مجالس میں حاضری اور آپؐ کے ساتھ غزوات میں شرکت کا شوق ابھرتا ہے لیکن اس سے محروم ہیں۔ اے اللہ ان محرومیوں کے بدلے ہمیں اپنی جنت میں آپؐ کی صحبت کا شرف عطا فرما اور ہمیں اپنی خاص توفیق سے نواز کہ ہم تیرے دین کے راستے میں اور تیری شریعت کو نافذ کرنے کے لیے ہر آزمائش اور ہر تکلیف کو جھیلنے میں آپ کے طریقے کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور آپ کے نقشِ قدم پر چلیں۔

۶۔ احساسِ ذمہ داری کا ایک درخشاں نمونہ:

ضروری ہے کہ مسلمان ٹھہر کر ان دونوں صحابیوں کے واقعے میں طویل غور و فکر کرے جو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے گھاٹی کے ناکے کی حفاظت کر رہے تھے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اسلامی جہاد کا مزاج کیا ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ کے اصحاب کس طرح اسے سرانجام دیتے تھے؟

جہاں کوئی حرکی عمل نہیں ہے جس کی بنیاد محض مقاومت پر ہو۔ ان اولین مسلمانوں میں سے کسی نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کی اس مسخ شدہ تصویر کا تصور نہیں کیا تھا۔

جہاد— جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کو بتایا تھا اور جیسا کہ صحابہ نے سمجھا تھا— ایک عظیم عبادت ہے جس میں مسلمان کا پورا وجود اپنے خالق عزوجل سے جڑ جاتا ہے۔ وہ اسی کی بارگاہ میں اپنی جبین نیاز ٹیکتا، اسی کی مدد چاہتا اور اسی سے لو لگاتا ہے۔ اس لمحے سے زیادہ اور کسی لمحے میں مومن اپنے رب سے قریب نہیں ہوتا ہے جب وہ دنیا سے پیٹھ پھیر کر موت اور شہادت کو گلے لگانے کے لیے دیوانہ وار آگے بڑھتا ہے۔

اسی لیے ان صحابی (حضرت عباد بن بشرؓ) کے تعلق سے یہ چیز بالکل فطری تھی کہ وہ پہرہ دیتے ہوئے رات کا ایک حصہ خشوع و خضوع کے ساتھ چند رکعتوں کے لیے خاص کر دیں جن میں وہ اپنے رب کے حضور کھڑے ہوں اور ان کے تمام احساسات کتاب الٰہی کی چند آیات کی تلاوت کے ذریعے اس کی مناجات میں مشغول ہوں۔

یہ چیز بالکل فطری تھی کہ انہیں اس تیر کی بالکل پروانہ ہو جو تیزی سے آ کر ان کے جسم میں پیوست ہو گیا تھا اور نہ اس کے بعد آنے والے دوسرے تیر کی پروا ہو۔ اس لیے کہ ان کی بشریت اس لمحے اپنے تمام احساسات کے ساتھ اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ اور اپنے خالق سے مناجات کی لذت میں مدہوش تھی۔

پھر جب ان کا احساس واپس لوٹا اور انہیں اپنے جسم میں تیر لگنے کی خبر ہوئی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں زیادہ تکلیف کا احساس ہونے لگا تھا، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ انہیں خیال ہوا کہ جو ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے کہیں وہ ان کے مسلسل خاموش رہنے اور ان کی جان چلی جانے سے فوت نہ ہو جائے۔ اسی احساس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جلدی سے نماز پوری کر کے اپنے ساتھی کو بیدار کر دیں، تاکہ گھاٹی کے ناکے کی حفاظت کی جو امانت ان کے سپرد تھی وہ اس کے حوالے کر دیں۔

اے میرے مسلمان بھائی! ان صحابی کے اس قول میں غور کیجئے "اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ نے جس ناکے کی حفاظت کرنے کا مجھے حکم دیا ہے اس کی حفاظت میں مجھ سے کوتاہی ہو جائے گی تو میں نماز مختصر نہ کرتا، خواہ میری جان چلی جاتی۔"

یہ ہے اس جہاد کا مزاج جس میں مصروف رہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے فتح وکامرانی کی ضمانت دی ہے، خواہ ان کے خلاف حملہ آور ہونے والی اور ان کا محاصرہ کرنے والی طاقتیں کتنی ہی زور آور ہوں۔

اُس جہاد کا موازنہ اس (نام نہاد) جہاد سے کیجئے جس پر آج ہم فخر کرتے ہیں اور اس کا نعرہ لگاتے ہیں تو آپ کا کلیجہ حسرت وافسوس سے پھٹنے لگے گا۔

ان دونوں کا موازنہ کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام عدل قائم ہے۔ وہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

پھر اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائیے اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اہل باطل کے اعمال کی بنا پر ہلاک نہ کرے۔ کوشش کیجئے کہ آپ کی آنکھوں سے چند گرم گرم قطرے آپ کے ہاتھوں کو تر کر دیں۔ شاید کہ بندگی کا لبادہ اوڑھ کر ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سرخ رو ہو سکیں اور اپنی کوتاہیوں اور بداعمالیوں کے نتیجے میں جو سزا ہمارا مقدر بن چکی ہے، اس سے بچ سکیں۔

غزوۂ بنی المصطلق

(اسے غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے)

ابن اسحاقؒ اور بعض علمائے سیرت نے لکھا ہے کہ یہ ۶ھ میں پیش آیا۔ لیکن صحیح رائے جسے عام محققین نے اختیار کیا ہے، یہ ہے کہ اس کا وقوع ہجرت کے پانچویں سال شعبان میں ہوا۔ اس کی سب سے نمایاں دلیل یہ ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ اس موقع پر باحیات اور اس غزوہ میں شریک تھے۔ واقعہ افک میں بھی ان کا تذکرہ آتا ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ عنقریب بیان کی جائے گی۔ حضرت سعد بن معاذؓ کو غزوۂ خندق کے دوران ایک زخم لگ گیا تھا جس کی وجہ سے غزوہ بنی قریظہ کے موقع پر ان کی وفات ہو گئی تھی۔ غزوہ بنی قریظہ ۵ھ میں پیش آیا تھا جیسا کہ آگے اس کا بیان آتا ہے۔ پھر حضرت سعدؓ اپنی وفات کے ایک سال بعد کیونکر زندہ رہ سکتے ہیں۔ ۵۸

اس غزوہ کا سبب یہ تھا کہ نبی ﷺ کو خبر ملی کہ بنو مصطلق حارث بن ضرار کی سربراہی میں جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ان کی سرکوبی کے لیے نکلے۔ یہاں تک کہ مریسیع نامی چشمے پر انہیں جالیا۔ دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ اللہ نے بنو مصطلق کو شکست دی اور ان کے متعدد لوگ مارے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت کے پانچ حصے کر کے چار حصے فوج میں تقسیم فرما دیے، آپ ﷺ نے شہ سواروں کو پیدل فوج کے مقابلے میں دوگنا عطا فرمایا۔ ۵۹

---

۵۸ اس دلیل کی تفصیل کے لیے دیکھیے فتح الباری، ابن حجر ۷/ ۳۰۴، زاد المعاد، ابن القیم ۲/ ۱۱۲، عیون الاثر، ابن سید الناس ۲/ ۹۳

۵۹ طبقات ابن سعد ۲/ ۱۰۶، سیرت ابن ہشام ۲/ ۲۹۰

اس غزوہ میں مسلمانوں کے ساتھ منافقین بھی بڑی تعداد میں شریک ہوئے جو کہ گذشتہ غزوات میں اکثر پیچھے رہ جاتے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان ہمیشہ فتح و کامرانی سے ہم کنار ہوتے ہیں، اس لیے مال غنیمت کی لالچ میں وہ بھی فوج میں شامل ہو گئے۔

بخاریؒ اور مسلمؒ نے دو مختلف سندوں سے روایت کیا ہے کہ اس غزوہ میں ہاتھ آنے والی عورتوں کو جب رسول اللہ ﷺ نے فوج میں تقسیم کیا تو بعض صحابہ نے آپؐ سے عزل کے بارے میں دریافت کیا۔ آپؐ نے جواب دیا: "ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قیامت تک جس روح کو بھی اس دنیا میں آنا ہے وہ آ کر رہے گی۔"

ابن سعدؒ نے اپنی طبقات میں اور ابن ہشامؒ نے اپنی سیرت میں روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک غلام جس کا نام جہجاہ بن سعید غفاری تھا اور سنان بن وبر جہنی دونوں مریسیع کے چشمے پر لڑ پڑے۔ اس وقت وہاں مسلمانوں کی ایک جمعیت موجود تھی اور نبی ﷺ بھی وہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ قریب تھا کہ بات بڑھ جائے۔ جہنی نے مدد کے لیے انصار کو پکارا "اے گروہ انصار۔" جہجاہ نے مہاجرین کو پکارا "اے گروہ مہاجرین۔" (لیکن چند لوگوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا) عبداللہ بن ابی کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت غصہ ہوا اور اس وقت جو لوگ اس کے پاس تھے ان سے کہنے لگا: کیا اب ان لوگوں کے حوصلے اتنے بلند ہو گئے ہیں؟! یہ لوگ ہمارے وطن میں ہم سے برابری کرتے اور ہم پر فخر جتاتے ہیں۔ اللہ کی قسم! ہمارا اور ان کا معاملہ ویسا ہی ہے جیسا اس مثال میں بیان کیا گیا ہے کہ "اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو وہ تمہی کو کاٹنے دوڑے گا" اللہ کی قسم جب ہم مدینہ واپس ہوں گے تو وہاں کے اشراف ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

اس کی یہ بات حضرت زید بن ارقمؓ نے سن لی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو اس کی خبر دی۔ اس وقت آپؐ کی مجلس میں حضرت عمرؓ موجود تھے۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول۔ عباد بن بشرؓ کو حکم دیجیے کہ جا کر اس کی گردن اڑا دیں۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "اے عمر کیا تم پسند کرو گے کہ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں؟ نہیں (میں ایسا نہیں کروں گا) البتہ لشکر کو کوچ کا حکم دو۔" یہ ایسا وقت تھا کہ اس میں رسول اللہ ﷺ عموماً سفر نہیں کرتے تھے۔ آپؐ کے حکم پر لشکر روانہ ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ اس دن مسلسل چلتے رہے یہاں تک کہ شام ہوگئی۔ رات بھر سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔ سفر جاری رہا یہاں تک کہ دن چڑھ گیا۔ اس وقت آپ نے قیام فرمایا۔ لوگ اس قدر تھک چکے تھے کہ زمین پر ان کی پیٹھ لگتے ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا اس لیے کیا تاکہ لوگوں کو اس بات کے سلسلے میں جو عبداللہ بن ابی نے گزشتہ دن کہی تھی، ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کا موقع ہی نہ ملے۔

سورۂ منافقون نازل ہوئی تو اس سے حضرت زید بن ارقمؓ کی اطلاع کی تصدیق ہوگئی جو انہوں نے عبداللہ بن ابی کے بارے میں آں حضرت ﷺ تک پہنچائی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَقُولُونَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ إِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (المنافقون۔۸)[٦٠]

یہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔

جب لشکر مدینہ واپس آگیا تو عبداللہ بن ابی کے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے باپ کی جو بات آپ تک پہنچی ہے اس کی بنا پر آپ اسے قتل کرنے والے ہیں۔ اگر واقعی آپ کا یہی ارادہ ہے تو مجھے ہی حکم دیں میں ابھی اس کا سر کاٹ لاتا ہوں۔ اللہ کی قسم پورے قبیلۂ خزرج کو معلوم ہے کہ مجھ سے زیادہ اپنے باپ کا فرماں بردار اور کوئی نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو

---

٦٠ اس روایت کو مذکورہ طریقے پر ابن اسحاق نے مرسل نقل کیا ہے۔ اور ان سے ابن سعد نے، اور بیہقی نے حضرت جابرؓ سے، احمد اور ابن جریر نے حضرت زید بن ارقم سے اور ابن ابی حاتم نے حضرت عمرو بن ثابت الانصاریؓ سے مختصراً روایت کیا ہے۔ یہ تمام روایات خلاصہ میں متفق اور تفصیل میں قریب ہیں اور ابن اسحاق کی روایت کے علاوہ جو کہ مرسل ہے، سب متصل الا[illegible] ہیں۔ نیز دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۴/ ۳۷۰، تاریخ ابن جریر ۲/ ۶۰۶، الفتح الربانی ۲۱/ ۷۰، ۱۸/ ۶۰
سیرت ابن ہشام ۲/ ۲۹۱

اسے قتل کرنے کا حکم دیں اور میں اپنے باپ کے قاتل کو گھومتا پھرتا نہ دیکھ سکوں اور غیرت و محبت کے جوش میں آکر اسے قتل کردوں۔ اس طرح ایک کافر کے بدلے ایک مومن کو قتل کرنے کا قصوروار اور جہنم کا مستحق ٹھہروں۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے، بلکہ وہ جب تک ہمارے درمیان ہے ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور اچھا سلوک کریں گے۔"

اس واقعے کے بعد جب بھی عبداللہ بن ابی کوئی بات کہتا خود اس کے قبیلہ والے اسے ملامت کرتے اور سخت سست کہتے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن الخطابؓ سے فرمایا "اے عمر! تمہارا کیا خیال ہے؟ اگر میں نے اس دن اسے قتل کرادیا ہوتا جس دن تم نے مشورہ دیا تھا تو اس کے حمایتی طوفان کھڑا کردیتے۔ لیکن اگر آج میں اس کے قبیلے کو اسے قتل کرنے کا حکم دوں تو وہ فوراً اس کی تعمیل کریں گے۔" حضرت عمرؓ نے کہا: "اللہ کی قسم! مجھ پر واضح ہوگیا ہے کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ میری رائے سے زیادہ بابرکت تھا۔"

واقعۂ افک

اس غزوہ سے لوٹتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ واقعہ پیش آیا جو واقعۂ افک کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہم اس سلسلہ میں صحیحین میں مذکور روایت کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے کہ اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہ نکلی تھیں۔ فرماتی ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ اس غزوہ سے فارغ ہوگئے اور واپسی کا قصد فرمایا تو آپ نے رات میں کوچ کرنے کا حکم دیا۔ کوچ کی تیاریاں چل رہی تھیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی۔ جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا ہے۔ میں واپس جاکر اسے تلاش کرنے لگی۔ اس میں مجھے دیر لگ گئی۔ ادھر وہ لوگ جو مجھے ہودج میں سوار کراتے تھے، آئے۔ انہوں نے میرا ہودج اٹھایا اور اسے اس اونٹ پر رکھ دیا جس پر میں سوار ہوتی تھی۔ ہودج اٹھاتے وقت انہیں محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں -- یہ واقعہ حجاب کا حکم نازل ہونے کے بعد کا ہے -- پھر انہوں نے اونٹ کو اٹھایا اور روانہ ہوگئے میرا ہار اس وقت ملا جب قافلہ روانہ ہوچکا تھا۔ میں واپس قافلہ کی جائے قیام پر آئی تو وہاں

کوئی نہ تھا۔ میں اندازہ لگا کر ٹھیک اسی جگہ پہنچی جہاں میرا پڑاؤ تھا اور سوچا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں گے۔ صفوان بن معطلؓ لشکر کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ صبح کے وقت وہ اس جگہ سے گزرے جہاں میں تھی۔ انہوں نے ایک انسانی ہیولہ دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔ اس وقت میں نیند کے غلبے کی وجہ سے سو گئی تھی۔ مجھے پہچان کر انہوں نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھی۔ اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے فوراً اپنے چہرے پر چادر ڈال لی۔ اللہ کی قسم! ہم دونوں نے ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے علاوہ میں نے ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔ انہوں نے اپنا اونٹ لا کر میرے پاس بٹھا دیا۔ میں اٹھ کر اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے وقت ہم نے لشکر کو جا لیا جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھہرا ہی تھا۔ اس پر بہتان لگانے والوں نے بہتان لگا کر اپنی ہلاکت کا سامان کیا۔ ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "مدینہ پہنچ کر میں تقریباً ایک ماہ بیمار رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں مگر مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ البتہ مجھے جو چیز کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی توجہ میری طرف اس مرتبہ ویسی نہیں تھی جیسی میری بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں تشریف لاتے۔ بس سلام کرتے اور اتنا پوچھتے کیسی ہو؟ جب کمزوری بڑھ گئی تو ایک رات میں ام مسطح کے ساتھ رفع حاجت کے لیے شہر سے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلاء نہیں تھے۔ واپسی میں ام مسطح کا پیر چادر میں الجھ گیا جس سے انہیں ٹھوکر لگی۔ بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "غارت ہو مسطح" میں نے کہا: اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو اور بیٹا بھی وہ جس نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا: بیٹی کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: پھر انہوں نے سارا واقعہ سنایا کہ افتراء پرداز لوگ میرے متعلق کیا کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ یہ سن کر میری بیماری میں اور اضافہ ہو گیا۔ میں نے پوری رات رو رو کر کاٹی۔ نہ آنسو تھمنے کا نام لیتے تھے نہ نیند آتی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ میں اپنے بعض اصحاب سے مشورہ کیا۔ بعض لوگوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! آپ کے گھر والوں میں ہم نے بھلائی کے سوا کچھ نہیں پایا۔" اور بعض لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ

نے آپ پر تنگی نہیں رکھی ہے۔ عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی (یعنی بریرہ) کو بلا کر دریافت کر لیں۔ رسول اللہ ﷺ نے بریرہ کو بلا کر اس سے پوچھا کیا تم نے عائشہ کی جانب سے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جس سے کچھ شبہ ہو؟ اس نے جواب دیا کہ وہ ان کے بارے میں صرف خیر ہی جانتی ہے۔ آں حضرت ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ دیا جس میں فرمایا: "مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزام لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے؟ اللہ کی قسم! میں نے اپنے گھر والوں میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور جس شخص کے بارے میں وہ تہمت لگا رہے ہیں اس میں بھی میں نے کوئی برائی نہیں دیکھی۔" اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے اٹھ کر کہا: اے اللہ کے رسول! اس شخص کے حملوں سے میں آپ کو بچاؤں گا۔ اگر وہ ہمارے قبیلے (قبیلۂ اوس) کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں گے اور اگر وہ ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ حکم دیں، ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں" اس پر مسجد نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قریب تھا کہ لوگ مسجد ہی میں لڑ پڑتے، مگر رسول اللہ ﷺ نے انہیں خاموش کیا۔

آخر کار ایک روز رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ اس وقت میرے ماں باپ میرے پاس موجود تھے۔ میرے مسلسل رونے سے میرے والدین انتہائی پریشان تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ رونے سے میرا کلیجہ شق ہو جائے گا۔ جب سے یہ افواہ پھیلی تھی آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ اور تقریباً ایک ماہ ہونے کو تھا لیکن میرے سلسلے میں آپ پر کوئی وحی نہیں آئی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: آپ آکر بیٹھ گئے، کلمۂ شہادت پڑھا۔ پھر فرمایا: امابعد: اے عائشہ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں ملی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے اللہ تعالیٰ تمہاری براءت ظاہر فرما دے گا اور اگر واقعی تم نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرو۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ کی یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ آنکھوں سے ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ میں نے اپنے والد سے کہا کہ آپ میری طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بات کا جواب دیں۔ انہوں نے فرمایا: میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آپ ہی کچھ کہیں۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ "میں حیران ہوں کہ کیا کہوں۔" اس پر میں نے کہا: آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور وہ دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں

کہوں کہ میں بے گناہ ہوں --اور اللہ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں-- تو آپ لوگ نہ مانیں گے اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کرلوں جو میں نے نہیں کی --اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی-- تو آپ لوگ مان لیں گے۔ اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو یوسف علیہ السلام کے والد نے کہی تھی: فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ (میں اس پر بخوبی صبر کروں گا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ سے مدد چاہوں گا) یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: اللہ کی قسم! رسول اللہ ﷺ ابھی اسی مجلس میں تھے اور گھر والوں میں سے کوئی نہ اٹھا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر وحی نازل فرمائی۔ یکایک آپؐ پر وہ کیفیت طاری ہوئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتی کہ سخت جاڑے کے موسم میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ جب وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور بہت خوش تھے۔ آپؐ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ "مبارک ہو اے عائشہ! اللہ نے تمہاری براءت نازل فرمادی۔" میری والدہ نے کہا: ان کی طرف اٹھ کر جاؤ (یعنی ان کا شکریہ ادا کرو) میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نہ اٹھ کر ان کے پاس جاؤں گی اور نہ اللہ کے علاوہ کسی کا شکر ادا کروں گی۔ اسی نے میری براءت نازل کی ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں: اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی:

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ، لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ، لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ، وَالَّذِیْ تَوَلّٰی كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ. (النور۔۱۱)

جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا۔ اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: میرے والد مسطح پر اس سے قرابت داری اور اس کے فقر کی وجہ سے اس پر خرچ کرتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! اب میں اس پر

خرچ نہیں کروں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَالْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا، اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (النور۔۲۲)

تم میں سے جو لوگ صاحب فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی مدد نہ کریں گے۔ انہیں معاف کردینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟ اور اللہ کی صفت یہ ہے کہ وہ غفور ورحیم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت سن کر فرمایا: کیوں نہیں۔ اللہ کی قسم، میں چاہتا ہوں کہ اللہ میری مغفرت فرمادے۔ چنانچہ وہ مسطح پر اسی طرح خرچ کرنے لگے جس طرح پہلے کرتے تھے۔

پھر آں حضرت ﷺ نے باہر نکل کر لوگوں کے درمیان خطبہ دیا اور انہیں قرآن کی وہ آیات سنائیں جو اس موقع پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش کو حدِ قذف کے کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے یہ فعل سرزد ہوگیا تھا۔[۹۱]

دروس ونتائج

اس غزوہ سے درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ فوج کے درمیان مالِ غنیمت کی تقسیم کی مشروعیت:

اس غزوہ سے سلب اور مالِ غنیمت کا خمس (پانچواں حصہ) مستثنیٰ کرکے بقیہ مال غنیمت کی فوج کے درمیان تقسیم کی مشروعیت کا علم ہوتا ہے۔ سلب سے مراد وہ سامان ہے جو مقتول کے ساتھ ہو مثلاً ہتھیار وغیرہ۔ قاتل کے لیے اسے لینا جائز ہے۔ اس کی دلیل آں حضرت ﷺ کا

[۹۱] ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن اسحاق وغیرہ۔

یہ ارشاد ہے: "جو شخص جنگ میں کسی کو قتل کرے تو مقتول کا سامان اس کا ہے" اور خُمس کا استحقاق ان لوگوں کا ہے جن کا تذکرہ اس آیت کریمہ میں ہے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ. (الانفال۔۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

رہے بقیہ چار حصے (4/5) تو وہ فوج کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں گے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ تقسیم فرمادیا کرتے تھے۔

منقولہ اموال کے سلسلے میں یہ ائمہ کا متفقہ مسلک ہے۔ رہی غیر منقولہ جائیداد (زمین) تو اس کی تقسیم کے سلسلے میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کا تذکرہ ہم بنو نضیر کی جلاوطنی کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

۲۔ وقتِ جماع عزل یا تحدیدِ نسل کا حکم

دوسری چیز جو اس غزوہ سے معلوم ہوتی ہے وہ وقتِ جماع عزل کا حکم ہے۔ اسی سے متعلق مسئلہ نطفہ یا روح پڑنے سے قبل علقہ کے اسقاط کا ہے اور اسی سے متعلق وہ چیز بھی ہے جسے آج "تحدید نسل" کا نام دیا جاتا ہے۔

جو حدیث ہم نے اوپر پیش کی ہے اس میں عزل کے جواز کی صراحت ہے۔ صحابہ نے جب آں حضرت ﷺ سے یہ مسئلہ پوچھا تو آپ نے جواب دیا: "ایسا نہ کرنا تمہارے لیے ضروری نہیں۔" مسلم کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "ایسا نہ کرنا تمہارے لیے ضروری نہیں ہے۔ قیامت تک جس روح کو بھی اس دنیا میں آنا ہے وہ آکر رہے گی" یعنی عزل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ نے جو کچھ مقدر کر رکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ تمہارے کچھ کرنے سے تقدیر نہیں بدل جائے گی۔ اس سے زیادہ صریح وہ حدیث ہے جسے بخاری و مسلم نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں "ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں عزل کرتے تھے جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا" (یعنی اگر عزل کرنا غلط ہوتا تو وحی کے ذریعے اس کی ممانعت ہو جاتی)

اس بنا پر جمہور ائمہ عزل کے جواز کے قائل ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں انہوں نے بیوی کی رضامندی کی شرط عائد کی ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے اسے ضرر پہنچنے کا امکان رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا سبب غربت اور تنگ دستی کا اندیشہ ہے تو ایسا کرنا مکروہ ہے۔

ابن حزمؒ کی رائے جمہور کے مخالف ہے۔ وہ مطلق عزل کی حرمت کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل امام مسلمؒ کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جس میں نبی ﷺ سے عزل کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: "یہ خفیہ طریقے سے درگور کرنا ہے۔" ابن حزمؒ نے بعض دیگر احادیث سے بھی استدلال کیا ہے لیکن وہ سب کی سب صحابہ پر موقوف ہیں۔ مثلاً انہوں نے اپنی سند سے حضرت نافعؒ سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ عزل نہیں کرتے تھے اور فرماتے تھے: "اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ میرا کوئی بیٹا عزل کرتا ہے تو میں اسے سخت سزا دوں گا" اسی طرح انہوں نے حجاج بن منہال کی سند سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؓ عزل کو ناپسند کرتے تھے۔

حضرت جابرؓ کی حدیث جس سے جمہور نے استدلال کیا ہے، اس کے بارے میں ابن حزمؒ نے فرمایا ہے کہ وہ منسوخ ہے۔ [۶۲]

ابن حجرؒ نے فتح الباری میں ابن حزمؒ کی یہ رائے نقل کی ہے، پھر لکھا ہے: یہ رائے دو احادیث کے معارض ہے۔ پہلی حدیث ترمذیؒ اور نسائیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے انہوں نے فرمایا: "ہمارے پاس لونڈیاں تھیں اور ہم عزل کرتے تھے۔" یہود نے کہا: "یہ تو درگور کرنے کی ایک صورت ہے۔" اس پر رسول اللہ ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "یہود جھوٹ بولتے ہیں۔ اگر اللہ کسی کو پیدا کرنا چاہے تو تم اسے پیدا ہونے سے نہیں روک سکتے۔" دوسری حدیث امام نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ [۶۳]

یہ بات واضح ہے کہ عزل کے بارے میں آں حضرت ﷺ کا یہ فرمانا کہ "یہ خفیہ طریقے سے درگور کرنا ہے" اس کا مطلب اس کی تحریم نہیں ہے بلکہ آپؐ کے اس ارشاد کو دیگر ثابت شدہ احادیث کی روشنی میں نہی تنزیہی پر محمول کرنا زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ جمہور کا مسلک ہے۔

---

[۶۲] دیکھیے محلی، ابن حزم ۱۰/۸۷

[۶۳] ملاحظہ کیجیے فتح الباری ۹/۲۴۵

ابن حزمؒ کا یہ دعویٰ کہ عزل کو جائز قرار دینے والی احادیث منسوخ ہیں، اس کی تردید حضرت جابرؓ کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے جسے صحاح ستہ کے مؤلفین میں امام ابو داؤدؒ کے علاوہ سب نے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "ہم رسول اللہ کے عہد میں عزل کرتے تھے جب کہ قرآن نازل ہو رہا تھا" امام مسلمؒ کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے "اللہ کے نبی ﷺ کو یہ بات معلوم ہوئی لیکن آپ نے ہمیں اس سے منع نہیں کیا" اگر عزل کے جواز کا حکم آں حضرت ﷺ کی وفات تک باقی نہ ہوتا تو حضرت جابرؓ یہ بات نہ کہتے اور ضرور واضح کر دیتے کہ آخر میں اس سلسلے میں کیا شرعی حکم قرار پایا تھا؟

جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ نطفہ میں روح پڑنے سے قبل اس کے اسقاط کا وہی حکم ہے جو عزل کا ہے۔ بعض علماء ایسے ہیں جو عزل کے جواز کے قائل ہیں لیکن اسقاط کو حرام قرار دیتے ہیں۔ شاید اس معاملے میں انہوں نے اسقاط کو عزل پر قیاس کرنے سے احتراز کیا ہے اور مضغہ کو نطفہ کے مقابلے میں تخلیق کی صلاحیت سے زیادہ متصف سمجھا ہے۔ الا یہ کہ عزل پر اس کو قیاس نہ کرنے کا یہ محرک ہو کہ اسقاط کی وجہ سے حاملہ کی صحت کو ضرر لاحق ہوتا ہے۔

گذشتہ تفصیل کی روشنی میں تحدید نسل سے متعلق شرعی حکم بھی واضح ہو جاتا ہے۔ (تحدید نسل سے مراد عزل کے بجائے منع حمل کے لیے کوئی علاجی تدبیر اختیار کرنا ہے) اور وہ یہ کہ تحدید نسل جائز ہے اگر اس کے لیے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جنہیں جمہور ائمہ نے جائز قرار دیا ہے۔ بشرطیکہ اس میں بیوی کو کوئی ضرر لاحق ہونے کا گمان نہ ہو اور یہ زوجین کی باہمی رضامندی سے ہو۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے ائمہ فقہاء میں سے کسی کی رائے اس حکم کے مخالف ہے۔ سوائے شیخ عماد الدین بن یوسفؒ اور شیخ عز الدین بن عبد السلامؒ کے۔ حافظ ولی الدین عراقیؒ نے ان دونوں کی یہ رائے نقل کی ہے کہ عورت کے لیے کوئی ایسی دوا استعمال کرنا حرام ہے جس کے نتیجے میں استقرار حمل نہ ہو۔ ابن یونسؒ کہتے ہیں: خواہ اس میں شوہر کی مرضی شامل ہو۔ ۶۴

لیکن یہ رائے سنت کی دلالت اور اس پر مبنی جمہور کے مسلک کو دیکھتے ہوئے قابل حجت نہیں ہے۔

۶۴ دیکھیے طرح التقریب وشرحہ، حافظ عراقی ۸/۶۴

یہاں یہ جاننا بہت اہم ہے کہ عزل یا تحدید نسل کی اباحت کا حکم خارج سے کسی دباؤ یا ہدایت کے بغیر زوجین کی اپنی رضامندی پر موقوف ہے۔ بسا اوقات جو کام متعلق فرد کے لیے انفرادی طور پر جائز ہو اسے قانون بنا کر تمام لوگوں کو اسے انجام دینے پر مجبور کرنا جائز نہیں ہوتا۔ یہ متفقہ فقہی قواعد میں سے ہے۔

مثلاً طلاق ایک ایسا حق ہے جس کا استعمال شادی شدہ شخص کے لیے ضرورت یا مصلحت کے وقت جائز ہے۔ لیکن حکمراں کو یہ اختیار نہیں کہ وہ لوگوں کو جبری یا تادیبی طور پر یا مشورۃً اس حق کو استعمال کرنے کا حکم دے کہ وہ اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں۔ تحدید نسل کا معاملہ بھی ٹھیک طلاق جیسا ہے۔ اس اہم قاعدہ کو اچھی طرح ذہن نشین کرنا اور سمجھنا ضروری ہے تاکہ ان لوگوں کی باتوں سے آپ دھوکہ میں نہ مبتلا ہوں جو آج فتویٰ گری کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ "سنت نے تحدید نسل کو جائز قرار دیا ہے، اور یہ دلیل ہے اس بات کی کہ ریاست کو اختیار حاصل ہے کہ لوگوں کو اس پر آمادہ کرنے کے لیے جو وسائل چاہے اختیار کرے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل اور اس مدلول کے درمیان مطلق کوئی تعلق نہیں ہے، اپنے خود ساختہ نظریہ پر ناحق سنت کو دلیل بنایا گیا ہے۔

حاصل یہ کہ عزل یا تحدید نسل کے معاملہ کو اگر زوجین کے باہمی تعلقات، حقوق اور مصالح کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ایک آسان معاملہ ہے اور اس میں کوئی دشواری نہیں، جیسا کہ گذشتہ بحث سے واضح ہوا۔ لیکن اگر اسے اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کی طرف عام لوگوں کو دعوت دی جائے اور انہیں اسے اختیار کرنے پر ابھارا جائے اور اس کی بنیاد ایک ایسے رہنما فلسفہ پر ہو جس کو رواج دینے کے لیے تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جائے تو اس وقت یہ معاملہ بہت زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ اور اس وقت اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مسلمان اس کی خطرناکی کو سمجھتے ہوئے شدت سے اس کی مخالفت کریں۔ وہ مختلف پُر فریب منصوبوں کو سمجھیں جو دشمنانِ اسلام ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے بناتے ہیں۔ اور پیداوار کی قلت اور معاش کی مشکلات کی جو افواہیں پھیلائی جاتی ہیں ان سے دھوکہ نہ کھائیں، اس لیے کہ یہ بھی اسی منصوبے کا ایک حصہ ہے۔

۳۔ معاملات سلجھانے اور لوگوں کی تربیت کرنے میں نبی ﷺ کا حکیمانہ طرزِ عمل:

عبداللہ بن ابی کے پیدا کردہ مسئلے کو جس خوب صورت طریقے سے نبی ﷺ نے حل کیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معاملات نمٹانے، لوگوں کی تربیت کرنے اور ان کے مسائل کو قابو میں کرنے کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ابن ابی کی جو باتیں آپؐ تک پہنچی تھیں وہ اس بات کے لیے کافی تھیں کہ آپؐ اس کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے اس کے قتل کا حکم دے دیں۔ لیکن آپ نے اس معاملے کو زیادہ کشادہ دلی سے لیا۔ آپ کو لوگوں کے شور و ہنگامہ اور آویزش کی خبر ملی۔ اس وقت لشکر میں منافقین کی بڑی تعداد تھی جو اس قسم کی کسی چیز کی تلاش میں رہتے ہیں، تاکہ اس کی بنیاد پر فتنہ پھیلا سکیں۔ اس لیے آپؐ نے اس معاملہ کو حل کرنے میں جذباتیت اور انفعالیت کا مظاہرہ نہیں کیا، بلکہ اس کے لیے بڑا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا۔ آپؐ نے لوگوں کو ایسے وقت میں کوچ کرنے کا حکم دیا جس میں وہ اس کے عادی نہیں تھے، تاکہ انہیں اس موضوع پر ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ آپ اس دن کا بقیہ حصہ، پوری رات اور دوسرے دن کے ابتدائی حصے تک برابر چلتے رہے، آپ نے بالکل موقع ہی نہ دیا کہ منافقین فتنہ انگیزی کے لیے فرصت پاسکیں۔ اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب زمین پر ان کے پیر ٹکے تو تھکن سے اتنے نڈھال تھے کہ کوئی بات کرنے کی انہیں فرصت نہ تھی اور سب لوگ گہری نیند سوگئے۔

لوگوں کو انتظار تھا کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ پہنچیں گے تو منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آئیں گے، اور یقیناً اس کا اظہار عبداللہ بن ابی کے قتل کی صورت میں ہوگا، اسی لیے اس کے صاحب زادے جن کا نام بھی عبداللہ تھا اور جو مخلص صحابہ میں سے تھے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر واقعی آپ نے اس کا فیصلہ کرلیا ہے تو اس کام کو انہی کے حوالے کریں۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انہیں ایسا جواب دیا جس کی انہیں توقع نہیں تھی۔ آپؐ نے فرمایا: "نہیں ہم ایسا نہیں کریں گے، بلکہ وہ جب تک ہمارے درمیان ہیں ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور اچھا سلوک کریں گے" دیکھئے یہی حکمت اس وقت بھی حضرت ﷺ کے پیش نظر تھی جب آپؐ نے عمرؓ سے فرمایا تھا: "اے عمر! کیا تم پسند کرو گے کہ لوگوں میں یہ چرچا ہونے لگے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کردیتے ہیں؟"

اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبداللہ بن ابی کے قبیلے نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب وہ ایسی ویسی کوئی بات کہتا تو وہی لوگ اس کو سخت سست کہتے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔ اور یہ بات آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ منافق دنیاوی احکام قضا میں مسلمان سمجھا جاتا ہے، البتہ اس سے تحفظ اور احتیاط ضروری ہے۔

حکمت و سیاست اور معاملات کو خوب صورتی سے نمٹانے کی جن اعلیٰ صفات سے آں حضرت ﷺ متصف تھے ان میں غور و خوض سے قبل ایک بار پھر یہ یاد دہانی کرادینی ضروری ہے کہ یہ تمام صفات آپؐ کی صفتِ نبوت کا پرتو تھیں۔ ان سب کا سرچشمہ آپ کا شرف نبوت و رسالت سے بہرہ ور ہونا تھا۔ یہ فاش غلطی ہے کہ کوئی تحقیق کرنے والا آں حضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پائی جانے والی ان صفات کا تجزیہ انہیں ان کے اولین اساسی سرچشمہ -- یعنی آپ کی نبوت و رسالت -- سے جوڑے بغیر کرے۔ اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں یہ ایک منصوبہ ہے جسے فکری محاذ پر یلغار کرنے والوں نے تیار کیا ہے، تاکہ مسلمانوں کو آں حضرت ﷺ کی نبوت میں غور کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے اور ان کے اس منصوبے کو وہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لے لیں جو اندھی تقلید میں بندروں سے بھی بڑھ کر ہیں۔

۴۔ نبی ﷺ کو پہنچنے والی اذیتوں کی ایک نئی کڑی:

رہا واقعہ افک تو یہ اذیتوں اور آزمائشوں کے سلسلے کی ایک نئی کڑی تھی جس کا رسول اللہ ﷺ کو دشمنانِ دین کی جانب سے سامنا تھا۔ اس اذیت کا اثر آں حضرت ﷺ کے نفس پر گذشتہ تمام آزمائشوں سے زیادہ تھا۔ منافقین کی جانب سے ظاہر ہونے والے فتنے کا یہی مزاج ہوتا ہے۔ وہ دوسرے فتنوں کے مقابلے میں شرانگیز ہوتا ہے اور اس کی خطرناکی اور ضرر دوسروں سے کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس لیے کہ دوسروں کے مقابلے میں منافقین کو اس کے زیادہ مواقع اور ذرائع حاصل ہوتے ہیں۔ واقعہ افک منافقین کے ذریعے برپا کیے گئے فتنہ کا ایک منفرد انداز تھا۔

اس واقعے سے نبی ﷺ کو سب سے زیادہ اذیت پہنچی۔ اس لیے کہ اس سے قبل آپ نے

جو آزمائشیں جھیلی تھیں (جن میں سے کچھ کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں) وہ ایسے امور تھے جن کی آپ کو پہلے سے توقع تھی۔ اس لیے آپ نے انہیں قبول کرنے اور ان کا سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا، بلکہ راہِ دعوت میں ان کا ایک وقت متعین تھا۔ رہی یہ آزمائش تو اس سے آپ کو اچانک سابقہ پیش آیا تھا۔ آپؐ اس کے عادی تھے نہ آپ کو اس کی کچھ توقع تھی۔ یہ ایک ایسی افواہ تھی کہ اگر یہ صحیح ثابت ہو جاتی تو آپ کی عزیز ترین شئی پر کاری ضرب ہوتی۔ کسی بھی انسان کے نزدیک اس کی عزیز ترین شئی عزت و کرامت ہوتی ہے-- آپ سوچتے تھے کہ معلوم نہیں یہ افواہ صحیح ہے یا غلط؟ اسی لیے یہ اذیت گذشتہ تمام اذیتوں سے سوا تھی۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آپ کا نفسانی شعور ایسے سخت اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا جس سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود اگر وحی کے ذریعے جلد ہی اس کی حقیقت واضح کر دی گئی ہوتی اور منافقین کی بہتان طرازی کا پردہ چاک کر دیا گیا ہوتا تو آپؐ کو اس اضطراب اور ان شکوک و شبہات سے نجات مل جاتی، لیکن وحی ایک ماہ سے زائد رکی رہی اور اس کے ذریعے صورتِ حال کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہ قلق و اضطراب اور شکوک و شبہات کی دوسری وجہ تھی۔

اس کے باوجود بہتان کی یہ آزمائش ایک الٰہی حکمت پر مشتمل تھی۔ اس کے ذریعے نبی ﷺ کی شخصیت نمایاں ہوئی اور ان تمام چیزوں سے الگ ہو کر اور نکھر کر سامنے آئی جو اس کی شفافیت کو گدلا کر رہی تھیں۔ اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو اس کا احتمال تھا کہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں نبوت کا مفہوم، آپؐ پر ایمان لانے والوں اور آپ کا انکار کرنے والوں دونوں کے تصور میں نکھر نہ پاتا۔ اس واقعے نے نبی ﷺ کی شخصیت کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کا انسانی پہلو خالص نبوت کے مفہوم سے الگ ہو گیا۔ اس طرح نبوت اور وحی کا مفہوم نگاہوں اور افکار میں پوری طرح نکھر گیا اور اس میں اور دیگر نفسیاتی یا شعوری مفاہیم میں سے کسی مفہوم میں التباس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

یہ افواہ نبی ﷺ کے کانوں میں پڑی۔ اس وقت آپ اپنی عام انسانیت کے دائرہ میں تھے۔ انبیاء اور رسولوں کے لیے معروف عصمت کے حدود میں عام لوگوں کی طرح غور و فکر کرتے اور کام انجام دیتے تھے۔ اس افواہ کا اثر آپ پر ویسے ہی ہوا جیسے دوسرے انسانوں پر ہوتا

ہے۔ آپ کو پوشیدہ غیب کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ نہ آپ نے لوگوں کے دلوں میں جھانک کر دیکھا تھا اور نہ آپ کو اس کی خبر تھی کہ یہ جھوٹ اور بہتان ہے جو آپ کے خلاف تراشا گیا ہے۔ اس لیے اس افواہ کو سن کر آپ بھی اسی طرح پریشان ہوئے جس طرح دوسرے انسان پریشان ہوتے ہیں۔ اور آپ کے دل میں بھی اسی طرح شک پیدا ہوا جس طرح دوسرے انسانوں کے دلوں میں شک پیدا ہوتا ہے۔ آپ اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگے اور اس سلسلے میں آپ نے اپنے اصحاب الرائے صحابہ سے بھی مشورہ کیا۔

آں حضرت ﷺ کی ذات میں اس خالص انسانی پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ وحی کا نزول کچھ مدت تک موخر رہے، تاکہ لوگوں پر دو حقیقتیں واضح ہو جائیں۔ ان میں سے ہر حقیقت انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔

پہلی حقیقت یہ کہ نبی ﷺ اپنی نبوت اور رسالت کی وجہ سے اپنی بشری حیثیت سے خارج نہیں ہو گئے تھے۔ اس لیے آپ پر ایمان لانے والے کسی شخص کے لیے یہ تصور قائم کر لینا مناسب نہیں کہ نبوت نے آپ کو بشریت کی حدود سے ماوراء کر دیا تھا، اس لیے وہ آپ کی جانب ایسے امور منسوب کر دے یا اشیاء میں آپ کی ایسی تاثیر کا قائل ہو جائے جس کی نسبت اللہ کے علاوہ اور کسی کی طرف کرنا جائز نہیں۔

رہی دوسری حقیقت تو وہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کسی نفسیاتی احساس کا نام نہیں جو نبی ﷺ کے اپنے وجود سے خارج ہوتا ہو، اور نہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو آپؐ کے ارادے یا امنگ اور آرزوؤں کے تابع ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ کے لیے آسان تھا کہ اس مسئلہ کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دیتے اور اس کے عواقب و نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ اور اپنے گھر والوں کے بارے میں خیر اور راست روی کے خیال کو قرآن کی شکل میں ڈھال کر پیش کر دیتے جس سے آپ پر ایمان لانے والے مطمئن ہو جاتے اور دوسرے لوگ بھی خاموش ہو جاتے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، اس لیے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔

اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز نے اپنی کتاب "النبأ العظیم" میں لکھا ہے: "کیا ایسا نہیں ہوا کہ منافقین نے ام المومنین حضرت عائشہؓ پر بہتان کا خوب چرچا کیا۔ وحی رکی رہی۔ معاملہ نے طول پکڑا اور لوگوں میں چہ مگوئیاں ہوتی رہیں، یہاں

تک کہ کلیجے منہ کو آگئے۔ اس پوری مدت میں آں حضرت ﷺ بہت احتیاط اور تحفظ کے ساتھ صرف اتنا ہی کہہ سکے "میں اس کے بارے میں صرف خیر ہی کا علم رکھتا ہوں۔" آپؐ نے پورے ایک ماہ اس معاملہ کی تحقیق کی پوری کوشش کی۔ مختلف افراد سے سوالات کیے۔ اپنے اصحاب سے مشورہ کیا اور تمام لوگوں نے یہی کہا: ہمیں اس کے بارے میں کسی برائی کا علم نہیں ہے۔ ان سب باتوں کے بعد بھی آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے کچھ فرمایا تو یہی فرمایا: "اے عائشہ! مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں ملی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے اللہ تعالیٰ تمہاری براءت ظاہر فرمادے گا اور اگر واقعی تم نے کسی گناہ کا ارتکاب کیا ہے تو اللہ سے توبہ واستغفار کرو۔"

آں حضرت ﷺ نے یہ بات اپنی سمجھ کے مطابق فرمائی تھی۔ اور یہ واضح ہے کہ یہ ایسے شخص کی بات ہے جو غیب سے واقف نہیں۔ یہ تحقیق کرنے والے ایسے دوست کی بات ہے جو گمان کی پیروی کرتا ہے نہ بلا تحقیق کوئی بات کہتا ہے۔ ان کلمات کو ادا کرنے کے بعد آں حضرت ﷺ اپنی جگہ سے ہٹے بھی نہ تھے کہ سورۂ نور کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں جن میں حضرت عائشہؓ کی براءت کا اعلان کیا گیا اور ان کی شرافت اور پاکیزگی کا قطعی فیصلہ سنایا گیا۔

اگر قرآن بنا کر پیش کرنے کا معاملہ آپؐ کے ہاتھ میں ہوتا تو کون سی چیز آپ کو اس کام سے روکے ہوئے تھی کہ ان قطعی کلمات کو ابتداء ہی میں گھڑ لیتے، تاکہ ان کے ذریعے اپنی آبرو کی حفاظت کرتے، اپنی شریک حیات کا دفاع کرتے اور ان کلمات کو وحی سماوی کی طرف منسوب کر دیتے تاکہ انگل لگانے والوں کی زبانیں بند ہو جاتیں۔ لیکن آپ کی ذات ایسی نہ تھی کہ لوگوں سے تو کبھی نہ جھوٹ بولتے ہوں لیکن اللہ پر جھوٹ باندھیں۔ ارشاد باری ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ، ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ، فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِيْنَ. (الحاقۃ: ۴۴-۴۷)[65]

اور اگر اس (نبیؐ) نے خود گھڑ کر کوئی بات ہماری طرف منسوب کی ہوتی تو ہم اس کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ گردن کاٹ ڈالتے۔ پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس کام سے روکنے والا نہ ہوتا۔

سب سے پہلے حضرت عائشہؓ پر یہ دونوں حقیقتیں منکشف ہوئیں۔ اسی لیے انہوں نے

۶۵ النبأ العظیم۔ ڈاکٹر عبداللہ دراز ص ۱۷

اس موقعے پر اللہ کی وحدانیت اور عبودیت کا اظہار کیا۔ اور یہ کیفیت ان پر اس حد تک غالب ہوئی کہ وہ اللہ کے علاوہ ہر چیز کو اور ہر شخص کو بھول گئیں۔ ان کی ماں نے جب ان سے کہا کہ "اٹھ کر نبی ﷺ کا شکریہ ادا کرو" تو انہوں نے فرمایا "میں نہ اٹھ کر ان کے پاس جاؤں گی اور نہ اللہ کے علاوہ کسی کا شکر ادا کروں گی۔ اسی نے میری براءت نازل کی ہے۔"

حضرت عائشہؓ کی اس بات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی ﷺ کے لیے کسی حد تک درشت خوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالات نے ان سے یہ بات کہلوائی تھی۔ یہ حالات حکمتِ الٰہی نے پیدا کیے تھے، تاکہ اہلِ ایمان کا عقیدہ مستحکم ہو، منافقین اور ملحدین کے بہتان کا خاتمہ ہو جائے اور اللہ وحدہ لاشریک کے لیے توحید اور عبودیت کا اظہار ہو۔

اس طرح واقعہ افک میں ایک ایسی روشن الٰہی حکمت موجود تھی جس کا مقصد اسلامی عقیدے کا اثبات اور اس پر وارد ہونے والے شبہات کا رد تھا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے "خیر" سے تعبیر کیا ہے:

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ. (النور۔۱۱)

اس واقعہ کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے۔

۵۔ حدِ قذف کی مشروعیت اور اس کی شروط:

اس واقعہ سے ہمیں حدِ قذف کی مشروعیت اور اس کی شروط کا علم ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ جن لوگوں نے صریح الفاظ میں اس بہتان میں حصہ لیا تھا ان پر نبی ﷺ نے حدِ قذف جاری کروائی۔ انہیں اسّی کوڑے لگائے گئے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

اشکال اس میں ہے کہ اس شخص پر حد کیوں نہیں جاری کی گئی جو اس بہتان طرازی کا سرغنہ تھا، اور جس نے اس افواہ کی لوگوں کے درمیان خوب تشہیر کی تھی، یعنی عبد اللہ بن ابی۔ اس کا سبب، جیسا کہ علامہ ابن قیمؒ نے بیان کیا ہے، یہ تھا کہ "وہ لوگوں کے درمیان اس بہتان کو بڑی خباثتِ نفس اور ہوشیاری کے ساتھ پھیلاتا تھا۔ وہ اپنی باتوں کو اس طرح پیش کرتا تھا کہ کوئی انہیں اس کی طرف منسوب نہ کر سکے۔"[66] اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حد قذف

۶۶ دیکھیے زاد المعاد، ابن القیم ۲/۱۱۵

صرف اس شخص پر جاری ہوتی ہے جو صریح الفاظ میں کسی پر بہتان لگائے۔

واقعہ افک اور اس سے حاصل ہونے والے دروس سے متعلق اپنی گفتگو کو ہم ان دس آیات پر ختم کرتے ہیں جن سے ام المومنین حضرت عائشہؓ کی براءت ثابت ہوتی ہے اور ان میں منافقوں اور خطاکاروں کی مذمت کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْکِ عُصْبَةٌ مِّنْکُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّکُمْ بَلْ هُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ، لِکُلِّ امْرِیءٍ مِّنْهُمْ مَّا اکْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَیْرًا، وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْکٌ مُّبِیْنٌ، لَوْلَا جَآءُوْ عَلَیْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ، فَاِذْ لَمْ یَاْتُوْا بِالشُّهَدَآءِ فَاُولٰٓئِکَ عِنْدَاللّٰهِ هُمُ الْکٰذِبُوْنَ، وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ، لَمَسَّکُمْ فِیْ مَآ اَفَضْتُمْ فِیْهِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ، اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِکُمْ وَ تَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِکُمْ مَّا لَیْسَ لَکُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَاللّٰهِ عَظِیْمٌ، وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَکَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَکَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ یَعِظُکُمُ اللّٰهُ اَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖٓ اَبَدًا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ وَیُبَیِّنُ اللّٰهُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ، اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُهٗ وَاَنَّ اللّٰهَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ. (النور: ۱۱-۲۰)

جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو بلکہ یہ بھی تمہارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا، اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے ہیں اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر

دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا۔ (ذرا غور تو کرو، اس وقت تم کیسی غلطی کر رہے تھے) جب کہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ "ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔" اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمہیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے (تو یہ چیز جو ابھی تمہارے اندر پھیلائی گئی تھی بدترین نتائج دکھا دیتی۔)

غزوۂ خندق

اسے غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں۔ یہ شوال ۵ھ میں پیش آیا جیسا کہ ابن اسحاقؒ، عروہ بن زبیرؒ، قتادہؒ، بیہقیؒ اور جمہور علمائے سیرت نے قطعیت سے بیان کیا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ ۴ھ میں پیش آیا۔ یہ قول موسیٰ بن عقبہؒ کا ہے۔ اسے ان سے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے اور امام مالکؒ نے بھی ان کی متابعت کی ہے۔[۶۷]

سبب: یہودِ بنی نضیر کے سرداروں کا ایک وفد مکہ گیا اور وہاں انہوں نے قریش کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر اکسایا۔ انہوں نے قریش کے لوگوں سے کہا "ہم تمہارے ساتھ مل کر اسے جڑ سے اکھاڑ دیں گے" ان لوگوں نے مزید کہا کہ تم لوگ جو کچھ کر رہے ہو وہ محمد (ﷺ) کے دین سے بہتر ہے" ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝ (النساء: ۵۱-۵۲)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی زیادہ صحیح راستے پر ہیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اس کا کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔

اس طرح ان لوگوں نے قریش کو مسلمانوں کے خلاف لڑنے پر تیار کر لیا اور اس کے لیے ایک وقت مقرر کر لیا۔ پھر وہ یہود وہاں سے نکل کر قبیلۂ غطفان کے پاس گئے اور ان سے

---

۶۷ دیکھئے فتح الباری ۷/۳۷۵، الفتح الربانی بترتیب الامام احمد ۲۱/۷۶

بھی وہی باتیں کیں جو قریش سے کر چکے تھے۔ اور برابر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ قبیلۂ غطفان کے لوگوں نے بھی ان کی حامی بھر لی۔ پھر وہ لوگ بنو فزارہ اور بنو مرہ سے بھی ملے اور ان کو بھی جنگ کے لیے تیار کر لیا۔ اس طرح ان تمام قبیلوں کا رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر اتفاق ہو گیا اور اس کے لیے وقت اور جگہ کی تعیین بھی ہو گئی۔[۶۸]

جنگ کے لیے مسلمانوں کی تیاری: جب رسول اللہ ﷺ کو یہ معلوم ہوا اور مکہ سے ان لوگوں کے نکلنے کی خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو بلایا۔ انہیں ان کے دشمنوں کی خبر دی اور ان سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اس موقع پر خندق کھودنے کا مشورہ دیا۔ مسلمانوں نے اس مشورہ کو پسند کیا۔ (اس وقت تک عرب خندق کو جنگی تدبیر کی حیثیت سے نہیں جانتے تھے۔) وہ لوگ مدینہ سے نکلے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ کوہ سلع کے دامن میں مورچہ بنایا اور اس کوہ کو اپنی پشت پر رکھا۔ پھر اپنے اور دشمن کے درمیان خندق کھودنے لگے۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد تین ہزار اور قریش اور دیگر گروہوں اور قبائل سے اکٹھا ہونے والے لشکر کی تعداد دس ہزار تھی۔[۶۹]

خندق کھودنے میں مسلمانوں کی لگن کے چند مناظر: امام بخاریؒ نے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "غزوۂ احزاب کے موقع پر رسول اللہ ﷺ بھی خندق کھودنے میں شریک تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ خندق کی مٹی ڈھو کر دوسری جگہ منتقل کر رہے ہیں اور مٹی آپ کے پیٹ میں اَٹی ہوئی ہے۔ آپ کے جسم اطہر میں بہت بال تھے" حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ انصار اور مہاجرین جب خندق کھود رہے تھے اور اپنی پیٹھوں پر مٹی لاد کر دوسری جگہ لے جا رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ رجز جاری تھا۔

نحن الذین بایعوا محمدا   علی الاسلام مابقینا ابدا

(ہم ہی ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ جب تک زندہ رہیں گے اسلام پر قائم رہیں گے)

نبی ﷺ بھی ان کا جواب اسی انداز سے دے رہے تھے:

---

۶۸ سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد (باختصار)

۶۹ طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام

اللهم انه لا خیر الآخیر الآخرة   فبارك فی الانصار والمهاجرة [۷۰]

(اے اللہ آخرت کے خیر کے علاوہ اور کوئی خیر نہیں۔ تو انصار اور مہاجرین کو برکت عطا فرما)

امام بخاریؒ ہی نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں: "غزوۂ خندق کے موقع پر ہم خندق کھود رہے تھے۔ ایک سخت چٹان آگئی۔ صحابہ نبی ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ خندق میں ایک سخت چٹان آگئی ہے (جو ٹوٹ نہیں رہی ہے) آپؐ نے فرمایا: میں ابھی آتا ہوں۔ پھر آپ اٹھ کھڑے ہوئے، اس حال میں کہ آپ کے پیٹ پر ایک پتھر بندھا ہوا تھا۔ اس وقت ہم صحابہ تین دن سے فاقہ سے تھے۔ نبی ﷺ نے کدال ہاتھ میں لی اور اتنی زور سے ضرب لگائی کہ چٹان ریزہ ریزہ ہوگئی۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! کچھ دیر کے لیے مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمادیں۔ گھر پہنچ کر میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے نبی ﷺ کو ایسی حالت میں دیکھا ہے جس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ تمہارے پاس (کھانے کی) کوئی چیز ہے؟ اس نے کہا۔ تھوڑی سی جو اور ایک بھیڑ ہے۔ [۱] میں نے بھیڑ کو ذبح کیا۔ اس نے جو پیسا۔ پھر ہم نے گوشت دیگچی [۲] میں چڑھادیا۔ اس کے بعد میں نبی ﷺ کی خدمت میں جانے لگا۔ اس وقت تک آٹا گوندھا جاچکا تھا اور دیگچی چولھے [۳] پر چڑھی ہوئی تھی اور گوشت پکنے کے قریب تھا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کے لیے مختصر سا کھانا تیار کیا ہے۔ آپ تشریف لے چلیے اور اپنے ساتھ بس ایک یا دو آدمی لے لیجیے۔ آپ نے دریافت کیا: کتنا کھانا ہے۔ میں نے تفصیل بتائی۔ فرمایا: بہت ہے اور اچھا ہے۔ جاکر اپنی بیوی سے کہو کہ میرے پہنچنے سے قبل دیگچی چولہے سے نہ اتارے اور تنور سے روٹی نکالنی نہ شروع کرے۔" پھر آپؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان

[۷۰] بخاری ۵/۴۶، امام مسلم نے اسے حضرت براءؓ سے روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ بھی ملتے جلتے ہیں۔ ۶/۱۸۷

[۱] روایت میں 'عناق' کا لفظ ہے۔ اس کے معنی مادہ بھیڑ کے ہیں۔

[۲] روایت میں 'برمۃ' کا لفظ ہے۔ اس کے معنی دیگچی کے ہیں۔

[۳] روایت میں 'اثافی' کا لفظ ہے۔ یہ ان پتھروں کو کہتے ہیں جن پر ہانڈی رکھی جاتی ہے۔

اعلان کرادیا کہ چلو (جابر کے یہاں دعوت ہے) دوسری روایت میں ہے کہ "نبی ﷺ نے زور سے پکارا۔ اے اہل خندق! جابر نے دعوت عام [۴] کی ہے۔ آؤ چلو" حضرت جابرؓ گھر پہنچے اور بیوی سے کہا۔ سختی ہو، نبی ﷺ تو مہاجرین اور انصار سب لوگوں کو لے کر آگئے۔ ان کی بیوی نے کہا: کیا آں حضرت ﷺ نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ کتنا کھانا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ہاں! ان کی بیوی نے کہا: پھر اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے (کہ اتنے کھانے میں سب لوگ کیسے شریک ہوجائیں گے)

نبی ﷺ تشریف لائے تو صحابہ سے فرمایا: اطمینان سے گھر میں آؤ اور بھیڑ نہ لگاؤ۔ پھر آپؐ نے خود کھانا تقسیم فرمایا۔ آپ روٹی کا ایک ٹکڑا لیتے اور اس پر گوشت رکھ کر کسی کے ہاتھ میں دے دیتے۔ ہر مرتبہ گوشت اور روٹی نکالنے کے بعد آپ ہانڈی اور تنور کو ڈھک دیتے۔ اسی طرح آپ تقسیم کرتے رہے، یہاں تک کہ تمام صحابہ نے شکم سیر ہوکر کھانا کھالیا، پھر بھی کچھ کھانا بچ رہا۔ آپؐ نے حضرت جابرؓ کی بیوی سے فرمایا: اسے خود بھی کھاؤ اور دوسروں کو بھی دو۔ اس لیے کہ لوگ فاقہ میں ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت جابرؓ نے فرمایا: "اللہ کی قسم! تمام لوگوں نے کھالیا پھر بھی کچھ کھانا بچ رہا۔ سب لوگ کھا کر چلے گئے، پھر بھی ہماری ہانڈی بھری رہی اور آٹا بچا رہا۔ [۵]

منافقین کا رویہ: ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ بعض منافقین نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں سستی کا مظاہرہ کیا۔ وہ معمولی اور ہلکے پھلکے کام کا دکھاوا کرتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے علم میں لائے بغیر چپکے سے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ جب کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی ناگزیر ضرورت پیش آتی تھی تو وہ آں حضرت ﷺ سے اجازت طلب کرتا تھا اور جب آپ اجازت دے دیتے تبھی وہاں سے ہٹتا تھا اور جوں ہی اس کی ضرورت پوری ہوجاتی فوراً کام پر واپس آجاتا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

[۴] روایت میں 'سور' کا لفظ ہے۔ اس کے معنی 'دعوت عام' کے ہیں۔

[۵] صحیح بخاری ۶/۴۶، نیز دیکھئے فتح الباری ۷/۲۷۹-۲۸۰

وَرَسُوْلِهٖ، فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (النور۔٦٢)

مومن تو اصل میں وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو دل سے مانیں اور جب کسی اجتماعی کام کے موقع پر رسولؐ کے ساتھ ہوں تو اس سے اجازت لیے بغیر نہ جائیں۔ اے نبی! جو لوگ تم سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور رسول کے ماننے والے ہیں۔ پس جب وہ اپنے کسی کام سے اجازت مانگیں تو جسے تم چاہو اجازت دے دیا کرو، اور ایسے لوگوں کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کیا کرو۔ اللہ یقیناً غفور و رحیم ہے۔

بنو قریظہ کی عہد شکنی : بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس آیا اور اس کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عہد شکنی پر آمادہ کرنا چاہا۔ اس نے کہا: میں قریش کے سپہ سالاروں اور سرداروں کو لے کر آیا ہوں، وہ رومہ کے نشیبی علاقہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اور قبیلہ غطفان کے سپہ سالاروں اور سرداروں کو بھی میں نے آمادۂ جنگ کر لیا ہے۔ وہ احد کے پہلو میں "ذنب نقمی" تک آپہنچے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھ سے عہد کیا ہے کہ اس وقت تک یہاں سے نہ ہٹیں گے جب تک کہ محمد اور اس کے ساتھیوں کا بالکل صفایا نہ کر دیں۔" کعب نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! تم میرے پاس زمانہ کی ذلت لے کر آئے ہو۔ اے حیی، تمہارا برا ہو، مجھے میرے حال پر رہنے دو، میں نے محمد کو ہمیشہ سچا اور عہد کا پابند پایا ہے" ۔۔ حیی برابر اصرار کرتا رہا، یہاں تک کہ کعب کو خیانت اور عہد شکنی پر آمادہ کر لیا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ملی تو آپؐ نے حضرت سعد بن معاذؓ کو تحقیق کے لیے بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ اگر یہ خبر صحیح ہو تو اس کی اطلاع اشاروں میں دیں اور برسر عام اس کا تذکرہ کر کے لوگوں میں انتشار پیدا نہ کریں۔ اور اگر خبر جھوٹی ہو تو لوگوں کے درمیان اس کا اعلان کر دیں۔ حضرت سعدؓ نے جا کر معلومات حاصل کیں تو خبر کو صحیح پایا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: "عضل و قارہ" (ان کی مراد یہ تھی کہ ویسی ہی غداری ہوئی ہے جیسی عضل اور قارہ نامی قبائل نے کی تھی) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ اکبر، اے مسلمانو! بشارت قبول کرو۔"[٦]

مسلمانوں کی حالت : مسلمانوں کو بنو قریظہ کی بد عہدی کا پتا چلا، ادھر منافقوں کے بھی

[٦] طبقات ابن سعد و سیرت ابن ہشام

نکل آئے اور وہ مسلمانوں کو کمزور کرنے میں لگے رہے۔ دشمن ان کے اوپر سے بھی آگئے اور نیچے سے بھی۔ منافقین مدینہ میں افواہیں پھیلانے میں لگے رہے۔ ان میں سے بعض کہتے تھے: "محمد تو ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں کے مالک ہوں گے۔ لیکن آج ہماری حالت یہ ہے کہ رفعِ حاجت کے لیے جانے میں بھی محفوظ نہیں" جب رسول اللہ ﷺ نے حالات کی یہ سنگینی دیکھی اور مسلمانوں کو آزمائش میں گھرا ہوا پایا تو حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ کو بلا کر ان سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ قبیلہ غطفان سے اس شرط پر معاہدہ کر لیں کہ ان کو مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی دے دیا جائے اور وہ لوگ مسلمانوں سے جنگ سے باز آجائیں اور واپس چلے جائیں۔ "ان دونوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! یہ آپ کی مرضی ہے یا اللہ کا حکم ہے یا آپ ایسا ہمارے لیے کر رہے ہیں؟" آپ نے فرمایا: "میں ایسا تمہارے لیے کر رہا ہوں، تاکہ ان لوگوں کی قوت و شوکت ٹوٹ جائے۔" اس پر حضرت سعد بن معاذؓ نے عرض کیا: "اللہ کی قسم! ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ کی قسم! ہمارے پاس اس کے لیے تلوار کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے۔" یہ سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرہ کھل اٹھا اور آپؐ نے فرمایا: "جیسی تمہاری رائے ہو۔"

ابن اسحاق نے عاصم بن عمرو بن قتادہ اور محمد بن مسلم بن شہاب زہری سے روایت کیا ہے کہ "(مسلمانوں اور غطفان کے درمیان) ابھی نہ صلح کی پختہ بات چیت ہوئی تھی اور نہ اس پر کسی کو گواہ بنایا گیا تھا، بلکہ انہیں منانے کی صرف ابتدائی کوشش ہوئی تھی۔"[٧]

رہے مشرکین، تو وہ جب خندق کے پاس پہنچے تو اچنبھے میں پڑ گئے۔ کہنے لگے یہ تو ایک نئی چال ہے جس سے عرب واقف نہیں ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کا محاصرہ کرنے کے لیے خندق کے گرد مورچہ بنا لیا۔ اس موقع پر جنگ کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ بعض مشرکین نے ایسی جگہیں تلاش کیں جہاں خندق کی چوڑائی کم تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور خندق پار کر گئے۔ ایسی جگہوں پر مسلمان پہلے سے موجود تھے، انہوں نے حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر بعض شہسوار پلٹ گئے اور بعض مارے گئے۔ مارے جانے والوں میں مشہور شہسوار عمرو بن ود بھی تھا۔ اسے حضرت علی بن ابی طالبؓ نے قتل کیا۔

[٧] دیکھیے سیرت ابن ہشام ٢/ ٢٢٣، تاریخ طبری ٢/ ٥٧٣

جنگ کے بغیر مشرکوں کی شکست : اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو جنگ سے بچالیا۔ اس نے مشرکوں کی فوجوں کو دو ذریعوں سے شکست دی جن میں مسلمانوں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ پہلا ذریعہ یہ تھا کہ قبیلۂ غطفان کے ایک صاحب نُعیم بن مسعود نے اسی دوران اسلام قبول کرلیا۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پیش کش کی کہ وہ ہر ایسا کام کرنے کے لیے تیار ہیں جو آں حضرت ﷺ ان سے لینا چاہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "تم ہمارے درمیان (اپنے قبیلے کے) اکیلے آدمی ہو۔ اگر تم سے ہو سکے تو کسی تدبیر سے اپنے قبیلے والوں کو جنگ بندی پر آمادہ کرو۔ اس لیے کہ جنگ حیلہ و تدبیر کا نام ہے۔"

حضرت نعیم بن مسعودؓ وہاں سے رخصت ہو کر بنو قریظہ کے پاس گئے۔ وہ لوگ انہیں اب تک مشرک سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے کچھ ایسی باتیں کیں جن سے انہیں اس بات آمادہ کرلیا کہ قریش کے ساتھ مل کر اس وقت تک جنگ کے جال میں نہ پھنسیں جب تک کہ ان کے کچھ لوگوں کو اپنے پاس بطور یرغمال نہ رکھ لیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ (یعنی قریش) پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں اور وہ (یعنی بنو قریظہ) مدینہ میں تنہا رہ جائیں اور محمد اور ان کے اصحاب کے مقابلے میں ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ان لوگوں نے کہا: یہ تو بہت معقول رائے ہے!... پھر وہاں سے چل کر وہ قریش کے سرداروں کے پاس گئے اور انہیں آگاہ کیا کہ بنو قریظہ اپنے فعل پر پچھتا رہے ہیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا ہے کہ وہ قریش اور غطفان کے چند سرداروں کو یرغمال بنا کر ان کے حوالے کردیں گے تاکہ وہ انہیں قتل کردیں۔ اس لیے اگر یہود تم میں سے کچھ آدمیوں کو بطور رہن مانگیں تو ہرگز اپنے ایک آدمی کو بھی ان کے حوالے نہ کرنا۔ پھر نعیمؓ غطفان کے پاس گئے اور ان سے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی قریش سے کر چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب ایک دوسرے سے چوکنا ہوگئے اور ان کے دلوں میں باہم کینہ پیدا ہوگیا۔ ہر فریق دوسرے پر بدعہدی اور غداری کا الزام دینے لگا۔

دوسرا ذریعہ یہ ہوا کہ ایک تاریک اور یخ بستہ رات میں ایسی خوفناک آندھی چلی کہ ان کی دیگچیاں الٹ گئیں، ان کے خیمے اکھڑ گئے اور ان کی رسیاں ٹوٹ گئیں۔ اس وقت تک انہیں مسلمانوں کا محاصرہ کیے ہوئے دس سے کچھ زائد دن ہو چکے تھے۔

امام مسلمؒ نے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: غزوۂ احزاب کے موقعے پر ایک رات ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں تھے۔ اس رات تیز ہوا چل رہی تھی اور سخت ٹھنڈک تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس وقت کون جا کر دشمن کی خبر لائے گا۔ ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن میری معیت عطا فرمائے گا۔ ہم سب خاموش رہے۔ کسی نے جواب نہیں دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بات تین بار دہرائی۔ لیکن اس مجلس میں حاضر تمام لوگ خاموش رہے۔ تب آپ نے فرمایا: حذیفہ! کھڑے ہو جاؤ اور جا کر دشمن کی خبر لے کر آؤ۔ آں حضرت ﷺ نے جب میرا نام لے کر پکارا تو مجھے اٹھنا پڑا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا: جاؤ! دشمن کی خبر لے کر آؤ، لیکن اس ہوشیاری سے کہ انہیں ہماری بھنک نہ لگے۔ میں مجلس نبوی سے اٹھا اور بڑے اطمینان سے، گویا میں حمام میں چل رہا ہوں (یعنی مجھے ٹھنڈک کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا) دشمن کے پڑاؤ میں پہنچا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ ابوسفیان آگ جلائے ہوئے اپنی پیٹھ سینک رہا ہے۔ میں نے کمان میں تیر لگایا اور چاہا کہ اسے نشانہ بنالوں، اسی وقت مجھے رسول اللہ ﷺ کی یہ بات یاد آگئی کہ "انہیں ہماری بھنک نہ لگنے پائے۔" اس وقت میں ایسی پوزیشن میں تھا کہ ایک ہی تیر میں ابوسفیان کا کام تمام ہو جاتا۔ میں اسی طرح پورے اطمینان سے چلتا ہوا (یعنی بغیر ٹھنڈک کے احساس کے) واپس آگیا، اور نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر سب حال بتایا۔ آپ مجھ سے بہت خوش ہوئے اور انعام کے طور پر مجھے اپنی وہ عبا عنایت فرمادی جو اس وقت آپ کے پاس تھی اور جسے پہن کر آپ نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں جا کر سو گیا اور صبح تک سوتا رہا، یہاں تک کہ خود نبی ﷺ نے آکر مجھے بیدار کیا اور پیار سے فرمایا: "اٹھو اے سونے والے۔"[۸۷]

ابن اسحاق کی روایت میں یہ اضافہ ہے: "میں دشمن کے پڑاؤ میں پہنچا۔ اس وقت تیز ہوا اور اللہ کی فوج اپنا کام کر رہی تھی۔ نہ ان کی دیگچیاں چولھے پر رک پا رہی تھیں، نہ آگ جل پا رہی

[۸۷] مسلم ۵/۱۷۷، بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دشمن کی مخبری کے لیے جانے والے صحابی حضرت زبیرؓ تھے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ان کا واقعہ دوسرا ہے۔ انہیں نبی ﷺ نے بنو قریظہ کی خبر لانے کے لیے بھیجا تھا۔ مشرکوں کا حال معلوم کرنے کے لیے جانے والے حضرت حذیفہؓ تھے جیسا کہ عام علمائے سیرت نے صراحت کی ہے۔ دیکھیے عیون الاثر، ابن سید الناس اور فتح الباری، ابن حجر۔

تھی اور نہ خیمے صحیح سالم بچے تھے۔ (ایک جگہ کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی جاکر ان میں شامل ہوگیا۔ اس مجلس میں ابوسفیان بھی تھا) اس نے اٹھ کر کہا: اے گروہ قریش! تم میں سے ہر شخص دیکھ لے کہ اس کے پہلو میں کون بیٹھا ہے؟ (کہیں دشمن کا کوئی جاسوس نہ ہو) حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں: ایک شخص میرے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا (قبل اس کے کہ وہ مجھ سے پوچھتا) میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ تم کون ہو؟ اس نے کہا: فلاں بن فلاں (چنانچہ اسے مجھ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی) اس طرح تمام حاضرین کے بارے میں اطمینان کر لینے کے بعد ابوسفیان نے کہا: اے گروہ قریش! اللہ کی قسم، اب یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں رہی۔ ہمارے گھوڑے اور خچر ہلاک ہوگئے، بنو قریظہ نے ہم سے بدعہدی کی اور ان کی طرف سے ہمیں ایسی اطلاعات مل رہی ہیں جو ہمارے لیے خوش آئند نہیں ہیں اور اس آندھی نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ بھی تم سب کے سامنے ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔ میں بھی واپس جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔"[۷۹]

اگلے دن صبح تمام مشرکین پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ بھی مدینہ واپس آگئے۔

ان دنوں اور راتوں میں آں حضرت ﷺ ایک لمحہ کے لیے بھی بارگاہِ الٰہی سے مدد طلب کرنے، تضرّع کرنے اور مسلمانوں کی کامیابی کے لیے دعا کرنے سے غافل نہیں رہے۔ اس موقع پر آپ کی ایک یہ دعا منقول ہے: اے اللہ! جس نے کتاب نازل کی ہے اور جو جلد حساب لینے والا ہے۔ ان گروہوں کو شکست دے دے، اے اللہ! ان گروہوں شکست دے دے اور ان کے قدم لڑکھڑا دے۔"[۸۰]

اس غزوہ میں نبی ﷺ کی ایک نماز چھوٹ گئی۔ اس کا وقت نکل جانے کے بعد آپ نے اس کی قضا کی۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ ایک دن سورج غروب ہونے کے بعد خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور کفار قریش کو برا بھلا کہتے ہوئے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! مجھے عصر کی نماز پڑھنے کا موقع نہیں مل سکا، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔ نبی ﷺ نے

۷۹ سیرت ابن ہشام ۲/۲۳۱

۸۰ بخاری

فرمایا: واللہ! میں بھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ ہم بطحان نامی وادی میں اترے۔ آپؐ نے وضو فرمایا، ہم نے بھی وضو کیا۔ پھر آپ نے سورج ڈوبنے کے بعد پہلے عصر کی نماز ادا فرمائی، پھر مغرب کی۔"[۸۱] امام مسلمؒ نے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر ایک دن فرمایا: ان لوگوں نے ہمیں درمیانی نماز یعنی عصر پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ اللہ ان کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔ پھر آپؐ نے مغرب اور عشاء کے درمیان عصر کی نماز قضا کی۔

دروس و نصائح

یہ غزوہ بھی — جیسا کہ آپ نے دیکھا — یہود کی غداری اور سازش کی بنا پر ہوا۔ انہی لوگوں نے مختلف گروہوں اور قبیلوں کو بھڑکایا۔ انہیں جنگ کے لیے آمادہ کیا اور گھیر کر لائے۔ یہ کام صرف قبیلۂ بنو نضیر کے یہودیوں ہی نے نہیں کیا جو کہ مدینہ سے نکال دیے گئے تھے، بلکہ ان کے ساتھ یہود بنو قریظہ بھی شریک رہے جن کے اب تک مسلمانوں کے ساتھ مختلف معاہدے قائم تھے۔ اور مسلمانوں کی جانب سے کسی ایسے عمل کا اظہار نہیں ہوا تھا جو انہیں ناگوار گزرا اور جس کی بنا پر وہ ان معاہدوں کو توڑ دینے پر آمادہ ہوئے ہوں۔

اب اس کی ضرورت نہیں رہی کہ اس منظر پر یا اس جیسے کسی دوسرے منظر پر تبصرہ کیا جائے اور اس سے دروس و نصائح کا استنباط کیا جائے، اس لیے کہ یہ ایسے نمایاں امور میں سے ہے جنہیں تاریخی مقولات کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ معروف ہیں۔

اس لیے اب ہم اس غزوہ میں پیش آنے والے بعض واقعات اور مناظر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان سے مستنبط ہونے والے دروس، نصائح اور احکام سے واقف ہوں۔ ان کا خلاصہ ہم درج ذیل نکات کی صورت میں بیان کر سکتے ہیں۔

۱۔ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے:

اس غزوہ میں مسلمانوں نے جو جنگی تدابیر اختیار کیں ان میں سے ایک خندق کی کھدائی

۸۱ بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں۔

ہے۔ غزوۂ احزاب عربی اور اسلامی تاریخ میں پہلا غزوہ ہے جس میں خندقیں کھودی گئیں۔ اس لیے کہ یہ چیز صرف عجم میں معروف تھی۔ اوپر گزرا کہ غزوۂ احزاب میں اس کا مشورہ حضرت سلمان فارسیؓ نے دیا تھا، اور یہ بھی گزرا کہ نبی ﷺ نے اس جنگی تدبیر کو پسند فرمایا اور فوراً اپنے اصحاب کو اسے روبعمل لانے کا حکم دیا۔

یہ ان بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، وہ جہاں بھی اسے پاتا ہے اختیار کر لیتا ہے۔ بلکہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ مستحق ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت جتنا اس چیز کو ناپسند کرتی ہے کہ مسلمان بغیر سمجھے بوجھے دوسروں کی پیروی اور تقلید کریں، اتنا ہی وہ یہ چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو جہاں بھی کوئی خیر نظر آئے اور جہاں بھی وہ اسے پائیں اختیار کر لیں اور تمام مفید اصولوں کو اپنا لیں۔ اس سلسلے میں عام اسلامی قاعدہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے طرزِ عمل اور عام احوال و معاملات میں اپنی آزاد عقل اور دقیق فکر کو معطل نہ کرے۔ اس صورت میں وہ نہ اپنی نکیل دوسروں کے ہاتھ میں تھما سکتا ہے کہ وہ اس کو بغیر کسی شعور اور بصیرت کے جہاں چاہیں لے جائیں اور نہ کسی ایسے اصول عمل یا نظام کو نظرانداز کر سکتا ہے جس کے ذریعے اس کی روشن عقل اور آزاد فکر محفوظ رہے اور جو شریعت اسلامی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو۔

یہ طرزِ عمل جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمان کے لیے روا رکھا ہے اس کا سرچشمہ انسان کی وہ عظمت اور شرف ہے جس کے ساتھ اس نے اس کی تخلیق کی ہے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ انسان سید المخلوقات ہو۔ اللہ تعالیٰ کے لیے بندگی کے آداب کی بجا آوری اور اس کی شریعت کے احکام پر عمل اس عظمت و سیادت کی حفاظت کی ضمانت ہیں۔

۲۔ اسلامی مساوات۔ ایک زندہ حقیقت :

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام کے خندق کھودنے کا جو منظر ہم نے پیش کیا ہے اس سے ایک عظیم الشان درس حاصل ہوتا ہے۔ اس کے اس مساوات کی حقیقت عیاں ہوتی ہے جسے اسلامی معاشرہ اپنے تمام افراد کے درمیان رائج کرنا چاہتا ہے۔ اور واضح ہوتا ہے کہ عدل و مساوات کی حیثیت اسلامی قدروں میں محض کھوکھلے نعروں کی سی نہیں ہے اور نہ زرق

برق امتیازی علامات کی سی ہے جن کی وجہ سے معاشرہ کا ظاہر خوش نما معلوم دے۔ بلکہ عدل و مساوات وہ حقیقی بنیاد ہے جس سے معاشرے کے ظاہر اور باطن دونوں میں اسلامی اقدار اور اصول صادر ہوتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ مسلمانوں کو تو خندق کھودنے کا حکم دے دیا ہو اور خود عیش و آرام کے ساتھ ان کی نگرانی کے لیے اپنے "قصر شاہی" میں چلے گئے ہوں۔ اور نہ آپؐ نے ایسا کیا کہ ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں تشریف لائے ہوں، کسی کام کرنے والے کی کدال اپنے ہاتھ میں لے کر ایک بار زمین پر ماری ہو اور اس طرح کام شروع ہو جانے اعلان ہو گیا ہو اور علامتی طور پر اس میں آپ کی بھی شرکت ہو گئی ہو، پھر آپ نے کدال زمین پر ڈال دی ہو اور اپنے خوش نما لباس پر آ جانے والی معمولی گرد کو جھاڑتے ہوئے واپس چلے گئے ہوں۔

بلکہ رسول اللہ ﷺ صحابہ کی طرح خود بھی اس کام میں شریک رہے۔ آپ کا جسم اطہر مٹی اور گرد و غبار سے اٹ گیا۔ مگر آپ اپنے ساتھیوں اور بھائیوں سے الگ نہیں ہوئے۔ وہ لوگ ایک دوسرے کو حوصلہ دینے کے لیے رجز پڑھتے تو ان کے ساتھ آپ بھی رجز پڑھتے۔ ان لوگوں کو تھکن اور بھوک کا احساس ہوتا تو ان میں سر فہرست آپ بھی تھے۔ یہ ہے اس مساوات کی حقیقت جو اسلامی شریعت نے حاکم و محکوم، امیر و غریب اور محتاج و رئیس کے درمیان قائم کی ہے۔ آپ احکام شریعت کی کوئی ایسی شق نہ پائیں گے جو اس بنیاد پر قائم نہ ہو اور جس میں اس حق کی ضمانت نہ دی گئی ہو۔

اس غلطی میں ہرگز مبتلا نہ ہوئیے گا کہ اس مظہر کو طرز عمل یا حکومت کی "جمہوریت" کا نام دے دیجیے، اس لیے کہ دونوں میں بین فرق ہے۔

دین اسلام میں پائے جانے والے عدل اور مساوات کا سرچشمہ عبودیتِ الٰہی ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس میں تمام انسان شامل ہیں۔ جو تمام انسانوں کو یکساں درجہ میں رکھتی اور یکساں حیثیت دیتی ہے۔ اور جس چیز کو لوگ جمہوریت کا نام دیتے ہیں اس میں اکثریت کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر اس میں اکثریت کی رائے کو تقدس کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی اسے قبول کرنا لازمی ہوتا ہے، خواہ اس رائے کا مزاج اور ہدف کچھ

بھی ہو۔

اسی وجہ سے اسلامی شریعت کسی طبقے یا کسی گروہ کو مراعات دینے کی قائل نہیں ہے اور نہ کسی جماعت کو تحفظ فراہم کرتی ہے، خواہ اس کے جو بھی محرکات اور اسباب ہوں۔ اس لیے کہ صفتِ عبودیت ان تمام فروق و امتیازات کو ختم اور ناقابل اعتبار قرار دیتی ہے۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا نبوی پہلو:

اسی واقعہ میں ایک دوسرا درس اور نصیحت بھی پنہاں ہے۔ اس کے ذریعے نبی ﷺ کی شخصیت میں نبوت کا مظہر آشکارا ہوتا ہے۔ آپ کے دل میں اپنے اصحاب کے لیے کتنی محبت اور شفقت موجزن رہتی ہے اس کی وضاحت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو جن خوارق اور معجزات سے نوازا تھا ان کی ایک اور مثال کا علم ہوتا ہے۔

اس واقعے میں آں حضرت کی شخصیت کے نبوی پہلو کا اظہار اس چیز سے ہوتا ہے کہ آپ صحابہ کے ساتھ خندق کھودنے کے دوران شدید بھوک برداشت کرتے ہیں، یہاں تک کہ خالی معدہ کی وجہ سے ہونے والی تکلیف سے بچنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھتے ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اس قسم کی محنت و مشقت کو برداشت کرنے پر کس چیز نے آمادہ کیا؟ کیا اس کا محرک لیڈری کی خواہش ہے!... یا مال اور حکومت کی حرص!... یا اپنے حامی و مددگار اکٹھا کر لینے کی آرزو؟ یہ تمام اہداف و مقاصد ان تمام پریشانیوں اور تکالیف سے صریح متعارض ہیں۔ جو شخص جاہ و منصب، حکومت یا اقتدار کا خواہاں ہوتا ہے وہ اس قسم کی تکلیفیں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

جس چیز نے آں حضرت ﷺ کو یہ سب تکلیفیں برداشت کرنے پر آمادہ کیا وہ رسالت اور امانت کی ایسی ذمہ داری ہے جس کی تبلیغ کا آپ کو مکلف بنایا گیا ہے، اور جسے ایسی پر خطر راہ پر چل کر لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ہے آں حضرت ﷺ کی شخصیت کا نبوی پہلو جو صحابہ کے ساتھ آپ کے خندق کھودنے کے عمل سے نمایاں ہے۔

رہی آں حضرت ﷺ کی اپنے اصحاب سے شدید محبت اور شفقت تو اس کا اظہار آپ کے اس طرز عمل سے ہوتا ہے جو آپؐ نے اس موقعے پر اختیار فرمایا جب حضرت جابرؓ نے آپ کو ماحضر تناول فرمانے کے لیے بلایا تھا۔

آں حضرت ﷺ کو کھانے کی دعوت دینے کا خیال حضرت جابرؓ کے دل میں اس وقت آیا جب آپؐ کے پیٹ پر پتھر بندھا دیکھ کر انہیں آپؐ کے شدید بھوکے ہونے کا علم ہوا۔ اس وقت ان کے گھر میں صرف اتنا کھانا تھا جو بس چند لوگوں کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے مختصر کھانے کو دیکھتے ہوئے صرف چند ہی لوگوں کو دعوت دی۔

لیکن اس چیز کا کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی ﷺ اپنے اصحاب کو جو آپ ہی کی طرح شدید بھوکے تھے، کام کرتا چھوڑ دیں اور خود اپنے تین چار مخصوص صحابہ کو لے کر آرام کرنے اور بھوک مٹانے کے لیے چلے جائیں، جب کہ آپ اپنے اصحاب سے اس سے زیادہ شفقت فرماتے تھے جتنی ماں اپنے بیٹوں سے کرتی ہے۔

رہے حضرت جابرؓ تو جو کچھ انہوں نے کیا ویسا کرنے کے لیے مجبور تھے، اور ایسا کرنا ان کے لیے فطری تھا۔ اس لیے کہ وہ کسی بھی سوچنے والے انسان کی طرح، جو مادی اسباب انہیں حاصل تھے انہی کے مطابق کام کر سکتے تھے۔ جو کھانا انہوں نے تیار کیا تھا وہ عرف عام میں صرف چند آدمیوں کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہوں نے سوچا کہ صرف رسول اللہ ﷺ کو اور آپؐ کے چند اصحاب کو جنہیں آپؐ اپنے ساتھ لانا چاہیں، دعوت دے دیں۔

لیکن آں حضرت ﷺ کا منصب یہ نہیں تھا کہ حضرت جابرؓ کے اس نقطۂ نظر سے متاثر ہو جائیں۔ اولاً آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ آپؐ کو اپنے اصحاب سے بڑھ کر کوئی نعمت یا آرام حاصل ہو۔ ثانیاً آپ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ خود کو ان مادی اسباب کا اسیر بنا لیں جن سے تمام انسان مانوس ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ اس کے لیے یہ بہت معمولی سی بات ہے کہ کم کھانے کو زیادہ کر دے اور اس کی قلیل مقدار میں اتنی برکت دے دے کہ ایک بڑی جمعیت کے لیے کافی ہو جائے۔

اس واقعہ میں جو خارق عادت معجزہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ حضرت جابرؓ کے بکری کے بچے سے بڑی مقدار میں کھانا تیار ہو گیا۔ اتنا کہ سیکڑوں صحابہ نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا پھر بھی بہت سا بچ رہا۔ تب نبی ﷺ نے گھر والوں کو مشورہ دیا کہ اس کا صدقہ کر دیں۔ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ظاہر ہونے والا یہ عجیب و غریب اور خارق عادت واقعہ آپ کی اپنے اصحاب سے شدید محبت اور قدرتِ الٰہی کے بالمقابل مادی اسباب سے اعراض پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کی

قدر افزائی کا مظہر تھا۔

یہاں میں چاہتا ہوں کہ قاری اس قسم کی الٰہی تائیدات میں غور کرے جن سے نبی ﷺ کو، مادی اسباب سے ماورا ہو کر سرفراز کیا گیا تھا۔ ان میں غور کرنے سے آں حضرت ﷺ کی شخصیت کے نبوی پہلو کے نقوش نمایاں ہوتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ قاری اس حقیقت میں اتنا ہی غور کرے جتنا بعض لوگ اسے نظر انداز کرنے میں پوری قوت صرف کرتے ہیں، خواہ ان سے بحث کے دوران ان کے سامنے اس کے کتنے ہی محکم اور قطعی دلائل کیوں نہ پیش کر دیے جائیں۔

۴۔ قبیلۂ غطفان سے صلح کے متعلق صحابہ سے مشورہ کی قانونی دلالت:

آں حضرت نے اس معاملے میں اپنے بعض اصحاب سے مشورہ کیا کہ قبیلۂ غطفان سے اس بات پر صلح کر لی جائے کہ انہیں مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی دے دیا جائے، اس کے بدلے وہ قریش اور ان کے ہم نواؤں کی تائید سے دست بردار ہو جائیں اور مسلمانوں سے جنگ سے باز آ جائیں۔ آں حضرت ﷺ کے اس مشورے میں کیا حکمت تھی؟ اور آپ کی اس سوچ سے کیا قانونی دلالت مستنبط ہوتی ہے؟

اس کی حکمت یہ تھی کہ نبی ﷺ اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے کہ ان حالات میں جب کہ ایک طرف مشرکین بھاری تعداد میں ان کے خلاف متحد ہو کر آگئے ہیں اور دوسری طرف بنو قریظہ نے عین وقت پر غداری کی ہے اور معاہدہ توڑ دیا ہے، ان حالات میں آپ کے مخلص صحابہ کتنی معنوی طاقت و قوت سے بہرہ ور ہیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر کتنا بھروسہ ہے؟ آں حضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی۔ جیسا کہ پیچھے گزرا۔ کہ اگر آپ محسوس کرتے کہ صحابہ کسی جنگ یا معرکے کی اپنے اندر ہمت نہیں پاتے یا اسے فائدہ مند نہیں سمجھتے تو اس میں انہیں جھونکنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ چیز آپؐ کے نمایاں تربیتی اسالیب میں سے تھی۔ اسی لیے آپؐ نے صحابہ کے سامنے یہ رائے رکھی اور انہیں بتایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس رائے کا اظہار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر وہ اپنے اندر ان دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں پاتے تو اس تدبیر کے ذریعے ان کی شوکت توڑ دی جائے۔

رہی اس مشورے کی قانونی دلالت تو وہ صرف یہ ہے کہ غیر منصوص چیزوں میں مشورہ

کرنا مشروع ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس میں کوئی ایسی دلالت موجود نہیں ہے کہ اگر مسلمانوں کے دشمن ان کے کسی علاقے پر حملہ آور ہو جائیں تو اپنی سرزمین کا ایک حصہ یا مال و دولت اور پیداوار کا کچھ حصہ انہیں دے کر واپس چلے جانے پر راضی کر لینا جائز ہے۔ اس لیے کہ شریعت اسلامی کے اصولوں میں سے اس چیز پر سب کا اتفاق ہے کہ آں حضرت ﷺ کے صرف وہ اقوال اور افعال حجت ہیں جن پر بعد میں اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی اعتراض نہ کیا گیا ہو۔ رہی اس سلسلے کی وہ چیزیں جو محض مشورہ لینے اور رائے جاننے کے قبیل سے ہوں تو وہ کسی بھی حال میں دلیل نہیں بن سکتیں۔ اس لیے کہ اولاً اس کا مقصد، ممکن ہے، دلوں کا حال جاننا ہو، جیسا کہ اوپر گزرا۔ اس طور پر یہ ایک خالص تربیتی عمل ہوا۔ ثانیاً اگر اس پر واقعی عمل کیا جاتا تو اس کا امکان تھا کہ وحی کے ذریعے اس پر اعتراض کر دیا جاتا اور اسے غلط قرار دے دیا جاتا۔ اس لیے اس میں کوئی تشریعی دلالت نہیں پائی جاتی۔

جب کہ علمائے سیرت نے صراحت کی ہے کہ نبی ﷺ نے قبیلۂ غطفان کے ساتھ صلح نہیں کر لی تھی اور نہ اس سلسلے میں ان کے درمیان کوئی دستاویز تیار ہوگئی تھی، بلکہ اس سلسلے میں صرف ابتدائی بات چیت ہوئی تھی۔

ہم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہیں کیونکہ اس زمانے میں ایک گمنام گروہ ایک عجیب و غریب اور بھیانک دعویٰ کرنے لگا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر ضرورت متقاضی ہو تو مسلمانوں کا غیر مسلموں کو "جزیہ" دینا واجب ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے غزوۂ احزاب میں صحابہ سے ایسا کرنے کا مشورہ کیا تھا۔

قطع نظر اس بات کے جس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں کہ مشورہ کے لیے پیش کی گئی رائے کو قانونی دلیل نہیں قرار دیا جا سکتا، ہمیں نہیں معلوم کہ "جزیہ" اور دو باہم برسرپیکار فریقوں کے درمیان بطور صلح پیش ہونے والی تجویز، جس پر ابھی معاہدہ بھی نہ ہوا ہو، دونوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ بالفرض اگر مسلمان اپنی کسی کمزوری کے سبب اپنی جان بچانے اور اپنے استیصال کو روکنے کے لیے اپنا کچھ مال دینے پر مجبور ہو جائیں تو کیا وہ ایسا نہیں کر سکتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے بہت سے حالات ہو سکتے ہیں جب مسلمانوں کے اموال

غصب کر لیے جائیں اور ان کے دشمنوں کے لیے مالِ غنیمت بن جائیں اور کفار اسلامی علاقوں پر حملہ آور ہو جائیں اور ان پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار قائم کرلیں۔ لیکن یہ چیز بالکل بدیہی ہے کہ مسلمان ایسا اختیاری طور پر اور فتویٰ لے کر نہیں کریں گے، بلکہ اس پر وہ مجبور کر دیے جائیں گے اور ایسا وہ بادلِ ناخواستہ کریں گے۔ ساتھ ہی وہ اپنے دشمنوں کے خلاف مناسب موقعوں کی تلاش میں رہیں گے۔ اور یہ چیز معروف ہے کہ شریعتِ اسلامی کے احکام کے مخاطب مجبور، بے بس، بچے اور مجنون نہیں ہوتے۔

اس لیے ایک ایسی حالت کو پیش کر کے جس میں انسان مکلف نہیں رہتا، اس کی بنیاد پر ایک ایسا حکم ثابت کرنا جس میں وہ مکلف رہتا ہے اور جسے مشورہ، مصلحت یا مصالحت کی بنیاد پر اختیار کرتا ہے، فعل عبث ہے۔

۵۔ اس غزوہ میں مسلمانوں کیوں کر فتح مند ہوئے؟

ہم نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب نے غزوۂ بدر میں فتح و کامرانی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا ٹھیک وہی طریقہ انہوں نے غزوۂ خندق میں اختیار کیا۔ اور وہ ہے اللہ سے تضرع اور دعا اور مدد طلبی کے ذریعے کثرت سے اس کی طرف توجہ کا طریقہ۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ کا جب بھی دشمن سے مقابلہ ہوتا تھا یا آپ جہاد کے لیے نکلتے تھے یہی آپ کا پیہم عمل ہوتا تھا جس میں آپ مصروف رہتے تھے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس کی تاثیر تمام دیگر مادی اسباب و وسائل سے بڑھ کر ہے اور یہی وہ وسیلہ ہے جسے پوری توجہ سے اختیار کیے بغیر مسلمانوں کے حالات درست نہیں ہو سکتے۔

مسلمانوں کی ثابت قدمی، صبر و استقلال اور بارگاہِ الٰہی میں دعا و مناجات کے بعد، مشرکین اپنی کثرت کے باوجود کیوں کر شکست کھا گئے؟ اللہ تعالیٰ نے اس کیفیت کو اپنی کتاب مبین میں یوں بیان فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَجُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا. إِذْ جَاءُوكُمْ مِنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ

وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا. (الاحزاب:۹-۱۰)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے جب دشمن اوپر سے اور نیچے سے تم پر چڑھ آئے، جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں، کلیجے منہ کو آگئے۔ اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔

اسی سیاق میں آگے کی آیات بھی ہیں، درج ذیل آیت تک:

وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ قَوِيًّا عَزِيزًا. (الاحزاب۔۲۵)

اور اللہ نے کفار کا منہ پھیر دیا۔ وہ کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر اپنے دل کی جلن لیے یونہی پلٹ گئے اور مومنین کی طرف سے اللہ ہی لڑنے کے لیے کافی ہو گیا۔ اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

غزواتِ رسول کے سلسلے میں یہ بات جو بار بار دہرائی گئی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بغیر کسی تیاری اور منصوبہ بندی کے معرکہ آرائی اور جہاد پر ابھارا گیا ہے۔ بلکہ اس سے صرف یہ وضاحت مقصود ہے کہ مسلمانوں کو یہ بات بخوبی جان لینی چاہیے کہ کامیابی کے مختلف اسباب میں سرفہرست صدق دلی سے اللہ کے آگے ہاتھ پھیلانا اور پورے اخلاص سے اس کی بندگی کرنا ہے۔ اگر انہیں یہ ذریعہ حاصل نہ ہو تو طاقت کے تمام وسائل انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ اور اگر مسلمانوں کے اعمال سے اس ذریعے کا اظہار ہوتا ہو تو معجزانہ طریقوں سے فتح و کامرانی کے حصول کا تذکرہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ورنہ یہ زبردست آندھی کہاں سے آ گئی جس نے صرف مشرکین کے پڑاؤ کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور مسلمانوں کو اپنی جانب اس کا بالکل احساس نہیں ہوا؟! ایک طرف تو اس ہوا نے لوگوں کی دیگچیاں الٹ دیں، ان کے خیمے اڑا دیے، ان کی میخیں اکھاڑ دیں اور ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ دوسری طرف یہ ہوا ٹھنڈی، خنک اور فرحت بخش رہی اور اس سے کسی کو اذیت نہیں پہنچی!....

۶۔ چھوٹ جانے والی فرض نماز کی قضا واجب ہے:

اس غزوہ میں نبی ﷺ کی عصر کی نماز، بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے چھوٹ گئی۔ چنانچہ آپؐ نے سورج ڈوب جانے کے بعد اس کی قضا کی۔ صحیحین کے علاوہ دیگر روایات میں ہے کہ اس موقعے پر آں حضرت ﷺ کی ایک سے زائد نمازیں چھوٹ گئی تھیں۔ انہیں آپ نے ان کا وقت نکال جانے کے بعد، فرصت پانے پر اکٹھا پڑھیں۔

اس سے چھوٹ جانے والی نماز کی قضا کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ اس کی تردید بعض ان لوگوں کے مسلک سے نہیں ہوتی جو کہتے ہیں کہ اس قسم کی مصروفیت کی بنا پر نماز کو موخر کر دینا پہلے جائز تھا، بعد میں جب مسلمانوں کے لیے صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت ہوئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیں تو بھی نسخ قضا کی مشروعیت پر نہیں بلکہ مصروفیت کی وجہ سے نماز میں تاخیر کے جواز پر وارد ہوتا ہے۔ یعنی صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت سے نماز کو موخر کرنے کا جواز منسوخ ہو گیا۔ لیکن اگر نماز چھوٹ جائے تو اس کی قضا کی مشروعیت منسوخ نہیں ہوئی ہے بلکہ اس سلسلے میں کوئی حکم مذکور نہیں ہے، اس لیے اس کی سابقہ مشروعیت برقرار رہے گی۔ یہ تو اس صورت میں ہے جب صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت کو اس غزوہ کے بعد مانیں۔ لیکن قطعی دلیل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ صلوٰۃ الخوف کی مشروعیت اس غزوہ سے قبل ہو چکی تھی، جیسا کہ غزوہ ذات الرقاع پر گفتگو کے ضمن میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے۔ [۸۲]

اس مشروعیت کی ایک دلیل صحیحین کی وہ حدیث بھی ہے کہ نبی ﷺ نے غزوۂ احزاب سے مدینہ واپس آنے کے بعد فرمایا: "سب لوگ عصر (یا ظہر) کی نماز بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کریں"۔ بعض لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا۔ ان میں سے کچھ نے کہا کہ ہم وہاں پہنچ کر ہی نماز پڑھیں گے اور بعض نے کہا کہ نماز پڑھ کر پھر چلیں گے، آں حضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ تھا کہ نماز کے وقت تک بنو قریظہ پہنچ جاؤ، یہ مطلب نہیں تھا کہ اگر پہنچنے میں تاخیر ہو جائے اور راستے میں نماز کا وقت نکلا جا رہا ہو تب بھی نماز نہ پڑھو۔ الغرض کچھ لوگوں نے بنو قریظہ پہنچنے کے بعد نماز کی قضا کی۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ چھوٹ جانے والی فرض نماز کی قضا واجب ہے تو چاہے نماز

۸۲ دیکھیے غزوۂ ذات الرقاع کے زمانۂ وقوع کی بحث ص: ۳۶۴-۳۶۶

سونے کی وجہ سے چھوٹی ہو یا غفلت کی وجہ سے، یا جان بوجھ کر چھوڑی گئی ہو، سب برابر ہے۔ اس لیے کہ چھوٹ جانے والی نماز کی قضا کے وجوب پر عمومی دلیل فراہم ہو جانے کے بعد کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جو کہ قضا کی مشروعیت کو نماز چھوٹنے کے بعض مخصوص اسباب کے ساتھ خاص کرتی ہو۔ جن لوگوں نے بنو قریظہ جاتے ہوئے نماز چھوڑ دی تھی وہ نہ سو گئے تھے اور نہ بھول گئے تھے، اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ چھوٹ جانے والی فرض نماز کی قضا کی مشروعیت کو جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کے علاوہ دیگر اسباب کے ساتھ خاص کر دیا جائے۔ اس لیے کہ تخصیص کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔

بعض لوگوں کو وہم ہو گیا ہے کہ مشروعیتِ قضا کے عمومی دلائل کو خاص کرنے والی ایک دلیل موجود ہے اور وہ ہے درج ذیل حدیث کا مفہوم مخالف:

"جس شخص کی نماز سو جانے یا بھول جانے کی وجہ سے چھوٹ جائے، اسے جوں ہی یاد آ جائے وہ نماز ادا کر لے۔"

لیکن یہ ان کا وہم ہے جس میں کوئی صاحب بصیرت عالم مبتلا نہیں ہو سکتا۔ حدیث سے مقصود بھول جانے یا سو جانے والے کے نماز کی قضا کا حکم بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود حدیث میں مذکور قید "جوں ہی یاد آ جائے" پر زور دینا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ جس شخص کی نماز کسی بھی وجہ سے چھوٹ جائے اور وہ اسے ادا کرنا چاہے تو اس کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ اگلے دن اسی وقت کا انتظار کرے، پھر اسے ادا کرے، بلکہ جوں ہی اسے یاد آ جائے فوراً ادا کر لے، خواہ کوئی بھی وقت ہو۔ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے، جیسا کہ خود حدیث کے صیغہ سے معلوم ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث کے ماہرین اور شارحین [۸۳] نے بیان کیا ہے، تو یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حدیث میں "سونے یا بھول جانے" کے مفہوم مخالف سے متعلق کوئی قانونی دلالت موجود نہیں ہے۔

۸۳ دیکھیے فتح الباری ۲/ ۷۴، نیل الاوطار ۲/ ۲۷

غزوۂ بنی قریظہ

صحیحین میں ہے کہ نبی ﷺ جب خندق سے واپس آگئے اور ہتھیار رکھ کر غسل فرمایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: "آپ نے ہتھیار رکھ دیے؟ اللہ کی قسم! ابھی ہم نے نہیں رکھے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف کوچ کیجیے۔" فرمایا: "کدھر؟" جواب دیا: "وہاں" اور بنو قریظہ کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ نبی ﷺ بنو قریظہ کی طرف روانہ ہوئے۔[۸۴] آپ نے مسلمانوں میں اعلان فرمادیا۔ "خبردار! سب لوگ عصر کی نماز بنو قریظہ میں پہنچ کر ادا کریں۔" بعض لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا۔ ان میں سے کچھ نے کہا کہ ہم لوگ وہیں پہنچ کر نماز ادا کریں گے اور بعض نے کہا کہ نماز پڑھ کر پھر چلیں گے۔ آں حضرت ﷺ کے ارشاد گرامی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اگر پہنچنے میں تاخیر ہو جائے اور راستے میں نماز کا وقت نکلا جارہا ہو تب بھی نماز نہ پڑھو۔ وہاں پہنچنے کے بعد لوگوں نے اس کا تذکرہ کیا۔ آپ نے کسی کی سرزنش نہیں فرمائی۔[۸۵]

رسول اللہ ﷺ نے بنو قریظہ کا، جو اپنے قلعوں میں مورچہ بند تھے، پچیس دن (یا ایک قول کے مطابق پندرہ دن) محاصرہ جاری رکھا[۸۶] یہاں تک کہ وہ لوگ اس سے تنگ آگئے اور اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسعد نے جب دیکھا کہ

---

۸۴ بخاری و مسلم

۸۵ بخاری

۸۶ ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ محاصرہ کی مدت پچیس دن تھی، جب کہ ابن سعد نے اپنی طبقات میں قطعیت سے بیان کیا ہے کہ محاصرہ صرف پندرہ دن جاری رہا۔

رسول اللہ ﷺ کسی بھی طرح پلٹنے والے نہیں ہیں تو اس نے اپنے قبیلہ کے یہود سے کہا: "اے گروہ یہود! تمہارے سامنے ایسا معاملہ درپیش ہے جسے تم دیکھ رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے تین تجویزیں رکھتا ہوں۔ ان میں سے جسے چاہو اختیار کرلو۔ لوگوں نے کہا: کیا تجویزیں ہیں؟ اس نے کہا: ہم اس آدمی کی اتباع کرلیں اور اس پر ایمان لے آئیں۔ اللہ کی قسم تم یہ اچھی طرح جان چکے ہو کہ وہ اللہ کا بھیجا ہوا نبی ہے اور وہی ہے جس کا تذکرہ تمہاری کتابوں میں موجود ہے۔ ایسا کرنے سے تمہاری اپنی جانیں اور تمہارے بچوں اور عورتوں کی جانیں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔ ان لوگوں نے جواب دیا: ہم تورات کا حکم کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس نے دوسری تجویز یہ رکھی کہ پھر آؤ، ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو قتل کردیں، پھر تلوار سونت کر پیدل ہی محمد اور اس کے ساتھیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ ایسا کرنے سے ہم اپنے پیچھے کچھ بوجھ نہیں چھوڑیں گے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اور محمد کے درمیان فیصلہ کردے۔ اگر ہم ہلاک ہوگئے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اور ہمارے پیچھے کوئی نسل نہیں ہوگی جس کے بارے میں ہمیں کچھ اندیشہ ہو۔ لوگوں نے کہا: ان بیچاروں کا کیا قصور ہے؟ اس نے کہا: اگر تم اس پر بھی تیار نہیں ہو تو پھر شنبہ کی رات اچانک حملہ کردو۔ اس رات محمد اور اس کے ساتھیوں کو ہماری طرف سے اطمینان ہوگا کہ ہم کچھ نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے اس طرح اچانک حملہ کردینے سے ہم ان پر فتح پالیں۔ لوگوں نے اس تجویز کو بھی قبول نہیں کیا۔

پھر وہ لوگ اس پر تیار ہوگئے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں گے وہ انہیں منظور ہوگا۔ بنو قریظہ قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار قبیلہ اوس کے کسی سردار کو دے دیں۔ چنانچہ آپؐ نے یہ اختیار حضرت سعد بن معاذؓ کو عطا فرمایا۔ غزوۂ خندق کے موقعے پر انہیں ایک تیر لگ گیا تھا جس کا وہ ایک خیمہ میں رہ کر علاج کر رہے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا اور انہیں بلا بھیجا تو وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر تشریف لائے۔ جب وہ مسجد[۸۷] سے قریب ہوئے تو آں حضرت ﷺ نے انصار سے فرمایا:

---

۸۷ یہاں مسجد سے مراد مدینہ کی مسجد نبوی نہیں ہے بلکہ، جیسا کہ شارحین حدیث نے لکھا ہے، وہ جگہ ہے جسے آں حضرت ﷺ نے بنو قریظہ سے قریب نماز باجماعت کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔

اپنے سردار (یا اپنے بہترین شخص) کا اٹھ کر استقبال کرو" پھر جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا: یہ لوگ تمہارے فیصلے پر راضی ہو گئے ہیں۔ حضرت سعدؓ نے یہ فیصلہ سنایا کہ ان کے جنگجوؤں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنالیا جائے۔ اس پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تم نے اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔" ۸۸

پھر حضرت سعدؓ نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: "اے اللہ! تو جانتا ہے کہ ان لوگوں سے جہاد کرنے سے بڑھ کر میرے دل میں اور کوئی خواہش نہیں ہے جنہوں نے تیرے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور انہیں اپنے وطن سے نکالا ہے۔ اے اللہ! میرا گمان ہے کہ اب آئندہ ہمارے اور ان کے درمیان جنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔ اگر آئندہ قریش سے مسلمانوں کی جنگ ابھی اور ہونی ہے تو مجھے کچھ دن اور زندہ رکھ، تاکہ میں تیرے لیے ان سے جہاد کر سکوں۔ اور اگر اب ان سے جنگ نہیں ہونی ہے تو میرا یہ زخم ہرا کر دے اور اسی سے میری موت مقدر کر دے۔ چنانچہ سینے کے اوپری حصہ میں ان کا زخم کھل گیا۔ اور اس سے اتنا خون بہا کہ مسجد ہی میں ان کے خیمے کے قریب ہی قبیلہ بنو غفار کا خیمہ تھا اس تک پہنچ گیا۔ اہل خیمہ نے خون دیکھا تو گھبرا گئے۔ انہوں نے پکار کر کہا کہ اس خیمہ کی طرف سے یہ کیا آرہا ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت سعدؓ کے زخم سے خون فوارے کی طرح بہہ رہا ہے۔ اسی سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ ۸۹ امام احمدؒ کی روایت میں ہے کہ حضرت سعدؓ کا زخم تقریباً ٹھیک ہو چکا تھا، صرف کان کی بالی کے برابر (یعنی بہت تھوڑا سا) رہ گیا تھا کہ یہ حادثہ پیش آگیا۔

پھر یہود اپنے قلعوں سے نکال کر لائے گئے اور مدینہ کے ارد گرد جو خندقیں کھودی گئیں تھیں وہاں لے جا کر ان کے جنگجوؤں (یعنی مردوں) کو قتل کر دیا گیا اور ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنالیا گیا۔ قتل کیے جانے والوں میں حیی بن اخطب بھی تھا جس نے کافی کوشش کر کے بنو قریظہ کو غداری اور بدعہدی پر آمادہ کیا تھا۔ ابن اسحاق نے روایت کیا ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ کے سامنے لایا گیا۔ اس وقت اس کے دونوں ہاتھ ایک رسی سے اس کی گردن میں بندھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ پر جب اس کی نگاہ پڑی تو اس نے کہا: "اللہ کی قسم مجھے

۸۸ بخاری و مسلم

۸۹ بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں۔

تم سے دشمنی پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ لیکن اللہ جسے رسوا کرنا چاہے وہ رسوا ہو کر رہتا ہے۔" پھر اسے بٹھا کر اس کی گردن مار دی گئی۔

دروس و نصائح

محدثین اور اصحاب سیر نے بنو قریظہ کے اس واقعہ سے چند اہم احکام مستنبط کیے ہیں جنہیں ہم سطور ذیل باختصار بیان کرتے ہیں:

۱۔ بدعہدی کرنے والوں سے جنگ کا جواز:

امام مسلمؒ نے اس حکم کو غزوۂ بنی قریظہ کا عنوان بنایا ہے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہونے والی صلح، معاہدہ اور پیمانِ امن کا احترام مسلمانوں پر اسی وقت تک واجب ہے جب تک دوسرے اس عہد یا صلح یا امان کو نہ توڑیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کریں تو مسلمانوں کے لیے ان سے جنگ جائز ہے، اگر وہ اسے قرین مصلحت سمجھتے ہوں۔

۲۔ مسلمانوں کے معاملات اور مسائل میں کسی کو حَکَم بنانے کا جواز:

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے امور اور ان کے اہم معاملات میں کسی کو حکم بنانا اور ان کے سلسلے میں کسی مسلم، عدل پرور اور اہل حکم کی طرف رجوع کرنا جائز ہے۔ خوارج کے علاوہ تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے۔ خوارج نے حضرت علیؓ کے کسی کو حکم بنانے کے فیصلے کو قبول نہیں کیا تھا، جب کہ حضرت علیؓ نے ان پر حجت قائم کر دی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی بستی یا قلعہ والوں کا اس بات پر مصالحت کر لینا جائز ہے کہ وہ ایک مسلم، عدل پرور، اہل اور امانت دار حکم کے فیصلے کو قبول کر لیں گے۔ اس حکم کا فرض ہے کہ ایسا فیصلہ کرے جو مسلمانوں کے مفاد میں ہو۔ پھر جو کچھ وہ فیصلہ کر دے اسے قبول کرنا سب کے لیے لازم ہوگا۔ نہ امام اس سے رجوع کر سکتا ہے اور نہ فریق مخالف۔ البتہ مخالف کو حکم کے فیصلہ کرنے سے قبل رجوع کرنے کا حق ہوگا۔ ۹۰

۹۰ صحیح مسلم کی شرح نووی ۱۳/۹۲

۳۔ فروع میں اجتہاد کی مشروعیت اور ان میں اختلاف کی ناگزیری:

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی "سب لوگ عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچ کر ادا کریں۔" کی مراد کو سمجھنے میں صحابہ کے درمیان اختلاف ہوا، لیکن آپؐ نے کسی کی سرزنش کی نہ عتاب کیا۔ اس سے عظیم شرعی اصولوں میں سے ایک اصل کا اظہار ہوتا ہے اور وہ یہ کہ فروعی مسائل میں اختلاف عین ممکن ہے۔ اور جن لوگوں کے درمیان اختلاف ہو وہ سب معذور اور اجر کے مستحق ہوں گے۔ خواہ ان میں صحیح رائے کسی ایک شخص کی ہو یا کئی لوگوں کی ہو۔ اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرعی احکام کے استنباط میں اجتہاد مشروع ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظنیؔ دلالتوں پر مبنی فروعی مسائل میں اختلاف کا خاتمہ ناقابل تصور ہے۔ اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کو دو چیزوں کا مکلف قرار دیا ہے:

اوّل: عقیدہ اور عبادات و اخلاق سے متعلق جو متعین اور واضح احکام دیے گئے ہیں ان پر عمل کریں۔

دوم: فروعی احکام کو ان کی مختلف عام دلالتوں سے سمجھنے کی پوری کوشش کریں، مثال کے طور پر کوئی شخص صحرا یا کھلے میدان میں ہو، نماز کا وقت ہو جائے اور سمت قبلہ اس پر مشتبہ ہو جائے تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ مطلوب ہے کہ اس کے عمل سے اللہ کی بندگی کا اظہار ہو۔ وہ اپنی فہم اور ظاہری دلائل کی روشنی میں سمت قبلہ معلوم کرنے کی حتی الوسع کوشش کرے، پھر جس سمت کی طرف اس کا دل مطمئن ہو جائے اس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر لے۔

بہت سے شرعی دلائل اور نصوص ظنیّ الدلالۃ اور غیر قطعی ہیں۔ اس کی متعدد روشن حکمتیں ہیں۔ سب سے نمایاں حکمت یہ ہے کہ اس طرح کسی مسئلہ میں کیے جانے والے مختلف اجتہادات سب کے سب شریعت کے نزدیک معتبر دلائل سے گہرے مربوط ہوں گے۔ اور مسلمانوں کے لیے گنجائش ہوگی کہ اپنے حالات اور معتبر مصالح کے اعتبار سے ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کرلیں۔ یہ ہر زمانے میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نمایاں مظاہر میں سے ہے۔

اس حکمت میں غور کریں تو واضح ہوگا کہ فروعی مسائل میں اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش حکمتِ ربانی اور تدبیر الٰہی کی مخالفت ہے۔ مزید برآں یہ ایک فعل عبث ہے۔ کسی مسئلہ میں اختلاف کو کیوں کر ختم کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کی دلیل ظنی ہے اور اس میں صحت اور خطا دونوں

کا احتمال ہے؟ اگر ایسا ہو پانا ہمارے زمانے میں ممکن ہے تو اس سے زیادہ امکان ابتدائی زمانے یعنی عہدِ رسالت میں تھا اور اختلاف نہ کرنے کے سب سے زیادہ مستحق اصحابِ رسول تھے۔ لیکن ان لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا، جیسا کہ اوپر گزرا۔ اس سے واضح ہوا کہ بعد کے ادوار میں بھی اختلاف کو ختم کرپانا ممکن نہیں ہے۔

۴۔ یہود کو حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا یقین تھا:

کعب بن اسد نے اپنے یہودی بھائیوں سے جو باتیں کہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا پورا یقین تھا اور وہ بخوبی جانتے تھے کہ تورات میں آں حضرت ﷺ کی ذات گرامی، آپ کی علامات اور بعثت کے بارے میں کیا باتیں کہی گئی ہیں۔ لیکن وہ اپنی عصبیت اور تکبر کے غلام تھے۔ بہت سے لوگ جو عدم ایمان اور عدم فہم کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے کفر کا یہی سبب ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اسلام اپنے عقیدہ اور عام احکام میں خالص فطرتِ انسانی کا دین ہے۔ اس کا عقیدہ عقل سے ہم آہنگ اور اس کے قوانین و احکام انسان کی ضروریات اور مصالح سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا صاحبِ عقل و دانش شخص نہ پائیں گے جس نے اسلام کا نام سنا ہو اور اس کی حقیقت اور جوہر کا ادراک کرلیا ہو، پھر بھی خالص عقلی بنیاد پر کفر کا رویہ اختیار کیا ہو۔ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ضرور ہوتی ہے، یا تو جو کچھ اس نے سنا ہے اس کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں اور وہ مہمل اور بے بنیاد ہے۔ یا وہ اسلام کی حقیقت سے واقف اور اس کے جوہر سے آگاہ ہو گیا ہے، پھر بھی اس کا انکار اس وجہ سے کر رہا ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے نفرت کرتا ہے، یا اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسے اپنا کوئی مفاد حاصل نہ ہو پانے یا کوئی خواہش نفس پوری نہ ہو پانے کا اندیشہ ہے۔

۵۔ آنے والے کے احترام میں کھڑے ہونے کا حکم:

حضرت سعد بن معاذؓ جب اپنی سواری پر خدمت نبوی میں حاضر ہوئے اس وقت وہاں انصار بھی موجود تھے۔ آپؐ نے انصار کو حکم دیا کہ اٹھ کر ان کا استقبال کریں۔ اس علت پر یہ ارشاد نبوی دلالت کرتا ہے۔ "اپنے سردار یا اپنے قبیلے کے بہترین شخص (کا استقبال کرو)" اس

حدیث سے اور اس طرح کی دیگر احادیث سے عام علماء نے مناسب موقعوں پر علماء و صالحین کا کھڑے ہو کر استقبال کرنے کی شروعیت پر استدلال کیا ہے۔ امام نووی اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ جب اصحاب فضل آئیں تو کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرنا چاہیے۔ اس حدیث سے جمہور علماء نے قیام کے استحباب پر استدلال کیا ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: "یہ وہ قیام نہیں ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔ نہی دراصل ان لوگوں کے لیے ہے جو کسی ایسے شخص کے پاس کھڑے ہوتے ہیں جو بیٹھا ہو۔ اور خواہ وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہے وہ لوگ برابر اس کے پاس کھڑے رہتے ہیں۔" آگے امام نووی فرماتے ہیں: "کوئی صاحب فضل آرہا ہو تو اس کے لیے کھڑے ہو کر استقبال کرنا مستحب ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں۔ اس سے نہی کے سلسلے میں کوئی صریح چیز ثابت نہیں ہے۔" [۹۱]

استحباب قیام پر دلالت کرنے والی صحیح احادیث میں سے ایک حدیثِ کعب بن مالکؓ ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ حضرت کعبؓ غزوۂ تبوک میں پیچھے رہ جانے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے گھر سے روانہ ہوا۔ راستے میں لوگوں نے جماعت در جماعت مجھ سے ملاقات کی۔ وہ مجھے قبولیتِ توبہ کی مبارک باد دیتے اور کہتے: "مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کرلی۔" یہاں تک کہ میں مسجد نبوی پہنچ گیا۔ وہاں اللہ کے رسول ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ کے اردگرد صحابہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی طلحہ بن عبید اللہؓ دوڑتے ہوئے آئے۔ مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ اللہ کی قسم ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی شخص کھڑا نہیں ہوا۔" حضرت کعب حضرت طلحہ کا یہ محبت بھرا عمل کبھی نہیں بھولتے تھے۔

استحباب قیام پر دلالت اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام ترمذیؒ اور امام ابوداودؒ نے اور امام بخاریؒ نے "الادب المفرد" میں حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں: "بول چال اور نشست و برخاست میں نبی ﷺ سے مشابہت رکھنے والا میں نے فاطمہؓ سے بڑھ کر کسی کو نہیں دیکھا۔ نبی ﷺ جب انہیں آتا دیکھتے تو خوش آمدید کہتے، پھر کھڑے ہو کر ان کا بوسہ لیتے، پھر ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنی جگہ لا کر بٹھاتے۔ اسی طرح جب نبی ﷺ ان کے پاس تشریف لے

---

[۹۱] شرح مسلم نووی ۱۲/۹۳

جاتے تو وہ آپ کو خوش آمدید کہتیں، پھر کھڑے ہو کر آپ کا بوسہ لیتیں۔" [۹۲]

یہ سب چیزیں رسول اللہ ﷺ کے اس ارشادِ گرامی کے منافی نہیں ہیں "جو شخص یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے (ہاتھ باندھے) کھڑے رہیں اس کا ٹھکانہ جہنم ہے" اس لیے کہ اصحابِ فضل کے اکرام واحترام اور عزت و توقیر کی مشروعیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ اس کے لیے کوشش کرتے ہیں، یا ایسا پسند کرتے ہیں۔ بلکہ صالحین اور اصحابِ فضل کی نمایاں ترین صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے لیے متواضع ہوتے ہیں اور انہیں اس چیز کی طلب نہیں ہوتی۔ مثلاً فقیر و محتاج کو دیکھئے۔ اسلامی ادب اسے یہ ہدایت اور تعلیم دیتا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے فقر و فاقہ کا اظہار کر کے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ لیکن دوسری طرف یہی اسلامی ادب مال داروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ایسے سفید پوش فقراء کو تلاش کریں۔ ان کے ساتھ عزت سے پیش آئیں اور اپنی ضروریات سے زائد مال انہیں دیں۔

ہر چیز کا ایک ادب اور ایک محل ہے۔ اس لیے مناسب نہیں ہے کہ ہم ان دونوں میں خلط ملط کردیں یا ایک کو دوسرے سے منسوخ کردیں۔ یہ جلد بازی اور جہالت کے بدترین مظاہر میں سے ہے۔

البتہ اس سلسلے میں یہ جاننا بہت اہم ہے کہ اس جائز اکرام واحترام کے کچھ حدود ہیں۔ اگر ان کی رعایت نہ کی جائے تو یہ فعل حرام ہو جاتا ہے اور اس کے گناہ میں اسے کرنے والا اور اس پر خاموش رہنے والا دونوں شریک ہو جاتے ہیں۔

مثلاً بعض صوفیوں کی مجالس میں مریدین کا کھڑا ہونا۔ مرید اپنے شیخ کے سامنے انتہائی خاک ساری اور فروتنی میں سر جھکائے کھڑا رہتا ہے اور جب تک شیخ اسے بیٹھنے کو نہ کہے وہ بیٹھ نہیں سکتا۔ بعض مرید جب اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو اس کے گھٹنے یا ہاتھ پر اپنا سر رکھتے ہیں۔ یا اگر مجلس شروع ہونے کے بعد آتے ہیں تو بیٹھے بیٹھے شیخ تک پہنچتے ہیں۔ ان سب کاموں کے جواز میں کہا جاتا ہے کہ یہ مرید کی تربیت کا ایک انداز ہے۔ اس سے ہرگز دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ اس لیے کہ اسلام نے تربیت کے کچھ طریقے اور اسلوب بتائے ہیں اور ان سے تجاوز کرنے سے مسلمانوں کو روکا ہے۔ تربیت کے نبوی طریقہ کے بعد پھر کسی اور طریقہ کی ضرورت نہیں۔

---

[۹۲] یہ بخاری کے الفاظ ہیں۔ دیگر روایات میں بعض الفاظ کا فرق اور معمولی اضافے ہیں۔

۶۔ حضرت سعد بن معاذؓ کی امتیازی خصوصیات:

اس غزوہ کے واسطے سے حضرت سعد بن معاذؓ کی متعدد امتیازی خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔ ان کی پہلی خصوصیت یہ سامنے آئی کہ نبی ﷺ نے انہیں اختیار دیا کہ وہ بنو قریظہ کے بارے میں جو چاہیں فیصلہ دیں۔ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان کا فیصلہ سامنے آنے سے قبل ہی اسے اپنی تائید و حمایت سے نوازا۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ تشریف لائے تو نبی ﷺ نے انصار کو ان کا اٹھ کر استقبال کرنے کا حکم دیا۔ یہ حضرت سعدؓ کا ایک عظیم امتیاز ہے کہ ان کے لیے یہ حکم خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔

پھر ان کی امتیازی خصوصیت کا اظہار اس زخم کے واقعے سے بھی ہوتا ہے جو غزوۂ خندق میں ان کے بازو میں لگ گیا تھا۔ انہیں جب یہ زخم لگا تو انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی "اے اللہ تو جانتا ہے کہ ان لوگوں سے جہاد کرنے سے بڑھ کر میرے دل میں اور کوئی خواہش نہیں ہے جنہوں نے تیرے رسول ﷺ کو جھٹلایا اور وطن سے نکالا ہے۔ اے اللہ اگر آئندہ قریش سے مسلمانوں کی جنگ ابھی اور ہونی ہے تو مجھے کچھ دن اور زندہ رکھ تاکہ میں تیرے لیے ان سے جہاد کر سکوں" حضرت سعدؓ کی یہ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی۔ ان کا زخم سوکھنے لگا اور قریب قریب ٹھیک ہو گیا۔ اسی دوران غزوۂ بنی قریظہ پیش آگیا اور اس میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کا اختیار انہی کے حوالے کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو یہود کے شر سے محفوظ رکھا اور مدینہ ان کی نجاستوں سے پاک ہو گیا تو حضرت سعدؓ نے دوبارہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: "اے اللہ! میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اور ان کے (یعنی قریش اور مشرکین کے) درمیان جنگ اب ختم ہو چکی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو میرا یہ زخم ہرا کر دے اور اسی سے میری موت مقدر فرما دے" حضرت سعدؓ کی یہ دعا بھی مقبول ہوئی۔ اسی رات ان کے اس زخم سے خون بہنے لگا اور اسی سے ان کی موت واقع ہو گئی۔"

ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے: "بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ کا اندازہ صحیح تھا اور ان کی دعا مقبول ہوئی۔ غزوۂ خندق کے بعد مسلمانوں اور قریش کے درمیان کوئی ایسی جنگ نہیں ہوئی جس کا آغاز مشرکین کی جانب سے ہوا ہو۔ آں حضرت ﷺ نے عمرہ کے ارادے سے مکہ میں داخل ہونا چاہا، لیکن مشرکین نے روک دیا۔ اس موقع پر جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِىْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ. (الفتح۔ ۲۴)

وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے۔ حالانکہ وہ ان پر تمہیں غلبہ عطا کر چکا تھا۔

پھر صلح ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ نے اگلے سال عمرہ فرمایا۔ پھر جب مشرکین نے معاہدہ توڑ دیا تو آپؐ ان پر حملہ کرنے کے ارادے سے نکلے، اور مکہ فتح ہو گیا۔ [۹۳]

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ احزاب سے واپسی میں فرمایا تھا: "اب ہم ان پر حملہ کریں گے، وہ ہم پر حملہ آور نہیں ہوں گے۔ اب ہم ان پر فوج کشی کریں گے" بزار نے حسن سند سے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر، جب کہ مشرکین نے بہت بڑی فوج اکٹھا کر لی تھی، فرمایا تھا: "آئندہ کبھی یہ لوگ تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے، بلکہ تم ہی ان پر حملہ کرو گے۔"

حضرت سعدؓ کا یہ واقعہ اپنے تمام متعلقات سمیت آپ کو اس چیز کی یاد دلاتا ہے جسے ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ اور وہ یہ کہ اسلام میں دفاعی جنگ دعوت نبوی کے مراحل میں سے ایک مرحلہ تھا۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ تمام انسانوں کو اسلام کی دعوت دینے کا تھا۔ اس مرحلہ میں ملحدوں اور مشرکوں سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور اہل کتاب سے بھی کہا گیا کہ وہ یا تو اس کے دائرہ میں آجائیں یا اس کے عام حکم کی ماتحتی قبول کر لیں۔ پھر دعوت کے تمام معروف پُرامن ذرائع اختیار کرنے کے بعد جو لوگ اس راستے میں رکاوٹ بنے، ان سے حتی الامکان جنگ کی گئی۔

جہاد اور دعوت سے متعلق اسلامی احکام کی تکمیل کے بعد اب اس چیز کی کوئی گنجائش نہیں رہی جسے "دفاعی جنگ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جس کا چرچا زمانۂ حال کے بعض محققین کی زبانوں پر رہا ہے۔ ورنہ آں حضرت ﷺ کے اس ارشاد گرامی کا کیا مطلب ہے "لیکن اب تم ان پر حملہ کرو گے۔"

---

[۹۳] فتح الباری ۷/ ۲۹۲

باب ششم

فتح: مقدمات اور نتائج

(دعوت کا نیا مرحلہ)

- صلح حدیبیہ
- قبائل اور سلاطین کو دعوتِ اسلام
- غزوۂ موتہ
- غزوۂ حنین
- حضرت ابوبکرؓ کی سربراہی میں حج
- قبیلۂ ثقیف کی آمد اور قبولِ اسلام
- عدی بن حاتم کا قبولِ اسلام
- تعلیم و تبلیغ کے لیے نمائندوں کی روانگی
- حجۃ الوداع
- غزوۂ خیبر
- عمرۃ القضاء
- فتح مکہ
- غزوۂ تبوک
- مسجدِ ضرار

صلح حدیبیہ

صلح حدیبیہ ۶ھ کے اواخر میں ذی قعدہ کے مہینے میں ہوئی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ نبی ﷺ نے مسلمانوں میں اعلان کر دیا تھا کہ آپؐ عمرہ کے ارادے سے مکہ جا رہے ہیں۔ یہ سن کر بہت سے مہاجرین اور انصار آپؐ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے، یہاں تک کہ ان کی تعداد تقریباً چودہ سو تک پہنچ گئی۔ آنحضرت ﷺ نے راستے میں عمرہ کا احرام باندھ لیا اور اپنے ساتھ قربانی کے جانور لے لیے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آپؐ جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے ہیں، بلکہ آپ کا مقصد صرف خانہ کعبہ کی زیارت اور تعظیم ہے۔

ذوالحلیفہ پہنچ کر آپؐ نے اپنے ایک مخبر کو، جو قبیلۂ خزاعہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا نام بشر بن سفیان تھا، اہل مکہ کی خبر لانے کے لیے بھیجا۔ آپؐ نے اپنا سفر جاری رکھا، یہاں تک کہ جب غدیر الاشطاط پہنچے تو اس مخبر نے واپس آکر آپ کو خبر دی کہ "قریش نے آپ سے مقابلہ کے لیے بہت بڑی جمعیت منظم کر لی ہے۔ انہوں نے احابیش کو اکٹھا کر رکھا ہے۔ وہ آپ سے جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی آپ کو بیت اللہ کی زیارت نہیں کرنے دینا چاہتے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے نکلے ہیں۔ آپ نہ کسی کو قتل کرنا چاہتے ہیں، نہ کسی سے جنگ کا ارادہ ہے، اس لیے اپنا سفر جاری رکھئے۔ اگر کسی نے ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالی تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اللہ کے نام سے آگے بڑھتے رہو۔"

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس راستے پر اہل مکہ ہمیں روکنے کے لیے

موجود ہیں، اس سے ہٹ کر کسی دوسرے راستے پر کیا کوئی شخص ہماری رہنمائی کر سکتا ہے؟" قبیلۂ بنو اسلم کے ایک شخص نے کہا: "میں اے اللہ کے رسول!" چنانچہ گھاٹیوں کے درمیان ایک ویران راستے پر اس شخص کی رہنمائی میں نبی ﷺ اور صحابہ کرام روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ جب مرار نامی گھاٹی میں پہنچے (یہ حدیبیہ کے بالمقابل ایک پہاڑی راستہ ہے) تو آپؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی۔ لوگوں نے ڈانٹ ڈانٹ کر اسے اٹھانے کی بہت کوشش کی مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا: قصواء (اونٹنی کا نام) اَڑ گئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: قصواء نہیں اَڑی ہے اور یہ اس کا شیوہ نہیں، بلکہ اسے اس نے روک دیا ہے جس نے ہاتھیوں کو روک دیا تھا۔ پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر وہ لوگ کوئی ایسا منصوبہ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا پہلو مدنظر ہو تو میں اسے ضرور منظور کر لوں گا۔

پھر آپؐ نے اونٹنی کو ڈانٹا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اپنا رخ بدل کر حدیبیہ کی جانب روانہ ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کے آخری کنارے پر ایک گڑھے کے پاس، جس میں تھوڑا سا پانی تھا، رک گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کا پانی ختم ہو گیا۔ پھر صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے پیاس کی شکایت کی۔ آپؐ نے اپنے ترکش سے ایک تیر نکالا اور حکم دیا کہ اس کو اس گڑھے میں ڈال دیا جائے۔ اسے ڈالتے ہی اس میں اس قدر پانی آ گیا کہ تمام صحابہ سیراب ہو گئے۔[1]

اسی اثناء میں قبیلۂ خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء چند لوگوں کے ساتھ آ گئے اور آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: میں نے کعب بن لوئی اور عامر بن لوئی کو اس حال میں چھوڑا ہے کہ انہوں نے حدیبیہ کے کنوؤں پر پڑاؤ ڈال لیا ہے۔ ان کے ساتھ دودھاری اور بچوں والی

---

[1] یہ روایت بخاری نے کتاب الشرط میں اور ابن اسحاق وغیرہ نے نقل کی ہے۔ لیکن بخاری نے کتاب المغازی میں اسے اس طرح بیان کیا ہے: "آں حضرت ﷺ کنویں پر بیٹھ گئے، پھر پانی کا ایک برتن منگولیا، اس میں کلی کی، پھر دعا کر کے پانی کنویں میں ڈال دیا اور فرمایا: تھوڑی دیر رکے رہو۔ اس سے کنویں میں اتنا پانی ہو گیا کہ تمام صحابہ سیراب ہو گئے۔" حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے: دونوں احادیث میں یوں تطبیق دی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے یہ دو واقعات ہوں۔ رہی وہ حدیث جس میں ہے کہ آپؐ نے پانی کے ایک برتن پر اپنا دستِ مبارک رکھ دیا اور معجزاتی طور پر آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے تو وہ دوسرا واقعہ ہے۔ اور یہ تمام واقعات ثابت ہیں۔

اونٹنیاں ہیں۔[2] وہ آپ سے جنگ کرنے اور آپ کو بیت اللہ کی زیارت نہ کرنے دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہم کسی سے جنگ کرنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ عمرہ کی غرض سے نکلے ہیں۔ جنگ نے قریش کی حالت خستہ کر دی ہے اور انہیں سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو میں ایک مدت کے لئے ان سے معاہدۂ صلح کے لیے تیار ہوں۔ وہ میرے اور دوسرے لوگوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ڈالیں۔ اگر مجھے غلبہ حاصل ہو جائے تو اگر چاہیں تو دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں اور نہ چاہیں تو بھی آرام میں رہیں گے۔ اور اگر وہ اس پر راضی نہیں ہیں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں اس وقت تک ان سے جنگ کروں گا جب کہ میری گردن الگ نہ ہو جائے یا اللہ اس دین کو غالب نہ کر دے۔" بدیل نے کہا: میں آپ کی یہ بات قریش تک پہنچاؤں گا۔ بدیل نے جا کر قریش کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو رسول سے سنی تھیں۔

عروہ بن مسعود نے مشرکین کو پیش کش کی کہ اگر وہ تیار ہوں تو وہ نبی ﷺ کے پاس جا کر ان معاملات میں گفتگو کرے جن کا تذکرہ بدیل بن ورقاء نے کیا ہے۔ لوگوں نے کہا: ٹھیک ہے، جا کر گفتگو کرو۔ وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا: "فرض کیجئے کہ آپ نے اپنی قوم کا استیصال کر دیا تو کیا اس کی اور بھی کوئی مثال ہے کہ کسی نے آپ سے پہلے اپنی قوم کو خود برباد کیا ہو۔ اور اگر اس کے برعکس ہوا تو اللہ کی قسم آپ کے ساتھ جو لوگ ہیں ان میں سے کوئی مجھے جواں مرد اور جاں نثار نظر نہیں آتا۔ یہ تو ایک بھیڑ ہے جو کوئی نازک موقع آتے ہی آپ کو چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوگی۔" حضرت ابو بکرؓ کو اس کی اس بدگمانی پہ اس قدر غصہ آیا کہ گالی دے کر کہا: "کیا ہم آں حضرت ﷺ کو چھوڑ کر بھاگ جائیں گے؟" عروہ نے ان کی طرف گھوم کر دیکھا اور پوچھا: یہ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا: ابو بکر۔ عروہ نے کہا: "اگر ان کا مجھ پر ایک ایسا احسان نہ ہوتا جس کا بدلہ میں اب تک نہیں چکا پایا ہوں تو ان کی اس

---

[2] حدیث میں العوذ المطافیل کے الفاظ ہیں۔ عوذ عائذ کی جمع ہے اس کے معنی دودھاری اونٹنی کے ہیں۔ مطافیل سے مراد وہ اونٹنیاں ہیں جن کے ساتھ ان کے بچے ہوں۔ بدیل کہنا یہ چاہتے تھے کہ قریش پوری تیاری کے ساتھ نکلے ہیں۔ اور تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے، خواہ انہیں کتنے ہی دن پڑاؤ ڈالنا پڑے۔

سخت کلامی کا جواب دے دیتا۔ [1]

پھر عروہ نبی ﷺ سے گفتگو کرنے لگا۔ گفتگو کے دوران وہ آپؐ کی ریش مبارک پکڑ لیتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ تلوار لیے اور خود پہنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر کھڑے تھے۔ جب عروہ نبی ﷺ کی ریش مبارک طرف ہاتھ بڑھاتا تو وہ تلوار کے دستے سے اس کے ہاتھ پر مارتے اور کہتے: "اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا۔" عروہ نے سر اٹھا کر پوچھا: یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: مغیرہ بن شعبہ۔ عروہ نے کہا: "او دغا باز! ابھی میں نے کل ہی تیرے اوپر لگی گندگی کو دھویا ہے۔" [2]

عروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے کن انکھیوں سے صحابہ کو دیکھتا جاتا تھا جن کا حال یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تھوکتے تو کوئی نہ کوئی اسے اپنے ہاتھ پر لے لیتا اور اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا، آپؐ کوئی حکم دیتے تو ہر شخص تعمیل کے لیے لپکتا، وضو فرماتے تو جو پانی گرتا اس پر لوگ اس طرح ٹوٹ پڑتے کہ لڑائی کا گمان ہونے لگتا، آپ کلام فرماتے تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے، فرط تعظیم کی وجہ سے کوئی آپ سے نظریں ملانے کی ہمت نہ کرتا تھا۔

عروہ نے واپس جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا: "اللہ کی قسم! میں بادشاہوں کے درباروں میں گیا ہوں اور قیصر و کسریٰ و نجاشی کی شان و شوکت بھی دیکھی ہے۔ لیکن اللہ کی قسم! میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کے درباری اور مصاحبین اس کا ایسا ادب اور اس درجہ تعظیم کرتے ہوں جیسی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ان کی کرتے ہیں!... انہوں نے تمہارے سامنے بہت اچھی تجویز رکھی ہے، تم لوگ اسے قبول کر لو۔"

پھر قریش نے سہیل بن عمرو کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا تاکہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان صلح کی دستاویز تیار کرے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: آیئے! ہمارے اور آپ کے درمیان صلح کی تحریری دستاویز تیار ہو جائے۔ نبی ﷺ نے کاتب

[1] عروہ پر حضرت ابو بکرؓ کا احسان یہ تھا کہ ایک موقع پر عروہ پر ایک دیت عائد ہو گئی تھی تو حضرت ابو بکرؓ نے اس کا تعاون کیا تھا۔

[2] عروہ کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے قبول اسلام سے قبل ایک موقع پر تیرہ آدمیوں کو قتل کر دیا تھا تو دو آدمیوں کی دیت ان کی طرف سے عروہ نے ادا کی تھی۔

کو طلب فرمایا۔ (صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ کاتب حضرت علیؓ تھے) اور ارشاد ہوا: لکھو بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ سہیل نے کہا: اللہ کی قسم! یہ رحمٰن کیا ہے؟ ہم نہیں جانتے (اسی پرانے دستور کے مطابق) باسمک اللّٰھم لکھوایئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ٹھیک ہے باسمک اللّٰھم لکھ دو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: لکھو یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد رسول اللہ نے تسلیم کیا ہے... سہیل نے فوراً ٹوکا اور کہا: اللہ کی قسم اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں تو آپ کو بیت اللہ سے روکتے ہی کیوں؟ اور آپ سے جنگ ہی کیوں کرتے؟ آپ اس جگہ محمد بن عبداللہ لکھوائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گو کہ تم لوگ جھٹلاتے ہو لیکن اللہ کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں۔ لکھ دو "محمد بن عبداللہ" (مسلم کی روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو "رسول اللہ" مٹا دینے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! میں اسے نہیں مٹا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس کی جگہ دکھاؤ۔ انہوں نے آپ کو وہ جگہ دکھائی تو آپؐ نے خود اسے مٹا دیا) پھر نبی ﷺ نے سہیل سے فرمایا: (یہ معاہدہ اس بات پر ہوا ہے کہ) تم لوگ ہمارے اور بیت اللہ کے درمیان حائل نہ ہو اور ہم لوگ اس کا طواف کر لیں۔ سہیل نے کہا: اللہ کی قسم! اس طرح تو عربوں میں یہ چرچا ہو جائے گا کہ ہم نے یہ معاہدہ دب کر کیا ہے۔ آپ آئندہ سال طواف کر سکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ مسلمانوں کے ساتھ صرف تلواریں ہوں گی اور وہ بھی نیام میں۔ آپ نے یہ دفعہ بھی معاہدہ میں شامل کر لی۔ سہیل نے کہا کہ یہ بھی لازم ہوگا کہ اگر ہمارے یہاں سے کوئی شخص آپ کے یہاں چلا جائے، خواہ وہ آپ کے مذہب پر ہو، تو اسے ہمارے پاس لوٹانا ہوگا۔ اور اگر آپ کا کوئی آدمی ہمارے یہاں آ جائے تو ہم اسے لوٹانے کے پابند نہیں ہوں گے۔

مسلمانوں نے کہا: سبحان اللہ اگر کوئی مسلمان ہو کر ہمارے پاس آتا ہے تو اسے کیوں کر مشرکوں کے پاس لوٹایا جا سکتا ہے؟ انہوں نے رسول ﷺ کو مخاطب کر کے آپؐ سے دریافت کیا: "اے اللہ کے رسول! کیا ہم اس دفعہ کو بھی لکھ لیں؟" فرمایا: ہاں، اگر ہم میں سے کوئی شخص ان کے پاس چلا جاتا ہے تو اللہ اسے دور کر دے اور اگر ان میں سے کوئی شخص ہمارے پاس آ جاتا ہے (اور اسے ہمیں واپس کرنا پڑ جاتا ہے) تو اللہ ضرور اس کے لیے کشادگی اور گلو خلاصی کی کوئی

راہ نکالے گا۔ ۵

ابن اسحاقؒ، ابن سعدؒ، اور حاکمؒ نے روایت کیا ہے کہ ان شروط پر مبنی صلح کی مدت پورے دس سال طے ہوئی۔ اور یہ بھی طے پایا کہ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے اعلان کیا کہ "ہم معاہدہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوتے ہیں"۔ اور بنو بکر نے قریش کے ساتھ شریک معاہدہ ہونا پسند کیا۔

جب صلح کی دستاویز تیار ہو گئی تو اس پر مسلمانوں اور مشرکوں دونوں میں سے چند افراد کو گواہ بنایا گیا۔

صحیحین میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں: میں اللہ کے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا "کیا آپ اللہ کے نبیؐ برحق نہیں ہیں؟ آپؐ نے جواب دیا: کیوں نہیں؟ میں نے کہا: کیا آپ حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں؟ میں نے کہا: کیا ہم میں سے جو اللہ کی راہ میں جان دیتا ہے وہ جنت میں اور ان میں سے جو مارا جاتا ہے وہ جہنم میں نہیں جائے گا؟ فرمایا کیوں نہیں؟ میں نے کہا: پھر ہم اپنے دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: "میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ وہ میری مدد ضرور کرے گا۔" میں نے کہا: کیا آپؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا: ہاں کیوں نہیں، لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟ میں نے کہا: نہیں۔ فرمایا: پھر تم ضرور اس کا طواف کرو گے۔

حضرت عمرؓ خاموش نہیں بیٹھ سکے۔ اٹھ کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے اور ان سے بھی وہی گفتگو کی جو نبی ﷺ سے کر چکے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اے ابن خطاب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ آپؐ اپنے رب کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ اللہ آپؐ کو ہرگز بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

اس پر سورۂ فتح نازل ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو بلا کر فرمایا کہ یہ سورہ نازل

۵ بخاری و مسلم

ہوئی ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول کیا یہ فتح ہے؟! فرمایا: ہاں۔ اس سے حضرت عمرؓ کو تسکین ہو گئی۔ ۶

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا: "جاؤ قربانی کے جانوروں کو ذبح کرو اور حلق کراؤ" یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی۔ مگر تمام صحابہ (اس قدر دل شکستہ تھے کہ) جمے رہے، ان میں سے ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ آپؐ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور لوگوں کے اس رویہ کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے کہا: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کریں؟ آپؐ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ باہر نکل کر خود قربانی کریں اور حلق کروائیں۔" چنانچہ آپؐ نے ایسا ہی کیا۔ باہر نکلے، کسی سے کچھ نہ کہا، قربانی کی اور حلق کرایا، یہ دیکھ کر (لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب اس فیصلہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی) وہ بھی جلدی سے اٹھے اور انہوں نے قربانی کی اور ایک دوسرے کا حلق کیا۔ عجلت میں ایسا لگتا تھا کہ ایک دوسرے کو ہلاک کر دیں گے۔

آں حضرت ﷺ جب مدینہ واپس تشریف لے آئے تو چند مومن خواتین مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئیں۔ ان میں حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ بھی تھیں۔ ان کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ، فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ. (الممتحنہ: ۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ جب مومن عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو (ان کے مومن ہونے کی) جانچ پڑتال کر لو اور ان کے ایمان کی حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔

رسول اللہ ﷺ نے انہیں کفار مکہ کے پاس واپس بھیجنے سے انکار کر دیا ۷

۶ بخاری و مسلم ۷ بخاری

بیعتِ رضوان

نبی ﷺ نے معاہدۂ صلح سے قبل حضرت عثمان بن عفانؓ کو قریش کے پاس گفتگو کے لیے بھیجا تھا۔ ان لوگوں نے انہیں روک لیا۔ ادھر رسول ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ عثمانؓ شہید کر دیے گئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم یہاں سے اس وقت تک نہ ہٹیں گے جب تک کہ اس کا بدلہ نہ لے لیں۔" رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا۔ اس وقت آپ ایک درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ یہ بیعت "بیعتِ رضوان" کے نام سے مشہور ہوئی۔

آنحضرت ﷺ نے ایک ایک کر کے تمام صحابہ سے اس بات پر بیعت لی کہ کوئی راہ فرار نہیں اختیار کرے گا۔ آخر میں خود اپنا ایک دستِ مبارک تھاما اور فرمایا: یہ عثمان کی طرف سے ہے۔"

جب بیعت سے فارغ ہوئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی خبر غلط تھی۔

دروس ونصائح

ا۔ صلح حدیبیہ کی حکمت:

صلح حدیبیہ سے حاصل ہونے والے دروس ونصائح اور احکام کی تفصیل میں جانے سے قبل اس کی حکمت پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

یہ صلح خالص الٰہی تدبیر کا ایک مظہر تھی جس میں نبوت کا عمل اور اثر اس طرح نمایاں ہوا جس طرح کسی دوسرے عمل یا تدبیر میں نمایاں نہیں ہوا تھا۔ اس کی کامیابی ایک ایسا سربستہ راز تھا جس کا علم الٰہی میں پوشیدہ غیب سے گہرا تعلق تھا۔ اسی لیے مسلمان اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس کے عواقب ونتائج سوچ کر گھبرا گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صلح اپنے مقدمات، مضمون اور نتائج کے اعتبار سے اسلامی عقیدہ کے استحکام اور رسوخ کی اہم بنیادوں میں سے ہے۔

پہلے ہم اس صلح میں پائی جانے والی ان چند عظیم الٰہی حکمتوں کو بیان کریں گے جو بعد میں نمایاں ہو کر سامنے آئیں، یہاں تک کہ اللہ کی روشن نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار پائیں۔ اس کے بعد ان شرعی احکام کا تذکرہ کریں گے جو اس صلح کے واقعات سے مستنبط ہوتے ہیں۔

صلح حدیبیہ کی ایک روشن حکمت یہ تھی کہ وہ فتح مکہ کی تمہید تھی۔ یہ صلح، جیسا کہ ابن

القیمؒ نے لکھا ہے، فتح مکہ کا دروازہ اور کلید تھی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ جن امور کی تکمیل کا وہ ارادہ کر لیتا ہے ان کے لیے پہلے سے راستہ ہموار کر دیتا ہے اور ایسے واقعات ظہور میں آتے ہیں جو ان کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اگر اس وقت مسلمانوں کو اس کا تنبہ نہیں ہوا تھا تو اس کا سبب یہ تھا کہ مستقبل ان کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ پھر موجودہ صورت حال، جو ان کے سامنے تھی، اس کا تعلق وہ اس غیب سے کیونکر سمجھ سکتے تھے جس کا ابھی انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔؟!

لیکن تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ مسلمان اس صلح کی اہمیت اور اس میں پائے جانے والے خیر کو سمجھنے لگے۔ لوگوں کو ایک دوسرے کا خوف نہیں رہا۔ مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ ملنا جلنا ہوا۔ انہوں نے انہیں دعوت دی، انہیں قرآن سنایا، علی الاعلان بلا کسی خوف وخطر کے اسلام کے بارے میں بحث ومباحثہ کیا اور جو لوگ اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھے وہ منظر عام پر آ گئے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کے واسطے سے زہری سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "اسلام میں اس سے قبل (یعنی صلح حدیبیہ سے قبل) اتنی عظیم فتح کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ پہلے مسلمانوں اور کافروں کا جب بھی آمنا سامنا ہوتا تھا، ان کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ لیکن جب صلح حدیبیہ ہو گئی اور جنگ بندی کا اعلان ہو گیا تو لوگوں کو ایک دوسرے کا خوف نہیں رہا اور وہ آپس میں ملے تو ان کے درمیان خوب گفتگو اور بحث ومباحثہ رہا۔ اس صورت حال میں جس سے بھی اسلام کے بارے میں بات چیت کی گئی، اگر وہ تھوڑی بھی عقل رکھتا تھا تو فوراً دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا تھا۔ ان دو سالوں میں اتنے یا اس سے زیادہ لوگوں نے اسلام قبول کیا جتنے اس سے قبل تک قبول کر چکے تھے۔"

اسی لیے قرآن نے اس صلح کو فتح کا نام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (الفتح: ۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔

انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہوگے۔ اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی۔

اس صلح کی ایک عظیم حکمت یہ تھی کہ اس کے ذریعے اللہ جل جلالہ نے چاہا کہ وحی نبوت اور انسانی تدبیر کے درمیان، اللہ کے نبی کی کامیابی اور عبقری مفکر انسان کے تصرفات کے درمیان اور اسباب کی دنیا اور ان کے مظاہر سے ماوراء ہو کر آنے والے الٰہی الہام اور ان اسباب کے اشاروں پر چلنے کے درمیان فرق کھل کر سامنے آجائے۔ اللہ عزوجل نے چاہا کہ اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ہر غور وفکر کرنے والے اور عقل سے کام لینے والے کی بصیرت کے سامنے اپنی نصرت سے نوازے۔ شاید یہی ایک پہلو ہے درج ذیل آیت کی تفسیر کا۔

وَيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا۔ (الفتح: ۳)

اور اللہ تم کو زبردست نصرت بخشے۔

یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو ایسی فتح سے بہرہ ور کرے گا جو اپنی مثال آپ ہوگی، جو مدہوش افکار کو بیدار کردے گی اور خواب غفلت میں مبتلا عقلوں کو جگادے گی۔

اسی لیے مشرکین نے جو شرطیں بھی رکھیں سب مان لی گئیں۔ اور ان کے ساتھ ان معاملات میں تساہل سے کام لیا گیا جن میں تساہل برتنے پر کوئی صحابی تیار نہ تھا۔ آپ نے دیکھا کہ حضرت عمر بن الخطابؓ کس طرح اس موقع پر پریشانی اور گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ احمدؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بعد میں اپنی اُس وقت کی کیفیت کا یوں اظہار کیا تھا: "اُس دن میرے منہ سے جو گستاخانہ باتیں نکل گئی تھیں ان کے کفارے کے لیے میں برابر روزے رکھتا رہا، نمازیں پڑھتا رہا، خیرات کرتا رہا اور غلام آزاد کرتا رہا۔" آپ نے دیکھا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو قربانی کر کے اور حلق کروا کے مدینہ واپس ہو جانے کا حکم دیا تو کس طرح وہ خاموش بیٹھے رہے اور باوجود یہ کہ آپؐ نے تین بار اپنی بات دہرائی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اس کا راز یہ ہے کہ صحابہ نبی ﷺ کے اعمال و تصرفات میں اپنی عام بشریت

کے دائرے میں رہتے ہوئے غور وفکر کرتے تھے، ایک حد تک ہی ان کا فہم حاصل کر پاتے تھے، اور ان سے صرف وہی کچھ سمجھتے تھے جو محسوس تجربات پر مبنی ان کی انسانی عقلیں انھیں سمجھاتی تھیں، جب کہ نبی ﷺ کو اپنے ان اعمال کی واقفیت بشریت اور اس کے تجربات اور اسباب سے ماوراء ہو کر تھی۔ مطلق نبوت آپ کی رہنمائی کرتی اور آپ پر الہام اور وحی کرتی تھی۔ اور صرف حکم الٰہی کا نفاذ آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔

اس کا اظہار آں حضرت ﷺ کے اس جواب سے ہوتا ہے جو آپؐ نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو دیا تھا۔ جب انہوں نے تعجب بلکہ شاید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے آپؐ سے کچھ سوالات کیے تو آپؐ نے انہیں جواب دیا: "میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ وہ میری مدد ضرور کرے گا۔" اس کی وضاحت نبی ﷺ کی اس ہدایت سے بھی ہوتی تھی جو آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو کی تھی۔ آپؐ نے انہیں قریش سے گفتگو کرنے کے لیے مکہ بھیجا تو انہیں اس کا بھی حکم دیا کہ وہاں جو اہل ایمان مرد اور عورتیں ہیں ان سے ملاقات کریں، انہیں فتح کی بشارت دیں اور بتائیں کہ اللہ عزوجل عنقریب مکہ میں اپنے دین کو غالب کرنے والا ہے، اس وقت ایمان کو چھپانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے موقف سے صحابہ کرام دہشت زدہ ہوگئے، اس لیے کہ وہ بشریت کے مفاہیم اور پیمانوں سے ماوراء تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس وقت ان کی دہشت ختم ہوگئی، غم دور ہوگیا اور ابہام کی وضاحت ہوگئی جب رسول ﷺ نے صلح سے فارغ ہوتے ہی ان کے سامنے سورۂ فتح کی تلاوت فرمائی۔ اس وقت صحابہ کرام پر واضح ہوگیا کہ ان شرطوں کو گوارا کرنا ان کی عین فتح تھی۔ مشرکین نے جہاں عزت ملنے کی امید قائم کی تھی وہاں ذلت ان کے ہاتھ آئی اور جن شرطوں کے ذریعے انہوں نے قوت اور غلبہ کا اظہار کیا تھا، انہی کے ذریعے وہ مغلوب ہوگئے۔ اس طرح عقلوں اور خیالات کی کسی تجویز کے بغیر اللہ کے رسول اور اہل ایمان عظیم فتح سے بہرہ ور ہوئے۔

کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر عقائد کے دلائل میں اس سے زیادہ بلیغ اور نمایاں کوئی دوسری دلیل ہے؟

سہیل بن عمرو کی اس شرط پر کہ "اگر قریش کا کوئی آدمی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (ﷺ) کے پاس آجائے تو اسے لوٹانا ہوگا اور اگر محمد (ﷺ) کے ساتھیوں میں سے کوئی قریش کے پاس چلا جائے تو اسے نہیں لوٹایا جائے گا" جب نبی ﷺ نے اپنی منظوری دے دی تو ابتداء میں مسلمانوں نے اپنے دلوں میں تنگی محسوس کی۔ ان کی تنگی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب سہیل بن عمرو کے بیٹے حضرت ابوجندلؓ مشرکین سے بھاگ کر بیڑیوں میں گرتے پڑتے وہاں آپہنچے۔ سہیل نے ان کا گریبان پکڑا اور کہا "اے محمد۔ اس کے آنے سے پہلے ہمارے اور آپ کے درمیان معاہدہ طے پاچکا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "تمہاری بات صحیح ہے"۔ سہیل اپنے بیٹے کو مارتے پیٹتے اور گھسیٹتے ہوئے واپس لے جانے لگے۔ اور وہ زور زور سے چلانے لگے "مسلمانو! کیا میں مشرکوں میں واپس کر دیا جاؤں گا کہ وہ لوگ محض مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے ستائیں" رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: "ابوجندل، صبر اور ضبط سے کام لو۔ اللہ تمہارے لیے اور دوسرے مظلوموں کے لیے کشادگی پیدا کرے گا اور کوئی راہ نکالے گا۔ ہم نے ان لوگوں سے معاہدہ کرلیا ہے اس لیے ان سے بدعہدی نہیں کرسکتے"

صحابہ کرام اس منظر کو دیکھ کر سخت دل گرفتہ ہوئے۔

لیکن پھر اس کے بعد کیا ہوا؟.... نبی ﷺ واپس مدینہ پہنچے تو قریش کے ایک شخص جن کا نام ابوبصیر تھا اور جو اسلام لے آئے تھے، آپؐ کی خدمت میں آگئے۔ قریش نے انہیں واپس لانے کے لیے دو آدمی بھیجے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ان دونوں کے حوالے کردیا۔ وہ انہیں لے کر واپس ہوئے۔ راستے میں یہ لوگ ستانے کے لیے ذوالحلیفہ میں رکے تو حضرت ابوبصیرؓ نے اپنے پہرہ داروں کو غفلت میں پاکر ان میں سے ایک کی تلوار اٹھالی اور اسے قتل کردیا۔ دوسرا بھاگ نکلا۔ حضرت ابوبصیرؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "اے اللہ کے نبی۔ اللہ کی قسم، اللہ نے آپ کا ذمہ پورا کردیا۔ آپؐ نے مجھے ان کے پاس واپس کردیا تھا، لیکن اللہ نے مجھے ان سے نجات دے دی۔" پھر وہ وہاں سے رخصت ہوکر سیف البحر نامی علاقے میں چلے گئے۔ دوسری طرف حضرت ابوجندلؓ بھی کسی طرح قریش کے چنگل سے نکل بھاگے اور حضرت ابوبصیرؓ سے آملے۔ اس طرح وہ جگہ مکہ سے آنے والے مسلمانوں کے لیے جائے پناہ بن گئی۔ قریش کا جو بھی شخص اسلام قبول کرتا وہ مکہ سے نکل کر

حضرت ابوبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں سے آملتا۔ رفتہ رفتہ ان کی پوری جمعیت تیار ہوگئی۔ اب قریش کا جو بھی قافلہ شام جانے کے لیے اس راہ سے گزرتا اسے یہ لوگ روک لیتے اور مشرکوں کو قتل کرڈالتے اور ان کے مال واسباب پر قبضہ کرلیتے۔ آخر قریش نے عاجز آکر اللہ کا واسطہ اور قرابت کی دہائی دے کر رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان لوگوں کو اپنے پاس بلالیں اور اپنے اصحاب میں شامل کرلیں۔ چنانچہ وہ لوگ مدینہ آگئے۔ [8]

فتح مکہ کے دن یہی ابوجندلؓ تھے جنہوں نے اپنے باپ کے لیے امان حاصل کی تھی۔ انہوں نے معرکہ یمامہ میں شہادت پائی[9]

اس طرح صحابہ کرام کا رنج و غم جب دور ہوا تو حکمت الٰہی اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ان کا ایمان اور پختہ ہوگیا۔ صحیح روایت میں ہے کہ حضرت سہیل بن سعیدؓ نے جنگ صفین کے موقع پر فرمایا: "لوگو! اپنی رائے کو غلط سمجھو۔ یوم ابی جندل (یعنی صلح حدیبیہ) کے موقع پر ہم بھی اپنی رائے کو صحیح سمجھ رہے تھے۔ اس وقت اگر میرے بس میں ہوتا کہ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کو رد کردوں تو ایسا ضرور کرتا (لیکن بعد میں واضح ہوا کہ ہماری رائے صحیح نہیں تھی)"

ایک مرتبہ پھر ہم کہیں گے: کیا حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر، عقائد کے دلائل میں اس سے زیادہ بلیغ اور نمایاں کوئی دوسری دلیل ہے؟

صلح حدیبیہ کی عظیم حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ وہ فتح مکہ کو اپنے نبی کے لیے جنگ و قتال کی فتح نہیں، بلکہ رحم و امن کی فتح بنادے۔ ایک ایسی فتح جس کے نتیجے میں لوگ تیزی سے جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگیں، جن لوگوں نے آپ کو تکلیفیں پہنچائی تھیں اور آپ کو نکالا تھا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، آپ کے سامنے صلح کی پیش کش کریں، عاجزی و فروتنی دکھائیں، آپ پر ایمان لائیں، اللہ کی طرف رجوع ہوں اور توحید کا اعلان کریں۔ اسی لیے صلح حدیبیہ کو اس نے فتح کی تمہید بنادیا، تاکہ اس عرصہ میں قریش خوابِ غفلت سے بیدار ہوں، اپنے نفس اور ضمیر کا محاسبہ کریں اور اصحاب رسول کے ساتھ اس صلح اور اس کے مقدمات و نتائج سے عبرت حاصل کریں، تاکہ لوگوں کے ذہن خوب

---

[8] بخاری

[9] دیکھئے الاصابہ ۲۴/۴

سوچ بچار کر لیں اور قبول حق کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

اور ایسا ہی ہوا۔ عنقریب اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

گزشتہ سطور میں صلح حدیبیہ سے متعلق چند الٰہی حکمتیں بیان کی گئی تھیں۔ رہے اس سے مستنبط ہونے والے نتائج اور احکام تو وہ بہت ہیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ ہم سطور ذیل میں کریں گے۔

۲۔ عام حالات میں غیر مسلمانوں سے مدد لینا:

ہم نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے بشر بن سفیان کو مخبر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تھا تاکہ ان کے حالات معلوم کر کے آئے۔ بشر بن سفیان مشرک تھے اور قبیلۂ خزاعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے اس بات کی مزید تائید ہوتی ہے، جسے ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، کہ غیر مسلم سے مدد لینے کا معاملہ حالات اور اس شخص کے کوائف کے تابع ہے۔ اگر وہ شخص قابل اعتماد ہو اور اس سے کسی غداری یا فریب دہی کا اندیشہ نہ ہو تو اس سے مدد لینا جائز ہے ورنہ نہیں۔ بہر حال نبی ﷺ نے جنگ کے علاوہ دیگر حالات میں بھی غیر مسلموں سے مدد لی ہے۔ مثلاً آپ نے غیر مسلم کو دشمنوں کے پاس مخبر بنا کر بھیجا ہے یا اس سے عاریتہً اسلحے لیے ہیں وغیرہ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اگر غیر مسلموں سے جنگ و قتال کے معاملات میں مدد لی جاسکتی ہے تو دیگر معاملات و مسائل میں ان سے مدد لینا بدرجۂ اولیٰ جائز ہے۔

۳۔ اسلام میں شوریٰ کا مزاج:

ہم نے دیکھا کہ رسول ﷺ کے عام اعمال و تصرفات سے شوریٰ کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے اور واضح ہوتا ہے کہ حکمراں کے لیے اسے اختیار کرنا ضروری ہے۔ صلح حدیبیہ کے موقعے پر آپؐ کے عمل سے اس شوریٰ کے مزاج اور اس کی مشروعیت کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی شریعت میں حکمراں کو مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اسے قبول کرنا لازم نہیں ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کی طرف سے مختلف رائیں سامنے آجائیں، ایسی مصلحت نمایاں ہو جائے جس کا علم صرف بعض لوگوں کو ہو، یا مسلمانوں کو تسکین ہو جائے۔

اگر ان کی پیش کردہ رایوں میں سے کسی رائے پر حکمراں کو اسلامی شریعت کے دلائل اور احکام کی روشنی میں اطمینان ہو جائے تو وہ اسے قبول کرلے، ورنہ اسے اختیار ہے کہ جس رائے پر چاہے عمل کرے، بشرطیکہ وہ کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف نہ ہو۔

ہم نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے حدیبیہ میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ نے یہ مشورہ دیا کہ "اے اللہ کے رسول! آپ بیت اللہ کی زیارت کے ارادے سے نکلے ہیں، اس لیے اپنا سفر جاری رکھیے۔ اگر کسی نے ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالی تو ہم اس سے جنگ کریں گے۔"

ابتداء میں نبی ﷺ نے اس مشورہ کو قبول کیا اور اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ کا رخ کیا۔ لیکن جب آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور آپ جان گئے کہ غیب سے اسے آگے بڑھنے سے روک دیا گیا ہے تو اس رائے کو ترک کر دیا جس کا آپ کو مشورہ دیا گیا تھا۔ اور آپؐ نے اعلان کر دیا کہ "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر وہ لوگ کوئی ایسا منصوبہ پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا پہلو مدِ نظر ہو تو میں اسے ضرور منظور کر لوں گا" اس وقت آپؐ حضرت ابو بکرؓ کے مشورہ پر عمل کرنے کے بجائے مشرکین کی شرطوں پر صلح کرنے کے لیے تیار ہو گئے اور اس سلسلے میں آپؐ نے کسی سے مشورہ نہیں کیا، بلکہ ان شروط کو ناپسند کرنے والوں کی ناپسندیدگی اور ناگواری کی بھی مطلق پروا نہیں کی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شوریٰ کا حکم ان معاملات میں ہے جن کے بارے میں وحی الٰہی موجود نہ ہو (آج کے زمانے میں کتاب، سنت اور اجماع ائمہ اس کے قائم مقام ہیں) اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ کی مشروعیت اس لیے ہے تاکہ اس کے ذریعے آنے والی رایوں میں غور کیا جائے، نہ کہ اس لیے کہ انہیں لازماً قبول کر لیا جائے یا ان کی بنیاد پر دوڑ کی جائے۔

۴۔ نبی ﷺ کے آثار سے "توسّل" اور "تبرّک":

ہم نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ سے گفتگو کرتے ہوئے عروہ بن مسعود کس [illegible] سے آپؐ کے اصحاب کو دیکھ رہا تھا۔ بعد میں جب وہ قریش کے پاس واپس گیا تو اس نے یہ تصویر کشی کی: "اللہ کی قسم، رسول اللہ ﷺ جب تھوکتے ہیں تو کوئی نہ کوئی اسے اپنے ہاتھ پر لے لیتا اور

اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے، آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص تعمیل کے لیے دوڑ پڑتا ہے، وضو فرماتے ہیں تو جو پانی گر جاتا ہے اس پر لوگ اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ لڑائی کا گمان ہونے لگتا ہے، آپ کلام فرماتے ہیں تو سب ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں، فرط تعظیم کی وجہ سے کوئی آپ سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں کرتا ہے۔"

رسول ﷺ سے آپ کے اصحاب کی محبت کی یہ ایک نمایاں اور زندہ تصویر ہے جس کی وضاحت عروہ بن مسعود کے مذکورہ بالا کلام سے ہوتی ہے۔ اس سے چند اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں جن سے ہر مسلمان کو واقف ہونا ضروری ہے:

پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت نہ ہو تو آپ پر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور محبت کوئی مجرد عقلی شئ نہیں ہے، بلکہ وہ ایسی چیز ہے جو دل میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان سے ایسے اعمال صادر ہوتے ہیں جیسے عروہ بن مسعود کے بیان کے مطابق صحابہ کرام سے صادر ہوتے تھے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ رسول ﷺ کے آثار سے برکت حاصل کرنا مندوب اور مشروع ہے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ صحابہ کرام نبی ﷺ کے بال، پسینے، وضو کے بچے ہوئے پانی، تھوک اور پانی کے پیالے سے برکت حاصل کرتے تھے۔ ایسی بعض احادیث ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔[۱۰]

یہ چیز معلوم و معروف ہے کہ کسی شئ سے برکت حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے واسطے اور وسیلے سے خیر و برکت چاہی جائے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ کے

---

[۱۰] دیکھئے باب سوم کے آخری صفحات، ص: ۲۵۵-۲۵۶

میرے ایک فاضل دوست نے مجھے خبر دی کہ اس کتاب کے جس صفحے میں عروہ کے بیان کردہ، مجلسِ نبوی کا منظر پیش کیا گیا ہے اس کی چند کاپیاں ایک شخص نے فوٹو اسٹیٹ کروا کے لوگوں میں تقسیم کروائیں، تاکہ اس کے ذریعے ذات نبوی کو مورد الزام ٹھہرایا جا سکے اور آپ کی تنقیص کی جا سکے۔ اس شخص نے اس صفحہ کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے اور اس کے مضمون کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کی جو کوشش کی اس میں اگر اس کی نیت خالص اور مقصد پاکیزہ ہوتا تو وہ شکریہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر) ★★★

آثار کا وسیلہ اختیار کرنا مندوب و مشروع ہے۔ چہ جائیکہ آپ کی ذات گرامی کا وسیلہ اختیار

★★★ اور اجر کا مستحق ہوتا، اس لیے کہ اس کے اس عمل سے ایک ایسی حقیقت کا اثبات ہوتا جس سے آج بہت سے لوگ ناواقف ہیں اور وہ یہ کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کی انتہائی تعظیم اور آپ سے از حد محبت کرتے تھے۔ اسلامی فتوحات کے حوادث و واقعات میں ایسی نہ جانے کتنی پہیلیاں ہیں جو عقل کو چیلنج کرتی ہیں۔ اگر ان کی وضاحت اس عظیم محبت سے نہ ہو جس نے صحابہ کے دلوں پر قبضہ جما لیا تھا، جو ان کے نفوس میں سرایت کر گئی تھی اور جو ان کے اس پختہ یقین کا نتیجہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول اور انسانوں کے لیے اللہ کی رحمت ہیں۔

لیکن اس شخص کے ایسا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں آں حضرت ﷺ کی حیثیت مجروح کر دے اور ان کی نگاہوں میں آپ کی تصویر ایک ایسے شخص کی ابھرے جس نے اپنے ساتھیوں کو دباؤ میں لے لیا ہو اور ان کی جانب سے اپنی انتہائی تعظیم و احترام دیکھ کر اسے لذت حاصل ہوتی ہو۔ اس طرح وہ آپ کی تصویر ایک ایسے بے حس اور بد خلق شخص جیسی پیش کرنا چاہتا تھا جس کی خصلت یہ تھی کہ وہ لوگوں کے سامنے ایسی چیز کا دکھاوا کرتا تھا جسے پوشیدہ ہی رکھنا مناسب تھا۔ اور اس دکھاوے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس سے محبت کرنے لگیں اور اس کے متعلقات سے انسیت محسوس کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس شخص نے مقصد حاصل کرنے کے لیے غلط راستے کا انتخاب کیا اور اس میں سراسر ناکام رہا۔

بہت سے لوگوں نے یہ کوشش کی۔ انہوں نے فکری موشگافیاں کیں، مختلف تدابیر اختیار کیں، اور تاریخی حوالے دیے، تاکہ اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی اس انداز کی تصویر گھڑ سکیں۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکام رہے اور عقل، تاریخ اور آزاد فکر سب نے آپ کے اس وصف کی تائید کی جس کا اظہار اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم: ٤) (اے نبی بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر فائز ہو)

رسول اکرم ﷺ کے اخلاق و شمائل پر کوئی کتاب پڑھ جایئے، آپ حضور کی ذات میں اعلیٰ ترین اور پاکیزہ انسانیت، معاملات کے پیمانوں میں بلند ذوق، دوسروں کا خیال رکھنے میں شدتِ احساس، صفائی اور ستھرائی، خوش سلیقگی اور حسن صورت اور اپنے تمام اصحاب کے سامنے انتہائی تواضع کا کامل نمونہ پائیں گے۔ آپ اپنے ملاقاتیوں کا استقبال صاف ستھرے لباس اور خوب صورت پوشاک

(بقیہ اگلے صفحہ پر) ★★★

کیا جائے۔
اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ ایسا آپ کی حیات مبارکہ میں کیا جائے یا آپؐ کی وفات

***

میں کرتے تھے اور آپ کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ آپ کی ہیئت ایسی ہو کہ وہ نگاہوں کو بھلی لگے اور لوگوں کو آپ کے پاس بہترین خوشبو کا احساس ہو۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپ اپنا خاصا مال خوشبو میں خرچ کرتے تھے۔ آپ پیاز، لہسن یا کوئی اور ایسی چیز نہیں تناول فرماتے تھے جس کی بو سے لوگوں کو اذیت ہو۔ جن دنوں آپؐ ہجرت مدینہ کے اولین ایام میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر مہمان تھے، ایک مرتبہ آپ نے بغیر کچھ کھائے کھانے کا برتن واپس کردیا۔ حضرت ابوایوبؓ گھبرا کر بھاگے ہوئے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کا سبب دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: "مجھے کھانے میں لہسن کی بو محسوس ہوئی تھی۔ مجھے چونکہ (لوگوں سے) گفتگو کرنی ہوتی ہے اس لیے میں نے اسے کھانے سے احتراز کیا۔ تم لوگ کھا سکتے ہو" جب آپ کو تقاضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تو آپ دور، بہت دور تشریف لے جاتے تاکہ لوگ آپ کا پتا نہ پاسکیں۔ آپ اپنے بالوں میں کنگھی کرتے۔ اپنے منہ اور دانتوں کی صفائی کا اہتمام فرماتے۔ اپنے کسی ہم نشیں کے دانتوں میں آپ کچھ لگا ہوا دیکھتے تو تمام حاضرین کو مخاطب کر کے انہیں نصیحت کرتے اور صفائی ستھرائی کا خیال نہ رکھنے والوں کی بہت نرمی سے سرزنش کرتے۔ فرماتے: "تم لوگ گندے منہ کے ساتھ کیوں آجاتے ہو؟ مسواک کیوں نہیں کرتے؟"

یہ ہیں حضرت محمد ﷺ کے بعض شمائل جو آپؐ کے اخلاق کی بلندی، شعور کی رقت، ذوق کی سلامتی اور احساس کی ذکاوت کا پتا دیتے ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی اس مثالی انسانی کردار کے بارے میں کوئی حرف گیری کی جاسکتی ہے یا اس پر کوئی الزام لگایا جاسکتا ہے؟

معلوم ہوا کہ عروہ بن مسعود کے کلام میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے آں حضرت ﷺ کے مزاج میں کسی نقص یا عیب اور آپ کے معاملات اور برتاؤ میں درشتی کا اشارہ ملتا ہو یا آپ کی تصویر ایسی بنتی ہو کہ آپؐ اپنے اصحاب کو دباؤ میں رکھتے تھے، یا اپنے لیے غیر معمولی عقیدت کا مظاہرہ کرنے پر انہیں ابھارتے تھے۔

اپنی اس کوشش میں ناکامی کے بعد، اگر یہ شخص ان حضرات کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے اور ان پر ناک

(بقیہ اگلے صفحہ پر) ***

کے بعد۔ اس لیے کہ نبی ﷺ کے آثار اور فضلات کو حیات سے مطلق نسبت نہیں ہے۔ ان سے برکت حاصل کرنا اور ان کا وسیلہ اختیار کرنا خواہ آپؐ کی حیات میں ہو یا آپ کی وفات کے

***

بھوں چڑھائے جن سے محبت نے یہ سب کام کروائے تھے تو اس پر یہ چیز واضح ہو جانی چاہئے کہ حقیقت میں اس کا مدِّ مقابل کون ہے؟ جس نے اس کے دل میں نفرت و کراہیت کے یہ احساسات پیدا کردیے ہیں؟ تاکہ بے قصوروں پر خواہ مخواہ الزام نہ آئے۔

اس دعوئی میں اس کا مدِّ مقابل محبت ہے۔ محبت ہی نے ان لوگوں کو ان سب کاموں پر مجبور کیا تھا جن کا تذکرہ عروہ بن مسعود نے کیا ہے۔ محبت ہی نے ان کے لیے لوہے کو موم، دور کو قریب، محال کو ممکن، بدصورت کو حسین اور کھاری نمک کو خوش ذائقہ حلوہ بنادیا تھا۔ محبت کا یہی کردار ہوتا ہے اور وہ یہی کام انجام دیتی ہے۔

اگر اس شخص کو معلوم ہو کہ نوامیس کائنات میں نفوس میں سرایت کرنے اور دلوں پر قبضہ جمانے والی کوئی قوت محبت سے بڑھ کر ہے تو اسے اس کے پاس شکوہ کرنا چاہیے، اسے محبت کے خلاف بھڑکانا چاہیے اور اس کے سامنے ان کاموں سے اپنی ناگواری کا اظہار کرنا چاہئے جو محبت سے مجبور ہو کر لوگ انجام دیتے ہیں۔

یہ شخص اور اس جیسے دوسرے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت کیا کیا کرشمے انجام دیتی ہے۔ یہ محبت ہی ہے جو عقل کی بے خبری میں یا اسے چیلنج کرتے ہوئے دل میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور اس کی وجہ سے انسان عجیب و غریب حرکتیں کرتا ہے اور ایسے ایسے حقیر کام انجام دیتا ہے جنھیں بیان کرنے سے بھی طبیعت ابا کرتی ہے، لیکن اس کی حساس طبیعت کو ان کاموں سے کچھ بھی گھن یا کراہیت نہیں ہوتی۔ انشا پرداز، ادبا اور شعرا اس "گلابی" انحراف کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کے نشے کو خالص شراب کے نشے سے تشبیہ دیتے ہیں۔

لیکن مقام حیرت ہے کہ یہی لوگ جب اس محبت کو قلب اور عقل کے احساسات میں جاگزیں دیکھتے اور انسان کی زندگی اور اس کے برتاؤ میں اس کے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں تعجب ہوتا ہے۔ وہ اس پر اپنی ناگواری اور کراہیت کا اظہار اور اپنی نفاستِ طبع اور ذوقِ لطیف کا دکھاوا کرتے ہیں۔

ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا کی تمام چیزیں ایک مستقل قانون کے تابع ہیں۔ سوائے محبت کے، کہ اس کا اپنا الگ قانون ہے۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر) ***

بعد، دونوں برابر ہیں، جیسا کہ صحیح بخاری باب شیب رسول اللہ ﷺ میں مذکور حدیث سے ثابت ہے۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے خالی ہیں۔ انہوں نے آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد آپ ؐ کی ذات کا وسیلہ اختیار کرنے سے انکار کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ نبی ﷺ کی تاثیر آپ ؐ کی وفات کے ساتھ ختم ہو گئی، اس لیے آپ کا وسیلہ اختیار کرنے کا مطلب ایک ایسی چیز کو وسیلہ بنانا ہے جس میں مطلق تاثیر نہ ہو۔

یہ دلیل ان کی عجیب و غریب اور انتہائی جہالت کا پتا دیتی ہے۔

★★★

بربادی ہے اس شخص کے لیے جس کا دل اس کی عقل سے ہم آہنگ نہ ہو۔ اور قابل مبارک باد ہے وہ شخص جس کی دلی محبت اس کے عقلی فیصلوں سے ہم آہنگ ہو۔

اصحاب رسول کے شرف اور فخر کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ سے جو شدید محبت پائی جاتی تھی وہ آپ ؐ کی نبوت کی صداقت اور بارگاہ الٰہی میں آپ ؐ کے عظیم مرتبے پر ان کے عقلی ایمان کا نتیجہ تھی۔ اس لیے یہ محبت ان سے جو کچھ کام کرواتی وہ کم تھے۔ وہ آپ کے پسینے، تھوک، سر سے جھڑنے والے بال اور وضو کرتے ہوئے گرنے والے پانی سے برکت حاصل کرتے تھے... یہ محبت کی زبان ہے۔ اور محبت کی زبان کو اسی کے سانچے سے ناپا جا سکتا ہے، کسی دوسرے ذریعے سے اس پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

میں جانتا ہوں کہ آج بھی ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اگر حضرت محمد ﷺ کا دیدار کر لیں اور آپ کو زمین پر چلتا پھرتا دیکھ لیں تو ان کی محبت جوش مارنے لگے، وہ زمین پر گر پڑیں اور اس مٹی کو چاٹنے لگیں جو رسول اللہ ﷺ کے قدموں کے نیچے آئی ہو۔

قبیلہ بنو عامر کے مجنوں نے بڑی پتے کی بات کہی تھی جسے زمانہ نے محفوظ کر لیا ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ بعض لوگ لیلیٰ سے اس کی محبت پر اسے تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں اور اسے بے وقوف قرار دے رہے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں وہ سانولے رنگ کی اور بدشکل ہے، تو اس نے کہا "اگر وہ لوگ اسے میری نظر سے دیکھتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ غلطی پر ہیں"

کیا رسول اللہ ﷺ کی حیات میں اشیاء میں آپ کی ذاتی تاثیر ثابت ہے کہ ہم آپ کی وفات کے بعد اس تاثیر کے ہونے یا نہ ہونے میں بحث کریں؟! کوئی مسلمان اشیاء میں ذاتی تاثیر کی نسبت اللہ وحدہ لاشریک کے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں کر سکتا۔ جو شخص اس کے برخلاف عقیدہ رکھے گا اس کے کفر پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے۔

آں حضرت ﷺ کی ذات گرامی یا آپ ؐ کے آثار سے برکت حاصل کرنے یا انہیں وسیلہ بنانے کی بنیاد اس بات پر نہیں ہے کہ کوئی تاثیر آپ ؐ کی جانب منسوب کی جا رہی ہے۔ العیاذ باللہ۔ بلکہ اس کی بنیاد اس چیز پر ہے کہ آں حضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے نزدیک علی الاطلاق اس کی تمام مخلوقات میں سب سے افضل ہیں اور آپ کی ذات گرامی بندوں پر اللہ کی رحمت ہے۔ اس لیے بارگاہ الٰہی میں آپ ؐ کے تقرب اور مخلوقات کے لیے آپ کی عظیم رحمت کا وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اسی معنی میں ایک نابینا شخص نے آپ ؐ کا وسیلہ اختیار کر کے اپنی بینائی واپس آ جانے کی دعا کی تھی، اور اللہ نے اس کی بینائی لوٹا دی تھی[1] اور اسی معنی میں صحابہ کرام آپ ؐ کے آثار اور فضلات کا وسیلہ اختیار کرتے تھے اور آپ ؐ انہیں ایسا کرنے سے نہیں روکتے تھے۔ گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ استسقاء وغیرہ میں اہل صلاح و تقویٰ اور خانوادۂ نبوت کے متعلقین کے واسطے سے دعا کرنا مستحب ہے۔ اس پر جمہور ائمہ و فقہاء کا اتفاق ہے جن میں شوکانیؒ، ابن قدامہ

---

[1] نابینا شخص کے رسول اللہ ﷺ کے وسیلے سے دعا کرنے اور اس کے نتیجے میں اس کی بینائی لوٹ آنے والی حدیث صحیح ہے جسے ترمذیؒ، نسائیؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے حضرت عثمان بن حنیفؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: "ایک نابینا شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کی مجلس میں بہت سے صحابہ موجود تھے۔ اس نے اپنی بے بصارتی کا شکوہ کیا۔ آپ ؐ نے اسے صبر کی تلقین فرمائی۔ اس نے پھر عرض کیا: "میری رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں، مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔" آپ ؐ نے فرمایا: "وضو خانے کے پاس جاؤ، وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرو، پھر یوں دعا کرو: "اے اللہ میں تیرے نبی حضرت محمد ﷺ نبی رحمت کے واسطے سے تیرے سامنے دست سوال دراز کرتا ہوں۔ اے محمدؐ! میں تیرے واسطے سے اپنے رب سے دعا کرتا ہوں کہ میری مراد پوری ہو جائے۔ اے اللہ تو میرے معاملے میں ان کی سفارش قبول فرما" بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ حضور نے اس شخص سے فرمایا: "تمہیں کوئی بھی ضرورت ہو تو اسی انداز سے دعا مانگا کرو۔" حضرت عثمان بن حنیفؓ فرماتے ہیں۔ ابھی یہ مجلس ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ شخص واپس آیا۔ اس وقت اس کی بینائی لوٹ آئی تھی۔

حنبلیؒ اور صنعانیؒ قابل ذکر ہیں [12]

اس معاملے میں آں حضرت ﷺ کی حیات اور وفات کا فرق کرنا عجیب وغریب غلط مبحث ہے جس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

۵۔ کسی بیٹھے ہوئے شخص کے پاس کھڑے رہنے کا حکم:

پیچھے گزرا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ تلوار لیے نبی ﷺ کے پاس کھڑے تھے۔ جوں ہی عروہ بن مسعود آپؐ کی ریش مبارک پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا وہ تلوار کے دستے سے اس کے ہاتھ پر مارتے اور کہتے: "اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا"۔

اور غزوۂ بنی قریظہ کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں کہ کسی بیٹھے ہوئے شخص کے پاس کھڑے رہنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ تعظیم کے ایسے مظاہر میں سے ہے جو عجمیوں کے نزدیک معروف ہیں، لیکن اسلام انہیں ناپسند کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کرنے سے منع کیا ہے۔ فرمایا: "جو شخص یہ پسند کرتا ہو کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے کھڑے رہیں اس کا ٹھکانہ جہنم ہے" پھر یہاں اس کی خلاف ورزی کیوں کی گئی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ممانعت کے عمومی حکم سے ایسی مخصوص حالت مستثنیٰ ہے۔ یعنی جب دشمن کے نمائندے امام یا خلیفہ کے پاس آئیں تو اس وقت اس کے پاس چند محافظین یا فوجیوں کے کھڑے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا مقصد اسلامی شان وشوکت کا اظہار، امام کی تعظیم اور ان نمائندوں کی جانب سے ممکنہ دست درازی سے حفاظت ہوتا ہے۔ [13] لیکن عام حالات میں بلا ضرورت یہ جائز نہیں، اس لیے کہ یہ چیز توحید اور اسلامی عقیدہ کے تقاضے کے برخلاف ہے۔

اسی سے مشابہ وہ چیز بھی ہے جس کا تذکرہ غزوۂ احد میں حضرت ابودجانہؓ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کیا جا چکا ہے۔ وہاں ہم نے کہا تھا کہ ہر وہ کام جس سے گھمنڈ یا غرور کا اظہار ہوتا ہو، شرعاً ممنوع ہے۔ لیکن خاص طور پر حالت جنگ میں اس کی اجازت ہے۔ اس کی دلیل یہ

[12] ملاحظہ کیجئے باب دوم کی پہلی بحث بعنوان "آں حضرت ﷺ کا نسب، ولادت اور رضاعت"۔

[13] دیکھئے زاد المعاد، ابن القیم ۲/ ۱۱۴

ہے کہ حضرت ابودجانہؓ جب آں حضرت ﷺ کی دی ہوئی تلوار لے کر اکڑ کر چلے تو آپؐ نے فرمایا: "یہ چال اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے لیکن اس موقع پر پسند ہے"

۶۔ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان صلح کی مشروعیت:

علماء اور ائمہ نے صلح حدیبیہ سے اس پر استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں اور ان کے دشمن حربیوں کے درمیان مخصوص مدت کے لیے صلح کرنی جائز ہے، خواہ یہ بلا عوض ہو یا اس کی شرط یہ ہو کہ غیر مسلم کچھ مالی تاوان ادا کریں۔ بلا عوض صلح کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ صلح حدیبیہ اسی طرح ہوئی تھی۔ اور غیر مسلموں سے کچھ مال لے کر صلح کرنی اس لیے جائز ہے کیونکہ جب ان کے ساتھ بلا عوض صلح جائز ہے تو عوض کے ساتھ بدرجہ اولیٰ جائز ہوگی۔

لیکن اگر صلح کی شرط یہ ہو کہ مسلمان کچھ مال غیر مسلموں کو دیں تو جمہور مسلمانوں کے نزدیک یہ ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اس میں ان کی ذلت ہے اور اس کے جواز پر کتاب اور سنت میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو اور اس سے کوئی مفر نہ ہو، اگر ایسا نہ کیا جائے تو مسلمانوں کی ہلاکت یا اسیری کا اندیشہ ہو تو جائز ہے، جیسا کہ مسلمان قیدی کو چھڑانے کے لیے فدیہ میں مال دینا جائز ہے۔

۷۔ صلح کے لیے مدت کی تعیین ضروری ہے:

امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور دیگر بہت سے ائمہ کا مسلک ہے کہ صلح کے لیے مخصوص مدت کی تعیین ضروری ہے اور یہ کہ یہ مدت دس سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقعے پر قریش سے اتنی ہی مدت کا معاہدہ کیا تھا۔

۸۔ صلح کی کون سی شرطیں صحیح ہیں اور کون سی غلط؟

معاہدۂ صلح کی شرطیں صحیح بھی ہو سکتی ہیں اور غلط بھی۔ صحیح ہر وہ شرط ہے جو کتاب اللہ یا سنت رسول کی کسی نص کے خلاف نہ ہو، مثلاً یہ شرط کہ فریقِ مخالف وقتِ ضرورت مسلمانوں کو کچھ مال دیگا، یا ان کا تعاون کرے گا۔ یا یہ شرط کہ اگر دشمن کے علاقے سے کوئی شخص مسلمان

ہو کر یا امان طلب کرنے کے لیے آئے گا تو اسے واپس کرنا ہوگا۔ تمام ائمہ نے اس موخرالذکر شرط کو صحیح قرار دیا ہے، سوائے امام شافعیؒ کے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس شخص کو واپس کیا جا سکتا ہے جس کے کافروں کے درمیان ایسے رشتے دار ہوں جو اسے تحفظ فراہم کر سکیں۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ نبی ﷺ نے قریش کے لیے اس شرط کو اسی لیے منظوری دی تھی کہ اسلام قبول کرنے والوں کے رشتے دار مکے میں موجود تھے۔ [۱۱۴]

غلط ہر وہ شرط ہے جس سے کسی ثابت شدہ شرعی حکم کی مخالفت ہوتی ہو۔ مثلاً یہ شرط کہ دشمنوں کے علاقے سے اگر مسلمان عورتیں آئیں گی تو انہیں واپس کر دیا جائے گا، یا ان کے مہر واپس کر دیے جائیں گے، یا یہ شرط کہ دشمنوں کو مسلمان کے کچھ ہتھیار یا مال دے دیا جائے۔ اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ جو مسلمان عورتیں اپنے دین وایمان کو بچا کر مکے سے آ گئی تھیں نبی ﷺ نے انہیں واپس نہیں کیا تھا اور قرآن میں بھی ایسا کرنے سے صراحت سے منع کیا گیا تھا، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس طرح تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہی عہد کی خلاف ورزی کی، اس لیے کہ آپؐ نے اس شرط کو منظوری دے دی تھی کہ مکے سے جو مسلمان بھی آئے گا اسے واپس کر دیا جائے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں یہ شرط منصوص نہیں تھی، بلکہ اس کا احتمال تھا کہ اس کا اطلاق صرف مردوں پر ہو۔ اور اگر بالفرض ہم یہ تسلیم کر لیں کہ معاہدہ کی دفعات اور شرائط میں عورتوں کی واپسی بھی تھی تو گزشتہ تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ نبی ﷺ کے اعمال وتصرفات کو شرعی حیثیت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب کتاب اللہ میں اس کے بارے میں سکوت ہو، یا اس کی تائید کر کے اس کا اثبات کیا گیا ہو۔ اور اس موقع پر نازل ہونے والی آیات نے اس معاہدہ کی تمام دفعات کی توثیق کر دی تھی، سوائے اس دفعہ کے جو عورتوں کو دارالکفر میں واپس کرنے سے متعلق تھی۔

۹۔ کسی وجہ سے عمرہ اور حج نہ کر پانے والے کا حکم:

صلح سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے احرام کھول دیا، قربانی کے جانور ذبح

[۱۱۴] صلح کے موضوع پر تفصیل کے لیے دیکھئے مغنی المحتاج ۴/۲۶۰، المغنی ابن قدامہ ۹/۲۹۰، ہدایہ ۲/۱۰۳، بدایۃ المجتہد ۱/۳۷۴

کر دیے اور حلق کروایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے حج یا عمرہ نہ کر پائے تو اس کے لیے احرام کھول دینا جائز ہے۔ اسے چاہئے کہ جہاں اسے روک دیا گیا ہے وہیں قربانی کرے اور حلق کرائے، پھر احرام کھولنے کی نیت کر لے۔

اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کا وہ حج یا عمرہ نفلی تھی تو اس کی قضا لازم نہیں۔ حنفیہ کی رائے اس کے برخلاف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص نفلی حج یا عمرہ کی نیت سے نکلنے کے بعد کسی وجہ سے اسے ادا نہ کر پائے تو اس پر اس کی قضا واجب ہے۔ اس کی دلیل انہوں نے یہ دی ہے کہ وہ تمام صحابہ جو آں حضرت ﷺ کے ساتھ صلح حدیبیہ میں نکلے تھے وہ سب کے سب عمرۃ القضاء میں آپ کے ساتھ تھے، سوائے ان صحابہ کے جن کی اس عرصہ میں وفات ہو گئی تھی، یا وہ غزوۂ خیبر میں شہید ہو گئے تھے۔

غزوۂ خیبر

پھر نبی ﷺ نے ۷ھ میں ماہ محرم کے اواخر میں خیبر کا قصد کیا۔ خیبر ایک بڑا شہر تھا جس میں بہت سے قلعے اور کھیت تھے۔ یہ مدینہ کے شمال میں شام کی سمت سو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

نبی ﷺ کے ساتھ اس غزوہ میں ایک ہزار چار سو جنگ جو تھے۔ ان میں سے کچھ شہ سوار اور زیادہ تر پیادہ تھے۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ جب نبی ﷺ خیبر کے پاس پہنچے تو آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: ٹھہرو! پھر آپؐ نے یہ دعا فرمائی:

"اے اللہ! جو آسمانوں کا رب ہے اور ان کا بھی جو ان کے نیچے ہیں۔ جو زمینوں کا رب ہے اور ان کا بھی جو ان کے اوپر ہیں۔ جو شیاطین کا رب ہے اور ان کا بھی جنہیں وہ بہکائیں، جو ہواؤں کا رب ہے اور ان کا بھی جنہیں وہ اڑا کے لے جائیں۔ ہم تجھ سے اس بستی اور اس کے رہنے والوں اور اس کی چیزوں کے خیر کے خواستگار ہیں اور اس کے شر سے اور اس کے رہنے والوں اور اس کی چیزوں کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔"

یہ دعا کر کے آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: "اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو"

رسول اللہ ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ جب آپ کسی قبیلے پر حملے کا ارادہ فرماتے تو رات کو حملہ نہ کرتے بلکہ صبح کا انتظار کرتے۔ اگر اذان کی آواز سنائی دیتی تو توقف فرماتے اور اگر اذان سنائی نہ دیتی تو حملہ کر دیتے۔ یہاں بھی آپؐ نے رات گزاری اور صبح حملہ کی نیت سے پیش قدمی کی۔ راستے میں خیبر کے کسان جو اپنے کدال، پھاوڑے اور ٹوکرے لیے اپنے کھیتوں کو جا رہے تھے، نظر آئے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو چلائے کہ محمد (ﷺ) اور لشکر آ گیا۔ پھر الٹے پیر بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ اکبر

خیبر برباد ہو گیا۔ ہم کسی قوم پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان لوگوں کی صبح بری ہوتی ہے (یعنی ان کی شامت آ جاتی ہے) جنہیں پہلے ہی ڈرایا اور آگاہ کیا جا چکا ہے"[15]

ابن سعدؒ کہتے ہیں: رسول ﷺ نے لوگوں کے سامنے وعظ فرمایا، پھر ان کے درمیان جھنڈے تقسیم کیے۔ مسلمانوں اور اہل خیبر کے درمیان معرکوں کا آغاز ہوا۔ وہ لوگ اپنے قلعوں میں مورچہ بند ہو گئے تھے۔ مسلمان ایک ایک کر کے سب فتح کرتے گئے۔ آخر میں وطیح اور سلالم نامی دو قلعے رہ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دس سے زائد دن ان کا محاصرہ کیے رکھا۔

احمد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے کہ حضرت بریدہ بن الخطیبؓ نے فرمایا:
"غزوہ خیبر میں ایک موقعے پر جھنڈا حضرت ابو بکرؓ نے سنبھالا، لیکن ان کے ہاتھوں قلعہ فتح نہیں ہو سکا اور وہ لوٹ آئے۔ دوسرے دن حضرت عمرؓ نے جھنڈا سنبھالا۔ وہ بھی قلعہ فتح نہیں کر سکے اور واپس آ گئے۔ تب نبی ﷺ نے فرمایا: کل میں پرچم ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھوں اللہ اس قلعہ کو فتح کرے گا۔ وہ شخص اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے" وہ رات صحابہ نے انگلیں لگاتے اور بحث و مباحثہ کرتے ہوئے گزاری کہ کل یہ سعادت کس کے حصے میں آئے گی۔ صبح ہوئی تو صحابہ رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر شخص امید لگائے ہوئے تھا کہ شاید یہ سعادت اس کے حصے میں آئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: علی بن ابی طالب کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا کہ اے اللہ کے رسول ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ آپؐ نے انہیں بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیا اور ان کے لیے دعا کی۔ وہ اسی وقت بالکل اچھے ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کچھ درد ہی نہ تھا۔ آپؐ نے پرچم ان کے حوالے کیا۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول! کیا ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک کہ وہ ہماری طرح (یعنی مسلمان) نہ ہو جائیں؟ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: یہاں سے روانہ ہو کر ان لوگوں کے سامنے پڑاؤ ڈالو۔ پھر ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان پر اللہ کا جو حق ہے اس سے انہیں آگاہ کرو۔ اللہ کی قسم! اگر اللہ تمہارے ذریعے ایک آدمی کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔" انہوں نے جا کر جنگ کی

---

[15] بخاری و مسلم

اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعے فتح عطا فرمائی۔ ۱۶ ان قلعوں میں جو کچھ مال اکٹھا تھا سب مسلمانوں کو غنیمت میں حاصل ہوا۔

جو دو قلعے فتح نہیں ہو سکے تھے مسلمان برابر ان کا محاصرہ کیے رہے، یہاں تک کہ جب ان میں محصور لوگوں کو یقین ہو گیا کہ وہ ہلاک ہو جائیں گے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ ان کی جاں بخشی کر دیں، ان کے اموال لے لیں اور انہیں کہیں اور چلے جانے کی اجازت دے دیں۔ آپؐ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمالی۔

پھر ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ خیبر انہی کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے، وہ یہاں کے کھیتوں میں کام کرتے رہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی زمینوں کو اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ان میں اچھی کاشت کر سکتے ہیں۔ اس کے عوض ان کی پیداوار کا نصف حصہ انہیں دے دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ان سے مصالحت کر لی اور فرمایا: ہم جب چاہیں گے تمہیں ان سے بے دخل کر دیں گے'' ۱۷

ابن اسحاق نے لکھا ہے: جب رسول اللہ ﷺ غزوہ سے فارغ ہوئے اور آپ کو اطمینان ہوا تو سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے بکری کا بھنا ہوا گوشت تحفے میں بھیجا۔ اس نے پہلے سے معلوم کر لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو بکری کا کون سا عضو زیادہ مرغوب ہے۔ اسے بتایا گیا کہ آپؐ کو دست بہت مرغوب ہے۔ اس نے پورے گوشت میں زہر ملا دیا۔ اور خاص طور پر دست کو زیادہ زہر آلود کر دیا۔ پھر گوشت لے کر آئی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپؐ نے دست اٹھا کر اس سے ایک لقمہ لیا لیکن اسے نگل نہ سکے اور تھوک دیا اور فرمایا: اس ہڈی نے مجھے خبر دی ہے کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے۔ آپؐ کے ساتھ کھانے میں ایک صحابی حضرت بشر بن البراء بن معرورؓ شریک تھے۔ انہوں نے بھی آں حضرت ﷺ کی طرح ایک لقمہ لیا اور اسے نگل گئے۔ چنانچہ اس کا زہر ان کے جسم میں سرایت کر گیا جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ آپؐ نے اس عورت کو بلایا اور اس سے باز پرس کی۔ اس نے

۱۶ ارشاد نبوی ''کل میں پرچم ایک ایسے شخص کو دوں گا...... الخ'' سے آگے کا حصہ بخاری اور مسلم دونوں میں مروی ہے۔

۱۷ بخاری و مسلم

اعتراف کر لیا۔ آپؐ نے فرمایا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: آپ نے میری قوم کے ساتھ جو معاملہ کیا ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر آپ دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ ہیں تو اس طرح آپ کی ہلاکت سے ہمیں راحت مل جائے گی اور اگر اللہ کے نبی ہیں تو آپ کو اس کی خبر ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس سے درگزر فرمایا اور اسے کوئی سزا نہیں دی۔ ۱۸

زہری نے اور سلیمان تیمی نے اپنی مغازی میں قطعیت سے بیان کیا ہے کہ اس عورت نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ پھر علماء سیرت میں اس بات پر اختلاف ہے کہ زہر کے اثر سے حضرت بشرؓ کے ہلاک ہو جانے کے بعد آپؐ نے قصاص میں اس عورت کو قتل کرا دیا تھا یا نہیں؟ ابن سعد نے متعدد سندوں سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اس عورت کو حضرت بشرؓ کے اولیاء کے حوالے کر دیا جنہوں نے اسے قتل کر دیا۔ لیکن صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے اس عورت سے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کبھی تجھے اس پر (یعنی ہلاک کرنے پر) قادر نہیں کرے گا" صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم اسے قتل کر دیں۔ فرمایا نہیں''

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان خیبر کا مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ آپؐ نے پیادہ کو ایک حصہ اور گھوڑے کو دو حصے دیے۔ امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت نافعؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ آپؐ نے شہ سوار کو تین حصے عطا فرمائے، ایک حصہ اس کا اپنا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔ یہود کے سردار حی بن اخطب کی صاحب زادی صفیہ بھی خیبر کی قید ہونے والی عورتوں میں تھیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا اور ان کی آزادی کو ان کا مہر قرار دیا۔ ۱۹

حبشہ سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد

ابھی رسول اللہ ﷺ خیبر میں ہی تھے کہ حبشہ سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ سولہ مرد و عورت تھے۔ ان کے ساتھ یمن کے بھی بہت سے لوگ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی اجازت سے مال غنیمت

۱۸ ان الفاظ میں یہ واقعہ ابن اسحاق نے نقل کیا ہے۔ مختصراً یہ بخاری اور مسلم میں بھی مروی ہے۔

۱۹ بخاری و مسلم

میں ان لوگوں کا بھی حصہ لگایا۔

ابن ہشام فرماتے ہیں کہ: حضرت جعفر بن ابی طالبؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، انہیں چمٹایا اور فرمایا: "مجھے نہیں معلوم کہ کس چیز کی مجھے زیادہ خوشی ہے، خیبر کی فتح سے یا جعفر کی آمد سے؟" [۲۰]

جب رسول اللہ ﷺ مدینہ واپس تشریف لے آئے تو ایک انصاری صحابی کو خیبر کا عامل (محصل) بنایا۔ کہا گیا ہے کہ ان کا نام سواد بن غزیہ تھا اور ان کا تعلق قبیلۂ بنو عدی سے تھا۔ وہ وہاں سے اچھی قسم کی کھجوریں [۲۱] لائے۔ رسول ﷺ نے دریافت فرمایا: کیا خیبر کی تمام کھجوریں اسی طرح ہوتی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: "نہیں اے اللہ کے رسول! ہم اس قسم کی ایک صاع کھجور عام قسم کی دو یا تین صاع کھجوریں دے کر لیتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: ایسا نہ کرو بلکہ سب کو بیچ کر درہم لے لو، پھر درہم سے اچھی کھجوریں لے لو۔ [۲۲]

دروس ونصائح

۱۔ غزوۂ خیبر اور سابقہ غزوات میں فرق:

غزوۂ خیبر کے سلسلے میں سب سے پہلے ہماری توجہ اس جانب مبذول ہونی چاہئے کہ گزشتہ جن غزوات کا پہلے ہم تذکرہ کر چکے ہیں ان میں اور اس غزوہ کے مزاج میں کیا فرق ہے؟

سابقہ تمام غزوات دفاعی اسباب پر مبنی تھے جن کا تقاضا تھا کہ مسلمان ان کے ذریعے اپنا دفاع کریں اور دشمنوں کے حملوں کا جواب دیں، جیسا کہ ہر غزوہ کا سبب بیان کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

رہا یہ غزوہ، جو کہ واقعہ بنی قریظہ اور صلح حدیبیہ کے بعد پہلا غزوہ ہے، تو اس کی دوسری حیثیت تھی۔ اس میں اور سابقہ تمام غزوات میں بنیادی فرق ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ

۲۰۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی آمد اور اموال غنیمت میں ان کی شرکت کا تذکرہ بخاری اور دیگر کتب کی روایتوں میں موجود ہے۔ لیکن بخاری میں ان کے استقبال کی تفصیل موجود نہیں ہے۔

۲۱۔ روایت میں "جنیب" کا لفظ ہے۔ اس کے معنی اچھی کھجور کے ہیں۔

۲۲۔ بخاری۔ دیکھئے فتح الباری ۷ / ۴۷۴

اسلامی دعوت صلح حدیبیہ کے بعد ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔

غزوۂ خیبر پہلا غزوہ ہے جس کی ابتداء رسول ﷺ کی جانب سے ہوئی۔ آپؐ نے خیبر میں رہنے والے یہود پر اچانک حملہ کر دیا، جب کہ ان لوگوں کی جانب سے مسلمانوں سے جنگ و قتال کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہود کو اسلام کی دعوت دی جا چکی تھی۔ یہ پرامن دعوت طویل مدت تک دلائل و براہین پر قائم رہی۔ لیکن یہود اپنے کفر پر جمے رہے۔ انہوں نے اپنی سرکشی کے سبب حق کو قبول نہیں کیا اور ان کے سینوں میں اسلام کے خلاف بغض و نفرت کا لاوا ابلتا رہا، اس لیے ان سے جنگ کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے خیبر پہنچنے کے بعد پہلی رات اتنی خاموشی سے گزاری کہ کسی کو آپ کے وہاں پہنچنے کا احساس تک نہیں ہو پایا۔ آپؐ نے صبح تک انتظار کیا جب اذان — جو کہ ایک عظیم اسلامی شعار ہے — سنائی نہیں دی تو آپؐ نے حملہ کر دیا اور ان سے جنگ کی - ہم بیان کر چکے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی قبیلہ پر حملے کا ارادہ کرتے تو رات کو حملہ نہ کرتے تھے، بلکہ صبح کا انتظار کرتے۔ اگر اذان سنائی دیتی تو توقف فرماتے اور اگر اذان سنائی نہ دیتی تو حملہ کر دیتے۔

اس سبب کی مزید وضاحت حضرت علیؓ کے سوال اور آں حضرت ﷺ کے جواب سے ہوتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پرچم ان کے حوالے کیا تو انہوں نے عرض کیا: کیا ان لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں گا جب تک کہ وہ ہماری طرح مسلمان نہ ہو جائیں؟ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: یہاں سے روانہ ہو کر ان لوگوں کے سامنے پڑاؤ ڈالو۔ پھر ان کو اسلام کی دعوت دو اور ان پر اللہ کا جو حق ہے اس سے انہیں آگاہ کرو۔"

علماء نے غزوۂ خیبر سے بہت سے نتائج اور احکام مستنبط کیے ہیں۔ ان میں سے چند کا ہم سطور ذیل میں تذکرہ کرتے ہیں۔

۲۔ جن لوگوں تک اسلامی دعوت پہنچ چکی ہو ان پر اچانک حملہ کر دینا جائز ہے:

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جن لوگوں تک اسلامی دعوت اپنی حقیقی صورت میں پہنچ چکی ہو ان کو پہلے سے آگاہ کیے اور از سر نو دعوت دیے بغیر ان پر حملہ کر دینا جائز ہے یہ شوافع اور جمہور

فقہاء کا مسلک ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خیبر پر حملہ کرنے میں ایسا ہی کیا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں دعوت پہنچ جانا اور اسلام کو صحیح طریقے سے سمجھ لینا بالاتفاق مشروط ہے۔

۳۔ اموال غنیمت کی تقسیم کی پالیسی:

جنگ میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں گے۔ ان میں سے چار حصے فوج کے درمیان تقسیم کر دیے جائیں گے۔ فوج کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم اس طرح ہو گی کہ پیادہ کو ایک حصہ اور شہ سوار کو تین حصے ملیں گے۔ ایک حصہ اس کا اپنا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے۔ [۲۳] مال غنیمت کا پانچواں حصہ (خمس) ان لوگوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا جن کی صراحت درج ذیل آیت میں آئی ہے:

وَاعْلَمُوْآ اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی
وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ. (الانفال:۴۱)

اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

شوافع اور احناف کا مسلک یہ ہے کہ اس خمس میں سے رسول اللہ ﷺ کا حصہ آپؐ کے بعد مسلمانوں کے مصالح میں تقسیم ہو گا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس کے سلسلے میں خلیفہ کو اختیار ہو گا کہ جہاں چاہے اسے خرچ کرے۔ ان اقوال میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔

۴۔ جنگ نہ کرنے والوں کو مال غنیمت میں شریک کرنے کا جواز:

اس سے ایک حکم یہ مستنبط ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے جنگ نہ کی ہو لیکن وہ میدان جنگ میں موجود ہوں، انہیں حق داروں کی اجازت سے مال غنیمت میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ اور ان کے رفقاء جب حبشہ اور یمن سے واپس آئے اور خیبر میں خدمت

[۲۳] امام ابو حنیفہ کا مسلک ہے کہ شہ سوار کو دو حصے ملیں گے، ایک حصہ اس کا اپنا اور دوسرا اس کے گھوڑے کا۔ غزوۂ خیبر میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کی نبی ﷺ نے جس طرح تقسیم فرمائی تھی اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

نبوی میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے صحابہ کی اجازت سے انہیں بھی اموال غنیمت میں شریک کیا۔

واضح رہے کہ اس سلسلے میں بخاری کی روایت "مسلمانوں کی اجازت" کی قید سے خالی ہے۔ البتہ بیہقی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "نبی ﷺ نے مال غنیمت میں ان کا حصہ لگانے سے قبل مسلمانوں سے گفتگو کی تو وہ تیار ہو گئے۔" اور عادل شخص کا اضافہ قابل قبول ہے۔ بیہقی کی روایت میں موجود قید کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ نبی ﷺ نے اس موقعے پر ایک صحابی حضرت ابان بن سعیدؓ کا حصہ نہیں لگایا تھا۔ انہیں آپؐ نے نجد کی طرف ایک سریہ میں بھیجا تھا۔ وہ وہاں سے واپس آکر خیبر پہنچے تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ انہوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! ہمارا بھی کچھ حصہ لگایئے۔" مگر آں حضرت ﷺ نے انہیں حصہ نہیں دیا۔ ان دونوں واقعات میں تطبیق اس طرح دی جاتی ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کا مالِ غنیمت میں حصہ مسلمانوں کی اجازت سے لگایا گیا اور ان کی اجازت نہ ہونے کی وجہ سے حضرت ابان بن سعیدؓ کو حصہ نہیں دیا۔ [۲۴]

شاید یہاں یہ سوال کیا جائے کہ آج جنگوں اور فوجوں کے حالات بہت بدل گئے ہیں اور انہیں تنخواہوں کے علاوہ الاؤنسز اور ایوارڈ بھی دیے جانے لگے ہیں، ایسے میں اموال غنیمت کا کیا حکم ہو گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے کہ غنیمت میں حاصل ہونے والے غیر منقولہ اموال امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فوج میں تقسیم نہیں کیے جائیں گے الا یہ کہ مصلحت کا تقاضا ہو یا ناگزیر ضرورت ہو۔ رہے منقولہ اموال تو انہیں رسول اللہ ﷺ کے اختیار کردہ طریقہ کے مطابق فوج میں تقسیم کرنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی جنگ کے وسائل و ذرائع میں جو تبدیلیاں آگئی ہیں اور جنگجوؤں کے درجات میں جو تفاوت پایا جاتا ہے انہیں بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ جنگجوؤں کے حصے ان کے درمیان الاؤنسز اور انکریمنٹس کی صورت میں تقسیم کیے جائیں۔ البتہ اہم بات یہ ہے کہ حکومت کے لیے جائز نہیں کہ ان اموال میں سے کچھ اپنے لیے روک لے۔

[۲۴] دیکھیے فتح الباری ۷/ ۳۴۰و۳۴۹

۵۔ مساقات کی مشروعیت:

مساقات کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا مالک کسی شخص سے یہ معاملہ کرے کہ اس زمین میں جو درخت ہیں ان کی دیکھ بھال کرے اور ان کی سینچائی کرے، اس کے معاوضے میں پھلوں میں اس کا بھی حصہ ہوگا۔ مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ معاملہ صحیح ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے خیبر کے باشندوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا تھا۔ صرف ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "حدیث سے اس پر استدلال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ خیبر بزور قوت فتح ہوا تھا۔ اس طرح اس کے باشندے آں حضرت ﷺ کے غلام بن گئے تھے۔ آپؐ نے جو کچھ لیا وہ بھی آپ کا تھا اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ بھی آپ کا تھا۔ صاحبین (یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ) کی رائے اس کے برخلاف ہے۔ وہ جمہور کے مثل اس معاملہ کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ پھر علماء کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ کیا اس کا اطلاق ہر طرح کے درختوں پر ہوگا یا یہ صرف کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں کے ساتھ خاص ہے؟ یہ اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوا کیونکہ خیبر میں عام طور سے کھجور کے درخت اور انگور کے باغات ہی تھے۔ بہت سے فقہاء کا مسلک ہے کہ ہر طرح کے درختوں کے سلسلے میں یہ معاملہ صحیح ہوگا۔

رہی مزارعت، یعنی زمین کو کھیتی کے لیے بٹائی پر دینا، تو بہت سے ان لوگوں نے جو معاملہ مساقات کو صحیح قرار دیتے ہیں، اس سے منع کیا ہے۔ ان میں شوافع بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مزارعت صحیح نہیں ہے۔ اس کی دلیل صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے مزارعت سے منع کیا ہے اور اجرت پر کام کرانے کا حکم دیا ہے" شوافع کہتے ہیں کہ اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ مزارعت کا معاملہ مساقات کے ماتحت ہو۔ یعنی مساقات کا معاملہ طے ہونے کے ساتھ ساتھ درختوں کے درمیان خالی زمین پر کھیتی کرنے پر بھی دونوں فریق تیار ہوگئے ہوں۔

تمام دلائل میں غور کرنے سے، راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ مساقات اور مزارعت دونوں معاملے میں صحیح ہیں۔ علماء نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "مزارعت کی ممانعت ابتداء میں لوگوں کی ضرورت کی وجہ سے تھی۔ مہاجرین کے پاس زمینیں نہیں تھیں۔

اس لیے نبی ﷺ نے انصار کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ ہمدردی و مواسات کا معاملہ کریں۔" اس کی دلیل امام مسلمؒ کی روایت کردہ وہ حدیث ہے جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "انصار میں سے بعض لوگوں کے پاس زائد زمینیں تھیں۔ وہ انہیں تہائی یا چوتھائی پیداوار پر دوسروں کو دے دیتے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جس کے پاس زمین ہو وہ اس پر یا تو خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی کو دے دے۔ اگر وہ لینے سے انکار کردے تب اسے اپنے پاس رکھے" پھر جب مسلمانوں کا حال بہتر ہوا اور ان کی ضرورتیں رفع ہوگئیں تو مزارعت کو جائز کردیا گیا اور زمین کے مالک کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جس طرح چاہے اس میں تصرّف کرے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ کے عہد میں اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کے عہد میں زمینوں میں مزارعت کی بنیاد پر بھی کام کرایا گیا اور اجرت کی بنیاد پر بھی۔

۶۔ آنے والے کو بوسہ دینے اور اسے چمٹانے کی مشروعیت:

اگر کوئی شخص سفر سے واپس آرہا ہو یا طویل عرصے کے بعد اس سے ملاقات ہو رہی ہو تو اسے بوسہ دینے اور چمٹانے کی مشروعیت کے سلسلے میں ہمیں کسی قابلِ ذکر اختلاف کا علم نہیں ہے۔ علماء نے اس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالبؓ حبشہ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور انہیں چمٹالیا۔ اس حدیث کو امام ابوداؤدؒ نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث امام ترمذیؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں: "زید بن حارثہؓ مدینہ آئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تھے۔ انہوں نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ نبی ﷺ کپڑے گھسیٹتے ہوئے ان کی جانب بڑھے، ان سے گلے ملے اور انہیں بوسہ دیا۔"

اس پر بظاہر اشکال ایک دوسری حدیث سے ہوتا ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ "ایک شخص نے آں حضرت ﷺ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک شخص اپنے بھائی یا دوست سے ملے تو کیا وہ اس کے سامنے کچھ جھک سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے سوال کیا: کیا وہ اسے چمٹا سکتا اور بوسہ دے سکتا ہے؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے پھر سوال کیا: کیا وہ اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور اس سے مصافحہ کر سکتا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں"

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اس حدیث میں اس شخص نے روز مرہ کی عام ملاقاتوں کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اس صورت میں بوسہ دینا یا چمٹانا پسندیدہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ کے ساتھ کیا وہ سفر سے ان کی واپسی کے بعد تھا، اس لیے دونوں حالتیں مختلف ہیں۔

۷۔ کھانے کی چیزوں میں سود کی حرمت:

کھانے کی چیزوں میں ربا الفضل (سود) حرام ہے۔ یعنی ایک جنس کی کھانے کی دو چیزوں کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو۔ اس سلسلے میں بہت سی صحیح احادیث میں رسول اللہ ﷺ سے ممانعت منقول ہے۔ مثلاً امام مسلمؒ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپؐ سونے کو سونے سے، چاندی کو چاندی سے، کھجور کو کھجور سے، گیہوں کو گیہوں سے، جو کو جو سے، اور نمک کو نمک سے، نقد، کمی بیشی کے ساتھ فروخت کرنے سے منع کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ جس نے زیادہ دیا اور زیادہ لیا اس نے سود کا معاملہ کیا۔" اسی طرح امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے اچھی کھجور کا تبادلہ خراب کھجور سے، کمی بیشی کے ساتھ کرنے سے منع کیا ہے۔

یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں ہے کہ اس قسم کے تبادلے کی حرمت کی حکمت کیا ہے؟ اور اس کا شمار حرام سود میں کیوں کیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں بحث مبسوط کتب فقہ میں ملے گی۔ لیکن یہاں اس جانب اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اچھی کھجور کا تبادلہ خراب کھجور سے یا اسی طرح دیگر کھانے کی چیزوں میں سے اچھی قسم کا تبادلہ خراب قسم سے کرنا چاہتا ہو، اسے نبی ﷺ نے ایک دوسری تدبیر بتائی ہے جس میں سود نہیں ہے اور وہ یہ کہ پہلے اس خراب قسم کی چیز کو درہم سے بیچ دے، پھر ان درہموں سے اچھی قسم کی مطلوبہ چیز خرید لے۔ اس میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ یہاں بیع اصلاً مقصود نہیں ہے، بلکہ اسے دوسری شئ حاصل کرنے کا (جو اصلاً حرام تھی) ذریعہ بنایا گیا ہے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی گنجائش نکالی ہے۔ حرام وہ کام ہے جس کی کتاب وسنت میں قطعی نہی آئی ہو۔

اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ کسی حرام حکم کو کسی جائز ذریعہ سے حلال بنایا جا سکتا

ہے۔ اس کا شمار حرام حیلہ میں نہیں ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص کسی ایسی عورت سے جسے تین طلاقیں دی جا چکی ہوں، اس ارادے سے نکاح کرلے کہ پھر اسے طلاق دے کر سابق شوہر سے اس کا نکاح جائز کردے، تو اگر عقد میں یہ شرط نہ لگائی گئی ہو تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اسی طرح اگر قرض خواہ اپنے مال کی زکوٰۃ ایسے قرض دار کو دے دے جو اس کا قرض ادا نہ کر سکا ہو اور پھر اپنے قرض کے بدلے اس سے وہ مال واپس لے لے تو ایسا کرنا جائز ہے۔

علامہ ابن القیمؒ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اعمال کا اعتبار ان کے مقاصد کے لحاظ سے ہوتا ہے جس شخص نے کوئی چیز فروخت کر کے ایسی چیز چاہی جس کے لیے بیع مشروع نہیں تھی، اسی طرح جس شخص نے نکاح کیا اور اس کے ذریعے وہ مقصد حاصل کرنا چاہا جس کے لیے نکاح مشروع نہیں ہے، ان دونوں نے ایک غلط کام کا ارتکاب کیا، اس لیے کہ انہوں نے حکم کو اس کے اصل مقصد سے پھیر کر اس سے دوسرا مقصد حاصل کرنا چاہا جس کے لیے وہ حکم مشروع نہیں ہے۔ ابن قیمؒ کی یہ بات قابل اعتبار نہیں ہے اس لیے کہ یہ بخاری کی مذکورہ بالا حدیث سے صریح متعارض ہے۔ فقہی قواعد نصوص سے مستنبط کیے جاتے ہیں، نہ کہ انہیں نصوص سے بالاتر ہو کر وضع کیا جاتا ہے۔ اس موضوع پر ابن قیمؒ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں جو بحث کی ہے اس میں صریح تناقض پایا جاتا ہے۔ انہوں نے بعض صورتوں کی تحریم کی مذمت میں طویل بحث کی ہے اور انہیں حرام حیلوں کا نام دیا ہے اور جو ائمہ انہیں صحیح قرار دیتے ہیں ان کی آراء کی مفصل تردید کی ہے اور انہیں وعید سنائی ہے کہ ایسے غلط اقوال کی بنا پر وہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ پھر چند صفحات کے بعد ہی ان صورتوں کو جائز قرار دینے لگے ہیں اور صحیح شرعی حیلوں کی حیثیت سے انہیں پیش کرنے لگے ہیں۔[۲۵]

---

[۲۵] دیکھئے اعلام الموقعین ۳/۲۹۲ طبع المکتبۃ التجاریۃ. علامہ ابن قیم یہاں طلاق سے بچنے کے لیے خلع کو واسطہ بنانے کے حیلے پر بحث کرتے ہیں تو فرماتے ہیں: "یہ حیلہ شرعاً باطل ہے۔" لیکن آگے (۴/۱۱۰) اس حیلہ کو جائز قرار دیتے ہیں، اس کی دس توجیہیں پیش کرتے ہیں اور انہیں معتبر دلائل قرار دیتے ہیں۔ ان مقامات کا سیاق وسباق کے ساتھ مطالعہ کرنے سے عجیب وغریب تناقض کا اظہار ہوتا ہے۔ شرعی حیلوں اور معاملات واحکام میں مقاصد کے اثرات پر تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھئے ہماری کتاب ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص ۲۹۳-۳۲۴

۸۔ اس غزوہ میں پیش آنے والے دو خارق عادت واقعات:

اس غزوہ میں دو ایسے واقعات پیش آئے جن کا شمار ان عظیم خوارق میں ہوتا ہے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کی تائید و توثیق فرمائی تھی۔ یہ دونوں واقعات صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی آنکھ میں تکلیف تھی۔ آں حضرت ﷺ نے اس میں اپنا لعاب دہن لگادیا جس سے وہ ٹھیک ہوگئے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس میں کوئی درد ہی نہ تھا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب آں حضرت ﷺ نے بکری کے زہر آلود گوشت کو کھانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو اس کے زہر آلود ہونے کی خبر دے دی۔ اور قبل اس کے کہ آپؐ دوسروں کو اس کے زہر آلود ہونے کی اطلاع دیں قضائے الٰہی سے حضرت بشر بن البراءؓ ایک لقمہ نگل گئے جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ اس سے اس بات کا مزید اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو لوگوں کی دست درازیوں اور سازشوں سے محفوظ کر رکھا تھا، اور اس طرح اپنے وعدے وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ المائدہ:۶۷ (اور اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے) کی تکمیل کی تھی۔

ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ اس یہودی عورت کے اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں راویوں کا اختلاف ہے۔ غالب گمان یہ ہے — جیسا کہ امام زہری وغیرہ نے قطعیت سے بیان کیا ہے — کہ وہ اسلام لے آئی تھی، اس لیے آں حضرت ﷺ نے اسے قتل نہیں کرایا تھا، جیسا کہ امام مسلمؒ نے ذکر کیا ہے۔

یہاں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ قصاص کی رو سے اسے بھی قتل کردیا جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ متفق علیہ قاعدہ یہ ہے کہ اسلام ماقبل (کے کاموں اور جرائم) کو ساقط کردیتا ہے۔ جس قتل کے نتیجے میں قصاص لازم ہوتا ہے وہ ایسا قتل ہے جس کا صدور قاتل کے اسلام قبول کرنے کے بعد ہوا ہو۔ رہا ماقبل اسلام قتل کا معاملہ تو اس کا تعلق حرابت (حربی ہونے) سے ہے اور یہ معلوم ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہی حرابت کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

پھر خیبر کے یہود بٹائی پر زمینوں کی کاشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت عمرؓ

الخطابؓ کی خلافت کے زمانے میں انہوں نے ایک انصاری صحابی کو قتل کردیا اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ پر دست درازی کی جس سے ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ تب حضرت عمرؓ نے لوگوں میں اعلان کرادیا کہ: "رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہود کے ساتھ اس شرط پر معاملہ کیا تھا کہ ہم جب چاہیں گے انہیں نکال دیں گے۔ ان لوگوں نے عبداللہ بن عمرؓ پر زیادتی کی ہے جس سے اس کے ہاتھ ٹوٹ گئے ہیں۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے اس سے پہلے بھی وہ ایک انصاری صحابی کے ساتھ جارحیت کا مظاہرہ کرچکے ہیں۔ یہ لوگ اصحاب رسول ہیں اور یہود ہمارے دشمن ہیں۔ اس لیے خیبر میں جن لوگوں کی جائدادیں ہیں ان کا انتظام وہ خود سنبھال لیں۔ میں یہود کو وہاں سے جلاوطن کرنے جارہا ہوں۔"

اس طرح جزیرۃ العرب سے یہود کو جلاوطن کردیا گیا۔ اگر ان کی سرکشی، جارحیت اور استکبار نہ ہوتا تو انہیں وہیں رہنے دیا جاتا اور جلاوطن نہ کیا جاتا۔ لیکن زمین کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جن کو چاہتا ہے اس کا وارث بنادیتا ہے۔ حسن انجام متقیوں کے لیے ہے۔

قبائل اور سلاطین کو دعوتِ اسلام

پھر رسول اللہ ﷺ نے جزیرۃ العرب میں پھیلے ہوئے بدوؤں کے مختلف قبائل کی طرف اپنے اصحاب کے سرایا بھیجے، تاکہ انہیں اسلام کی طرف دعوت دینے کا فریضہ انجام دیں۔ اگر وہ اسے قبول نہ کریں تو ان سے جنگ کریں۔

یہ سرایا ہجرت کے ساتویں سال بھیجے گئے۔ ان کی تعداد دس تک پہنچتی ہے۔ انہیں نبی ﷺ نے مختلف صحابہ کی سربراہی میں بھیجا تھا۔

اسی عرصہ میں نبی ﷺ نے دنیا کے مختلف سلاطین اور رؤساء کے پاس خطوط بھیجے۔ ان میں انہیں اسلام قبول کرنے اور باطل مذاہب کو ترک کردینے کی دعوت دی گئی تھی۔

ابن سعدؒ نے "طبقات" میں لکھا ہے کہ "آں حضرت ﷺ جب ذی الحجہ ۶ھ میں حدیبیہ سے واپس ہوئے تو آپؐ نے مختلف سلاطین کے پاس اپنے سفراء بھیجے اور ان کے نام خطوط لکھے جن میں انہیں اسلام کی دعوت دی۔ اس موقعے پر لوگوں نے آپؐ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! سلاطین صرف ان خطوط کو پڑھتے ہیں جن پر مہر لگی ہوتی ہے۔ تب رسول اللہ ﷺ نے چاندی کی ایک مہر بنوائی جس میں تین سطروں میں **محمد رسول اللہ** لکھا ہوا تھا۔ اور خطوط کے آخر میں وہ مہر لگائی۔ ان خطوط کو لے کر ایک ہی دن چھ افراد روانہ ہوئے۔ ہر شخص جس قوم میں بھیجا گیا تھا اس کی زبان سے اچھی طرف واقف تھا۔ یہ محرم ۷ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت عمرو بن امیہ الضمریؓ کو رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے پاس بھیجا۔ جب مکتوب نبوی نجاشی کے پاس پہنچا تو اسے اس نے سر آنکھوں پر رکھا۔ اپنے تختِ شاہی سے اتر کر تواضع میں زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر اسلام قبول کیا اور حق کی گواہی دی۔ اس موقعے پر اس نے یہ بھی کہا:

"اگر میں آں حضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ سکتا تو ایسا ضرور کرتا۔" [۲۶]

حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ شہنشاہ روم ہرقل کے پاس پہنچے۔ حضرت دحیہؓ نے مکتوب نبوی بصریٰ کے حکمراں کو دیا اور اس نے اسے ہرقل کے پاس بھیج دیا۔ اس مکتوب گرامی کے الفاظ یہ تھے: "بسم اللہ الرحمن الرحیم. محمد کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔ یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیسِ اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کر تو سلامت رہے گا اور اللہ تجھے دوگنا اجر دے گا۔ لیکن اگر تو نے انکار کر دیا تو اہل ملک [۲۷] کا گناہ تیرے سر ہوگا۔ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔ اور اگر وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں [۲۸]

ابن سعدؒ نے طبقات میں لکھا ہے کہ ہرقل نے مکتوب نبوی پڑھنے کے بعد اپنے درباریوں اور ارکان سلطنت سے کہا: اے اہل روم۔ کیا تم خیر و فلاح کے خواہاں ہو؟ اور چاہتے ہو کہ تمہارا الملک باقی رہے اور تم حضرت عیسیٰ بن مریم کے ارشاد پر عمل کرو؟ لوگوں نے کہا: اے بادشاہ! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا: تم اس نبی عربی کی اتباع کرو۔ یہ سنتے ہی وہ اپنی اپنی صلیبیں اٹھا کر جنگلی گدھوں کی طرح ادھر ادھر بھاگنے اور برہمی کا اظہار کرنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر ہرقل ان کے ایمان لانے سے مایوس ہو گیا۔ اسے اپنی جان سے ہاتھ دھو لینے اور حکومت سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ہو گیا۔ اس نے انہیں خاموش کیا، پھر کہا۔ "ابھی میں نے تم لوگوں سے جو بات کہی ہے وہ اس لیے کہی کہ اپنے دین پر تمھاری مضبوطی کا امتحان لوں۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس سے خوشی ہوئی۔" یہ سن کر سب اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

---

[۲۶] طبقات ابن سعد ۲/ ۲۳ باختصار

[۲۷] روایت میں "اریسین" کا لفظ آیا ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے: یہ "اریسی" کی جمع ہے۔ جو "اریس" کی جانب منسوب ہے۔ اس کے لفظی معنی کاشت کار کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد ماتحت لوگ اور عوام ہیں۔

[۲۸] بخاری و مسلم

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کو کسریٰ شہنشاہ ایران کے پاس بھیجا اور ان کے ساتھ کسریٰ کے نام اپنا مکتوب بھی ارسال کیا جس میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں: "میں نے مکتوب نبوی کو کسریٰ کے سامنے پیش کیا۔ اسے اس کے سامنے پڑھا گیا۔ پھر اس نے اسے لے کر چاک کر ڈالا۔" جب رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا: "اللہ اس کے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے" کسریٰ نے یمن کے حاکم باذان کو حکم دیا کہ اپنے یہاں سے دو ہٹے کٹے آدمیوں کو بھیجو کہ اس شخص کو میرے دربار میں حاضر کریں۔ اس نے دو طاقت ور آدمیوں کو بھیجا اور ان کے ساتھ آں حضرت ﷺ کے نام ایک خط بھی ارسال کیا۔ وہ دونوں مدینہ پہنچے اور باذان کا خط نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ خط پڑھ کر آپؐ مسکرائے اور فرمایا: آج واپس جاؤ، کل آنا تب جواب دوں گا۔ وہ دونوں اگلے دن حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا: اپنے حاکم کو جاکر بتا دو کہ میرے رب نے اس کے رب کسریٰ کو گزشتہ رات کے ساتویں پہر ہلاک کر دیا ہے" (ابن سعدؒ نے لکھا ہے کہ یہ منگل ۱۰؍ جمادی الاولیٰ ۷ھ کی رات تھی) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس پر اس کے بیٹے شیرویہ کو تسلط دے دیا تھا جس نے اسے قتل کر دیا۔ ان دونوں نے واپس جاکر باذان کو اس کی خبر دی۔ آں حضرت ﷺ کی یہ خبر حرف بحرف صحیح نکلی۔ یہ دیکھ کر باذان اور یمن میں موجود اس کے بیٹوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ۲۹

رسول اللہ ﷺ نے حارث بن عمیر الازدیؓ کو بصریٰ کے حکمراں شرحبیل بن عمرو

۲۹۔ کسریٰ کے نام مکتوب نبوی کی یہ تفصیل طبقات ابن سعد سے منقول ہے۔ بخاری نے اسے مختصراً ذکر کیا ہے۔ اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس نے آپؐ کے مکتوب کو چاک کر ڈالا ہے تو آپؐ نے بددعا کی کہ وہ لوگ بھی اسی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ شیخ ناصر الدین البانیؒ نے محمد الغزالیؒ کی کتاب فقہ السیرۃ پر اپنی تعلیقات میں ابن سعد کی روایت میں یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ "نبی ﷺ نے دیکھا کہ باذان نے جو دو آدمی بھیجے تھے ان کی مونچھیں اینٹھی ہوئی اور گال استرے سے چھلے ہوئے تھے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا: "تمہارا برا ہو۔ تم ایسا کس کے کہنے سے کرتے ہو؟" انہوں نے جواب دیا: "ہمارے رب (یعنی کسریٰ) نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔" یہ اضافہ مجھے ابن سعد کی روایت میں نہیں مل سکا۔ میری معلومات کی حد تک یہ ابن جریر کی روایت ہے۔

الغسانی کے پاس بھیجا۔ اس نے انہیں بیڑیوں میں جکڑنے کے بعد قتل کر دیا۔ اصحاب سیر نے لکھا ہے کہ حضرت حارثؓ کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کے کسی اور قاصد کا قتل نہیں ہوا تھا۔ ۳۰

آں حضرت ﷺ نے دیگر بہت سے عرب امراء اور رؤساء کو جو مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، خطوط ارسال کیے۔ ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کر لیا لیکن بعض نے مخالفت کی۔

اس عرصہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مختلف سمتوں سے پے درپے بہت سے وفود آئے۔ انہوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اس عرصہ میں عرب کے سرداروں اور سپہ سالاروں میں سے اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

ابن اسحاقؒ نے حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں: "میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے ارادے سے نکلا۔ راستے میں خالد بن الولید سے ملاقات ہو گئی۔ یہ فتح مکہ سے پہلے کا واقعہ ہے۔ وہ مکہ کی سمت سے آ رہے تھے۔ میں نے کہا: "کہاں کا ارادہ ہے اے ابو سلیمان؟" جواب دیا: "اللہ کی قسم میں اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں۔ اب کہاں تک اس سے گریز کیا جائے؟" میں نے کہا: "میں بھی اسی ارادے سے نکلا ہوں۔" پھر ہم دونوں ایک ساتھ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے۔ پہلے خالد نے آگے بڑھ کر اسلام قبول کیا اور آں حضرت ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر میں نے قریب ہو کر آپؐ سے بیعت کی۔

دروس ونصائح

۱۔ نئے مرحلے کے نقوش:

رسول اللہ ﷺ نے مختلف قبائل کی جانب سرایا بھیجے اور دنیا کے مختلف سلاطین اور امراء کو مکاتیب ارسال کیے۔ یہ ان مظاہر کا ایک جزء ہے جو حیاتِ نبوی کے اس مرحلۂ دعوت کو سابقہ مرحلہ سے ممتاز کرتے ہیں۔

۳۰۔ اسے واقدی نے عمر بن الحکم سے روایت کیا ہے۔ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "اسے شاہین نے بھی محمد بن یزید کے واسطے سے روایت کیا ہے۔"

وہ مرحلہ جس میں ہجرت کے آغاز سے صلح حدیبیہ تک کاروانِ دعوت جاری رہا، دفاعی مرحلہ تھا، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی ہے۔ اس مرحلہ میں پرامن انداز سے دعوت دی جاتی رہی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے کسی گروہ پر حملہ کا آغاز کیا ہو، یا ان سے جنگ چھیڑی ہو۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپؐ نے کسی قبیلہ کی جانب سریہ بھیجا ہو اور حکم دیا ہو کہ جاکر اس قبیلہ والوں کو اسلام کی دعوت دی جائے اور اگر وہ لوگ اسے قبول نہ کریں تو ان سے جنگ کی جائے۔

جب مکہ کے مشرکین اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان صلح حدیبیہ ہو گئی اور مسلمانوں کو کچھ سکون اور قریش کی پریشانیوں اور آویزشوں سے کچھ راحت ملی تو نبی ﷺ ایک نئے مرحلے میں داخل ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایسا مرحلہ جو اسلامی شریعت — جس کی تبلیغ وتنفیذ کے لیے آپ کی بعثت ہوئی تھی — کے لیے ناگزیر تھا۔ اور وہ تھا ان لوگوں سے جنگ کا مرحلہ جن تک دعوت پہنچ گئی تھی، وہ اسے اچھی طرح سمجھ گئے تھے، پھر بھی بغض ونفرت اور سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس پر ایمان نہیں لائے تھے اور اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جس کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کی دعوت دوسروں تک بے کم وکاست پہنچادی۔ یہ مرحلہ آں حضرت ﷺ کے قول وعمل کے ذریعے ایک ایسا شرعی حکم بن گیا جس پر قیامت تک ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کے بارے میں فکری محاذ پر یلغار کرنے والے کوشش کرتے ہیں کہ اس کے خدوخال کو مسخ کردیں اور اسے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کردیں۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں جہاد سے متعلق جتنے احکام ہیں وہ دفاعی جنگ اور جارحیت کے دفاع پر مبنی ہیں اور چونکہ اب کمزوروں کا دفاع کرنے اور ان پر ہونے والی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اقوام متحدہ کا قیام عمل میں آگیا ہے، اس لیے دفاعی جنگ کے اصول کو بھی باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

یہ چیز اب راز نہیں رہی کہ اس سازش اور فریب دہی کا محرک مغرب ومشرق کے اجنبی (غیر اسلامی) ممالک کا شدید خوف ہے کہ کہیں مسلمانوں کے دلوں میں از سر نو جہاد فی سبیل اللہ

کی روح بیدار نہ ہو جائے جو ایمان کی شعلہ کو بھڑکا دے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مغربی تہذیب کی بلند وبالا اور پرشکوہ عمارت کا انہدام یقینی ہے۔

یورپی باشندوں کی ذہنیت اسلام کی خالص دعوت کو سنتے ہی اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ پھر اگر خالص دعوت کے ساتھ قربانی اور جہاد بھی شامل ہو جائے تو اس کی اثر پذیری کا کیا کہنا؟

۲۔ اس مرحلہ کی مشروعیت کی حکمت:

شاید آپ اب یہ سوال کریں کہ مشرک یا ملحد کو اس طرح اسلام کی جانب کھینچ کر لانے کی کیا حکمت ہے؟ بیسویں صدی کی ذہنیت اس قسم کے قانون کو کیونکر سمجھ سکتی ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ جب فرد واحد حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہے اور ریاست کے عام افراد کے ساتھ، خواہ وہ حکمراں ہو یا رعایا، اسے بھی برابر کے حقوق حاصل ہیں، تو اسے ریاست کے نظام اور فلسفہ کو قبول کرنے پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے؟ اس میں کیا حکمت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ وہ یہاں اللہ تعالیٰ کی ریاست قائم اور اس کا قانون نافذ کرے۔ یہی اس کے وجود کی حکمت ہے۔ درج ذیل آیت میں اسی کو خلافت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (البقرۃ ۳۰)

پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔"

اس ریاست کا فلسفہ اللہ وحدہ لاشریک کی عبودیت کی حقیقت پر مبنی ہے اور اس کا نظام اس ایمان ویقین پر قائم ہے کہ حاکمیت صرف اللہ سبحانہ کی ہے۔ اس لیے کہ صرف وہی انسانوں کا مالک ہے اور وہی ہر چیز کا مالک ہے، کیونکہ آسمان اور زمین اسی کے دم سے قائم ہیں۔

پھر یہ بات کیوں کر عقل میں آسکتی ہے کہ کوئی ریاست، جس کا انتظام وانصرام اللہ کے بندے اور غلام چلا رہے ہوں، اس کی رعایا کو اس کا تو پابند بنایا جائے کہ وہ جو نظام، اصول اور احکام

وضع کریں ان کی پوری پابندی کریں۔ لیکن ان سب کے خالق کو یہ حق نہ ہو کہ وہ انہیں اس کا پابند کر سکے کہ وہ اس کے اقتدار کی ماتحتی قبول کریں اور ہر عقیدہ اور دین سے منہ موڑ کر اس کے دین کو اختیار کر سکیں؟ اور چونکہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور اسے روئے زمین پر اس کے احکام کے نفاذ کا ذمہ دار بنایا گیا ہے، اس لیے اسے انسان کے واسطے سے ہی اللہ کے اقتدار اور احکام کا پابند بنایا جاسکتا ہے۔ اور اس سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس کے دین کے دائرے میں آجائے اور اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کے قیام کی راہ میں اپنی جان اور مال قربان کر دینے پر اللہ تعالیٰ سے بیعت کرے۔ یہی انسان کا مقصدِ وجود ہے۔

یہ سمجھ لینے کے بعد اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ بیسویں صدی میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اسے سمجھنا اور اس پر مطمئن ہونا نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کا پایا جانا فطری ہے جب تک کہ لوگوں کی ایسی بھیڑ موجود رہے گی جو فکری حملوں کی کمان سنبھالے ہوئے ہوں، تاکہ دنیا میں اسلامی شعور کو پے در پے سن کر دینے اور سلا دینے والے انجکشن لگا سکیں۔ انہیں انسانی آزادی کا اتنا خیال نہیں رہتا جتنا کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

ان لوگوں کے نزدیک آزادی کی کیا قدر و قیمت ہے جو خود بھی فریب میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنی قوموں کے سامنے بھی جھوٹ بولتے ہیں جب وہ ان کے سامنے اسلام کی جھوٹی اور قابل نفرت تصویریں پیش کرتے ہیں اور مسلمانوں کی تصویر کشی ایسے بے وقوف اور سادہ لوح انسانوں کی کرتے ہیں جو اب بھی اپنے اونٹوں اور چوپایوں کے ساتھ صحراء میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ایسا کرنے کا ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کا فہم حاصل کرنے کی ان کی خواہشات اور کوششوں پر بند باندھ سکیں اور تلاش و تحقیق کے محرکات کو حقیر تارِ عنکبوت کے ذریعے قید کر سکیں۔ تاکہ وہ اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اس پر ایمان نہ لا سکیں اور اس طرح انسان کے خلاف طاغوت کی حکمرانی اپنی انتہائی گھناؤنی شکل میں قائم رہ سکے۔

یہاں یہ بات نہیں فراموش کرنی چاہئے کہ اس سے قبل ہر میدان میں اور ہر جگہ حکمت بحث و مباحثہ اور عمدہ نصیحت کے ذریعے پر امن دعوت پیش کرنی ضروری ہے۔ جب مسلمان اس دعوت کو اس کی حقیقی صورت میں نافذ کر لیں گے تو آپ کے اس یقین میں اضافہ ہو گا کہ اسلام

دین فطرت ہے اور تمام انسان خواہ وہ کسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، اس دین میں اپنی وہ گم شدہ متاع پائیں گے جس کی انہیں عرصہ سے تلاش تھی۔ اور اس سے صرف وہی لوگ پیچھے رہیں گے جن کے دلوں میں اس کے خلاف بغض اور نفرت پائی جاتی ہے۔ یہ سب سے بڑی دلیل ہے اس بات کی کہ وہ اپنے دلوں میں اسلام اور اس کے داعیوں کے خلاف دشمنی چھپائے ہوئے ہیں۔

اسی طرح یہ بات بھی نہیں فراموش کرنی چاہئے کہ یہ پابندی، جس کا سطور بالا میں تذکرہ کیا گیا ہے، ملحدین، مشرکین، بت پرستوں اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ رہے اہل کتاب تو انہیں صرف اسلامی معاشرے کے نظام کی ماتحتی قبول کرنے کو کہا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ پر ایمان اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا ربط و ضبط اور اٹھنا بیٹھنا انہیں راہِ صواب کی جانب رہنمائی کرے گا اور انہیں عقیدہ کی درستگی پر آمادہ کر دے گا۔

سلاطین و امراء کے نام بھیجے جانے والے مکاتیبِ نبوی سے بہت سے نتائج اور احکام مستنبط ہوتے ہیں جنہیں ہم سطور ذیل میں باختصار بیان کرتے ہیں۔

۳۔ نبی ﷺ کی دعوت تمام انسانوں کے لیے تھی:

رسول اللہ ﷺ جو دعوت لے کر آئے تھے وہ کسی مخصوص قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے تھی۔ آپ کا پیغام پوری انسانیت کے لیے عام تھا۔ وہ کسی نسلی، قومی یا گروہی مزاج کا حامل نہ تھا۔ اسی لیے آں حضرت ﷺ نے اپنی دعوت کو روئے زمین کے تمام حکمرانوں اور شہنشاہوں تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا اور اس کی کوشش کی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: "نبی ﷺ نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور دیگر طاقت ور حکمرانوں کو خطوط لکھے اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی"

۴۔ ہرقل اور اس کی قوم کی جانب سے تعصب کا مظاہرہ:

ہرقل اور اس کے پیروکاروں نے، جن کا دعویٰ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر ہیں، نبی ﷺ کی دعوت کے سلسلے میں جو رویہ اختیار کیا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ بہت

سے اہل کتاب اپنے استکبار کی بنا پر حق کو قبول کرنے سے کس قدر گریزاں اور باطل میں کس حد تک غلطاں و پیچاں تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے نزدیک دین رسوم و روایات اور تعصب کے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ وہ اسے حق و باطل کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے جتنا کہ اسے اس حیثیت سے اختیار کرتے تھے کہ وہ ان کی روایات کا ایک جزء اور ان کے تعصب اور تشخص کا ایک مظہر ہے۔ اس کے بعد خواہ وہ حق ہو یا باطل۔ ابتداء میں ہرقل ایک ایسے شخص کی صورت میں نمودار ہوا جو غور و فکر کرنے والا اور معاملات کے حقائق پر پہنچنے والا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اپنی رعایا اور درباریوں کا اندازہ لگا رہا تھا اور ان کی نبض ٹٹول رہا تھا، تاکہ وہ اپنی حکومت اور اقتدار بچاتے ہوئے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کے بارے میں اطمینان کر لے۔

۵۔ انگوٹھی بنانے اور پہننے کی مشروعیت :

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ انگوٹھی بنانا اور پہننا جائز ہے۔ آں حضرت ﷺ کی انگوٹھی چاندی کی تھی۔ اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ انگوٹھی پر اسے پہننے والے کا نام نقش کرایا جاسکتا ہے۔ بہت سے علماء نے اس سے اس پر بھی استدلال کیا ہے کہ چاندی کی انگوٹھی اس انگلی میں پہننا جس میں آں حضرت ﷺ پہنتے تھے (یعنی چھنگلی میں) مستحب ہے۔

۶۔ اسلامی دعوت کے لیے مناسب وسائل و ذرائع کا استعمال:

آں حضرت ﷺ کے عمل سے اس کا بھی اثبات ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ اسلامی دعوت کو روئے زمین کے گوشے گوشے میں پھیلانے کے لیے مناسب وسائل و ذرائع اختیار کریں۔ اس کا ایک اہم ذریعہ یہ ہے کہ جن قوموں تک وہ اسلام کی دعوت پہنچانا اور اس کے احکام و مبادی سے انہیں روشناس کرانا چاہتے ہیں ان کی زبانیں سیکھیں۔ ہم نے دیکھا کہ آں حضرت ﷺ نے ایک ہی دن میں چھ صحابہ کو مختلف سلاطین اور امراء کے پاس اپنے مکاتیب دے کر بھیجا۔ ان میں سے ہر صحابی اس قوم کی زبان اچھی طرح جانتا تھا جس کی طرف اسے بھیجا گیا تھا۔

۷۔ مسلمانوں کی ذاتی اصلاح اسلامی دعوت کی ایک اہم بنیاد ہے:

آں حضرت ﷺ کا یہ عمل دلیل ہے اس بات پر کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ پہلے اپنے درمیان دعوت کا فریضہ انجام دیں اور اپنی اصلاح کریں۔ یہاں تک کہ جب اس راہ میں بڑا فاصلہ طے کر لیں اور اسلامی نظام کو اپنی زندگی اور اپنے معاملات میں نافذ کر چکیں تب وقت آئے گا جب اس دوسرے فریضہ کو انجام دیں (یعنی دوسروں کو اسلام کی دعوت دیں) نبی ﷺ متعدد صحابہ کو ان سلاطین و امراء کے پاس اس وقت سے بہت پہلے بھیج سکتے تھے، لیکن اس صورت میں اس فریضہ کی انجام دہی نہ ہو پاتی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ جان لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ذاتی اصلاح دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کا ایک اہم جزء ہے۔ لوگ اخلاق و کردار میں صالح نمونہ کی تلاش میں رہتے ہیں، تاکہ اس کے نقش قدم پر چلیں اور اس کی اتباع کریں۔ اگر آج مسلمان اپنے اسلام پر فخر کریں اور اس کے اصول و مبادی اور احکام کو اپنے معاشروں میں نافذ کریں تو اس کی ضو فشانی سے افریقہ کے بیابان اور یورپ کے دور دراز علاقے منور ہو جائیں گے۔

یہ مکاتیب نبوی ۷ھ میں، یعنی فتح مکہ سے قبل ارسال کیے گئے۔ عام علمائے سیرت کا اس پر اتفاق ہے۔ لیکن امام بخاریؒ کا نقطۂ نظر اس سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے مکاتیب نبوی کا تذکرہ غزوۂ تبوک کے بعد کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مکاتیب ۹ھ میں بھیجے گئے تھے۔

ابن حجرؒ نے لکھا ہے: ”دونوں اقوال میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے قیصر سے دو مرتبہ مراسلت کی ہے۔ دوسری مرتبہ مراسلت کی صراحت مسند امام احمد میں موجود ہے۔ اسی طرح آپؐ نے اس نجاشی سے مراسلت کی جو اسلام لے آیا تھا اور اس کی وفات پر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر اس کے جانشین دوسرے نجاشی سے بھی مراسلت کی جو کافر تھا۔“

عمرۃ القضاء

رسول اللہ ﷺ ذی قعدہ ۷ھ میں مکہ کے ارادے سے نکلے، اور وہاں پہنچ کر عمرۃ القضاء ادا کیا۔ اسی مہینے میں گزشتہ سال مشرکین نے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ ابن سعدؒ نے "طبقات" میں لکھا ہے کہ آں حضرت ﷺ کے ساتھ عمرہ کرنے والوں کی تعداد دو ہزار تھی۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو واقعۂ حدیبیہ میں شریک تھے۔ ان میں سے کوئی پیچھے نہیں رہا۔ بجز ان لوگوں کے جو اس اثنا میں وفات پا چکے تھے یا غزوۂ خیبر میں شہید ہوگئے تھے۔" ۳۱

ابن اسحاقؒ نے لکھا ہے: "مشرکین قریش نے آپس میں یہ خیال ظاہر کیا کہ محمد اور ان کے اصحاب بڑی تنگی، مشقت اور پریشانی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے وہ دارالندوہ کے پاس اکٹھا ہوئے۔ جب رسول اللہ ﷺ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو آپؐ نے اپنی چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے لاکر بائیں کندھے پر ڈال لیا۔ اس طرح اپنا دایاں بازو چادر سے باہر نکال لیا۔ پھر فرمایا: "اللہ اس شخص پر رحم کرے جو آج ان لوگوں کے سامنے قوت کا مظاہرہ کرے۔" پھر آپ نے رکن کو بوسہ دیا۔ اس کے بعد دوڑنے لگے اور آپ کے ساتھ صحابہ بھی دوڑنے لگے۔ اس طرح آپؐ نے طواف کے تین پھیرے دوڑ کر اور بقیہ پھیرے معمول کی رفتار سے کیے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے تھے "لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا کرنا ان کے لیے ضروری نہیں ہے (یعنی یہ عام سنت نہیں ہے) اس لیے کہ آں حضرت ﷺ نے ایسا قریش کی باتوں کو سن کر انہیں دکھانے کی لیے کیا تھا۔ لیکن جب حجۃ الوداع کے موقعے پر بھی آں حضرت ﷺ نے ایسا ہی کیا تو آپ کا یہ عمل سنت قرار پایا۔ ۳۲

۳۱ طبقات ابن سعد ۲/ ۱۲۷
۳۲ سیرت ابن ہشام ۲/ ۳۷۰، یہ مضمون ملتے جلتے الفاظ میں بخاری و مسلم میں بھی موجود ہے۔

آں حضرت ﷺ نے اس موقعے پر حضرت میمونہ بنت الحارثؓ سے نکاح فرمایا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آں حضرت ﷺ نے یہ نکاح حالتِ احرام میں کیا تھا (یعنی صرف عقدِ نکاح کیا تھا) اور بعض کا خیال ہے کہ یہ عقد احرام سے نکلنے کے بعد ہوا تھا۔ یہ نکاح آں حضرت ﷺ کے چچا اور حضرت میمونہؓ کے بہنوئی حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ نے کرایا تھا۔ (حضرت میمونہ کی بہن حضرت ام الفضلؓ حضرت عباسؓ کے نکاح میں تھیں)۔ ۳۳

جب مکہ میں آں حضرت ﷺ اور صحابہ کو داخل ہوئے تین دن گزر گئے (قریش سے اتنی ہی مدت تک مکہ میں ٹھہرنے کا معاہدہ ہوا تھا) تو قریش حضرت علیؓ کے پاس آئے اور کہا "اپنے ساتھی سے کہہ دو کہ اب یہاں سے چلے جائیں۔ مدت پوری ہو چکی ہے" نبی ﷺ مکہ سے نکل آئے۔ ۳۴

آں حضرت ﷺ واپسی میں تنعیم سے قریب "سَرِف" نامی ایک مقام پر ام المومنین حضرت میمونہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر ذی الحجہ میں آپ کی مدینہ واپسی ہوئی۔

دروس ونصائح

ا۔ وعدۂ الٰہی کی تکمیل:

آں حضرت ﷺ نے صحابہ سے مکہ میں داخل ہونے اور بیت اللہ کا طواف کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، اس عمرہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی تکمیل ہوئی۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ کس طرح حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے صلح حدیبیہ کے دوران سوال کیا تھا کہ "کیا آپؐ نے ہم سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف کریں گے؟" آں حضرت ﷺ نے جواب دیا تھا: "ہاں کیوں نہیں، لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال کریں گے؟" حضرت عمرؓ کے انکار کرنے پر آپؐ نے فرمایا تھا: "پھر تم ضرور اس کی زیارت اور طواف کرو گے۔"

عمرۃ القضاء کے ذریعے اس وعدہ کی تکمیل ہوئی جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے

۳۳ دیکھیے عیون الاثر ۲/ ۱۴۸
۳۴ بخاری ۵/ ۸۵

کیا تھا۔ درج ذیل ارشاد باری میں اسی طرف اشارہ ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا (الفتح: ۲۷)

فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ انشاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی۔

یہ عمرہ اس عظیم فتح کی تمہید تھا جس سے مسلمان بعد میں بہرہ ور ہوئے۔ اس موقعے پر انصار اور مہاجرین کا جمِ غفیر رسول اللہ ﷺ کے گرد پروانوں کی طرح منڈلا رہا تھا اور پورے جوش وجذبہ سے آپؐ کے ساتھ طواف و سعی اور دیگر مناسک ادا کر رہا تھا۔ مشرکین اس منظر کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انہوں نے تو یہ تصور کر رکھا تھا کہ یثرب کے بخار اور وہاں کی نامانوس آب وہوا نے مسلمانوں کو کمزور اور نڈھال کر دیا ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس صورت حال دیکھ کر ان کے دلوں میں رعب طاری ہو گیا۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: "مشرکین نے جب مسلمانوں کو طواف اور سعی میں رمل کرتے ہوئے (یعنی اکڑ کر چلتے ہوئے) دیکھا تو آپس میں کہنے لگے: "یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تم کہہ رہے تھے کہ بخار نے انہیں کمزور کر دیا ہے؟! یہ تو فلاں فلاں سے بھی زیادہ طاقت ور ہیں۔" [۳۵]

اس میں شک نہیں کہ یہ عمرہ جس شکل میں انجام پایا، اس کا مشرکین کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔ اس سے پر امن انداز میں فتح مکہ کی راہ ہموار ہوئی، جیسا کہ عنقریب اس کی وضاحت ہوگی۔

عمرۃ القضاء سے درج ذیل احکام ومسائل مستنبط ہوتے ہیں:

---

[۳۵] مسلم ۵/۶۵

۲۔ طواف کے بعض پھیروں میں اضطباع اور رمل کا استحباب:

اضطباع یہ ہے کہ آدمی اپنے چادر کا درمیانی حصہ اپنے داہنے مونڈھے کے نیچے اور اس کے دونوں کنارے اپنے بائیں کندھے کے اوپر کرلے۔ اور رمل سے مراد اکڑ کر تیز قدموں سے چلنا ہے۔ یہ دونوں چیزیں رسول اللہ ﷺ کی اتباع میں طواف کے ابتدائی تین پھیروں میں مستحب ہیں۔ ان کا استحباب اس طواف میں ہے جس کے بعد سعی ہو، اس لیے کہ جس طواف میں نبی ﷺ نے رمل کیا تھا وہ ایسا ہی تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے بھی ایسا کرنا مستحب ہے۔ البتہ ان میں سے کوئی چیز عورت کے لیے مستحب نہیں ہے۔

۳۔ حالتِ احرام میں عقدِ نکاح جائز ہے:

بعض فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ حج یا عمرہ کے احرام کی حالت میں عقدِ نکاح جائز ہے۔ ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حالتِ احرام میں حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا تھا۔

لیکن جمہور فقہاء کا مسلک ہے کہ جو شخص احرام کی حالت میں ہو وہ نہ اپنا نکاح کر سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کی طرف سے وکیل بن سکتا ہے [۳۶] حنفیہ کے نزدیک محرم کے لیے عقد نکاح مطلق حرام نہیں ہے۔ وہ حضرات ارشاد نبوی "محرم نہ نکاح کر سکتا ہے نہ اس سے نکاح کیا جا سکتا ہے" [۳۷] میں "نکاح" سے مراد جماع لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے اور ایک حج کیا۔ امام مسلمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے چار عمرے کیے۔ آپؐ نے جو عمرہ حجۃ الوداع کے ساتھ کیا اس کے علاوہ بقیہ تینوں عمرے ذی قعدہ کے مہینے میں کیے۔ ایک حدیبیہ کی طرف سے آکر، دوسرا اگلے سال اور تیسرا جعرانہ سے آکر، جہاں آپؐ نے غزوۂ حنین میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کو تقسیم فرمایا تھا۔ [۳۸]

---

[۳۶] دیکھیے مغنی المحتاج ۲/۲۱۸

[۳۷] مسلم

[۳۸] مسلم ۵/۶۰، امام بخاری کی روایت بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔

غزوۂ موتہ

غزوۂ موتہ جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوا۔ موتہ شام کے قریبی علاقے کی ایک بستی کا نام ہے۔ آج کل یہ کرک کے نام سے موسوم ہے۔

اس غزوہ کا سبب ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے شاہ بصریٰ کے پاس حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، انہیں اس نے قتل کرا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے سفراء میں سے ان کے علاوہ اور کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ ان کے قتل کا انتقام لینے کے لیے لوگوں نے شام کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ بہت جلد مسلمانوں میں سے تین ہزار جنگ جو اکٹھا ہو گئے اور انہوں نے موتہ کا قصد کیا۔

نبی ﷺ ان کے ساتھ نہیں نکلے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ غزوہ نہیں بلکہ سریہ تھا لیکن عام علمائے سیرت نے اس میں مسلمانوں کی کثرتِ تعداد اور اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس پر "غزوہ" کا اطلاق کیا ہے۔ مسلمانوں کے لشکر کو روانہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس کے سپہ سالار زید بن حارثؓ ہوں گے۔ اگر وہ شہید ہو جائیں تو پھر سپہ سالار عبداللہ بن رواحہؓ ہوں گے۔ اگر وہ بھی جامِ شہادت نوش کر لیں تو پھر مسلمان جس کو چاہیں سالارِ لشکر بنالیں"۔[۹۳] آں حضرت ﷺ نے انہیں یہ بھی ہدایت فرمائی کہ پہلے وہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دیں۔ اگر وہ مشرف باسلام ہو جائیں تو بہتر ہے۔ اور اگر انکار کریں تو ان کے خلاف اللہ سے مدد طلب کریں اور ان سے جنگ کریں۔"

ابن اسحاقؒ نے لکھا ہے: "رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب نے مسلمانوں اور

[۹۳] صحیح بخاری، مسند احمد، طبقات ابن سعد۔ صحیح بخاری میں روایت کا آخری حصہ "اگر وہ بھی جام شہادت نوش کر لیں، تو پھر جس کو چاہیں، سالار لشکر بنالیں" موجود نہیں ہے۔

امرائے لشکر کو مدینہ سے روانہ ہوتے وقت رخصت کیا۔ اس وقت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ رو پڑے۔ لوگوں نے رونے کا سبب دریافت کیا تو فرمایا: اللہ کی قسم مجھے دنیا سے کوئی محبت ہے نہ تم لوگوں سے کوئی الفت۔ لیکن میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ کتاب اللہ کی ایک آیت پڑھتے تھے جس میں جہنم کا تذکرہ ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم:۷۱)

تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو۔ یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔

"مجھے معلوم نہیں کہ جہنم تک جانے کے بعد وہاں سے واپسی کیسے ہو گی؟"

لشکر روانہ ہوا تو مسلمانوں نے اس کے لیے دعا کی: "اللہ تم لوگوں کے ساتھ ہو، تمہاری مدافعت کرے اور تمہیں ہمارے پاس صحیح وسلامت واپس لائے۔" اس پر حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے درج ذیل اشعار کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا:

لکننی اسأل الرحمن مغفرة   وضربة ذات فرغ تقذف الزبدا
او طعنة بیدی حرّان مُجهزةً   بحربة تنفذ الاحشاء والکبدا
حتی یقال اذا مرّوا علی جدثی   ارشده الله من غاز وقد رشدا

لیکن اس کے بجائے میں رحمٰن سے مغفرت کا طالب ہوں۔ اور میری خواہش ہے کہ مجھے جنگ میں ایسی کاری ضرب لگے کہ جھاگ نکلنے لگے، یا حران کے ہاتھوں نیزے کا گہرا زخم لگے اور نیزا احشاء اور جگر کے پار ہو جائے، تاکہ جب لوگ میری قبر سے گزریں تو کہیں کہ جنگ جو کامیاب ہو گیا۔ اللہ اسے کامیاب کرے۔

یہ لوگ جب مدینہ سے روانہ ہوئے تو دشمن کو ان کی خبر لگ گئی اور انہوں نے لشکرِ عظیم جمع کر لیا۔ ہرقل نے رومیوں کی ایک لاکھ سے زائد فوج اکٹھا کر لی اور شرحبیل بن عمرو نے بھی عرب قبائل: لخم، جذام، قین اور بہراء کے جنگ بازوں کو جمع کر لیا۔ ان کی تعداد بھی ایک لاکھ تھی۔

مسلمانوں کو اس صورت حال کا علم ہوا تو وہ دو راتیں مقامِ معان پر ٹھہر کر غور کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا جائے اور

دشمن کی تعداد سے آپ کو مطلع کر کے آپؐ کے فیصلے کا انتظار کیا جائے، لیکن حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اس موقعے پر مسلمانوں کو ہمت دلائی اور فرمایا: لوگو اللہ کی قسم آج تم جس چیز کو ناگوار محسوس کر رہے ہو، اسی کے لیے نکلے ہو اور وہی تمہارا مطلوب و مقصود ہے یعنی شہادت۔ ہم دشمن کا مقابلہ تعداد اور قوت کو دیکھ کر نہیں کرتے، اور نہ جنگ پر اس وقت آمادہ ہوتے ہیں جب ہماری کثرت ہو۔ ہم دشمن کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سرفراز کیا ہے۔ اس لیے اٹھ کھڑے ہو، دونوں صورت میں ہمارے لیے بھلائی ہے۔ یا تو فتح حاصل ہو گی یا شہادت سے بہرہ ور ہوں گے۔

کرک سے ذرا پہلے مسلمانوں کی ان کے دشمنوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ تعداد، اسلحہ اور فوجی سازوسامان میں دونوں فوجوں کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ سب سے پہلے عَلَم حضرت زید بن حارثہؓ نے سنبھالا اور جنگ کا آغاز کیا۔ یہاں تک کہ نیزوں سے ان کا جسم چھلنی ہو گیا اور وہ شہید ہو گئے۔ تب عَلَم حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سنبھالا اور خوب داد شجاعت دی۔ جب لڑائی کا دباؤ بڑھا تو گھوڑے سے اتر گئے، اس کی کوچیں کاٹ دیں اور پاپیادہ لڑنے لگے۔ اس وقت درج ذیل اشعار ان کی زبان پر تھے:

يا حبّذا الجنة واقترابها   طيبةً وبارداً شرابها
والروم روم قد دنا عذابها   كافرة بعيدة انسابها
عليّ اذ لاقيتها ضرابها

بہت خوب، جنت تو قریب آگئی ہے۔ اس کا ٹھکانا فرحت بخش اور اس کا پانی ٹھنڈا ہے۔ رومیوں کو سزا دینے کا وقت قریب آگیا ہے۔ وہ کافر ہیں اور ان کے نسب کا کچھ پتہ نہیں۔ ان سے مڈبھیڑ کے وقت مجھ پر لازم ہے کہ اپنی تلوار کے جوہر دکھاؤں۔

وہ برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان پر ایک رومی نے ایسا زبردست وار کیا کہ ان کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ان کے جسم میں پچاس زخم پائے گئے۔ ان میں سے ایک بھی ان کی پیٹھ پر نہیں تھا۔ ۰؎

پھر عَلَم حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے سنبھالا اور یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

۰؎ بخاری

اقسمت يا نفس لتنزلنّه   لتنزلنّ او لتكرهنّه
ان اجلب الناس وشدّوا الرنة   مالى اراك تكرهين الجنة
قدطال ما قد كنت مطمئنة   هل انت الانطفه فى شنّة

اے نفس! میں نے قسم کھائی ہے کہ تجھے میدان جنگ میں اترنا ہے۔ اب چاہے تو بخوشی ایسا کرے ورنہ تجھے اس پر مجبور کیا جائے گا۔ اگر لوگ چیخ و پکار کر رہے ہیں اور ان کے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی ہیں تو تو کیوں جنت کی طرف لپکنے سے کترا رہا ہے۔ تو تو پہلے مطمئن تھا، تیری مثال تو ایسی ہے جیسے مشکیزے میں تھوڑا سا پانی ہو۔

پھر برابر لڑتے رہے یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد لوگوں نے بالاتفاق حضرت خالد بن ولیدؓ کو سالارِ لشکر بنایا۔ انہوں نے عَلَم سنبھالا اور مشرکین سے زبردست جنگ کی، یہاں تک کہ انہیں شکست دے دی۔ پھر اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ لوٹ آئے۔

امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے مدینہ خبر پہنچنے سے قبل ہی لوگوں کو حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت ابن رواحہؓ کی شہادت کی اطلاع دے دی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: "عَلَم زید نے اٹھایا، پھر وہ شہید ہوئے تو عَلَم جعفر نے سنبھالا، وہ بھی شہید ہو گئے تو اسے ابن رواحہ نے لیا، وہ بھی شہید ہو گئے (یہ بات بیان کرتے ہوئے آں حضرت ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے) یہاں تک کہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے عَلَم اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے اخیر میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ جب کہ بعض علماءِ سیرت نے بیان کیا ہے کہ مسلمان شکست کھا گئے تھے، ان کی جمعیت منتشر ہو گئی تھی اور اسی حالت میں وہ مدینہ واپس ہوئے تھے۔ شاید ان کا مقصود یہ ہے کہ رومیوں اور ان کے ہم نواؤں کو شکست دینے کے بعد مسلمانوں نے ان کا پیچھا نہیں کیا تھا اور مزید جانی نقصان سے بچنے کے لیے محاذِ جنگ سے ہٹ کر مدینہ واپس ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حضرت خالد بن ولیدؓ کی جنگی حکمت عملی تھی۔

ابن حجرؒ نے لکھا ہے: "مغازی موسیٰ بن عقبہ میں، جو صحیح ترین مغازی ہے، یہ صراحت موجود ہے کہ "عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے بالاتفاق خالد بن الولیدؓ کو

سالار لشکر بنایا۔ ان کی قیادت میں اللہ تعالیٰ نے دشمن کو شکست دی اور مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی۔"

ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: "دونوں میں یوں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ حضرت خالدؓ کی قیادت میں مسلمان فتح سے ہم کنار ہوئے۔ اگلے دن انہوں نے لشکر کی ہیئت تبدیل کردی۔ میمنہ کو میسرہ کی جگہ اور میسرہ کو میمنہ کی جگہ کردیا، تاکہ نئے چہروں کو دیکھ کر دشمن کو یہ وہم ہوجائے کہ مسلمانوں کو کمک مل گئی ہے۔ اس حکمت عملی سے حضرت خالد بن ولیدؓ نے حملہ کیا تو دشمن پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت حضرت خالد بن الولیدؓ نے ان کا پیچھا نہیں کیا اور مسلمانوں کے ساتھ مدینہ واپسی کو غنیمت جانا۔ [۱]

جب لشکر واپس ہوتے ہوئے مدینہ کے قریب پہنچا تو رسول اللہ ﷺ نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ بچے بھی پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "بچوں کو سواری پر بٹھالو اور جعفر کا بچہ مجھے دے دو۔" آپ کے پاس عبداللہ بن جعفر کو لایا گیا۔ آپ نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ لشکر کو دیکھ کر مسلمان زور زور سے کہنے لگے: "بھاگنے والو، تم اللہ کے راستے سے بھاگے ہو۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں، بلکہ انشاء اللہ پھر حملہ کرنے والے ہیں"

دروس ونصائح

ا۔ مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کی تعداد میں حیرت انگیز فرق:

اس غزوہ کی سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز مسلمانوں اور ان سے جنگ کرنے والے رومیوں اور مشرکینِ عرب کی تعداد میں غیر معمولی فرق ہے... آپ نے دیکھا کہ مشرکین اور ان کے ہم رکاب رومیوں کی تعداد تقریباً دولاکھ تک پہنچ گئی تھی، جیسا کہ ابن اسحاق، ابن سعد اور عام مؤلفینِ سیرت [۲] نے بیان کیا ہے، جب کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے متجاوز نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور اہل روم کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے کم از کم پچاس گنا

[۱] دیکھئے فتح الباری ۷/۳۶۱-۳۶۲

[۲] دیکھئے طبقات ابن سعد ۳/۱۷۵، سیرت ابن ہشام ۲/۳۷۵

زیادہ تھی۔

اس تناسب کا تصور کیجئے تو اہلِ روم اور مشرکین کے لشکرِ جرار کے سامنے اسلامی لشکر کی مثال عظیم ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مقابلے میں چھوٹی سی نہر کی سی تھی۔ مزید برآں دشمنوں کا لشکر سامانِ جنگ، رسد، اسلحہ اور شان وشوکت اور کرّوفر کے مظاہر سے لیس تھا، جب کہ مسلمانوں کے پاس بہت معمولی ساز وسامان تھا اور فقر وفاقہ کے مظاہر ان پر عیاں تھے۔

اس معاملے میں حیرت کی بات یہ ہے کہ اس صورت حال کے باوجود مسلمانوں نے پیٹھ نہیں دکھائی، بلکہ پیش قدمی جاری رکھی، حالانکہ انہیں اس وقت رسول اللہ ﷺ کی رفاقت بھی نہیں حاصل تھی۔ اپنے سامنے دشمن کے لشکر جرار کو انہوں نے ذرا سی بھی اہمیت نہیں دی، حالانکہ دشمن اتنی بڑی تعداد میں تھا کہ اگر انہیں گھیرے میں لے لیتا تو ان کی حیثیت بیاباں زمین میں ایک بیج کی سی ہوتی۔

اس کے باوجود حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مسلمان اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا جم کر مقابلہ کرتے ہیں، ان کے یکے بعد دیگرے تینوں سپہ سالار شہید ہوجاتے ہیں مگر ان کے جوش وجذبہ میں کمی نہیں آتی ہے، بلکہ وہ نشۂ شہادت سے سرشار دیوانہ وار آگے بڑھتے ہیں اور برابر لڑتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بہت سے مشرکین کے دلوں میں بغیر کسی ظاہری سبب کے رعب طاری ہوجاتا ہے، وہ میدانِ جنگ سے ہٹ جاتے ہیں، بہت سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور بہت بڑی تعداد موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

لیکن یہ ساری حیرت اس وقت کافور ہو جاتی ہے جب ہمیں یاد آتا ہے کہ اللہ پر ایمان، اس پر بھروسہ اور اس کے وعدے پر یقین ایک مومن کے دل میں کیسے احساسات پیدا کرتا ہے۔

بلکہ مسلمانوں کے تعلق سے — اگر وہ واقعی مسلمان ہوں — حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان سے ان چیزوں کا صدور نہ ہو۔ ان کے معاملے میں عجیب وغریب چیز یہ ہے کہ وہ مسلمان ہوں پھر بھی جنگ میں لشکر کی تعداد اور سامانِ جنگ کو اہمیت دیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ یا تو اس کی تائید ونصرت سے وہ فتح یاب ہوں گے یا شہادت کی صورت میں ابدی جنت اور اس کی نعمتوں سے شادکام ہوں گے.... مسلمان، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا، تعداد اور قوت کو دیکھ کر نہیں لڑتے اور نہ جنگ پر اس وقت آمادہ ہوتے ہیں جب ان کی کثرت

ہو، بلکہ وہ دشمن کا مقابلہ اس دین کی طاقت سے کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں سرفراز کیا ہے۔

یہ غزوہ بہت سی نصیحتوں اور روشن نتائج پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چند کا تذکرہ ہم سطور ذیل میں کرتے ہیں۔

۲۔ مشروط امارت یا متعدد امراء کا تقرر جائز ہے:

نبی ﷺ نے بالترتیب حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو سپہ سالار نامزد فرمایا۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ خلیفہ یا مسلمانوں کے سربراہ کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی شخص کو مشروط طور پر امیر بنائے، یا متعدد لوگوں کو بالترتیب امارت تفویض کرے۔ علماء فرماتے ہیں" صحیح بات یہ ہے کہ اگر خلیفہ اس طرح کا حکم دے تو تمام لوگوں کی ولایت بیک وقت اور فوراً منعقد ہو جاتی ہے، البتہ اس کا نفاذ بالترتیب ہو گا۔" [۴۳]

۳۔ امیر کے انتخاب میں مسلمانوں کو اجتہاد کرنے کا حق حاصل ہے:

رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ بالا ہدایت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر کسی موقعے پر مسلمانوں کا کوئی امیر نہ ہو، یا خلیفہ نے انہیں اپنی پسند کا امیر منتخب کرنے کا اختیار دے دیا ہو تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں: "یہ ایک اصل ہے۔ اس سے اس بات کا استنباط ہوتا ہے کہ اگر کسی موقعے پر امام موجود نہ ہو تو مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ اس کی واپسی تک کسی ایسے شخص کو منتخب کر لیں جو اس کی قائم مقامی کر سکے" اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اس ہدایت سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے نبی ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی اجتہاد کرنا مشروع تھا۔

۴۔ ایک خارقِ عادت امر:

آپ نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے صحابہ کو حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہ

۴۳ ملاحظہ کیجیے فتح الباری ۷/۳۶۱

بن رواحہؓ کی شہادت کی خبر دی۔ اس وقت آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ خبر آپؐ نے اس صورت میں دی جب کہ آپ کے اور ان شہداء کے درمیان طویل مسافت تھی۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے لیے زمین کی بساط لپیٹ دی تھی، اور آپ نے شام کے قریبی علاقے میں جنگ کرنے والے مسلمانوں کے احوال کا عینی مشاہدہ کر لیا تھا۔ یہ ان بہت سے خوارق میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضرت محمد ﷺ کو بہرہ ور فرمایا تھا۔

اسی طرح اس حدیث سے آں حضرت ﷺ کی اپنے اصحاب پر انتہائی شفقت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کو ان شہداء کی خبر دیتے وقت رو پڑیں۔ اور آپ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ کا رونا تقدیر الٰہی پر راضی برضا ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ آنکھوں سے آنسو جاری ہونا اور دل کا غمگین ہونا فطری رقت اور رحم دلی کا مظہر ہے، جیسا کہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ حضرت خالد بن الولیدؓ کی فضیلت اور ان کے لقب "سیف اللہ" کی معنویت:

آں حضرت ﷺ نے ان تینوں شہداء کی جو خبر دی اس سے حضرت خالد بن الولیدؓ کی ایک مخصوص فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپؐ نے صحابہ سے آخر میں فرمایا: "یہاں تک کہ علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے لیا اور اللہ تعالیٰ نے (اس کی قیادت میں) مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔" یہ پہلا معرکہ تھا جس میں حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کی صف میں شامل ہو کر حصہ لیا تھا۔ اس لیے کہ انہیں اسلام قبول کیے ہوئے ابھی تھوڑی ہی مدت گزری تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ کو خود رسول اللہ ﷺ نے "سیف اللہ" (اللہ کی تلوار) کا لقب مرحمت فرمایا تھا۔

اس غزوہ میں حضرت خالد بن ولیدؓ نے خوب دادِ شجاعت دی۔ امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ فرماتے ہیں: "موتہ کی جنگ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹیں، آخر میں صرف ایک یمانی تلوار رہ گئی۔" ابن حجرؒ فرماتے ہیں "اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اس معرکہ میں مسلمانوں نے بہت سے مشرکین کو قتل کیا تھا۔"

۶۔ راہِ خدا سے "فرار" کا مفہوم:

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر غزوۂ موتہ میں شریک ہونے والے جب مدینہ واپس آئے تو مسلمانوں نے ان سے یہ کیوں کہا تھا: "بھاگنے والو! تم اللہ کے راستے سے بھاگے ہو؟" اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے یہ بات اس لیے کہی تھی کیونکہ رومی جب شکست کھا کر بھاگنے لگے تو مسلمانوں نے ان کا پیچھا نہیں کیا تھا اور جس علاقے میں ان سے جنگ ہوئی تھی اسے یوں ہی چھوڑ دیا تھا، حالانکہ گزشتہ غزوات میں وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ ایسا حضرت خالد بن ولیدؓ نے کیا تھا۔ یہ ان کی ایک جنگی تدبیر تھی جو انہوں نے مسلمانوں کی حفاظت اور اہلِ روم کے دلوں میں ہیبت باقی رکھنے کے لیے اختیار کی تھی۔ اسی لیے نبی ﷺ نے ایسا کہنے والوں کو جواب دیا: "یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں، بلکہ انشاءاللہ پھر حملہ کرنے والے ہیں"

فتح مکہ

یہ واقعہ رمضان ۸ ھ میں پیش آیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ بنو بکر کے کچھ لوگوں نے اشرافِ قریش سے گفتگو کی کہ وہ خزاعہ کے خلاف جنگ جوؤں اور ہتھیاروں کے ذریعے ان کی مدد کریں (خزاعہ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ میں شریک ہوگئے تھے) قریش نے ان کی بات مان لی اور ان کے بہت سے لوگ، جن میں صفوان بن امیہ، حویطب بن عبدالعزیٰ، مکرز بن حفص بھی تھے، بھیس بدل کر نکلے اور "وتیر" نامی جگہ پر بنو بکر کے ساتھ جا ملے، انہوں نے خزاعہ پر شب خوں مارا، جب کہ وہ لوگ مطمئن اور بے خبر تھے، اور ان کے بیس آدمی قتل کر دیے، اس واقعہ کے بعد عمرو بن سالم الخزاعی خزاعہ کے چالیس شہ سواروں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جو کچھ اس قبیلے پر بیتی تھی اس سے آپؐ کو آگاہ کیا۔ آپؐ اپنی ردائے مبارک سنبھالتے ہوئے کھڑے ہوئے اور فرمایا: "اگر میں بنو کعب پر ہونے والے ظلم کے خلاف ان کی اس طرح مدد نہ کر سکوں جس طرح اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا دفعیہ کرتا ہوں تو اللہ کی تائید و نصرت سے محروم رہوں" مزید فرمایا "یہ بادل خوش خبری دے رہا ہے کہ بنو کعب کی ضرور مدد کی جائے گی"۔ [۴۴]

قریش کو اپنے کیے پر پشیمانی ہوئی۔ انہوں نے ابوسفیان بن حرب کو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا تاکہ وہ صلح کی تجدید کر لیں اور ایک مدت تک اس پر عمل کو یقینی بنائیں۔ ابوسفیان نے مدینہ آکر رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کی، لیکن آپؐ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب

---

[۴۴] طبقات ابن سعد۔ اسے ابن اسحاق نے بھی روایت کیا ہے۔ ابن حجر فرماتے ہیں: اس روایت کو بزار، طبرانی اور موسیٰ بن عقبہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

وہ حضرت ابو بکرؓ کے پاس گئے اور رسول اللہ ﷺ سے سفارش کرنے کی درخواست کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے جواب دیا: "میں ایسا نہیں کر سکتا۔" پھر وہ حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس گئے اور ان سے اس معاملہ میں گفتگو کی۔ انہوں نے فرمایا: "کیا میں رسول اللہ سے تم لوگوں کی سفارش کروں گا؟ اللہ کی قسم اگر تم لوگوں سے جنگ کرنے کی راہ میں مجھے چونٹیوں سے سہارا ملے گا تو ان کے ذریعے تم سے جنگ کروں گا" ابو سفیان نامراد مکہ واپس لوٹ گیا۔ اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔

رسول اللہ ﷺ نے جنگ کی تیاری شروع کر دی اور اسے مخفی رکھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: "اے اللہ! قریش کی بینائیاں سلب کر لے۔ انہیں اس وقت خبر ہو جب ہم اچانک ان کے سر پر پہنچ جائیں۔"[45]

جب نبی ﷺ نے مکہ روانگی کے ارادے سے صحابہ کرام کو باخبر کیا تو حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے قریش کو ایک خط لکھا اور انہیں ہوشیار کیا کہ مسلمان ان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے مجھے، اور حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو روانہ کیا اور فرمایا: تم لوگ روضۃ الخاخ (مدینہ اور مکہ کے درمیان ایک مقام) پہنچو گے تو وہاں تم کو ایک مسافر عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہوگا۔ اس خط کو اس سے لے کر آؤ" حضرت علیؓ فرماتے ہیں: "ہم لوگ گھوڑے دوڑاتے ہوئے وہاں پہنچے تو ٹھیک اسی جگہ وہ عورت ملی۔ ہم نے اس سے کہا: خط نکالو۔ اس نے جواب دیا: میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ ہم نے کہا: خط نکالو ورنہ ہم تمہاری جامہ تلاشی لیں گے۔ بالآخر اس نے اپنے بالوں کے جوڑے سے خط نکال کر دیا۔ اسے لے کر ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ حاطب بن ابی بلتعہؓ کا خط تھا جو مکہ کے بعض مشرکین کو لکھا گیا تھا اور انہیں مکہ پر چڑھائی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی تیاری سے متعلق بعض باتوں کی خبر دی گئی تھی۔ آں حضرت ﷺ نے حضرت حاطبؓ کو طلب کر کے دریافت فرمایا: "اے حاطب، تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے بارے میں فیصلہ کرنے میں عجلت نہ فرمائیں۔ میں ایسا شخص تھا جس کی قریش سے بس وابستگی تھی، یعنی قریش سے میرا نسبی تعلق نہیں تھا۔ میں ان کا حلیف تھا، جب کہ دیگر مہاجرین کی ان میں قرابتیں اور خاندانی تعلقات ہیں۔ وہ ان کے پشت پناہ بن سکتے ہیں اور ان کے اموال

45۔ اس روایت کو ابن اسحاق اور ابن سعد نے تقریباً ملتے جلتے الفاظ میں روایت کیا ہے۔

کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ جب مجھے یہ چیز حاصل نہیں ہے تو میں ان پر کوئی ایسا احسان کر دوں جس سے میرے خاندان کے لوگ محفوظ رہیں۔ میں نے ایسا اس لیے نہیں کیا ہے کہ میں مرتد ہو گیا ہوں اور دائرہ اسلام میں آنے کے بعد دوبارہ میں نے کفر کو پسند کر لیا ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: "یہ سچ کہہ رہے ہیں" اس موقعے پر حضرت عمرؓ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے، میں اس منافق کی گردن اڑا دوں" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "وہ بدر میں شریک تھے، اور تمہیں کیا معلوم، شاید اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو مخاطب کر کے فرما دیا ہو کہ تم جو چاہے کرو، میں نے تمہارے سب قصور معاف کر دیے ہیں۔" اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوا بِمَا جَاءَكُمْ مِنَ الْحَقِّ يُخْرِجُونَ الرَّسُولَ وَإِيَّاكُمْ أَنْ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ رَبِّكُمْ، إِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِي سَبِيلِي وَابْتِغَاءَ مَرْضَاتِي تُسِرُّونَ إِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَأَنَا أَعْلَمُ بِمَا أَخْفَيْتُمْ وَمَا أَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ. (الممتحنہ:۱)[46]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول کو اور خود تم کو صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم چھپا کر ان کو دوستانہ پیغام بھیجتے ہو۔ حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے گا وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت کلثوم بن حصینؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین بنایا اور چہار شنبہ، ۱۰ رمضان کو عصر کے بعد نکلے۔ آپؐ نے اردگرد کے عرب قبیلوں اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ

46۔ بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔

وغیرہ کو بھی بلا بھیجا۔ وہ سب ظہران — مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام — پر آپ سے جا ملے۔ مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ قریش کو اب تک لشکرِ اسلام کے کوچ کی خبر نہ مل سکی تھی، لیکن چونکہ ابوسفیان مدینہ سے اپنی سفارتی مہم میں ناکام واپس آئے تھے اس لیے قریش کو اندیشہ تھا کہ ضرور کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ انہوں نے ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء کو رسول اللہ ﷺ کی ٹوہ لینے کے لیے بھیجا۔ وہ لوگ نکلے، یہاں تک کہ جب "مرالظہران" کے قریب پہنچے تو انہوں نے آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن دیکھے۔ ابھی وہ ان کے بارے میں ایک دوسرے سے پوچھ ہی رہے تھے کہ خیمۂ نبوی کی نگہبانی پر متعین دستے نے انہیں دیکھ لیا اور پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ وہاں ابوسفیان نے اسلام قبول کرلیا۔" ۴۷

ابن اسحاق نے حضرت عباسؓ سے ابوسفیان کے ایمان لانے کی تفصیل نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: "اگلے دن صبح میں ابوسفیان کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب رسول اللہ ﷺ کی نظر مبارک ان پر پڑی تو فرمایا: "ابوسفیان! تمہارا بھلا ہو۔ کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں،" انہوں نے جواب دیا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کتنے حلیم، کتنے کریم اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ اللہ کی قسم! میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر اللہ کے سوا کوئی اور بھی معبود ہوتا تو آج ہمارے کام آتا" آں حضرت ﷺ نے پھر فرمایا: "ابوسفیان! اللہ تمہیں سمجھ دے، کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" ابوسفیان نے کہا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کتنے حلیم، کتنے کریم اور کس قدر صلہ رحمی کرنے والے ہیں۔ اللہ کی قسم جہاں تک اس بات کا تعلق ہے اس بارے میں

۴۷ روایت کا اتنا حصہ امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔ اس میں ابوسفیان کے دونوں ساتھیوں (حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء) کے اسلام قبول کرنے کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ علماء سیرت، جن میں موسیٰ بن عقبہ سرفہرست ہیں، انہوں نے بیان کیا ہے کہ بدیل اور حکیم نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہوتے ہی اسلام قبول کرلیا۔ ابوسفیان نے اسلام قبول کرنے میں تاخیر کی۔ انہیں یہ سعادت صبح حاصل ہوئی۔ اسی لیے بخاری کی روایت میں ان دونوں کا تذکرہ نہیں ہے، صرف ابوسفیان کے اسلام قبول کرنے کا بیان ہے۔

دل میں اب تک کچھ شبہ باقی ہے۔" حضرت عباسؓ نے فوراً کہا: "بندۂ خدا! قبل اس کے کہ تمہاری گردن اڑادی جائے اسلام قبول کرلو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔" یہ سن کر ابوسفیان نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام لے آئے۔

حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: "میں نے عرض کیا" اے اللہ کے رسول! ابوسفیان ایسے آدمی ہیں جو فخر پسند کرتے ہیں۔ ان کے لیے کسی باعثِ فخر چیز کا اعلان کردیجئے"۔ آپؐ نے فرمایا: "ہاں۔ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لیے امان ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کے لیے امان ہے۔ جو مسجد میں چلا جائے اس کے لیے امان ہے۔"

جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو حضرت عباسؓ سے فرمایا: "ابوسفیان کو ایک ایسی گھاٹی میں لے جاکر کھڑا کردو جہاں سے گزرنے والے اسلامی دستوں کا وہ نظارہ کرسکیں۔" حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: میں ابوسفیان کے ساتھ نکلا اور انہیں لے جاکر اس جگہ کھڑا کردیا جہاں کھڑا کرنے کا رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا تھا۔ مختلف قبائل اپنے اپنے جھنڈوں کے ساتھ وہاں سے گزرنے لگے۔ جب کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان کہتے: "اے عباس یہ کون سا قبیلہ ہے؟" میں اس قبیلہ کا نام لیتا تو وہ کہتے: "مجھے اس قبیلے سے کیا سروکار۔" یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ ایک مسلح دستے میں، جو مہاجرین وانصار پر مشتمل تھا، وہاں سے گزرے۔ یہ ایسا آہن پوش دستہ تھا کہ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ابوسفیان نے یہ منظر دیکھ کر کہا: "سبحان اللہ، عباس! یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے جواب دیا: "یہ اللہ کے رسول ہیں جو مہاجرین وانصار کے جلو میں تشریف لے جارہے ہیں۔" ابوسفیان نے کہا: "ان میں سے کسی کو آج سے پہلے یہ طاقت اور شان وشوکت حاصل نہ تھی۔ اللہ کی قسم، اے ابوالفضل! تمہارے بھتیجے کا اقتدار آج کی صبح کتنا عظیم ہے۔" حضرت عباسؓ نے فرمایا: "اے ابوسفیان! یہ نبوت ہے۔" انہوں نے کہا: "نبوت کہہ لو۔" ۴۸

پھر حضرت عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا: "جاؤ اپنی قوم کی نجات کی فکر کرو۔" ابوسفیان بسرعت وہاں سے روانہ ہوئے اور رسول اللہ ﷺ سے قبل مکہ میں داخل ہوگئے اور وہاں پہنچ کر بلند آواز سے اعلان کیا: "اے قریش کے لوگو! یہ محمد اتنی طاقت کے ساتھ آپہنچے ہیں کہ اس کا تم

۴۸ ابن سعد، ابن اسحاق، ابن جریر۔ اسی کے مثل امام بخاری نے بھی روایت کیا ہے۔

کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا۔اب جو ابوسفیان کے گھر میں آجائے اس کے لیے امان ہے۔"

ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ ان کے پاس آئی اور ان کی مونچھ پکڑ کر کہنے لگی: "اس گورے چٹے، موٹے اور بہادر شخص کو قتل کردو۔ یہ اپنی قوم کا براہراول ہے" ابوسفیان نے لوگوں سے کہا: "دھوکہ میں نہ رہو۔ محمد (ﷺ) اتنی طاقت کے ساتھ آئے ہیں کہ اس کا تم کو کبھی تجربہ نہ ہوا ہوگا۔اب جو ابوسفیان کے گھر میں آجائے اس کے لیے امان ہے۔" یہ سن کر لوگ کہنے لگے: "اللہ تم سے سمجھے۔ تمھارا گھر ہی کتنا بڑا ہے کہ ہم سب کو اس میں پناہ مل سکے؟" تب انہوں نے کہا: "جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کے لیے امان ہے۔ جو مسجد میں چلا جائے اس کے لیے امان ہے۔" چنانچہ لوگ منتشر ہوگئے اور اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام میں پناہ لی۔ [۴۹]

رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے گھاٹی سے گزرتے ہوئے جب ابوسفیان کو دیکھا تو کہا: "اليوم يوم الملحمة،اليوم تستحلّ الكعبة" (آج گھمسان کا دن ہے، آج کعبہ میں سب کچھ جائز ہے) آپ کو ان کی یہ بات پسند نہ آئی۔ آپؐ نے فرمایا: بل اليوم يوم المرحمة،اليوم يعظم الله الكعبة (بلکہ آج تو رحم و کرم کا دن ہے۔ آج اللہ کعبہ کی عظمت بڑھائے گا) آپؐ نے اپنی فوج کے سپہ سالاروں کو حکم دیا کہ صرف انہی لوگوں سے جنگ کریں جو ان سے آمادۂ پیکار ہوں"[۵۰] آں حضرت ﷺ نے عام معافی سے چھ مرد اور چار عورتوں کو مستثنیٰ کردیا اور ان کے بارے میں حکم دیا کہ وہ جہاں بھی پائے جائیں انہیں قتل کردیا جائے۔ وہ یہ ہیں: ۱۔ عکرمہ بن ابی جہل۔ ۲۔ ہبار بن اسود۔ ۳۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح۔ ۴۔ مقیس بن صبابہ اللیثی۔ ۵۔ حویرث بن نُقید۔ ۶۔ عبداللہ بن ہلال۔ ۷۔ ہند بنت عتبہ۔ ۸۔ عمرو بن ہشام کی آزاد کردہ لونڈی سارہ۔ ۹۔ فرتنی اور قرینہ ۱۰ (یہ دونوں لونڈیاں تھیں جو ہمیشہ نبی ﷺ کی ہجو میں اشعار گایا کرتی تھیں)۔ [۵۱]

نبی ﷺ مکہ معظمہ میں اس کے بالائی حصے سے، جو کداء کہلاتا تھا، داخل ہوئے اور آپؐ

---

[۴۹] ابن اسحاق

[۵۰] اسے بخاری، ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر و مغازی نے روایت کیا ہے۔

[۵۱] طبقات ابن سعد، سیرت ابن اسحاق۔ ابن حجر فرماتے ہیں: "میں نے مختلف روایتوں سے ان چھ مردوں اور چار عورتوں کے نام جمع کیے ہیں۔"

نے حضرت خالد بن الولیدؓ کو حکم دیا کہ اپنی ٹکڑی کے ساتھ مکہ کے زیریں حصے سے جس کا نام کدی تھا، داخل ہوں۔ آں حضرت ﷺ نے مختلف قبیلوں کو مکہ میں جدھر سے داخل ہونے کا حکم دیا تھا وہ وہیں سے داخل ہوئے۔ ان میں سے کسی کو مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ صرف حضرت خالد بن الولیدؓ کا مقابلہ مشرکین کی ایک جمعیت کے ساتھ ہوا جس میں عکرمہ بن ابی جہل اور صفوان بن امیہ بھی تھے۔ حضرت خالدؓ نے ان سے جنگ کی اور قریش کے چوبیس اور ہذیل کے چار اشخاص کو قتل کردیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دور سے تلواروں کی چمک دیکھی تو روئے انور پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ آپؐ سے بتایا گیا کہ یہ خالدؓ ہیں۔ ان سے جنگ کی ابتداء مشرکین کی جانب سے ہوئی ہے، اس لیے وہ بھی جنگ پر مجبور ہوئے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "قضائے الٰہی میں خیر ہے" [۵۲]

ابن اسحاقؒ نے حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ سے اور حاکمؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مقام ذی طویٰ پہنچے تو اپنی سواری کو روک لیا۔ اس وقت آپ ایک یمنی چادر کا عمامہ پہنے ہوئے تھے۔ آپؐ نے جب دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو فتح سے سرفراز فرمایا ہے تو آپ کا سر تواضع و خاکساری سے جھک گیا، یہاں تک کہ آپ کی ریش مبارک کجاوہ کے درمیانی ابھار کو چھونے لگی۔

بخاری نے معاویہ بن قرہ سے روایت کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے "میں نے فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ اپنی اونٹنی پر سوار سورۂ الفتح کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کی آواز حلق میں گھوم رہی تھی۔" انہوں نے مزید فرمایا: "اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ میری آواز سن کر اکٹھا ہوجائیں گے تو میں اسی طرح کی آواز نکال کر دکھاتا جیسی اس وقت آں حضرت ﷺ کے دہنِ مبارک سے نکل رہی تھی"

آں حضرت ﷺ مکہ میں داخل ہوئے تو آپؐ نے بیت اللہ کا رخ کیا۔ اس کے گرد تین

---

[۵۲] اس روایت کو ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔ ابن حجر نے بھی موسیٰ بن عقبہ سے ملتے جلتے الفاظ میں روایت کیا ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ اس موقعے پر مشرکین کے تیرہ یا چودہ آدمی مارے گئے تھے۔ اس حدیث کو امام بخاری نے باختصار روایت کیا ہے۔ دیکھئے فتح الباری ۸/۸-۹۔

سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپؐ کے دستِ مبارک میں ایک لکڑی تھی۔ آپ اس کے ذریعے ایک ایک کو گراتے جاتے تھے۔ اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے:

جاء الحق وزهق الباطل، جاء الحق وما يبدى الباطل وما يعيد [۵۳]

حق آگیا اور باطل مٹ گیا، حق آگیا اور باطل اب پھر کبھی نہ آئے گا۔

کعبہ کے اندر بھی بہت سے بت رکھے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی میں آپؐ نے کعبہ میں داخل ہونے سے انکار کیا اور انہیں باہر نکال دیے جانے کا حکم دیا۔ سارے بت نکال دیے گئے۔ کعبہ کے اندر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں (مجسّمے) بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر تھے، انہیں بھی باہر نکال دیا گیا۔ انہیں دیکھ کر نبی ﷺ نے فرمایا: "اللہ ان لوگوں کو ہلاک کرے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دونوں نے کبھی پانسے کے تیروں سے شگون نہیں لیا تھا" پھر آپ بیت اللہ کے اندر داخل ہوئے، اس کے مختلف گوشوں میں تکبیریں کہیں، لیکن نماز نہیں ادا کی اس کے بغیر باہر نکل آئے۔ [۵۴]

آپؐ نے عثمان بن طلحہ کو جو بیت اللہ کے کلید بردار تھے، بلوایا۔ ان سے کلید لے کر بیت اللہ کا دروازہ کھلوایا اور اس میں داخل ہوئے۔ جب باہر نکلے تو فرمایا: عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟ وہ حاضر ہوئے تو کلید ان کے حوالے کی اور فرمایا: لو یہ تمہارے پاس ہمیشہ رہے گی۔ اسے میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ اللہ دے رہا ہے۔ اور جو شخص اسے تم سے چھیننے کی کوشش کرے گا وہ ظالم ہوگا۔ آپ کا اشارہ اس ارشاد باری کی طرف تھا:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا. (النساء: ۵۸) [۵۵]

(مسلمانو) اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کردو۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے خانۂ کعبہ کی چھت

۵۳ بخاری و مسلم

۵۴ بخاری۔ امام مسلم نے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے بیت اللہ کے اندر نماز ادا کی تھی۔ عنقریب اس کی تحقیق ہم انشاء اللہ 'تبصرہ' میں کریں گے۔

۵۵ اس روایت کو طبرانی نے مرسل زہری سے اور ابن ابی شیبہ اور ابن اسحاق نے روایت کیا ہے۔ مزید دیکھئے فتح الباری ۸/ ۱۴

پر چڑھ کر اذان دی۔ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے: نبی ﷺ نے خانۂ کعبہ کے دروازے کے دونوں بازو تھام لیے۔ اس وقت لوگ آپ کے گرد اکٹھا تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ آپ ان کے ساتھ کیا معاملہ کرنے والے ہیں۔ آپؐ نے ان کے سامنے یہ خطبہ دیا:

"کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست دی۔ جان لو، تمام مفاخر، تمام انتقامات، خوں بہا سب میرے قدموں کے نیچے ہیں۔ صرف بیت اللہ کی تولیت اور حجاج کی آب رسانی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسب کا افتخار اللہ نے مٹا دیا ہے۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔ پھر آپؐ نے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا: "اے قوم قریش! جانتے ہو میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کرنے والا ہوں؟" انہوں نے جواب دیا: "ہم اچھی امید رکھتے ہیں۔ آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم النفس اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں" آپؐ نے فرمایا: "جاؤ تم سب آزاد ہو۔" [۵۶]

بخاری اور مسلم نے ابو شریح عدوی سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فتح مکہ کے دن لوگوں کے سامنے یہ خطبہ دیا:

"مکہ کی حرمت انسانوں کی جانب سے نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے ہے۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں کہ یہاں کسی کا خون بہائے یا کوئی درخت یا پودا اکھاڑے۔ اگر کوئی شخص جواز کے لیے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ کے رسول نے

۵۶ اسی کے مثل ابن سعد نے بھی اپنی طبقات میں روایت کیا ہے۔

یہاں قتال کیا ہے تو اس کو یہ جواب دو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس کی اجازت دی تھی، لیکن اس نے تمہیں اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس نے اپنے رسول کو بھی دن کے کچھ حصے میں اس کی اجازت دی تھی۔ اس کی حرمت اب پھر اسی طرح قائم ہو گئی ہے جس طرح کل تھی۔ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ بات ان لوگوں تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں"

پھر مکہ میں لوگ جمع ہوئے تاکہ رسول اللہ ﷺ سے اللہ اور رسول کی سمع و طاعت پر بیعت کریں۔ جب آں حضرت ﷺ مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں سے بیعت کی۔ آپ کی خدمت میں قریش کی چند خواتین حاضر ہوئیں، ان میں ہند بنت عتبہ بھی تھی۔ وہ نقاب میں تھی، کیونکہ حضرت حمزہؓ کے ساتھ اس نے جو کچھ کیا تھا اس کی وجہ سے اپنے کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب یہ خواتین بیعت کے لیے قریب ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس بات پر مجھ سے بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤ گی۔" ہند نے کہا: "اللہ کی قسم آپ ہم سے وہ اقرار لے رہے ہیں جو آپؐ نے مردوں سے نہیں لیا ہے، بہر حال ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "اور چوری نہیں کرو گی۔" ہند نے پھر کہا: "میں نے ابوسفیان کے مال سے اکثر تھوڑا تھوڑا لیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کرنا میرے لیے حلال تھا یا حرام؟" ابوسفیان نے، جو وہاں موجود تھے اور اس کی بات سن رہے تھے، کہا: "جو کچھ پہلے تم نے لیا ہے وہ حلال ہے۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا "کیا تم عتبہ کی بیٹی ہند ہو؟" اس نے کہا: "ہاں میں ہند بنت عتبہ ہوں۔ جو کچھ پہلے مجھ سے سرزد ہوا ہے اسے معاف کر دیں، اللہ بھی آپ کی خطاؤں سے درگزر کرے گا۔" آپؐ نے مزید فرمایا: "اور زنا نہ کرو گی۔" اس نے کہا: "کیا کوئی آزاد (اور شریف) عورت زنا بھی کر سکتی ہے؟" اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی" یہ سن کر اس نے کہا: "جب تک وہ بچے تھے ہم نے انہیں پالا۔ جب بڑے ہوئے تو بدر کی لڑائی میں آپ نے انہیں قتل کر دیا۔ اب آپ جانیں اور وہ جانیں" اس کی یہ بات سن کر حضرت عمرؓ کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور وہ خوب ہنسے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: "اور کوئی کھلا ہوا بہتان نہ باندھو گی۔" اس پر ہند نے کہا: "اللہ کی قسم بہتان تراشی بڑی معیوب بات ہے اور بعض مواقع پر چشم پوشی زیادہ بہتر ہے۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "اور معروف باتوں میں میری نافرمانی نہ کرو گی"

ان باتوں کا اقرار کرا کے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: "ان عورتوں سے بیعت لے لو..... حضرت عمرؓ نے ان سے بیعت لی۔ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتے تھے۔ آپ نہ کسی عورت کو ہاتھ لگاتے تھے اور نہ کوئی عورت آپ کو ہاتھ لگاتی تھی (سوائے ان عورتوں کے لیے جو آپؐ کے لیے حلال تھیں۔)" ۵۷

بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتی ہیں: "نبی ﷺ عورتوں سے صرف زبانی اقرار لیتے تھے۔" وہ مزید فرماتی ہیں: "رسول اللہ ﷺ کا دستِ مبارک کبھی کسی عورت سے مس نہیں ہوا، سوائے اس عورت کے جو آپ کی زوجیت یا ملکیت میں تھی۔" مسلمؒ نے بھی حضرت عائشہؓ سے ملتے جلتے الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے ۵۸

ام ہانی بنت ابی طالبؓ نے فتح مکہ کے دن ایک مشرک کو پناہ دے دی تھی، جب کہ حضرت علیؓ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرماتی ہیں: "میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت آپؐ غسل فرما رہے تھے اور آپ کی صاحب زادی فاطمہؓ ایک کپڑے سے اوٹ کیے ہوئے تھیں۔ میں نے سلام کیا۔ آپؐ نے فرمایا: کون ہے؟ میں نے جواب دیا: ام ہانی بنت ابی طالب۔ فرمایا: خوش آمدید۔ جب آپ غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے ایک کپڑا لپیٹ کر آٹھ رکعتیں نماز ادا کی۔ پھر میرے پاس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے بھائی علیؓ کہتے ہیں کہ وہ اس شخص کو قتل کر کے رہیں گے جسے میں نے پناہ دے دی ہے۔ فلاں شخص، ابن ہبیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے ام ہانی جسے تم نے پناہ دے دی اسے ہم نے پناہ دے دی۔" ۵۹

رہے وہ لوگ جن کا خون رسول اللہ ﷺ نے مباح قرار دے دیا تھا ان میں سے بعض لوگ قتل ہوئے اور بعض کو اسلام قبول کرنے کی توفیق ملی۔ قتل ہونے والوں میں حویرث، عبداللہ بن خطل اور مقیس بن حبابہ تھے، جو دو لونڈیاں ہجویہ اشعار گاتی تھیں ان میں سے ایک قتل ہوئی اور دوسری نے اسلام قبول کر لیا۔ عبداللہ بن سعد بن سرح کے بارے میں

---

۵۷ ابن اسحاق، ابن جریر

۵۸ دیکھئے صحیح بخاری ۸/۱۳۵، صحیح مسلم ۶/۲۹

۵۹ بخاری و مسلم

آپؐ نے سفارش قبول کرلی تھی۔ وہ مشرف باسلام ہوئے۔ اسی طرح عکرمہ، ہبار، اور ہند بنت عتبہ نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

ابن ہشام نے روایت کیا ہے کہ فضالہ بن عمیر لیثی •ٹ نے منصوبہ بنایا کہ جب نبی ﷺ خانۂ کعبہ کا طواف کررہے ہوں تب وہ آپ کو قتل کردے۔ اس ارادے سے وہ آپؐ سے قریب ہوا تو آپؐ نے اسے مخاطب کرکے فرمایا: کیا فضالہ ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں میں فضالہ ہوں اے اللہ کے رسول! آپؐ نے فرمایا: تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے؟ اس نے کہا: کچھ نہیں۔ اللہ کو یاد کررہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر ہنس پڑے، پھر فرمایا: "اللہ سے معافی چاہو۔" پھر اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر رکھا۔ اس کا دل اسی وقت پرسکون ہوگیا۔ فضالہ بیان کرتے تھے: اللہ کی قسم! جوں ہی آپ نے میرے سینے سے ہاتھ ہٹایا، آپ کی ذاتِ گرامی مجھے اتنی محبوب ہوگئی کہ اللہ کی تمام مخلوق میں میرے لیے اس سے زیادہ محبوب اور کوئی نہ تھا۔"

فضالہ اپنے گھر واپس ہوئے تو راستے میں ایک عورت ملی جس کی طرف وہ پہلے میلان رکھتے تھے اور اس کے ساتھ دل لگی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس نے کہا: آؤ باتیں کریں۔ انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار درج ذیل اشعار کی صورت میں کیا:

قالت هلمّ الى الحديث فقلت لا   يابى عليّ الله والاسلام
لوما رايت محمداً وقبيله   بالفتح يوم تكسّر الاصنام
لرايت دين الله اضحى بيّنا   والشرك يغشى وجهه الاظلام

اس نے کہا آؤ باتیں کریں۔ میں نے جواب دیا: نہیں، اس سے اللہ اور اسلام دونوں منع کرتے ہیں۔ اگر تو فتح مکہ کے موقع پر محمد اور ان کے ساتھیوں کو دیکھ لیتی، جب کہ بتوں کو پاش پاش کیا جارہا تھا تو تجھے معلوم ہوجاتا کہ اللہ کا دین بالکل نکھر کر سامنے آگیا ہے اور شرک کے چہرے پر تاریکی چھاگئی ہے۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ مکہ میں انیس دن ٹھہرے رہے۔ اس عرصے میں آپ قصر کرتے رہے، یعنی چار رکعتوں والی فرض نمازوں کے بجائے دو رکعتیں پڑھتے رہے۔

•ٹ اس واقعہ کو ابن ہشام نے اپنی "سیرت" میں اور ابن قیم نے زادالمعاد میں بیان کیا ہے۔

دروس ونصائح

ا۔ فتح مکہ میں پوشیدہ اسرار اور الٰہی حکمتیں:

اللہ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ اور آپ کے اصحاب کو جس عظیم فتح سے مشرف فرمایا تھا اس کے واقعات گزشتہ سطور میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات کو جاننے کے بعد اب آپ دعوت کے گزشتہ مرحلے اور اس کے واقعات کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور ان کے اسرار اور الٰہی حکمتیں آپ کی نگاہوں کے سامنے مجسم شکل میں آجائیں گی۔

فتح مکہ کے واقعے سے آگاہی کے بعد اب آپ اس سے قبل مکہ سے ہجرت کی اہمیت کا ادراک کرسکتے ہیں۔ آپ جان سکتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں زمین، وطن، مال، اہل و عیال اور رشتہ داروں کی قربانی کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اگر اسلام باقی رہے تو ان سب میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی، لیکن اگر اسلام باقی نہ رہ سکے تو یہ تمام چیزیں انسان کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔

اس فتح عظیم کے واقعات میں غور کرنے کے بعد آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس سے قبل ہونے والے جہاد، شہادت اور آزمائشوں کی کیا قدر و قیمت تھی؟ ان میں سے کوئی چیز ضائع نہیں گئی۔ کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بھی رائیگاں نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے غزوات اور اسفار میں جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کا سبب یہ نہیں تھا کہ اس وقت آویزشوں کی ہوا چلی ہوئی تھی بلکہ یہ سب کچھ اندازے کے مطابق ہوا۔ ان سب چیزوں کے ذریعے قسطوں میں فتح ونصرت کی قیمت ادا کی گئی۔ بندوں کے بارے میں یہی اللہ کی سنت ہے۔ بغیر صحیح اسلام کے اللہ کی مدد نہیں آتی۔ اور وہ اسلام معتبر نہیں جس میں اللہ کی بندگی نہ ہو اور وہ بندگی ناقابل اعتبار ہے جس میں انفاق، قربانی، تضرع اور اللہ کی راہ میں جہاد نہ ہو۔

اس فتح کی تفصیل جاننے کے بعد اب آپ بخوبی ادراک کرسکتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کی کتنی زیادہ اہمیت تھی اور اس کے ظاہر، جس نے حضرت عمرؓ اور دیگر بہت سے صحابہ کو حیرت زدہ کردیا تھا، اس کے پس پردہ کتنا دل آویز الٰہی راز پنہاں تھا؟ آپ پورے اطمینان اور وثوق کے ساتھ جان سکتے ہیں کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح قرار دیا تھا۔ ارشاد ہے: فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ

ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا۔ الفتح: ۲۷ (اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تم کو عطا فرمادی)۔

اگر آپ کو اس چیز کا ادراک ہو جائے گا تو آپ نبوت کے مزید ان حقائق سے بھی آگاہ ہو جائیں گے جو نبی ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں نمایاں تھے۔

کیا آپ کو وہ دن یاد ہے جب نبی ﷺ اپنے وطن مکہ سے نکلے تھے اور وادیوں اور گھاٹیوں میں چھپتے چھپاتے یثرب پہنچے تھے۔ آپ کے اصحاب بھی جن کی تعداد زیادہ نہ تھی اور جو کمزور تھے، چپکے سے ہجرت کر گئے تھے اور بیشتر آپ سے پہلے یثرب پہنچ گئے تھے اور کچھ آپ کے بعد آپ سے جا ملے تھے۔ انہوں نے اپنے مال، اہل و عیال، اور زمین اس لیے چھوڑ دی تھی تاکہ ان کا دین محفوظ رہے۔

یہ لوگ اب اپنے وطن، اہل و عیال اور مال و جائیداد کے پاس اس حال میں لوٹے تھے کہ ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، انہیں طاقت و قوت حاصل ہو گئی تھی اور جن لوگوں نے کل انہیں نکالا تھا انہوں نے خضوع، درماندگی اور عاجزی کے ساتھ ان کا استقبال کیا تھا۔

اہل مکہ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ حضرت بلال حبشیؓ جنھیں اکثر مشرکین کے ہاتھوں مکہ کی چلچلاتی ہوئی زمین پر گھسیٹا جاتا تھا اور تکلیفیں دی جاتی تھیں، خانۂ کعبہ پر چڑھے اور بلند آواز سے پکارنے لگے:

اللہ اکبر... اللہ اکبر

وہ نحیف آواز جو کبھی عذاب کے کوڑے کھا کر احد، احد، احد پکارتی تھی آج کعبۃ اللہ کے اوپر چڑھ کر اعلان کر رہی تھی: **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** اور تمام لوگ خشوع و خضوع اور خاموشی کے ساتھ اسے سن رہے تھے۔

جان لو کہ حقیقت صرف ایک ہے اور وہ اسلام ہے۔ وہ انسان کتنا احمق اور نادان ہے جو اسلام کے علاوہ کسی دوسری راہ میں جدوجہد اور معرکہ آرائی کرتا ہے۔ فی الواقع وہ سراب کے پیچھے بھاگتا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔

اس فتح عظیم کے واقعات سے بہت سی دلالتیں اور احکام مستنبط ہوتے ہیں جن سے واقفیت ضروری ہے۔ واقعات کی ترتیب سے ہم سطور ذیل میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

۲۔ معاہدہ اور اس کی خلاف ورزی سے متعلق احکام:

(الف) اگر اہلِ مصالحت مسلمانوں سے جنگ کریں تو وہ حربی ہو جاتے ہیں:

فتح مکہ کے سبب سے واضح ہوتا ہے کہ جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدہ اور مصالحت ہو وہ اگر ان لوگوں سے جنگ کریں جو مسلمانوں کی پناہ اور جوار میں ہوں تو وہ مسلمانوں کے لیے حربی ہو جاتے ہیں اور ان کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدہ باقی نہیں رہتا۔ اس پر تمام مسلمان علماء کا اتفاق ہے۔

(ب) دشمن پر اچانک حملہ کرنا جائز ہے:

رسول اللہ ﷺ نے مکہ پہنچنے کے بعد جو تدبیر اختیار کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر دشمن بدعہدی کرے اور صلح پر قائم نہ رہے تو مسلمانوں کے امام اور سربراہ کے لیے جائز ہے کہ اس پر اچانک حملہ کر دے۔ اس کے لیے آگاہ کر کے جنگ کا آغاز کرنا ضروری نہیں۔ آپ نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے جب مکہ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی: "اے اللہ قریش کی بینائیاں سلب کر لے، انہیں اس وقت خبر ہو جب ہم ان کے سر پر پہنچ جائیں" اس پر بھی تمام علماء کا اتفاق ہے۔

لیکن اگر بدعہدی کا اظہار نہ ہوا ہو صرف واضح علامتوں اور قوی دلائل سے اس کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں امام کے لیے جائز نہیں کہ ان سے کیے گئے معاہدہ کو ختم کر کے ان سے اچانک جنگ چھیڑ دے۔ بلکہ ضروری ہے کہ پہلے انہیں خبردار کر دے کہ ہمارا تمہارا اب کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا، کیونکہ تم عہد کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ

(الانفال: ۵۸)

اور اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدہ کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا۔

معاہدہ کو آگے پھینک دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے بتا دیا جائے کہ اب تم سے ہمارا معاہدہ باقی نہیں رہا۔

(ج) کسی قوم کے بعض افراد کی بدعہدی پوری قوم کی بدعہدی ہے:

آں حضرت ﷺ کا عمل اس بات پر بھی دلیل ہے کہ اگر کسی قوم کے بعض افراد بدعہدی کریں اور بقیہ لوگ واقعی اس کی مذمت نہ کریں اور ان کی طرف سے اس سے نفرت اور ناپسندیدگی کا اظہار نہ ہو تو اسے پوری قوم کی بدعہدی سمجھی جائے گی۔ قریش کے بعض لوگوں نے مسلمانوں کے حلیفوں پر شب خوں مارا۔ اس حرکت پر قریش کے عام افراد خاموش رہے اور انہوں نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسے نبی ﷺ نے اس بات کی دلیل قرار دیا کہ سب لوگ بدعہدی میں شریک ہوگئے ہیں۔ اس لیے کہ جب سربر آوردہ لوگوں اور نمائندوں کے صلح لینے سے قریش کے تمام لوگ اس میں شریک ہوگئے تھے تو جب ان کے سرداروں، لیڈروں اور نمائندوں نے اس معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کی تو عوام بھی اس خلاف ورزی کے مرتکب قرار پائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ کے تمام جنگ جوؤں کو قتل کرادیا تھا، بغیر اس کے کہ وہ ہر ایک سے دریافت کرتے کہ کیا اس نے معاہدہ کو توڑا ہے یا نہیں؟ اسی طرح آپؐ نے بنو نضیر کی بدعہدی کی بنا پر پورے قبیلے کو جلاوطن کر دیا تھا، حالانکہ بدعہدی ان کے صرف چند افراد نے کی تھی۔

۳۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے واقعہ سے مستنبط ہونے والے امور:

(الف) آں حضرت ﷺ کی نبوت کا ایک نیا مظہر:

ہمارے سامنے آں حضرت ﷺ کی نبوت کا ایک دوسرا نیا مظہر آشکار ہوتا ہے اور یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ وحی کے ذریعے آپؐ تائید الٰہی سے سرفراز ہوتے تھے۔ آپ نے اپنے بعض اصحاب سے فرمایا: "جاؤ۔ جب تم روضۃ الخاخ پہنچو گے تو وہاں تم کو ایک عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہوگا۔ اس خط کو اس سے لے کر آؤ" اس عورت کے پاس ایک خط ہے اور اس کے سلسلے میں اس کے اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ کے درمیان رازدارانہ بات ہوئی ہے، اس کی اطلاع آں حضرت ﷺ کو کس طرح ہوئی؟ وحی کے ذریعے۔ یہ نبوت کا ایک

مظہر ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اپنی تائید سے بہرہ ور کیا تھا، تاکہ فتح عظیم کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے جس کا اس نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا۔

(ب) کیا جرم ثابت ہونے سے قبل ملزم کو ٹارچر کیا جاسکتا ہے؟

کیا ملزم سے جرم کا اعتراف کرانے کے لیے اسے مختلف طریقوں سے ٹارچر کیا جاسکتا ہے؟ حضرت علیؓ نے اس عورت کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا "خط نکالو ورنہ ہم تمہاری جامہ تلاشی لیں گے۔" اس سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ امام یا اس کے نائب کے لیے وہ تدابیر اختیار کرنی جائز ہے جنہیں وہ جرم کا پتا لگانے اور اس کا انکشاف کرنے کے لیے مناسب خیال کرتا ہو۔ اسی طرح انہوں نے اس پر اس واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے کہ یہود نے غزوۂ خیبر کے موقع پر حیی بن اخطب کا کچھ مال چھپادیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے چچا سے دریافت کیا: "حیی کا وہ چرمی تھیلا کیا ہوا جسے وہ بنو نضیر کے پاس سے لایا تھا؟" اس نے جواب دیا: جنگوں اور دیگر اخراجات میں کام آگیا۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ابھی تو اسے لائے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اور وہ مال تو بہت تھا" رسول اللہ ﷺ نے اسے حضرت زبیرؓ کے حوالے کردیا۔ انہوں نے اسے ٹارچر کیا تو اس نے بتایا کہ "میں نے حیی کو فلاں ویران جگہ ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا" (ہوسکتا ہے اس نے وہ مال وہیں چھپایا ہو)۔ صحابہ نے وہاں جاکر تلاش کیا تو وہ مال مل گیا۔

آج کے بعض محققین اس قسم کی رائے کو امام مالکؒ کی جانب منسوب کرتے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے اور اس پر ائمہ اربعہ اور تمام محققین اور علماء کا اتفاق ہے کہ جب تک جرم کسی معقول شرعی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے، کسی ملزم سے جرم کا اقرار کرانے کے لیے اسے ٹارچر کرنا جائز نہیں۔ ملزم بے گناہ ہے جب تک کہ اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے مسافر عورت کو، جسے حضرت حاطبؓ نے اپنے خط کے ساتھ مکہ بھیجا تھا، جو دھمکی دی تھی اس سے یہ چیز ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے دو اسباب ہیں:

اول یہ کہ اس عورت پر کسی چیز کا محض الزام نہیں لگایا گیا تھا، بلکہ وہ ثابت شدہ حقیقت تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ دنیا کے سب سے سچے انسان حضرت محمد ﷺ نے اس کی خبر دی تھی۔ اس خبر کی دلالت اعتراف واقرار کے ثبوت سے زیادہ قوی تھی۔ پھر اس پر اس شخص کے معاملے کو کیوں کر قیاس کیا جاسکتا ہے جس پر بعض غیر معصوم انسانوں کی جانب سے محض

شکوک و شبہات کی بنا پر الزامات لگائے گئے ہوں۔ جو کچھ اس عورت کے معاملے میں کہا گیا ہے وہی حیی بن اخطب کے چچا کے بارے میں بھی کہا جائے گا۔

دوم یہ کہ جامہ تلاشی کو ٹارچر یا قید کے مثل نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دونوں کے درمیان بڑا واضح فرق ہے۔ جب یہ بات طے شدہ تھی کہ اس کے پاس ایک خط ہے جسے پانا اس کی جامہ تلاشی کے بغیر ممکن نہیں تو یقیناً جامہ تلاشی نہ صرف جائز، بلکہ رسول اللہ ﷺ کے حکم کے بنا پر واجب تھی۔ رہی یہ بات کہ پھر حضرت زبیرؓ نے حیی بن اخطب کے چچا کو کیوں ٹارچر کیا؟ تو اولاً اس کی بنیاد الزام پر نہیں بلکہ حقیقت پر تھی۔ ثانیاً اس کا تعلق جہاد اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جنگ سے تھا، مسلمانوں کے باہمی معاملات کو اس پر کیونکر قیاس کیا جاسکتا ہے؟!

رہا یہ دعویٰ کہ یہ امام مالکؒ کا مسلک ہے تو یہ غلط اور ان کے معروف مسلک کے برخلاف ہے۔ مدونہ جسے سحنونؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا ہے، اس میں ہے:

"میں نے عرض کیا: اگر کوئی شخص دھمکی یا قید یا وعید یا پٹائی یا جیل میں ڈالے جانے کے بعد کسی موجب حد جرم کا اقرار کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی یا نہیں؟ امام مالکؒ نے فرمایا: اگر کوئی شخص دھمکی کے بعد اقرار کرے تو اس سے درگزر کیا جائے گا (حد جاری نہیں کی جائے گی۔) وعید، قید، پٹائی، جیل میں ڈالنا یہ سب میرے نزدیک دھمکی کے ذیل میں آتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اس صورت میں حد نہیں جاری ہوگی۔ میں نے عرض کیا: اگر پٹائی اور دھمکی کے بعد وہ نہ صرف اقرار کرلے بلکہ مقتول کی لاش کا پتا بتادے یا چوری کیا ہوا سامان لاکر دے دے تو کیا اس صورت میں اس پر حد جاری ہوگی؟ امام مالکؒ نے جواب دیا: "اس صورت میں بھی اس پر حد نہیں جاری ہوگی۔ الا یہ کہ بغیر کسی خوف کے وہ اس کا اقرار کرلے۔" اک

(ج) اللہ کے دشمنوں کو دوست بنانا جائز نہیں:

رسول اللہ ﷺ کی، حضرت حاطبؓ سے ہونے والی گفتگو اور اس موقع پر نازل ہونے والی قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان خواہ کیسے ہی حالات سے دوچار ہوں ان کے لیے

اک المدونہ ۱۶/ ۹۳

جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو اپنا دوست بنائیں۔ ان کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھائیں یا ان کی جانب اخوت و تعاون کا ہاتھ دراز کریں۔ یہ حکم دیا گیا باوجود اس کے کہ حضرت حاطبؓ نے یہ عذر پیش کیا تھا کہ وہ قریش کے صرف حلیف ہیں، ان سے ان کا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے جس کی بنا پر انہیں حمایت اور پشت پناہی ملنے کی امید ہو، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان پر کوئی ایسا احسان کردیں جس سے ان کے اہل خانہ کو پشت پناہی مل سکے جب کہ دوسرے مہاجرین کو قریش سے قرابت داریاں اور خاندانی تعلقات تھے، اس بنا پر ان کے اہل خاندان کو تحفظ حاصل تھا۔

اس موقع پر نازل ہونے والی آیات میں مسلمانوں کو صراحت سے حکم دیا گیا کہ وہ ولایت کا تعلق صرف اللہ تعالیٰ سے رکھیں۔ اور لوگوں کے ساتھ خواہ کوئی بھی ہوں، اپنے تعلقات کو اس بنیاد پر استوار کریں جس کا اس دین حنیف سے ان کی وابستگی اور اس سے اخلاص تقاضا کرتا ہو۔ ورنہ کیوں کر تصور کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان، مال اور خواہشات کی قربانی پیش کریں گے ؟!!

اس زمانے میں یہ ان بہت سے لوگوں کا مسئلہ ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ وہ نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد جاتے ہیں، بہت سے اذکار و اوراد میں مصروف رہتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں گھومتی رہتی ہیں، لیکن لوگوں سے ان کے روابط اہل و عیال اور خاندان سے تعلق یا مال و دولت اور دنیا کے مفاد یا ذاتی اغراض اور خواہشات کے محرک کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ اور انہیں اس بات سے کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا کہ انہوں نے باطل کے بدلے حق کا سودا کرلیا ہے یا حقیر دنیوی آرزوؤں پر اللہ کے دین کا غلاف چڑھا دیا ہے!

یہی وہ منافقین ہیں جن کی وجہ سے مسلمان پس ماندگی، انتشار اور ضعف کا شکار ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر مرتبہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رچی جانے والی مختلف سازشوں میں پیش پیش رہتے ہیں۔

۴۔ ابوسفیان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا رویہ:

فتح مکہ کے موقع پر ایک عجیب و غریب واقعہ یہ پیش آیا کہ قریش کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم سے جنگ سے باز رکھنے والوں اور اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہونے والوں میں ابوسفیان سر فہرست تھے، حالانکہ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے جنگ کے لیے مکہ سے جتنے لشکر نکلے تھے سب انہی کی سربراہی اور نگرانی میں اور انہی کے اکسانے سے نکلے تھے!...

شاید حکمتِ الٰہی کا منشا یہ تھا کہ مکہ بغیر کسی قابل ذکر قتال کے فتح ہو اور وہاں کے باشندے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کو جلا وطن کیا تھا، تکلیفیں پہنچائی تھیں اور جنگ کی تھی، مسلمانوں کی جد وجہد اور معرکہ آرائی کے بغیر آپؐ کی اطاعت قبول کرلیں۔ اس لیے مرالظہران کے پاس رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوتے ہی ابوسفیان کے قبول اسلام کے اسباب فراہم ہو گئے تاکہ وہ مکہ میں اپنی قوم کے پاس واپس ہوں، ان کے ذہنوں سے جنگ وقتال کا خیال نکال پھینکیں اور مکہ کی فضا کو امن و آشتی کے لیے ہموار کردیں جس کے نتیجے میں جاہلیت اور شرک کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے اور توحید اور اسلام کا آفتاب ضوفشاں ہو۔

اس چیز کی تمہید کا ایک مظہر یہ تھا کہ ابوسفیان نے جب اسلام قبول کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان کرادیا کہ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اس کے لیے امان ہے۔ اس اعلان کے ذریعے ان کی تالیفِ قلب اور رسوخِ اسلام بھی مقصود تھا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام نام ہے دین کے اعتقادی اور عملی ارکان کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے کا۔ اس کے بعد ضروری ہے کہ مسلمان کے دل میں ایمان راسخ ہو۔ اور یہ چیز اسلام کے مبادی اور ارکان پر سختی کے ساتھ پیرا ہونے اور مداومت کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مداومت اور تسلسل کا اہم محرک یہ ہے کہ دوسرے مسلمان مختلف جائز وسائل وذرائع سے اس کی تالیفِ قلب کرتے رہیں، یہاں تک کہ اس کے دل میں ایمان کی جڑیں راسخ ہو جائیں اور اس کا اسلام اتنا طاقت ور اور ٹھوس ہو جائے کہ بگولے اسے متزلزل نہ کرسکیں۔

جب بعض انصاری صحابہ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا: "جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے تو اس کے لیے امان ہے" تو اس وقت ان کے ذہنوں سے یہ حکمت اوجھل ہو گئی تھی اور انہوں نے یہ گمان کرلیا تھا کہ آپؐ کو اپنے وطن اور اپنی قوم کی جانب میلان اور جذباتی تعلق کا احساس ہونے لگا ہے، اسی لیے آپؐ نے یہ بات کہی ہے اور امن پسندی اور عفو ودرگزر کا مظاہرہ کیا ہے۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے جب یہ اعلان کیا تو بعض انصار نے آپس میں کہا: "ایسا لگتا ہے کہ حضور اپنے وطن کی طرف مائل ہو گئے ہیں اور آپ کے دل میں اپنے رشتہ داروں اور اہل خاندان کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی ہے" اس کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے ہو گئی۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں: "جب وحی نازل ہوتی تھی تو ہمیں اس کی خبر ہو جاتی تھی اور نزول وحی کے وقت ہم میں سے کوئی رسول اللہ ﷺ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ کرپاتا تھا" وحی آجانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے انصار کو مخاطب کیا: "اے گروہ انصار!" انہوں نے جواب دیا: "لبیک یا رسول اللہ۔" آپ نے فرمایا: "تم لوگوں نے میرے بارے میں یہ بات کہی ہے کہ میرے دل میں اپنے وطن کی طرف میلان پیدا ہو گیا ہے" انہوں نے عرض کیا: "ہاں ہم میں سے بعض لوگوں نے یہ بات کہی ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "ہرگز نہیں۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے اللہ کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی ہے۔ اب میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہے" یہ سن کر صحابہ رونے لگے اور کہنے لگے کہ "ہم نے یہ بات محض اس وجہ سے کہی تھی کہ اللہ اور اس کا رسول ہمیں بہت محبوب تھے۔"

ہم نے اوپر اسلام اور ایمان کا جو فرق بیان کیا ہے اس سے وہ اشکال رفع ہو جاتا ہے جو حضرت ابوسفیانؓ کے اسلام کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ ان سے جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا: "کیا اب بھی تم کو یقین نہیں آیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟" تو انہوں نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! جہاں تک اس بات کا تعلق ہے اس کے بارے میں دل میں اب تک کچھ شبہ باقی ہے" حضرت عباسؓ نے فوراً کہا: "بندہ خدا! قبل اس کے کہ تمہاری گردن اڑادی جائے اسلام قبول کرلو اور گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں" یہ سن کر ابوسفیان نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔

اس میں اشکال یہ ہے کہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے اسلام کی کیا قدر وقیمت ہے جو دھمکی کے نتیجے میں ظاہر ہوا ہو۔ اس لیے کہ ایک لمحہ قبل ابوسفیان کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے سلسلے میں ان کے دل میں ابھی کچھ شبہ باقی ہے۔

لیکن یہ اشکال اس وضاحت سے رفع ہو جاتا ہے کہ دنیا میں مطلوب یہ نہیں ہے کہ [illegible]

مشرک یا کافر جب اسلام میں داخل ہونے کا ارادہ کرے تو ٹھیک اسی لمحہ ایمان مکمل طور پر اس کے دل میں راسخ ہو گیا ہو بلکہ اس سے مطلوب صرف یہ ہے کہ اس کا وجود اور اس کی زبان اللہ تعالیٰ کے دین کے آگے سر تسلیم خم کر دے، وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا قائل ہو جائے اور اس کے رسول کی نبوت اور جو کچھ آپؐ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے لے کر آئے ہیں اس کا اعتراف کرلے۔ رہا ایمان تو جوں جوں اسلام سے اس تعلق میں پختگی آئے گی اور اس کی اطاعت وفرماں برداری میں اضافہ ہوگا اسی کے بقدر اس کے دل میں ایمان راسخ ہوتا جائے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا،قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا،وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ. (الحجرات: ۱۴)

یہ بدوی کہتے ہیں کہ "ہم ایمان لائے" ان سے کہو تم ایمان نہیں لائے۔ بلکہ یوں کہو کہ "ہم مطیع ہو گئے" ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

اسی لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اگر دوران جنگ کفار میں سے کوئی شخص اسلام قبول کرلے تو اس کے اسلام کو قتل ہونے کے خوف یا مال غنیمت کی لالچ یا جھوٹے دکھاوے پر محمول کرے، خواہ اس کے کتنے ہی قرائن ہوں۔ اس لیے کہ مطلوب دلوں کے بھید معلوم کرنا نہیں ہے بلکہ مطلوب ظاہر کی اصلاح کرنی ہے۔ اسی لیے جب ایک سریہ میں ایک مشرک نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا مگر ایک صحابی نے یہ گمان کر کے کہ اس نے موت کے خوف سے ایسا کیا ہے، اسے قتل کر دیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ، كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (النساء: ۹۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمہاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمہارے لیے بہت سے اموال

غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو پھر اللہ نے تم پر احسان کیا۔ لہٰذا تحقیق سے کام لو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

دیکھیے اس آیت میں کس طرح اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو یاد دلایا ہے کہ جب وہ اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے تو ان میں سے بہت سے لوگوں کا حال اس شخص سے مختلف نہیں تھا جس کے اسلام پر آج انہیں اطمینان نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا، ان کے اسلام میں پختگی آگئی اور احکام اسلامی پر عمل کرتے کرتے وہ آمیزشوں اور کدورتوں سے پاک ہو گیا۔

ابوسفیان کے اپنے اسلام کا اعلان کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ حکمت عملی اپنائی کہ اپنے چچا حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ انہیں اس گھاٹی میں لے جاکر کھڑا کر دیں جہاں سے اسلامی لشکر گزرنے والا ہے، تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اسلام کو کتنی قوت وشوکت حاصل ہو گئی ہے اور جن لوگوں نے مکہ سے انتہائی بے سروسامانی، کس مپرسی اور کمزوری کی حالت میں ہجرت کی تھی، ان کا اب کیا حال ہو گیا ہے!... تاکہ یہ حیران کن نظارہ ان کے دین کو استحکام بخشنے اور ان کے عقیدہ کو راسخ کرنے کا اولین ذریعہ بن جائے۔

ابوسفیان ان فوجی ٹکڑیوں کو جو یکے بعد دیگرے وہاں سے گزر رہی تھی، دیکھتے رہے اور انہیں دیکھ دیکھ کر ان پر دہشت اور بے خودی طاری ہوتی رہی۔ بالآخر وہ حضرت عباسؓ کی طرف مڑے اور کہنے لگے: "تمہارے بھتیجے کا اقتدار آج صبح کتنا عظیم ہے"

یہ بات ابوسفیان کی زبان سے جاہلی فکر اور اس کے اوہام کے بقایاجات کی تاثیر کے تحت نکلی تھی۔ حضرت عباسؓ نے انہیں غفلت سے بیدار کیا اور فرمایا:

"اے ابوسفیان! یہ نبوت ہے"

یہ کیسا اقتدار ہے جس کی تم بات کر رہے ہو؟ اس نے تو اقتدار، مال اور جاہ کو اپنے قدموں سے روند ڈالا تھا جب تم لوگوں نے مکہ میں یہ چیزیں اس کے سامنے پیش کی تھیں اور وہ تمھاری جانب سے دی جانے والی تکلیفوں اور اذیتوں کو برداشت کر رہا تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنے وطن سے ہجرت کر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیا اس کا سبب اس کے علاوہ کچھ اور تھا کہ اس نے اس نبوت کے بدلے، جس پر ایمان لانے کی وہ تم لوگوں کو دعوت دے رہا تھا، اس اقتدار کو

قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کی تم نے اس کے سامنے پیش کش کی تھی،

"یہ نبوت ہے!"

یہ کلمہ جو حکمت الٰہی سے حضرت عباسؓ کی زبان پر آ گیا تھا، قیامت تک کے لیے ہر اس شخص کا جواب ہے جو اس وہم میں مبتلا ہے یا دوسروں کو مبتلا کرنا چاہتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت اقتدار یا لیڈری چاہنے یا قومیت یا عصبیت کے احیاء کے لیے تھی۔ یہ کلمہ رسول اللہ ﷺ کی پوری حیات طیبہ کا ایک جامع عنوان ہے۔ اس لیے کہ آپ کی عمر کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک مرحلہ اس حقیقت پر دلیل ناطق ہے کہ آپ کا مقصد زمین پر اپنا اقتدار جمانا نہیں تھا بلکہ آپ کی بعثت انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے ہوئی تھی۔

۵۔ مکہ میں آں حضرت ﷺ کے داخلے کی کیفیت:

(الف) مکہ میں داخلے کے وقت آں حضرت ﷺ سجدۂ شکر کی حالت میں تھے:

اوپر ہم نے حضرت عبداللہ بن مغفلؓ کی روایت ذکر کی ہے جس کی تخریج امام بخاری نے کی ہے کہ آں حضرت ﷺ جب مکہ کے قریب پہنچے اس وقت آپ سورۂ فتح کی تلاوت گنگنا کر کر رہے تھے۔ روایت میں "ترجیع" کا لفظ ہے۔ اس سے مراد قراءت کی وہ مخصوص کیفیت ہے جس میں قاری بترنم سے پڑھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں داخلے کے وقت آں حضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شہود و مناجات کی حالت میں تھے۔ اس وقت آپ کے دل پر عظیم فتح اور کامرانی کا نشہ نہیں چڑھا ہوا تھا اور نہ آپ کے احساسات پر گھمنڈ اور غرور طاری ہو گیا تھا، بلکہ آپؐ نے بارگاہ الٰہی میں مکمل خود سپردگی اختیار کر رکھی تھی اور اس کی تائید و نصرت پر آپؐ آداب شکر بجالا رہے تھے۔

اس منظر کی مزید وضاحت ابن اسحاق کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ آں حضرت ﷺ جب مقام ذی طویٰ پہنچے تو فتح کے اعزاز سے سرشار ہو کر تواضع میں آپ کا سر جھکا جاتا تھا، یہاں تک آپ کی ریش مبارک کجاوے کے درمیانی ابھار کو چھونے لگی تھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت آں حضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی کی حالت

میں مستغرق تھے، کیونکہ اپنے رب کے احکام کی تعمیل کے ثمرات آپ کے سامنے تھے۔ اپنی قوم سے آپ کو جو تکلیفیں پہنچی تھیں ان کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جس شہر کے لوگوں نے آپ کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا اسی شہر میں اللہ تعالیٰ آپ کو پوری شان و شوکت اور اعزاز کے ساتھ واپس لا رہا تھا۔ یہ وقت صرف اللہ تعالیٰ کے شکر بجالانے کا تھا اور اس میں اس کی مکمل بندگی ہی زیبا تھی۔

ضروری ہے کہ مسلمانوں کا ہمیشہ یہی حال ہو۔ خوشی کا موقع ہو یا تکلیف اور پریشانی کا، فراخی ہو یا تنگی، وہ کمزوری کی حالت میں ہوں یا طاقت ور ہوں، ہمیشہ اللہ کی مطلق بندگی بجالائیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ ہرگز زیب نہیں دیتا کہ جب وہ کسی مصیبت کا شکار ہوں یا پریشانی میں مبتلا ہوں تب تو اللہ کے سامنے عاجزی و فروتنی کا مظاہرہ کریں لیکن جوں ہی ان کی پریشانی دور ہو اور تکلیف زائل ہو جائے وہ خوشی سے سرشار ہو جائیں بلکہ اس میں مدہوش ہو کر ہر چیز سے غافل ہو جائیں اور اللہ کے احکام و فرامین سے اس طرح گزر جائیں کہ ان کا احساس بھی نہ ہو، اور ایسا معلوم ہو کہ اپنی پریشانی کے دنوں میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی نہیں دکھائی تھی اور فریاد نہیں کی تھی۔

(ب) قرآن کی تلاوت ترنم اور لَے کے ساتھ جائز ھے:

بخاری کی اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی قراءت ترنم اور لے کے ساتھ جائز ہے۔ اسی کو حضرت عبداللہ بن مغفلؓ نے "ترجیع" سے تعبیر کیا ہے۔ یہی صحیح رائے ہے اور یہی تمام شوافع اور احناف اور بیشتر مالکیہ اور دیگر علماء کا مسلک ہے۔

بہت سے صحابہ اور تابعین سے ایسی روایات مروی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی تلاوت گانے کے انداز پر ممنوع ہے۔ ان ائمہ نے اس ممانعت کو اس انداز قراءت پر محمول کیا ہے جس میں الفاظ کی ادائیگی صحیح طریقے پر نہیں ہوتی اور حروف اور کلمات صحیح عربی مخارج کے ساتھ ادا نہیں ہوتے۔ اس انداز سے تلاوتِ قرآن بالاتفاق ناجائز ہے۔

(ج) مکہ میں مختلف راستوں سے داخلے کا حکم دینے کی حکمت:

رسول اللہ ﷺ نے ایک حکیمانہ تدبیر یہ اختیار فرمائی کہ صحابہ کو حکم دیا کہ وہ مکہ میں مختلف راستوں سے داخل ہوں۔ سب لوگ کسی ایک راستے سے داخل نہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ

تھا کہ اہل مکہ کی جانب سے مزاحمت اور جنگ کی نوبت نہ آئے۔ کیونکہ اس صورت میں اگر وہ جنگ کرنا چاہتے تو مجبوراً انہیں اپنی جماعتوں کو تقسیم کرنا پڑتا اور جنگ جوؤں کو مکہ کی مختلف سمتوں میں بھیجنا پڑتا۔ اس طرح مزاحمت کے اسباب کمزور پڑ جاتے اور وہ اس پر آمادہ نہ ہوتے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسا اس لیے کیا تا کہ جہاں تک ممکن ہو خون نہ بہے اور محترم شہر مکہ میں امن اور سلامتی قائم رہے۔ اسی لیے آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ صرف ان لوگوں سے جنگ کریں جو ان سے جنگ کریں اور آپ نے اعلان فرمادیا کہ جو اپنے گھر سے باہر نہ نکلے اور اپنا دروازہ بند رکھے اس کے لیے امان ہے۔

۶۔ حرمِ مکی کے مخصوص احکام:

(الف) قتال کی حرمت:

اوپر گزرا کہ نبی ﷺ نے صحابہ کو حرم مکی میں کسی سے جنگ کرنے سے منع کر دیا تھا، سوائے ان لوگوں کے جو مسلمانوں سے جنگ کا آغاز کریں (اس حکم سے آپؐ نے چھ افراد کو مستثنیٰ کر دیا تھا۔ ان کے بارے میں آپ نے حکم دیا تھا کہ وہ جہاں بھی پائے جائیں قتل کر دیے جائیں)

اوپر یہ بھی گزرا کہ آں حضرت ﷺ نے ایک موقعے پر دور سے تلواروں کی چمک دیکھی تو روئے انور پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے۔ آپ کو خبر دی گئی کہ یہ خالد بن ولیدؓ ہیں۔ ان سے جنگ کی ابتداء مشرکین کی جانب سے ہوئی ہے، اس لیے وہ بھی جنگ پر مجبور ہوئے ہیں، تو آپ نے فرمایا: "قضائے الٰہی میں خیر ہے۔" اس کے علاوہ فتح مکہ کے موقعے پر کہیں قتال کی نوبت نہیں آئی۔

گزشتہ سطور میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ فتح مکہ کے موقعے پر آں حضرت ﷺ نے لوگوں کے سامنے جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ بھی فرمایا تھا:

"مکہ کی حرمت انسانوں کی جانب سے نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے ہے۔ کسی شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، جائز نہیں کہ یہاں کسی کا خون بہائے یا کوئی درخت یا پودا اکھاڑے۔ اگر کوئی شخص جواز کے لیے یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ کے رسول نے

یہاں قتال کیا ہے تو اس کا یہ جواب دو کہ اللہ نے اپنے رسول کو اس کی اجازت دی تھی لیکن اس نے تمہیں اجازت نہیں دی ہے۔ اس نے اپنے رسول کو بھی دن کے کچھ حصے میں اس کی اجازت دی تھی۔ اس کی حرمت اب پھر اسی طرح قائم ہو گئی ہے جس طرح کل تھی۔"

اس سے تمام علماء نے یہ استنباط کیا ہے کہ مکہ اور اس سے متصل حرم میں قتال جائز نہیں ہے۔ فتح مکہ کے دن نبی ﷺ نے اپنے خطبے میں اس سے صریح طور پر منع کیا ہے۔

لیکن اس ممانعت کی تطبیق کیسے ہو؟ اور اس کے اور ان نصوص کے درمیان کیسے موافقت پیدا کی جائے جن میں مشرکین اور باغیوں سے قتال کرنے اور قاتل کو قصاصاً قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ اس میں علماء کے درمیان کچھ تفصیل ہے۔

وہ فرماتے ہیں: "جہاں تک مشرکین اور ملحدین کا تعلق ہے ان سے قتال کے سلسلے میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات شرعاً ثابت ہے کہ جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کا ماننے والا ہے اس کو مکہ میں رہائش اختیار کرنے کا موقع دینا جائز نہیں ہے۔ اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، بلکہ شوافع اور بہت سے مجتہدین کی رائے ہے کہ ان کا مکہ میں داخلہ بھی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

(التوبہ: ۲۸)

مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔

جو لوگ مکہ میں ہوں ان کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کے وہاں پہنچنے اور اس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان سے قتال کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حرم کی حفاظت کا اور کسی کافر یا مشرک کی گندگی سے اسے پاک رکھنے کا ذمہ لیا ہے۔ یہ اس دین کے اعجاز کا ایک مظہر ہے اور اس سچے وعدے سے نمایاں ہے جو اللہ کی کتاب میں مذکور ہے اور جس کی اس کے رسول نے خبر دی ہے۔

رہے باغی — یعنی وہ لوگ جو صالح امام کے خلاف علم بغاوت بلند کریں — تو جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ اگر انہیں ان کی بغاوت اور سرکشی سے قتال کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے پھیرنا ممکن نہ ہو تو ان سے قتال کیا جائے گا۔ اس لیے کہ باغیوں سے قتال اللہ تعالیٰ کے ان

حقوق میں سے ہے جن کی پامالی جائز نہیں تو حرم میں اس حق کی حفاظت بدرجہ اولیٰ کی جائے گی۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: ''جمہور کی یہ رائے بالکل درست ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی کتاب اختلاف الحدیث میں اس کی صراحت کی ہے۔''

امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ''احادیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ حرم میں قتال مطلق ممنوع ہے (یہاں تک کہ باغیوں سے بھی) اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ قتال جس کی حرمت ہے اس سے مراد قتال کی وہ صورت ہے جس کے عمومی اثرات ہوں، مثلاً منجنیق وغیرہ سے قتال۔ اگر اس کے بغیر اصلاحِ حال ممکن ہو تو اس کے ذریعے قتال جائز نہیں۔ لیکن اگر کفار کسی دوسرے شہر میں قلعہ بند ہو گئے ہوں تو اس وقت ان سے ہر طریقے سے اور ہر شکل میں قتال جائز ہے''

لیکن بعض فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ حرم میں باغیوں سے بھی قتال حرام ہے۔ اس کے بجائے انہیں ہر طرف سے گھیرا جائے گا اور ان کا عرصۂ حیات تنگ کیا جائے گا، یہاں تک کہ وہ یا تو حرم سے نکلنے پر مجبور ہو جائیں یا دوبارہ اطاعت قبول کر لیں۔ ۶۲

اور جہاں تک حدود قائم کرنے کا معاملہ ہے تو امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک اس کے جواز کا ہے۔ ان کی دلیل امام بخاریؒ کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''حرم کسی نافرمان، کسی قاتل اور کسی غاصب کو پناہ نہیں دے سکتا۔'' ۶۳

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں — اور یہی امام احمدؒ کا بھی ایک قول ہے — کہ ایسا شخص جب تک حرم میں ہے وہ امان میں ہوگا، لیکن اسے تنگ کیا جائے گا اور وہاں سے نکلنے پر مجبور کیا جائے گا۔ یہاں تک کہ جیسے ہی وہ وہاں سے نکلے گا اسے پکڑ کر اس پر حد جاری کر دی جائے گی۔ ان کی دلیل رسول اللہ ﷺ کے خطبہ فتح مکہ کا عمومی مفہوم ہے۔

علامہ زرکشیؒ نے لکھا ہے: ''حرم مکی کی خصوصیت یہ ہے کہ کفار یا باغی اگر مکہ کے علاوہ

۶۲ دیکھیے شرح مسلم نووی ۹/ ۱۲۴-۱۲۵، الاحکام السلطانیہ، الماوردی ص ۱۶۶۔

۶۳ حدیث میں ''فاراً بخربۃ'' کے الفاظ ہیں۔ النہایہ میں ہے کہ خربۃ کے اصل معنی عیب کے ہیں۔ یہاں مراد ہے وہ شخص جو کوئی ایسی چیز لے کر فرار ہو گیا ہو جسے وہ صرف اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہو، حالانکہ شریعت میں اس کی اجازت نہ ہو۔

کسی اور شہر میں قلعہ بند ہو جائیں تو ان کے خلاف جس طریقے پر اور جس شکل میں بھی مصلحت کا تقاضا ہو، عمومی جنگ برپا کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ حرم مکی میں کہیں قلعہ بند ہو جائیں تو اس طریقے پر ان سے جنگ جائز نہیں۔ ۶۴

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ یہ حرم صرف مسلمانوں کے لیے پناہ گاہ اور جائے امن ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو حدود قائم کرنے اور بغاوت کو فرو کرنے کے علاوہ اور کسی سبب سے وہاں قتال کیوں کر جائز ہو سکتا ہے؟!!

(ب) شکار کی حرمت:

یہ بالاجماع ثابت ہے۔ بخاری اور مسلم کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا اور نہ شکار کو بھگایا جائے گا۔'' تو جب اسے بھگانا جائز نہیں تو اسے جان سے مارنا بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔ اگر کوئی شخص شکار کو پکڑ لے تو اسے چھوڑ دینا لازم ہے۔ اگر وہ اس کے قبضے میں تلف ہو جائے تو محرم شخص کی طرح وہ اس کا ضامن ہوگا۔ اس حکم سے آں حضرت ﷺ نے پانچ قسم کے حیوانات کو مستثنیٰ کیا ہے اور انہیں ''فواسق'' کہا ہے۔ وہ ہیں: کوا، چیل، بچھو، چوہیا اور کاٹنے والا کتا۔ علماء نے ان پر دوسرے موذی جانوروں کو بھی قیاس کیا ہے مثلاً سانپ اور خوں خوار درندے۔

(ج) نباتات کو کاٹنے کی حرمت:

اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے جو گذشتہ حدیث میں گزر چکا ہے ''نہ اس کا کانٹا توڑا جائے گا'' اس سے مراد ان نباتات کو کاٹنے کی حرمت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اگایا ہو، انہیں انسانوں نے نہ لگایا ہو، اور وہ تر و تازہ اور ہری بھری ہوں۔ چنانچہ ان پودوں اور درختوں کا کاٹنا حرام نہیں جنہیں انسانوں نے لگایا ہو۔ اسی طرح اس میں چوپایوں کو ذبح کرنا، گھاس چرانا اور سوکھے درختوں اور پودوں کو کاٹنا حرام نہیں ہے۔ زرکشی نے امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ سے روایت کیا ہے کہ حرم میں چوپایوں کو چرانا ممنوع ہے۔ ۶۵

جمہور نے پانچ فواسق حیوانات (جنہیں آں حضرت ﷺ نے مستثنیٰ قرار دیا تھا) پر قیاس

۶۴ دیکھیے اعلام الساجد فی احکام المساجد، زرکشی ص ۱۶۲ اور طرح التثریب ۵/ ۸۶

۶۵ دیکھیے اعلام الساجد ص ۱۵۷

کرتے ہوئے موذی نباتات کو عام نباتات کے حکم سے مستثنٰی کیا ہے۔ یہ قیاس کے ذریعے نص کی تخصیص کے قبیل سے ہے۔[۲۶]

(د) حالتِ احرام میں داخل ہونے کا وجوب :

جو شخص مکہ یا امام نوویؒ کے بقول حدود حرم میں داخل ہونے کا ارادہ کرے اور وہ ان لوگوں میں سے نہ ہو جنہیں بار بار داخل ہونا پڑتا ہے مثلاً تاجر، لکڑھارے اور وہ لوگ جو اپنے پیشے کی وجہ سے حرم میں مسلسل آمدورفت پر مجبور ہوں، تو اس پر لازم ہے کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھے بغیر داخل نہ ہو۔

علماء کا اختلاف ہے کہ یہ حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے یا استحباب پر۔ ائمہ ثلاثہ (ابو حنیفہؒ، مالکؒ، احمدؒ) کا مشہور مسلک ہے اور یہی احناف کا مفتی بہ قول ہے اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے کہ یہ حکم بطور وجوب ہے، جب کہ جمہور شوافع کا مسلک ہے کہ یہ حکم بر بنائے استحباب ہے۔

سببِ اختلاف یہ ہے کہ نبی ﷺ فتح مکہ کے موقعے پر جب مکہ میں داخل ہوئے تو حالت احرام میں نہیں تھے۔ امام مسلمؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے کہ "آں حضرت ﷺ یوم الفتح میں مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کے سر پر سیاہ عمامہ تھا اور آپ احرام میں نہیں تھے"

جو لوگ کہتے ہیں کہ احرام مستحب ہے انہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے اور جن حضرات نے وجوب کو صحیح قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی ﷺ جب مکہ میں داخل ہوئے تو آپ کو کفار کی جانب سے حملے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے آپ بھی پورے طور پر تیار تھے کہ اگر وہ لوگ جنگ کریں گے تو آپ بھی ان کا جواب دیں گے۔ اور یہ وہ حالت ہے جو وجوب احرام کے عمومی حالات سے مستثنٰی ہے۔

(ح) غیر مسلموں کے قیام کی حرمت :

اس حکم اور اس کی دلیل کی وضاحت ہم حکم اول یعنی قتال کی حرمت کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

---

۲۶ دیکھیے مؤلف کی کتاب ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ ص: ۲۰۰

۷۔ خانہ کعبہ کے پاس آں حضرت ﷺ کے اعمال :

(الف) خانہ کعبہ کے اندر نماز :

امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ خانہ کعبہ میں اس وقت تک داخل نہیں ہوئے جب تک کہ سارے بت نہیں نکال دیے گئے جو اس کے اندر تھے اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں (مجسمے) نہیں نکال دی گئیں جن کے ہاتھ میں پانسے کے تیر تھے۔ خانہ کعبہ میں داخل ہو کر آپ نے اس کے گوشوں میں تکبیریں کہیں، لیکن نماز ادا نہیں کی۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، اسامہؓ، بلالؓ، اور عثمان بن طلحہ الحجبیؓ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے۔ پھر آپؐ نے دروازہ بند کر لیا اور کچھ دیر اندر رہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں۔ جب سب لوگ باہر نکلے تو میں نے بلالؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اندر کیا کیا؟ انہوں نے جواب دیا: آپؐ نے دو عمود اپنے بائیں جانب، ایک عمود دائیں جانب اور تین عمود اپنی پشت پر رکھے (بیت اللہ اس وقت چھ عمود پر تھا) پھر نماز ادا کی" امام بخاریؒ نے بھی حضرت ابن عمرؓ سے یہ روایت تقریباً انہی الفاظ میں نقل کی ہے۔

علماء فرماتے ہیں کہ دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباسؓ — جو بیان کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر نماز نہیں ادا فرمائی تھی — خانہ کعبہ کے اندر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ حافظ ابن حجرؒ کے بقول آں حضرت ﷺ کے نماز ادا نہ کرنے کو کبھی حضرت اسامہؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور کبھی اپنے بھائی فضلؓ کے حوالے سے، جب کہ اس موقع پر فضلؓ بھی ان لوگوں کے ساتھ نہ تھے۔ دوسری جانب حضرت بلالؓ جنہوں نے بیان کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر نماز ادا فرمائی تھی، اس موقع پر آپؐ کے ساتھ تھے۔ اس بنا پر اس روایت کو ترجیح دینی چاہیے جسے حضرت ابن عمرؓ نے حضرت بلالؓ کے واسطے سے بیان کیا ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

پہلا سبب یہ کہ اس میں ایک کام کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اثبات کرنے والی روایت نفی کرنے والی روایت پر مقدم ہوتی ہے۔

دوسرا سبب یہ کہ حضرت بلالؓ کی روایت بلاواسطہ معرفت اور مشاہدہ پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ وہ خود آں حضرت ﷺ کے ساتھ خانہ کعبہ کے اندر موجود تھے، جب کہ حضرت ابن

عباسؓ کی روایت مشاہدہ پر مبنی نہیں ہے۔ وہ کبھی حضرت اسامہؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور کبھی اپنے بھائی فضلؓ کے حوالے سے اور فضل اس موقع پر موجود نہیں تھے۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "حضرت بلالؓ کی روایت کو اختیار کرنے پر اصحاب حدیث کا اجماع ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک کام کا اثبات کیا گیا ہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے اس لیے اسے ترجیح دینی ضروری ہے۔"٦٧

شافعیؒ، ابو حنیفہؒ، احمدؒ اور جمہور علماء کا مسلک ہے کہ کوئی شخص خانۂ کعبہ کے اندر اس کی کسی دیوار کی جانب رخ کر کے نماز پڑھ لے تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی، خواہ وہ نفل ہو یا فرض۔ لیکن امام مالکؒ نے فرق کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خانۂ کعبہ کے اندر نفل نماز پڑھی جاسکتی ہے، فرض اور سنن موکدہ پڑھنا صحیح نہیں"٦٨

(ب) تصویر بنانے، کھینچنے اور رکھنے کا حکم:

اوپر ہم نے امام بخاریؒ کی روایت کردہ جو حدیث نقل کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ آں حضرت ﷺ خانۂ کعبہ کے اندر اس وقت تک داخل نہیں ہوئے جب تک کہ اس کے اندر موجود تمام صورتیں اور بت نکال نہیں دیے گئے۔ ابو داؤد نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے بطحاء میں حضرت عمر بن الخطابؓ کو حکم دیا کہ خانۂ کعبہ کے اندر جاکر وہاں جتنی تصویریں بنی ہوئی دیکھیں، سب کو مٹادیں۔ آپؐ اس وقت تک اس کے اندر تشریف نہیں لے گئے جب تک کہ تمام تصویریں مٹا نہیں دی گئیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب الحج میں حضرت اسامہؓ سے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئے تو وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر دیکھی۔ آپؐ نے پانی منگوایا اور اسے مٹانے لگے۔

ان احادیث سے بحیثیت مجموعی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں کو مٹانے اور درمیان میں کھڑے ہوئے مجسموں کو باہر نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جب آپ اندر تشریف لے گئے تو بعض دیواروں پر ان تصویروں کے بچے کھچے اثرات دیکھے، چنانچہ آپ نے پانی منگوا کر انہیں خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کر دیا۔

---

٦٧ رجوع کیجیے فتح الباری ۳/ ۳۰۴، شرح مسلم نووی ۹/ ۸۲

٦٨ ملاحظہ کیجیے شرح مسلم نووی اور طرح التثریب، حافظ عراقی ۵/ ۱۷۵

اس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام میں تصویر سازی اور تصویروں اور مجسموں کا کیا حکم ہے؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہم امام نوویؒ کا ایک اقتباس نقل کر دیں۔ صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں:

"ہمارے اصحاب اور دیگر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی جاندار کی تصویر بنانا شدید حرام ہے۔ یہ کبائر میں سے ہے، اس لیے کہ اس پر احادیث میں شدید وعید آئی ہے۔ خواہ وہ کسی ایسی چیز سے بنائی گئی ہو جس کا احترام نہیں کیا جاتا یا کسی ایسی چیز سے بنائی گئی ہو جس کا احترام کیا جاتا ہے، ہر حال میں اسے بنانا حرام ہے، اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ خواہ یہ تصویر کپڑے پر بنائی گئی ہو یا فرش پر، درہم و دینار پر بنائی گئی ہو یا سکے پر، برتن پر بنائی گئی ہو یا دیوار پر یا کسی اور چیز پر، ہر حال میں اس کا حکم یکساں ہے۔

رہا کسی درخت یا کجاوہ یا کسی اور غیر جاندار چیز کی تصویر بنانا تو یہ حرام نہیں ہے۔

یہ تو تصویر سازی کا حکم ہے۔ رہا تصویر رکھنے کا مسئلہ تو اگر وہ کسی جاندار کی ہو اور دیوار پر ٹنگی ہوئی ہو، یا پہننے والے کپڑے یا عمامہ یا کسی ایسی چیز میں بنی ہوئی ہو جسے حقیر نہ سمجھا جاتا ہو تو وہ حرام ہے۔ لیکن اگر وہ ایسے فرش میں بنی ہو جسے پیروں سے روندا جاتا ہو یا تکیہ یا گاؤ تکیہ یا کسی ایسی چیز میں بنی ہوئی ہو جسے حقیر سمجھا جاتا ہو تو وہ حرام نہیں ہے۔ لیکن کیا رحمت کے فرشتے ایسے گھروں میں داخل نہیں ہوتے؟ اس میں تفصیل ہے جس کا تذکرہ ہم انشاء اللہ آئندہ کسی مناسب مقام پر کریں گے۔

اس مسئلہ میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تصویر کا سایہ ہے یا نہیں۔ یہ ہمارے اصحاب کے مسلک کا خلاصہ ہے اور تقریباً یہی بات صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے جمہور علماء نے کہی ہے۔ اور یہی ثوریؒ، مالکؒ، ابو حنیفہؒ اور دیگر فقہاء کا مسلک ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ "صرف وہ تصویر رکھنا ممنوع ہے جس کا سایہ ہو۔ جس تصویر کا سایہ نہ ہو اسے رکھنے میں کوئی حرج نہیں" یہ رائے باطل ہے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے جس پردے میں تصویریں دیکھ کر ناگواری کا اظہار فرمایا تھا ٦٩ اس کی تصویروں کا سایہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ احادیث میں مطلق

---

٦٩ امام نووی کا اشارہ اس حدیث کی طرف ہے جسے امام مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے۔ فرماتی ہیں: "رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تصویر سے منع کیا گیا ہے۔

آگے امام نووی فرماتے ہیں:

"فقہاء کا اجماع ہے کہ جس تصویر کا سایہ ہو اسے رکھنا ممنوع ہے اور اسے بگاڑ دینا واجب ہے۔ قاضی فرماتے ہیں: جہاں تک گڑیوں کا معاملہ ہے جن سے چھوٹی بچیاں کھیلتی ہیں تو ان کے سلسلے میں رخصت ہے۔"٭۷

آج لوگ سوال کرتے ہیں کہ "کیمرہ کے ذریعے کھینچی گئی تصویروں کا کیا حکم ہے؟ کیا وہ بھی ان پر پینٹنگس اور تصویروں کے حکم میں ہیں جنہیں ہاتھ کی مہارت سے بنایا جاتا ہے، یا ان کا دوسرا حکم ہے؟

اوپر امام نوویؒ نے تصویر کی جو علت ذکر کی ہے اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ کیمرہ سے لی گئی تصویر کا حکم ہاتھ سے بنائی گئی تصویر جیسا نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں کسی کاریگری یا ہاتھ کی مہارت کا اظہار نہیں ہوتا کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی مشابہت کی کوشش کا اظہار ہو، بلکہ یہ تصویر کیمرہ کا بٹن دباتے ہی اس کے اندر اصل شکل کا سایہ رک جانے سے وجود میں آتی ہے، اور یہ کام چھوٹا بچہ بھی کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں احتیاط ملحوظ رکھتے ہوئے اور حدیث کے مطلق الفاظ کو دیکھتے ہوئے، تصویر کی مختلف قسموں کے درمیان بتکلف فرق نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات ہم تورع اور احتیاط کے طور پر کہہ رہے ہیں۔ رہا اس کے حکم شرعی کی حقیقت میں غور و خوض تو اس کے لیے طویل بحث و تحقیق کی ضرورت ہے۔

یہ بات تصویر سازی سے متعلق ہے۔ رہا تصویر کا رکھنا تو خواہ وہ کیمرہ سے کھینچی گئی ہو یا ہاتھ سے بنائی گئی ہو، بظاہر دونوں کا حکم یکساں ہے۔ واللہ اعلم۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ کا)

میں نے ایسا باریک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آپ نے پردہ لے کر پھاڑ دیا، پھر فرمایا: "قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب پانے والے وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت اختیار کرتے ہیں۔"

٭۷ شرح نووی بر صحیح مسلم ۸۱/۱۴

بہر حال تصویر کی نوعیت تصویر بنانے اور اسے رکھنے کے حکم پر ضرور اثر انداز ہوگی۔ اگر جس چیز کی تصویر بنائی گئی ہے وہ محرمات کے قبیل سے ہے، مثلاً عورتوں کی تصویر یا اس جیسی کوئی دوسری چیز تو یقیناً وہ حرام ہوگی اور اگر کوئی ایسی چیز ہو جس کی تصویر سازی ضرورت یا مصلحت کا تقاضا ہو تو بسا اوقات اس کے سلسلے میں رخصت ہوگی۔ واللہ اعلم

آج بعض لوگ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر سازی اور مجسمہ سازی حرام ہے، حالانکہ یہ دونوں چیزیں عصر حاضر میں تمام متمدن اقوام کے نزدیک عظیم فنی لوازم میں شمار ہوتی ہیں۔

ان لوگوں کے تعجب کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ اسلام آج کی مغربی تہذیب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ بس ان بعض جزئی مظاہر میں وہ اس سے مختلف ہے۔ اس تناقض کی وجہ سے انہیں تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ اسلام اگر فن کے ان مظاہر کو تسلیم نہیں کرتا اور انہیں حرام قرار دیتا ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام کا ایک مستقل بالذات اصول ہے جو اس تہذیب کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جو ہم تک خالص عقلی بحث و تمحیص کے ذریعہ نہیں پہنچی ہے، بلکہ اندھی تقلید کے روزن سے ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ یہ لوگ فن کے نام پر اسلام کے خلاف دلیل قائم کرتے ہیں، حالانکہ اسلام میں فن کا ایک دوسرا مفہوم ہے جو اس مفہوم سے مختلف ہے جسے ہم نے اپنے عقیدے سے غیر متعلق ایک دوسرے فلسفے سے اخذ کیا ہے۔

(ج) بیت اللہ کی کلید برداری:

پیچھے گزرا کہ آں حضرت ﷺ نے بیت اللہ کی کلید عثمان بن طلحہؓ کو لوٹا دی اور فرمایا: لو یہ تم لوگوں ــــ مراد بنو عبدالدار اور بنو شیبہ ــــ کے پاس ہمیشہ رہے گی اور جو شخص اسے تم سے چھیننے کی کوشش کرے گا وہ ظالم ہوگا" اس بنا پر عام علماء کی رائے ہے کہ بیت اللہ کی کلید برداری اور نگہبانی کا منصب اس خاندان سے لے کر کسی اور کے حوالے کر دینا قیامت تک جائز نہیں ہے۔ امام نوویؒ نے قاضی عیاضؒ سے نقل کیا ہے: "یہ منصب انہیں رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمایا ہے، اس لیے یہ ہمیشہ انہیں اور ان کی نسلوں کو حاصل رہے گا۔ نہ ان سے چھین کر کسی اور کو دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی اور کو ان کے ساتھ شریک کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ اس خاندان کا وجود ہو

اور اس کے افراد اس کے اہل ہوں"

نبی ﷺ کی وصیت اور ہدایت کے مطابق یہ منصب آج بھی اسی خاندان میں ہے۔

(د) بت شکنی :

یہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور اپنے رسول کی عظیم تائید کا بڑا دل آویز منظر تھا کہ آپؐ ان جھوٹے معبودوں کو جو خانہ کعبہ کے ارد گرد بکھرے ہوئے تھے، اپنی چھڑی سے گرا رہے تھے اور فرماتے جاتے تھے: "حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ حق آگیا اور باطل اب پھر کبھی نہ آئے گا" ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر نے بیان کیا ہے کہ ہر بت نیچے زمین سے جڑا ہوا تھا تاکہ سیدھا کھڑا رہ سکے۔ آں حضرت ﷺ جوں ہی کسی بت کو اپنی چھڑی سے ٹھوکر مارتے وہ اوندھے بل یا پشت پر گر پڑتا تھا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا تھا۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ اللہ نے آپؐ کے ذریعے قریش کے غرور کو خاک میں ملا دیا تھا اور اہل مکہ کو آپؐ کے لائے ہوئے دین کا تابع اور آپ کی بلند کی ہوئی صدائے حق کا مطیع بنا دیا تھا۔

۸۔ فتح مکہ کے دن آں حضرت ﷺ کا خطبہ:

مکہ، وہ شہر جہاں سے آں حضرت ﷺ نے آٹھ سال قبل ہجرت فرمائی تھی، اب آپ کے تابع ہو گیا ہے اور آپ کے پیغام اور آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر ایمان لے آیا ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے طویل عرصے تک آپؐ سے دشمنی روا رکھی تھی اور آپ کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہنچائی تھیں، آپ کے ارد گرد خوف کے عالم میں سر جھکائے کھڑے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ آپؐ آج ان کے بارے میں کیا فیصلہ فرمانے والے ہیں۔

آں حضرت ﷺ کی ذمہ داری تھی کہ سب سے پہلے اپنے رب کی حمد و ثنا کریں جس نے آپؐ کو اپنی تائید و نصرت سے نوازا تھا اور اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔ اسی لیے آپؐ نے اپنے خطبے کا آغاز یوں فرمایا:

"کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اپنے بندے کی مدد کی اور تمام جتھوں کو تنہا شکست دی"

اس کے بعد آپ کی ذمہ داری یہ تھی کہ قریش اور ان کے علاوہ دیگر تمام انسانوں کے

سامنے نئے معاشرے اور اس کے امتیازی وصف کا اعلان کریں۔ یہ امتیازی وصف اس ارشاد باری میں مذکور ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ (الحجرات: ۱۳)

لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

اس لیے ان قدیم اور متعفن جاہلی کاموں مثلاً آباء و اجداد پر فخر، قومیت اور دیگر عصبیتوں پر مباہات اور شکل و صورت، زبان اور حسب و نسب کے فرق کا لحاظ وغیرہ کے بقایا جات کو مسلمانوں کے قدموں کے نیچے دفن ہو جانا چاہیے۔ تمام انسان آدم سے پیدا ہوئے ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔

جاہلیتِ قریش کی بساط اسی لمحے لپیٹ دی گئی ہے، اس لیے اس کی عادات واطوار اور رسوم وروایات کو بھی ختم ہونا چاہیے اور انہیں ماضی کی تاریکیوں میں دفن ہو جانا چاہیے۔ قریش کو اپنی گندگیوں سے بھی پاک وصاف ہو جانا چاہیے تاکہ وہ قافلہ اسلام میں شامل ہو کر اس کے ہم رکاب ہو سکیں۔ عنقریب انہیں کسریٰ کے ایوان تک پہنچنا اور مملکت روم کو فتح کرنا ہے اور عنقریب مکہ سے ایک نئی تہذیب اور نیا تمدن جنم لے گا جس کی بدولت پوری دنیا ہمہ گیر انسانی سعادت کی پوشاک زیب تن کرے گی۔

اس طرح عملاً اسی لمحے جاہلیت کے بقیہ مفاخر قدموں کے نیچے دفن ہو گئے اور قریش نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی برتری نہیں، اگر ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر۔ کوئی شخص کسی سے بڑھ کر نہیں، اگر ہے تو زیور اسلام سے آراستہ ہو کر۔ اور فخر و مباہات کا کوئی موقع نہیں، اگر ہے تو اسلامی نظام کو مضبوطی سے تھام کر۔ جب قریش نے رسول اللہ ﷺ سے یہ بیعت کر لی تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زمام اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دی اور اسے ان کے سامنے سرنگوں کر دیا۔

تعجب ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد اب اس گڑے مردے کو دوبارہ قبر سے

نکالنے کی کوشش کی جارہی ہے!!

۹۔ بیعتِ خواتین اور اس سے متعلق احکام:

اس سے درج ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

(الف) عام اسلامی ذمہ داریوں میں عورت اور مرد دونوں شریک ہیں:

مکمل مساوات کی بنیاد پر تمام ذمہ داریوں میں عورت اور مرد دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اسی لیے خلیفہ یا مسلمان حکمراں پر لازم تھا کہ وہ ان سے تمام جائز اور ممکن وسائل کو بروئے کار لا کر اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے کام کرنے کا عہد لے جس طرح کہ وہ مردوں سے اس کا عہد لیتا تھا۔ ان دونوں کے درمیان اس سلسلے میں کوئی فرق اور تفاوت نہیں ہے۔

اس لیے مسلمان عورت پر فرض ہے کہ مرد کی طرح وہ بھی اپنے دین کے مسائل جاننے کی کوشش کرے، علوم وفنون اور شعور وآگہی کے اسلحوں سے لیس ہونے کے لیے تمام جائز اور ممکن ذرائع اختیار کرے اور اسلام کے دشمن اس کے خلاف جو سازشیں کرتے ہیں ان کے اسالیب اور کمین گاہوں سے واقف ہو۔ تاکہ اپنی ذات کے بارے میں اس نے جو عہد کیا ہے اسے پورا کر سکے اور بیعت کا جو قلادہ اس نے اپنی گردن میں ڈالا ہے اس کا حق ادا کر سکے۔

اور یہ واضح ہے کہ عورت ان ذمہ داریوں میں سے کچھ بھی انجام نہیں دے سکتی اگر وہ اپنے دین کے حقائق سے ناواقف ہو اور اس کے ارد گرد جو بیرونی سازشیں رچی جارہی ہیں ان کے اسالیب سے بے خبر ہو۔

(ب) اجنبی عورت سے مصافحه جائز نہیں:

نبی ﷺ نے خواتین سے جس طریقے سے بیعت فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بغیر محض زبانی بیعت کی تھی۔ (اس کے برخلاف مردوں سے آپ نے بیعت اپنے ہاتھ پر لی تھی) اس سے ثابت ہوا کہ مرد کے لیے جائز نہیں کہ کسی اجنبی عورت کی جلد اس سے مس ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ علمائے اسلام میں سے کسی کو اس سے اختلاف ہے، الا یہ کہ کوئی شدید ضرورت اس کی متقاضی ہو، مثلاً علاج ومعالجہ، فصد

کھولنا، داڑھ نکالنا وغیرہ۔

شدید ضرورت یہ نہیں ہے کہ عورتوں سے مصافحہ کا عرف عام ہو گیا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ عرف کے ذریعے کتاب یا سنت سے ثابت شدہ احکام نہیں بدل سکتے۔ اس سے صرف وہی حکم بدل سکتا ہے جو کسی عرف عام پر مبنی ہو۔ کہ اگر وہ عرف بدل جائے تو اس کی وجہ سے اس کے حکم میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ گویا وہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مشروط حکم ہے جو ایک مخصوص حالت کا مرہون منت ہے۔ اس کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(ج) اجنبی عورت کی آواز کا پردہ نہیں ھے:

اوپر مذکور احادیث بیعت سے ثابت ہوتا ہے کہ وقت ضرورت اجنبی عورت کی گفتگو سنی جاسکتی ہے اور یہ کہ اس کی آواز کا پردہ نہیں ہے یہ تمام فقہاء (جن میں شوافع بھی ہیں) کا مسلک ہے۔ بعض احناف کی رائے ہے کہ عورت کی آواز کا اجنبی مرد سے پردہ ہوگا۔ عورتوں سے آں حضرت ﷺ کی بیعت سے متعلق صحیح احادیث اور دیگر بہت سی احادیث ان کے خلاف جاتی ہیں۔

۱۰۔ مکہ بزورِ قوت فتح ہوا یا بذریعۂ صلح؟

کیا مکہ بزور قوت فتح ہوا تھا یا بذریعہ صلح؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔ شافعیؒ، احمدؒ، اور دیگر فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ مکہ میں صلح کے بعد داخل ہوئے تھے۔ اس صلح میں قریش کے نمائندے ابوسفیان تھے۔ صلح کی دفعات اور شرائط یہ تھیں: جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اس کے لیے امان ہے، جو اسلام قبول کرلے اس کے لیے امان ہے، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اس کے لیے امان ہے، سوائے چھ افراد کے کہ ان کا خون مباح ہے۔"

ابوحنیفہؒ اور مالکؒ فرماتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ مکہ میں بزور قوت داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے اس طریقے سے استدلال کیا ہے جو مسلمانوں نے مکہ میں داخلہ کے لیے اختیار کیا تھا اور اس سے کہ داخلہ کے وقت وہ اسلحہ اور سامان جنگ سے لیس تھے۔

لیکن سب لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ نے فتح کے بعد نہ مال غنیمت حاصل کیا اور نہ کسی کو لونڈی اور غلام بنایا۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مکہ بذریعہ صلح فتح ہوا تھا ان کے نزدیک تو اس کا سبب واضح ہے۔ لیکن جو لوگ بزور قوت اس کے فتح ہونے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس کا سبب دوسرے شہروں کے مقابلے میں مکہ کی امتیازی حیثیت ہے۔ وہ عبادت کی جگہ، حق کا مرکز اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا حرم ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اسے تمام دنیا والوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اسی لیے بعض علماء (جن میں امام ابو حنیفہؒ بھی ہیں) کا مسلک یہ ہے کہ مکہ مکرمہ کی اراضی اور مکانات کو فروخت نہیں کیا جاسکتا۔ [1]

یہ مکہ مکرمہ کی فتح عظیم کے واقعات سے مستنبط بعض احکام اور نصائح کا خلاصہ ہے۔ اتنی تفصیل کافی ہے۔ واللہ اعلم

۱؎ دیکھیے الاحکام السلطانیہ ص ۱۶۴، زاد المعاد، ابن القیم ۲/ ۱۷۴۔

غزوۂ حنین

غزوۂ حنین شوال ۸ھ میں پیش آیا۔

اس کا سبب یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے مکہ فتح ہوا اور قریش نے اپنی بغاوت اور سرکشی کے بعد سر تسلیم خم کر دیا تو قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف کے اشراف باہم اکٹھا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اور اہل ایمان کو جس فتح ونصرت سے نوازا تھا اس پر ان کے سینوں میں انگارے دہک رہے تھے۔ انہوں نے قبیلہ ہوازن کے سردار مالک بن عوف کی سربراہی میں بہت بڑی جمعیت اکٹھا کی۔ مالک بن عوف کے حکم سے وہ اپنے ساتھ اپنا سارا مال، عورتیں اور بچے بھی لائے، یہاں تک کہ اوطاس (مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام) میں پڑاؤ ڈالا۔ مالک بن عوف نے انہیں اپنے ساتھ مال، عورتیں اور بچے لانے کا حکم اس لیے دیا تھا تاکہ وہ ان کی مدافعت میں جی جان سے لڑیں اور راہ فرار نہ اختیار کریں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کیا۔ آں حضرت ﷺ ۶ر شوال [2] کو بارہ ہزار مسلمانوں کے ساتھ نکلے جن میں سے دس ہزار مدینہ کے تھے اور دو ہزار مکہ کے۔ [3]

رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمیؓ کو مشرکین کی مخبری کے لیے بھیجا تاکہ ان کے حالات معلوم کریں اور واپس آکر آپ کو ان کی خبر دیں۔ وہ ان کے پاس گئے۔ ان کے پڑاؤ میں گھوم پھر کر ان کی فوجی طاقت کا اندازہ کیا، پھر آکر آپ کو اس کی خبر دی۔

رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا کہ صفوان بن امیہ کے پاس کچھ زرہیں اور اسلحہ ہے۔ وہ اس وقت مشرک تھے۔ آپ نے انہیں بلا بھیجا اور ان سے ان زرہوں اور اسلحوں کا مطالبہ کیا۔ صفوان

۲؎ طبقات ابن سعد ۴/ ۲۰۰

۳؎ طبقات ابن سعد ۴/ ۲۰۰، سیرت ابن ہشام

نے کہا: اے محمد! کیا زبردستی لینے کا ارادہ ہے؟! آپؐ نے فرمایا: نہیں بلکہ عاریۃً لینا ہے اور ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے گی۔ اس نے سو زرہیں اور کچھ ہتھیار دیے۔[74]

مالک بن عوف کو رسول اللہ ﷺ کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے دستوں کو وادئ حنین میں تعینات کر دیا۔ انہوں نے اس وادی کے مختلف حصوں میں کمین گاہیں اور مورچے بنا لیے۔ مالک بن عوف نے انہیں حکم دیا کہ محمد (ﷺ) اور ان کے اصحاب جوں ہی وہاں پہنچیں ان پر دفعۃً حملہ کر دیا جائے۔

مسلمان وادئ حنین پہنچے تو انہوں نے صبح کے دھندلکے میں نشیب کی طرف اترنا شروع کیا۔ اچانک وادی کی گھاٹیوں اور تنگ راستوں سے مشرکین کے فوجی دستے نمودار ہوئے اور انہوں نے دفعۃً مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے شہ سوار چھٹ گئے اور مسلمان گھبرا کر پیچھے پلٹے۔ ان کی بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔

رسول اللہ ﷺ تھوڑا دائیں طرف مڑے، پھر پکارا:

الیَّ عباد الله، انا النبی لا کذب، انا ابن عبدالمطلب

اے اللہ کے بندو! میرے پاس آؤ۔ (میں یہاں ہوں) میں نبی ہوں۔ یہ جھوٹ نہیں ہے، میں عبدالمطلب کا فرزند ہوں۔

امام مسلمؒ نے حضرت عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "میں غزوۂ حنین میں شریک تھا۔ میں اور ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلبؓ مستقل آں حضرت ﷺ کے ساتھ رہے اور کسی وقت بھی آپ سے علیحدگی نہیں اختیار کی۔ اس موقع پر آپ ایک سفید خچر پر تھے۔ جب مسلمانوں اور کفار میں مڈبھیڑ ہوئی اور مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے تو رسول اللہ ﷺ اپنے خچر کو کفار کی جانب بھگانے لگے۔ حضرت عباسؓ فرماتے ہیں: میں رسول اللہ ﷺ کے خچر کی لگام تھامے اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ وہ تیز نہ چلے۔ اور ابو سفیان بن حارثؓ آپ کی رکاب پکڑے ہوئے تھے۔ آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "ببول کے درخت والوں کو پکارو"[75]

[74] اس روایت کو ابن اسحاق نے صحیح سند سے نقل کیا ہے اور انہی کی سند سے ابن جریر اور ابن سید الناس نے بھی اس کی روایت کی ہے۔

[75] اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے حدیبیہ میں بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔

(حضرت عباسؓ کی آواز بہت بلند تھی) میں نے پوری طاقت سے پکارا "اے ببول کے درخت والو" اللہ کی قسم مسلمانوں نے جوں ہی میری آواز سنی وہ اس طرح پلٹ آئے جیسے گائے اپنے بچھڑے کی طرف پلٹ کر آتی ہے، اور کہتے جاتے تھے: "لبیک، لبیک" واپس آ کر وہ کفار سے جنگ کرنے لگے۔ حضرت عباسؓ نے یہ بھی پکارا "اے انصار"۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں فریقوں کو برسرِ پیکار دیکھا تو فرمایا: "اب زور کا رن پڑا ہے۔" پھر آپؐ نے کچھ کنکریاں لے کر کفار کی جانب پھینکیں اور فرمایا: "محمد کے رب کی قسم یہ شکست کھا کر رہیں گے۔"[76]

اللہ نے مشرکین کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ انہیں شکست ہوئی اور ان پر اتنی بدحواسی طاری ہوئی کہ کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ مسلمانوں نے ان کا پیچھا کیا اور بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور بہت سوں کو گرفتار کیا۔ تھوڑی دیر میں بہت سے قیدی پابجولاں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے۔

اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا: "جو شخص (دشمن فوج کے) کسی شخص کو قتل کرے اور اس کا ثبوت پیش کرے تو وہ اس کے سامان کا مالک ہے۔"[77]

ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر نے روایت کیا ہے کہ حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا:

"غزوہ حنین میں حضرت ابو طلحہؓ نے تن تنہا بیس آدمیوں کو قتل کیا اور ان کے سامان کے مالک ہوئے۔"

ابن اسحاق اور ابن سعد نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پلٹ کر دیکھا تو اپنے قریب حضرت ام سلیم بنت ملحانؓ کو پایا۔ ان کے ساتھ ان کے شوہر ابو طلحہؓ بھی تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے پکارا "ام سلیم!" انہوں نے جواب دیا: "جی۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں اے اللہ کے رسول۔ یہ لوگ جو آپ کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں یہ بھی اسی طرح موجبِ گردن زدنی ہیں جس طرح آپؐ ان لوگوں کو قتل کر رہے ہیں جو آپؐ سے برسرِ جنگ ہیں۔" حضرت ام سلیمؓ کے ہاتھ میں ایک خنجر تھا۔ ابو طلحہؓ نے کہا: "اے ام سلیم تمہارے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "یہ خنجر ہے۔ اسے میں نے اس لیے رکھا

[76] مسلم۔ اسے بخاری نے بھی باختصار روایت کیا ہے۔ اور تمام کتب سیرت میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

[77] بخاری و مسلم

ہے تاکہ اگر کوئی مشرک میرے قریب آئے تو اس سے اس کا پیٹ پھاڑ دوں۔"

رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک عورت کے پاس سے ہوا جسے حضرت خالد بن الولیدؓ نے قتل کر دیا تھا اور لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اس کی لاش دیکھ کر آپؐ نے فرمایا: یہ کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس عورت کو خالد بن الولیدؓ نے قتل کر دیا ہے۔ آپؐ نے ایک صحابی سے جو آپ کے ساتھ تھے فرمایا: جاؤ جا کر خالد بن ولید سے کہہ دو کہ اللہ کے رسول نے تمہیں بچے، عورت، اور مزدور کو قتل کرنے سے منع کیا ہے۔"۷۸

مالک بن عوف نے اپنی شکست خوردہ فوج کے ساتھ طائف میں جاکر پناہ لی اور وہاں قلعہ بند ہو گیا۔ ان لوگوں نے اپنے پیچھے بہت سا مال غنیمت چھوڑا۔

رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ سارا مال غنیمت جعرانہ میں محفوظ رکھا جائے۔ آپؐ نے حضرت مسعود بن عمرو غفاریؓ کو اس کا نگراں بنایا اور خود صحابہ کے ساتھ طائف کا رخ کیا، وہاں پہنچ کر صحابہ نے اس کا محاصرہ کر لیا۔ قبیلۂ ثقیف کے لوگوں نے اپنے قلعوں سے مسلمانوں پر خوب تیر برسائے جس سے متعدد مسلمان شہید ہو گئے۔ طائف کا محاصرہ دس سے کچھ زائد (اور ایک قول کے مطابق بیس سے کچھ زائد) دنوں تک جاری رہا، مگر شہر فتح نہ ہو سکا تو آپؐ کی رائے یہ بنی کہ اب محاصرہ اٹھا دینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے صحابہ میں اعلان کر دیا: "ہم انشاء اللہ اب واپس جانے والے ہیں" اس پر بعض صحابہ نے کہا: "شہر فتح کیے بغیر ہم کیسے واپس چلے جائیں؟ آپؐ نے فرمایا: "ٹھیک ہے اگر تمہاری رائے ہے تو ابھی اور رکتے ہیں" اگلے دن بھی انہوں نے محاصرہ جاری رکھا۔ اس دن بعض صحابہ زخمی ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پھر فرمایا: "ہم کل واپس جا رہے ہیں" اب سب تیار ہو گئے۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کو ہنسی آگئی۔۷۹

جب رسول اللہ ﷺ واپس ہونے لگے تو صحابہ سے یہ دعا کرنے کی ہدایت فرمائی: آیبون، تائبون عابدون لربنا حامدون، (ہم واپس ہوتے ہوئے اپنے رب کی طرف پلٹتے

۷۸۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، اسی مفہوم کی ایک حدیث بخاری و مسلم نے بھی روایت کی ہے۔ حدیث میں لفظ "عسیف" آیا ہے جس کے معنی مزدور یا غلام کے ہیں۔

۷۹۔ بخاری و مسلم

ہیں، اسی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں۔)

بعض صحابہ نے کہا: "اے اللہ کے رسول قبیلۂ ثقیف کے لیے بد دعا کر دیجئے۔" آپ نے اس کے بجائے ان کے لیے دعا کی۔ فرمایا: "اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں توفیق دے کہ میرے پاس حاضر ہو جائیں۔"۸۰

آپ کی یہ دعا قبول ہوئی۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اللہ نے ثقیف کو ہدایت کی توفیق عطا فرمائی اور ان کا وفد مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اپنے اسلام کا اعلان کرنے کے لیے حاضر ہوا۔

اموالِ غنیمت کی تقسیم

رسول اللہ ﷺ جعرانہ تشریف لائے۔ وہاں ہوازن کے وہ قیدی اور اموالِ غنیمت محفوظ رکھے گئے تھے جو غزوۂ حنین میں ہاتھ آئے تھے۔ آپؐ نے قیدیوں کو تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد ہوازن کے ایک وفد نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ انہوں نے آپؐ سے درخواست کی کہ ان کے اموال اور قیدی واپس کر دیے جائیں۔ آپؐ نے فرمایا: "تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کون لوگ ہیں۔ اور مجھے سب سے زیادہ وہ بات پسند ہے جو سچی ہو۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنی عورتیں اور بچے زیادہ محبوب ہیں یا اپنا مال۔ ان میں سے کوئی ایک ہی تمہیں مل سکتا ہے۔ میں نے تم لوگوں کا انتظار کیا تھا" (کہ اسلام قبول کر کے میرے پاس آؤ گے اس لیے قیدیوں اور اموال غنیمت کو تقسیم نہیں کیا تھا۔ لیکن تم نہیں آئے تو تقسیم کرنا پڑا) نبی ﷺ نے طائف سے واپسی کے بعد دس سے زائد دن ان کا انتظار فرمایا تھا۔

ان لوگوں نے جواب دیا: "آپؐ ہمیں اپنی عورتوں اور بچوں اور ہمارے اموال میں سے کسی ایک کو لینے کا اختیار دیتے ہیں تو ہمیں اپنی عورتیں اور بچے زیادہ محبوب ہیں۔" تب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپؐ نے اللہ کی حمد و ثنا کی، پھر فرمایا: (مسلمانو) "تمہارے یہ بھائی تائب ہو کر آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی عورتیں

۸۰۔ طبقات ابن سعد، سنن ترمذی۔ اس روایت کو ابن سعد نے عاصم کلابی عن الاشہب عن الحسن کی سند سے روایت کیا ہے۔

اور بچے انہیں واپس کر دوں۔ اب تم میں سے جو لوگ بخوشی اس پر تیار ہوں وہ انہیں چھوڑ دیں اور جو لوگ اپنے حق سے دست بردار نہ ہونا چاہیں وہ بھی انہیں چھوڑ دیں، ہم ان کے بدلے انہیں آئندہ سب سے پہلے حاصل ہونے والے مال غنیمت میں سے حصہ دیں گے۔[۸۱] یہ سن کر تمام لوگ پکار اٹھے: "اے اللہ کے رسول! ہم بخوشی انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔" آپؐ نے فرمایا: "ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے۔ اس وقت تم لوگ اپنی اپنی جگہ چلے جاؤ اور تمہارے سردار ہمارے پاس آکر صحیح صورت حال کی اطلاع دیں۔" لوگ چلے گئے اور ان کے سرداروں نے ان کے پاس جاکر ان کی مرضی معلوم کی، پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کو اطلاع دی کہ تمام لوگ ان قیدیوں کو چھوڑنے پر بخوشی تیار ہیں۔[۸۲] اس طرح ہوازن کے تمام قیدی واپس کر دیے گئے۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ہوازن سے دریافت فرمایا: عوف بن مالک کہاں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ ثقیف کے ساتھ طائف میں ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "اس کو خبر کر دو کہ اگر وہ آکر اسلام قبول کرلے تو اس کے اہل و عیال اور اس کا مال اسے واپس کر دیا جائے گا اور ساتھ ہی اسے سو اونٹ بھی دیے جائیں گے۔" مالک کو یہ خبر ملی تو وہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ جعرانہ اور مکہ کے درمیان اس کی آپؐ سے ملاقات ہوئی۔ آپؐ نے اس کے اہل و عیال اور اس کا مال لوٹا دیا اور اسے سو اونٹ عطا فرمائے۔ اس نے اسلام قبول کرلیا اور اس کے اسلام میں پختگی آگئی۔

نبی ﷺ نے مؤلفۃ القلوب (یعنی مکہ کے وہ مسلمان جو ابھی جلد ہی اسلام لائے تھے اور ان کی دل داری مقصود تھی) کو اموال غنیمت اور عطیات میں سے خوب دل کھول کر عنایت فرمایا۔ یہ دیکھ کر بعض انصار کو رنج ہوا۔ انہوں نے کہا: اللہ رسول اللہ ﷺ کی مغفرت کرے۔ وہ قریش کو نواز رہے ہیں اور ہمیں محروم رکھ رہے ہیں، حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک ان کے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔"[۸۳]

---

۸۱ یعنی ان کے حصے میں جو قیدی آئے ہیں انہیں چھوڑ دیں۔ اس کا معاوضہ انہیں بعد میں دے دیا جائے گا۔

۸۲ بخاری۔ اس روایت کو طبری، بیہقی اور ابن سید الناس نے ابن اسحاق کے واسطے سے مزید تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ۸۳ بخاری و مسلم

رسول اللہ ﷺ کو ان باتوں کی خبر ہوئی تو آپ نے انصار کو بلا بھیجا۔ وہ ایک جگہ جمع ہوئے جو آپؐ نے ان کے لیے خاص کی تھی۔ وہاں آپؐ نے ان کے علاوہ اور کسی کو نہیں بلایا۔ پھر آپؐ کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی۔ اس کے بعد فرمایا:

"اے گروہ انصار! یہ کیسی باتیں ہیں جو تمہاری طرف سے مجھ تک پہنچی ہیں؟ کیا میں تمہارے پاس اس حالت میں نہیں آیا تھا کہ تم سب گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ تم منتشر اور پراگندہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں دولت مند کیا"

ہر سوال پر ان کا جواب تھا: "کیوں نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کا فضل واحسان سب سے بڑھ کر ہے۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "اے گروہ انصار! مجھے جواب دو" انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم کیا جواب دیں؟ اللہ اور اس کے رسول کا فضل واحسان سب سے بڑھ کر ہے۔"

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم، اگر تم چاہو تو یہ کہہ سکتے ہو اور جو کچھ کہو گے سچ ہو گا اور میں اس کی تائید کروں گا کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے کہ سب نے آپ کو جھٹلا دیا تھا، ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ سب نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، ہم نے آپ کی مدد کی۔ لوگوں نے آپ کو بے خانماں کر دیا تھا، ہم نے آپ کو پناہ دی۔ آپ مفلس آئے تھے ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری کی۔"

یہ سن کر انصار چیخ اٹھے: "نہیں بلکہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے احسان مند ہیں"

رسول اللہ ﷺ نے اپنی بات جاری رکھی: "اے گروہ انصار کیا دنیا کی چند روزہ سرسبزی وشادابی[۸۴] کے لیے تمہارے دل میں ناراضی پیدا ہوئی ہے جسے میں نے کچھ لوگوں کو تالیف قلب کے لیے دیا ہے، تاکہ وہ اسلام لے آئیں اور تمہارے اسلام کی پختگی پر بھروسہ کیا ہے۔ اے گروہ انصار کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ لوگ اپنے ساتھ بھیڑ اور بکریاں لے جائیں اور تم اپنے خیموں میں اللہ کے رسول کو لے کر جاؤ؟ اللہ کی قسم، تم جو چیز اپنے ساتھ لے کر جاؤ گے

---

۸۴ حدیث میں لفظ "لعاعۃ" آیا ہے جس کے معنی ہیں: 'ہریالی جو آنکھوں کو بھلی معلوم دے۔' اس سے دنیا کو تشبیہ دی گئی ہے۔

وہ اس سے کہیں بہتر ہے جسے وہ لے جائیں گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا۔ اگر دوسرے لوگ کسی ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستے پر چلیں تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔ تم لوگ میرے بعد خود غرضی دیکھو گے۔ اس وقت صبر کرنا یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے جاملو۔ اے اللہ! انصار پر، انصار کی اولاد پر اور انصار کی اولاد کی اولاد پر رحم فرما۔"

یہ سن کر تمام انصار رو پڑے اور اتنا روئے کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ وہ کہنے لگے "ہم اللہ اور اس کے رسول کی تقسیم پر راضی ہیں۔"۵۵

بعض بدو آں حضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے آئے اور آپ سے مزید عطیات مانگنے لگے۔ ان کی وجہ سے ببول کے ایک درخت میں آپ کی چادر اٹک گئی۔ آپ ان کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "لوگو! مجھے میری چادر دے دو۔ اللہ کی قسم، تہامہ میں جتنے درخت ہیں اگر میرے پاس اتنے اونٹ ہوں تو انہیں بھی میں تمہارے درمیان تقسیم کر دوں گا۔ پھر تم مجھے نہ بخیل پاؤ گے، نہ جھوٹا، نہ بزدل ۵۶ لوگو۔ اللہ کی قسم، تمہارے مالِ فیٔ میں سے مجھے صرف خمس (پانچواں) حصہ ملتا ہے اور وہ بھی تم ہی لوگوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔"۵۷

ایک بدو آپ کے پاس آیا اور آپ کی چادر پکڑ کر زور سے کھینچی۔ آپ اس وقت ایک موٹی نجرانی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اسے کھینچنے سے آپ کی گردن پر اس کے کنارے کا نشان پڑ گیا۔ اس نے کہا: "مجھے اس مال میں سے دلوائیے جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔" آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے، اس کے اس انداز پر ہنسے، پھر اسے کچھ دیے جانے کا حکم دیا۔ ۵۸

ابن اسحاق فرماتے ہیں: پھر رسول اللہ ﷺ نے جعرانہ سے عمرہ کا احرام باندھ لیا۔ عمرہ سے فراغت کے بعد آپ مدینہ لوٹ آئے اور مکہ میں حضرت عتاب بن اسیدؓ کو اپنا جانشین بنا دیا۔

---

۵۵ بخاری، مسلم، ابن اسحاق اور ابن سعد نے تقریباً ملتے جلتے الفاظ میں یہ روایت نقل کی ہے۔

۵۶ بخاری

۵۷ یہ اضافہ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کیا ہے۔

۵۸ بخاری و مسلم

دروس ونصائح

۱۔ اسلامی عقیدہ کا ایک عظیم درس:

غزوۂ حنین سے ہمیں اسلامی عقیدہ اور اسباب ومسببات کے قانون کے سلسلے میں ایک درس ملتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح غزوۂ بدر سے ہمیں یہ درس ملا تھا، بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔

اگر معرکہ بدر سے مسلمانوں کو یہ درس ملا تھا کہ دشمنوں کی کثرت کے مقابلے میں ان کی قلت انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی، اگر وہ صبر واستقامت اور تقویٰ اختیار کریں۔ تو غزوۂ حنین سے انہیں یہ درس ملا کہ کثرتِ تعداد سے بھی انہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچے گا اگر وہ صابر اور متقی نہ ہوں۔ اور جس طرح بدر سے حاصل ہونے والی نصیحتوں کے لیے قرآنی آیات نازل ہوئیں اسی طرح حنین سے اخذ کی جانے والی نصیحتوں کے لیے بھی قرآنی آیات کا نزول ہوا۔

بدر میں مسلمانوں کی تعداد دوسرے کسی بھی معرکہ میں ان کی تعداد سے بہت کم تھی۔ اس کے باوجود قلت سے انہیں کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا۔ اس لیے کہ ان کا اسلام سچا، ان کا ایمان پختہ اور اللہ اور اس کے رسول سے ان کا تعلق بہت گہرا تھا۔

حنین میں مسلمانوں کی تعداد اس سے پہلے ہونے والے کسی بھی معرکہ میں ان کی تعداد سے زیادہ تھی۔ اس کے باوجود کثرت سے انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا، اس لیے کہ اس معرکہ میں شریک بہت بڑی تعداد کے نفوس میں ایمان راسخ نہیں تھا اور ان کے دلوں کی گہرائیوں میں اسلام کا مفہوم جاگزیں نہیں ہوا تھا۔

یہ بہت بڑی تعداد فوج میں محض اپنے جسموں اور شکلوں کے ساتھ شریک تھی، دنیا اور اس کی خواہشات ان کے دلوں میں گھر کر گئی تھیں اور ان کے نفوس پر قبضہ جما لیا تھا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ جسموں اور شکلوں کی تعداد کا فتح ونصرت میں کوئی اثر ظاہر ہو۔

اسی لیے اتنی بڑی تعداد کا سامنا جب دشمن سے ہوا جو اپنی کمین گاہوں سے نکل کر اچانک ان کے سامنے آگئے تھے، تو وہ الٹے پیروں بھاگ کھڑے ہوئے اور حنین کی وادی میں منتشر ہو گئے۔

اس موقعے پر اس بات کا امکان ہو چلا تھا کہ اس دہشت کے سائے بظاہر بہت سے

مومنین صادقین کے دلوں تک پہنچ جائیں، لیکن انصار اور مہاجرین نے جوں ہی رسول اللہ ﷺ کی پکار سنی فوراً پلٹ آئے اور آپ کے گرد حلقہ بنالیا اور زبردست جنگ کی۔ ان لوگوں کی تعداد دوسو سے زائد نہ تھی لیکن ان دوسو کی وجہ سے مسلمان دوبارہ فتح ونصرت سے ہم کنار ہوئے، ان کے دلوں پر سکینت طاری ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو بری طرح شکست دی، حالانکہ جب ان کی تعداد بارہ ہزار تھی اور ان میں ہر طرح کے لوگ تھے اس وقت وہ کچھ نہیں کرسکے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس بلیغ درس کو یوں بیان کیا ہے۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذَا اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا، وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِيْنَ، ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ، وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا، وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِيْنَ، ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (التوبہ: ۲۵-۲۷)

ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دست گیری کی شان تم دیکھ چکے ہو) اس روز تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرّہ تھا، مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جس کو چاہتا ہے توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

۲۔ دشمن کی مخبری جائز ہے:

پیچھے ہم بیان کرچکے ہیں کہ یہ کام جائز ہے بلکہ اگر ضرورت متقاضی ہو تو واجب ہے۔ اس غزوہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہی کیا تھا۔ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد الاسلمیؓ کو بھیجا کہ دشمن کے حالات معلوم کرکے آئیں اور ان کی تعداد اور سامانِ جنگ کے بارے میں مسلمانوں کو خبر دیں۔ اس میں ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

۳۔ دشمنوں سے جنگ کے لیے مشرکین سے اسلحہ عاریۃً لیا جاسکتا ہے:

مسلمانوں کے لیے جائز ہے کہ اپنے دشمنوں سے جنگ کے لیے مشرکین سے عاریۃً اسلحہ لے لیں۔ اسلحہ کے مثل وہ سامان جنگ بھی ہے جس کی فوج کو ضرورت ہو۔ اور عاریۃً لینے کے مثل یہ بھی ہے کہ وہ ان سے مفت یا خرید کر حاصل کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس غزوہ میں یہی کیا تھا۔ آپ نے صفوان بن امیہ سے اسلحہ عاریۃً حاصل کیا تھا، جب کہ وہ اس وقت مشرک تھے۔

یہ جنگ میں کفار سے مدد لینے کے عمومی حکم میں داخل ہے۔ اس مسئلہ کو ہم غزوۂ احد کے ضمن میں بیان کرچکے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کفار سے مدد لینے کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ کے لیے ان کے بعض افراد سے مدد لی جائے۔ اس پر غزوۂ احد کے ضمن میں گفتگو کی جاچکی ہے۔ وہاں ہم نے بیان کیا ہے کہ اگر ضرورت متقاضی ہو اور مسلمانوں کو ان کے ساتھ مل کر جنگ کرنے والے مشرکوں کی سچائی اور امانت داری پر بھروسہ ہو تو یہ جائز ہے۔

دوسری قسم یہ کہ ان کی بعض مملوکہ چیزوں مثلاً اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ کی مدد لی جائے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ یہ جائز ہے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کی عزت وعظمت پر حرف نہ آتا ہو اور اس کی وجہ سے ان پر دوسروں کا اقتدار نہ قائم ہوتا ہو، یا انہیں اپنے بعض دینی فرائض سے دست بردار نہ ہونا پڑتا ہو۔ اور یہ واضح ہے کہ صفوان بن امیہ نے جب رسول اللہ ﷺ کو اسلحہ عاریۃً دیا تھا اس وقت وہ مغلوبیت اور ضعف کی پوزیشن میں تھا اور رسول اللہ ﷺ کو طاقت اور مضبوط پوزیشن حاصل تھی۔[۵۹]

۴۔ جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی بے مثال جرأت:

اس غزوہ میں ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی بے مثال جرأت کا مظاہرہ ہوا۔ جب مسلمانوں کی جمعیت وادیٔ حنین میں منتشر ہوگئی، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے اور رسول

[۵۹] دیکھیے زاد المعاد ۲/۱۹۰ اور مغنی المحتاج ۴/۲۲۱

اللہ ﷺ میدانِ کارزار میں تن تنہا رہ گئے جہاں دشمن کی کمین گاہوں سے تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی اس موقع پر آپؐ نے پوری ثابت قدمی دکھائی، جس کا بھاگنے والے مسلمانوں کے دلوں پر گہرا اثر ہوا اور یہ منظر دیکھ کر ان میں شجاعت اور عزیمت پیدا ہو گئی۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں غزوۂ حنین کا واقعہ بیان کرنے کے بعد لکھا ہے:

”یہ آں حضرت ﷺ کی انتہائی شجاعت کا مظہر ہے۔ آپ دشمنوں کی زد پر تھے۔ آپؐ کی فوج بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور آپؐ ایک خچر پر سوار تھے جو نہ تیز دوڑ سکتا تھا، نہ بھاگنے میں مدد دے سکتا تھا، نہ اس کے ساتھ پلٹ کر حملہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود آپؐ دشمنوں کی سمت میں اسے ایڑ لگا رہے تھے اور زور زور سے اپنا نام لے رہے تھے، تاکہ جو آپ کو نہ جانتا ہو وہ بھی جان لے۔ آپؐ پر ہمیشہ درود و سلام ہو قیامت کے دن تک۔ یہ منظر اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا بھروسہ اور اعتماد تھا اور آپ بخوبی جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آپؐ کو ضرور کامیاب کرکے رہے گا اور جو مشن لے کر آپ آئے ہیں وہ پورا ہوگا اور آپ کے دین کو تمام ادیان پر غلبہ حاصل ہوگا۔“[۹۰]

۵۔ جہاد میں عورتوں کی شرکت؟

کیا جہاد میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہو سکتی ہیں؟ جہاں تک زخمیوں کے علاج و معالجہ اور پیاسوں کو پانی پلانے کے لیے ان کی شرکت کا تعلق ہے تو اس مقصد سے متعدد غزوات میں ان کی شرکت صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ رہا جنگ و جدال میں ان کا حصہ لینا تو یہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔ اگرچہ امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد میں ایک باب کا عنوان یہ قائم کیا ہے: باب غزو النساء وقتالهن مع الرجال (جنگ میں عورتوں کی شرکت اور مردوں کے دوش بدوش ان کے قتال کا بیان) ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ”اس سلسلے میں (یعنی اس موضوع پر وارد احادیث میں) مجھے کہیں یہ صراحت نہیں ملی کہ عورتوں نے قتال میں حصہ لیا ہو۔“[۹۱]

فقہاء نے قتال کے لیے عورت کے نکلنے کا جو حکم بیان کیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ

۹۰ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۵

۹۱ دیکھیے فتح الباری ۶/ ۵۱

”اگر دشمن مسلمانوں کے کسی شہر پر حملہ آور ہو جائے تو وہاں کے تمام باشندوں پر قتال کے لیے نکلنا واجب ہو جاتا ہے۔ اس حکم میں عورتیں بھی شامل ہیں، اگر ان سے امید ہو کہ وہ دفاع کر سکیں گی اور جنگ لڑ سکیں گی۔ اگر اس کی امید نہ ہو تو جائز نہیں ہے۔“[۹۲] رہا وہ خنجر جو حضرت ام سلیمؓ کے ہاتھ میں تھا وہ محض ان کے دفاع کے لیے تھا، جیسا کہ انہوں نے خود بیان کیا ہے۔

اسی پر امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کا روایت کردہ حضرت عائشہؓ کا یہ بیان محمول کیا جائے گا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد میں شرکت کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا: ”تم عورتوں کا جہاد حج ہے“ حضرت عائشہؓ نے جو اجازت طلب کی تھی وہ قتال میں شرکت کے لیے تھی نہ کہ زخمیوں کے علاج و معالجہ، فوجیوں کی خدمت اور اس جیسے دوسرے کاموں کے لیے۔ اس لیے کہ ان کاموں کے لیے عورتوں کی شرکت باتفاق جائز ہے اگر اس کی شرائط پوری ہوں۔

بہرحال جہاد کے لیے مردوں کے ساتھ عورتوں کا نکلنا اس بات سے مشروط ہے کہ ستر اور حفاظت کے تمام اسباب فراہم ہوں اور ان کے نکلنے کی واقعی ضرورت ہو۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو یعنی عورتوں کے نکلنے کی حقیقی ضرورت نہ ہو یا نکلنے سے محرمات میں جاپڑنے کا امکان ہو تو ان کا نکلنا حرام ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ تمام اسلامی احکام ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے مناسب نہیں ہے کہ جو احکام مخصوص اسباب کی بنا پر خواہشاتِ نفس سے میل کھاتے ہوں انہیں تو قبول کر لیا جائے لیکن ان سے متعلق دیگر احکام اور فرائض سے روگردانی اختیار کی جائے۔ اس طرزِ عمل پر یقیناً اللہ تعالیٰ کا درج ذیل ارشاد صادق آئے گا۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ، فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ. (البقرۃ-۸۵)

کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔

۹۲ دیکھیے مغنی المحتاج ۴/ ۲۱۹

اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ یہ بڑا گھناؤنا فریب ہے جو بعض لوگ حقیر دنیاوی اغراض کے لیے کرتے ہیں۔ ان سے اس موضوع پر فتوے طلب کیے جاتے ہیں تو وہ تمام قیود و شرائط اور تمنات کو الگ کر کے اس انداز سے فتوے دیتے ہیں کہ وہ مطلوبہ صورتوں کے عین مطابق اور "طبقۂ اشراف" کی خواہشات کے تابع ہوں۔ پھر وہ مداہنت اور نفاق کے سنہری طبق میں سجا کر ان فتووں کو ان کے سامنے پیش کرتے ہیں!..

۶۔ جہاد میں عورتوں، بچوں، مزدوروں اور غلاموں کو قتل کرنے کی حرمت:

آں حضرت ﷺ نے جب اس عورت کو دیکھا جسے حضرت خالد بن ولیدؓ نے قتل کر دیا تھا تو جہاد میں عورتوں، بچوں، مزدوروں اور غلاموں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔ اس حدیث کی روشنی میں تمام علماء اور ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جہاد میں عورتوں، بچوں، مزدوروں اور غلاموں کو قتل کرنا حرام ہے۔ اس سے صرف یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ وہ جنگ میں شریک ہوں اور براہ راست مسلمانوں سے قتال کریں۔ اس صورت میں جب ان سے مڈ بھیڑ ہو تو انہیں قتل کیا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے ہوں تو اعراض کیا جائے گا۔

اسی طرح اس حکم سے یہ صورت بھی مستثنیٰ ہے جب کفار اپنے بچوں اور عورتوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کریں اور انہیں قتل کیے بغیر ان کفار کی سر کوبی ممکن نہ ہو۔ اس صورت میں ان کا قتل جائز ہے۔ امام کی ذمہ داری ہے کہ جو مصلحت کا تقاضا ہو اس پر عمل کرے۔ [۹۳]

۷۔ مقتول کے سامان کا حکم:

پیچھے گزرا کہ نبی ﷺ نے اس غزوہ میں اعلان فرمادیا تھا کہ جو شخص دشمن کے کسی فرد کو قتل کر دے اس کے سامان کا وہ مالک ہے۔ ابن سید الناس فرماتے ہیں: "یہ حکم ہمیشہ کے لیے ہو گیا" اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، لیکن ان کے درمیان اس ثابت شدہ حکم کی نوعیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ امامت کے احکام میں سے ہے یا فتویٰ ہے؟ یعنی کیا رسول اللہ ﷺ کے اس اعلان کی نوعیت یہ تھی کہ آپؐ نماز اور روزہ کے احکام کی طرح اللہ تعالیٰ کا ایک

[۹۳] الاحکام السلطانیہ ص: ۴۰، مغنی المحتاج ۴/ ۲۲۳

حکم بیان کر رہے تھے جس پر عمل نہ کرنے کا آپ کو یا کسی اور کو اختیار نہ تھا، یا آپ نے یہ حکم مسلمانوں کے امام کی حیثیت سے دیا تھا جسے اختیار ہوتا ہے کہ جس چیز میں مسلمانوں کی بھلائی اور مصلحت دیکھے اس کا حکم دے۔

امام شافعیؒ کی رائے ہے کہ یہ حکم تبلیغ اور فتویٰ پر مبنی ہے۔ مجاہد کو ہر زمانہ میں یہ حق حاصل ہے کہ اہل حرب میں سے جس فرد کو بھی وہ قتل کرے اس کا سامان لے لے۔ اس کے لیے امام یا سپہ سالار سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ یہ ایک قضائی حکم ہے جو صرف امامت کی اساس پر قائم ہے۔ مقتول کا سامان قاتل کے لے لینے کا جواز ہر زمانے میں امام کی اجازت پر موقوف ہے۔ اگر وہ اجازت نہ دے تو مقتولین کے سامان اموال غنیمت میں شامل کر دیے جائیں گے اور وہ انہی کے حکم میں ہوں گے۔ [۹۴]

۸۔ جہاد کا مطلب کافروں سے نفرت نہیں:

جہاد کا مطلب کافروں سے نفرت نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ طائف کے محاصرہ سے واپسی پر بعض صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ "ثقیف پر بددعا کر دیجیے" مگر آپؐ نے اس کے بجائے ان کے لیے یہ دعا فرمائی: "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں توفیق دے کہ وہ میرے پاس آجائیں۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد نام ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی کا۔ یہ تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے، تاکہ وہ قیامت کے دن ابدی عذاب سے خود کو محفوظ رکھ سکیں۔

اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دوسروں کو ہمیشہ ہدایت اور اصلاح ہی کی دعا دیں۔ کیونکہ مشروعیت جہاد کی یہی حکمت ہے۔

۹۔ فوجی اموالِ غنیمت کے کب مالک ہوں گے؟

پیچھے گزرا کہ قبیلۂ ہوازن کا وفد جب اسلام قبول کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

[۹۴] ملاحظہ کیجیے الاحکام السلطانیہ ص: ۱۳۹، الاحکام، القرافی ص: ۳۸

حاضر ہوا تو آپؐ نے فرمایا: "میں نے تمہارا انتظار کیا تھا" یعنی اس امید میں کہ تم اسلام قبول کرکے آؤ گے، اموال غنیمت کی تقسیم روکے رکھی تھی۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی اموال غنیمت کے اس وقت مالک ہوں گے جب حاکم یا امام انہیں تقسیم کردے۔ تقسیم سے قبل وہ جنگ جوؤں کی ملکیت تصور نہیں کیے جائیں گے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے انہیں مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرنے میں تاخیر فرمائی۔

اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام کو اختیار ہے کہ اموال غنیمت ان کے مالکان کو لوٹا دے اگر وہ مسلمان ہو کر آئیں اور اس وقت تک اموال غنیمت کو فوجیوں کے درمیان تقسیم نہ کیا گیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ اسی کو ترجیح دے رہے تھے۔

آں حضرت ﷺ نے ہوازن کے وفد اور ان کے اموال (جنہیں مسلمانوں نے غنیمت میں حاصل کیا تھا) کے سلسلے میں جو موقف اختیار فرمایا اس سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان جو اموال تقسیم کردیے گئے تھے انہیں ان سے واپس لینا امام کے لیے جائز نہیں ہے، اِلّا یہ کہ وہ بخوشی بغیر کسی جبر واکراہ کے واپس کردیں۔

آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے مسلمانوں سے — جو ان اموال کے مالک بن گئے تھے — اجازت حاصل کرنے کے لیے کتنا اہتمام فرمایا۔ جب ان لوگوں نے ایک ساتھ زور سے پکار کر کہا: "اے اللہ کے رسول! ہم اسے بخوشی واپس کرتے ہیں" تو آپؐ نے اسے ہر ایک کی طرف سے اجازت نہیں سمجھ لیا بلکہ ہر شخص سے الگ الگ یا ان کے نمائندوں کے واسطے سے سن کر ان کی مرضی معلوم کرنے پر اصرار کیا اور اس طرح اس کی توثیق ضروری سمجھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے اختیارات اور اقتدار کا استعمال کرکے لوگوں کو مجبور کرے کہ وہ اپنے بعض حقوق اور قانونی طور پر اپنی مملوکہ چیزوں سے دست بردار ہوجائیں۔ یہ اختیارات اور حقوق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول تک کو نہیں دیے تھے۔

یہ ہے حقیقی اور دل آویز عدل اور مساوات....... ان عظیم الٰہی قدروں کی موجودگی میں ان تمام بے بنیاد دعووں کو زمین میں دفن ہوجانا چاہیے جو خوش نما الفاظ اور خوبصورت نعروں کے ذریعے بلند کیے جاتے ہیں۔

۱۰۔ مؤلفۃ القلوب کے بارے میں اسلام کی پالیسی:

آپ نے دیکھا کہ نبی ﷺ نے اہل مکہ کو جو فتح کے موقعے پر اسلام لائے تھے، دوسروں سے زیادہ مال غنیمت عطا فرمایا۔ اس تقسیم میں آپؐ نے جنگ جوؤں کے درمیان حقیقی مساوات کے اصول کی بھی رعایت نہیں فرمائی۔ آں حضرت ﷺ کا یہ عمل ان اہم دلالتوں میں سے ہے جن سے عام ائمہ اور فقہاء نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ امام جن لوگوں کی تالیف قلب چاہتا ہے انہیں مصلحت کے مطابق زیادہ عطیات دے سکتا ہے۔ بلکہ ایسا کرنا وقتِ مصلحت واجب ہے اور کوئی حرج نہیں کہ یہ عطیات اصل اموال غنیمت میں سے ہوں۔

اسی لیے زکوٰۃ میں ان لوگوں کا ایک خاص حصہ رکھا گیا ہے جو حاکم کے پاس جمع ہوتا رہے گا، تاکہ جب بھی ضرورت ہو وہ اس میں سے ان لوگوں کو دیتا رہے جن کے بارے میں وہ محسوس کرے ان کی تالیفِ قلب اسلامی مفاد میں ہے۔

۱۱۔ انصار کی فضیلت اور رسول اللہ ﷺ کی ان سے محبت:

رسول اللہ ﷺ نے صحیح فرمایا ہے کہ "شیطان ابن آدم کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے۔" شیطان نے چاہا کہ آں حضرت ﷺ نے اموالِ غنیمت کی تقسیم کی جو پالیسی اختیار فرمائی تھی اس کے سلسلے میں انصار کے ایک گروہ کے دلوں میں تنقید کا رجحان پیدا کردے۔ شیطان نے ان کے دلوں میں یہ خیال ڈال دیا کہ نبی ﷺ اپنی قوم اور اہل وطن کی محبت میں گرفتار ہوگئے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے انصار کو فراموش کردیا ہے۔

جب نبی ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے ان سے کیا فرمایا؟

آپؐ نے ان وسوسوں کے جواب میں ان کے سامنے جو خطبہ دیا وہ رقت، اعلیٰ ذوق اور انصار سے شدید محبت کے احساسات سے بھرپور ہے۔ ساتھ ہی اس میں اس بات کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں کہ آپ کو یہ جان کر سخت تکلیف پہنچی ہے کہ جو لوگ آپؐ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں ان کے دل میں آپ کے بارے میں یہ شکایت پیدا ہوگئی ہے کہ انہیں آپؐ نے فراموش کردیا ہے اور ان سے منہ پھیر لیا ہے۔

آں حضرت ﷺ کے اس خطاب کا از سر نو مطالعہ کیجیے اور اس میں غور کیجیے۔ آپ

دیکھیں گے کہ اس میں آں حضرت ﷺ کے دل کی دھڑکنیں اور لطیف احساسات موجود ہیں۔

اس رقت اور ان دھڑکنوں نے انصار کے احساسات کو چھولیا اور انہیں بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کے دلوں میں جو وسوسے اور اندیشہ ہائے دور دراز پیدا ہوئے تھے وہ سب کافور ہوگئے۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل آئے اور اموال غنیمت کی تقسیم میں ان کے حصے میں جو کچھ آیا تھا اس پر پھولے نہیں سمائے۔

مال، بھیڑ، بکریوں اور اموال غنیمت کی ان کے نزدیک کیا حیثیت ہے جب کہ ان کے حصے میں ان کے محبوب رسول اللہ ﷺ آئے ہیں۔ وہ آں حضرت ﷺ کے ساتھ اور آں حضرت ﷺ ان کے ساتھ واپس لوٹیں گے، تاکہ ان کا جینا اور مرنا ساتھ ساتھ ہو۔ آں حضرت ﷺ کی جانب سے وفا اور بے لوث محبت و مودت کی اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہوسکتی ہے کہ آپ اپنے وطن اور اپنی جنم بھومی کو خیر باد کہہ دیں اور زندگی کے بقیہ دن ان کے ساتھ گزاریں؟!

پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی میزان میں مال قدر افزائی اور محبت کی دلیل کہاں تھی؟! آپ نے قریش کو بہت سامال غنیمت عطا فرمایا.... لیکن کیا اپنے لیے بھی کچھ مال خاص کیا یا اپنا حصہ انصار کے حصے کی طرح رکھا؟ آپؐ نے صرف "خمس" (پانچواں حصہ) لیا جسے اللہ نے رسول کے لیے خاص کیا ہے اور اسے خرچ کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اور اسے بھی آپؐ نے ان بدوں کے درمیان تقسیم فرمادیا جو اس وقت آپ کے ارد گرد تھے۔

غور کیجئے کہ آپؐ نے ان بدوں سے کیا فرمایا؟ وہ آپؐ کو گھیرے ہوئے تھے اور آپؐ سے مزید عطیات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "لوگو۔ اللہ کی قسم! تمہارے مال فئی میں میرا صرف خمس (پانچواں حصہ) ہے اور اسے بھی میں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا ہوں۔"

اللہ کا درود و سلام ہو آپ پر اے میرے آقا، اے اللہ کے رسول، اور اس کی رحمتیں ہوں آپ کے پاکیزہ اور نیک صفات اصحاب انصار اور مہاجرین پر۔ اللہ ہمیں آپ کے جھنڈے تلے اکٹھا کرے اور ہمارا شمار ان لوگوں میں کرے جو قیامت کے دن حوض کوثر پر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کریں گے۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک کا سبب — جیسا کہ ابن سعد اور دیگر اصحاب سیر نے بیان کیا ہے — یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان نبطیوں سے، جو شام اور مدینہ کے درمیان تجارت کرتے تھے، یہ خبر ملی کہ رومیوں نے مسلمانوں سے جنگ کے لیے بہت بڑی فوج اکٹھا کی ہے اور لخم، جذام اور عرب کے دیگر عیسائی قبائل کو، جو رومی شہنشاہیت کے ماتحت تھے، شامل کر لیا ہے اور ان کے دستے بلقاء تک پہنچ چکے ہیں۔ نبی ﷺ نے لوگوں کو جنگ میں نکلنے کے لیے تیاری کرنے کا حکم دیا۔ طبرانی نے ابن حصین کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ روم کا لشکر چالیس ہزار جنگ جوؤں پر مشتمل تھا۔[95]

یہ غزوہ رجب ۹ھ میں پیش آیا۔ گرمی کا موسم تھا۔ گرمی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ لوگ عسرت اور تنگی میں تھے۔ مدینہ کے کھجور پک گئے تھے اور مزیدار ہوگئے تھے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ میں اعلان فرمادیا کہ انہیں کس سمت سفر کرنا ہے، حالانکہ دیگر غزوات میں آپؐ ایسا نہیں کرتے تھے۔ حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو جب تک اس کا وقت نہ آجاتا آپ صراحت سے یہ نہیں بتاتے تھے کہ کس سمت میں نکلنا ہے۔ غزوۂ تبوک شدید گرمی میں پیش آیا تھا، دور کا سفر تھا، راستہ پر خطر تھا اور دشمن کی بہت بڑی فوج تھی اس لیے آپؐ نے مسلمانوں کو پورے معاملے کی صاف صاف خبر دے دی تھی، تاکہ وہ غزوہ کی پوری تیاری کر سکیں۔"[96]

---

95 دیکھئے طبقات ابن سعد ۳/۲۱۸، فتح الباری ۸/۸۷

96 بخاری و مسلم

اس غزوہ کے لیے سفر، نفس پر بہت گراں تھا۔ اس میں شرکت بہت بڑی آزمائش اور امتحان تھا۔ اس لیے اس موقعے پر جہاں ایک طرف جابجا منافقین کے نفاق کا اظہار ہونے لگا وہیں دوسری طرف مومنین صادقین کا ایمان بھی عیاں ہو گیا۔

بعض منافقین ایک دوسرے سے کہنے لگے: "گرمی میں نہ نکلو" ایک منافق [۹۷] رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آکر کہنے لگا "مجھ کو تو معذور سمجھیے اور فتنے میں نہ ڈالیے۔ اللہ کی قسم! میری قوم خوب جانتی ہے کہ مجھ سے زیادہ عورتوں کا رسیا کوئی نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں بنو اصفر (یعنی رومیوں) کی عورتوں کو دیکھ لوں گا تو خود پر قابو نہ رکھ سکوں گا" رسول اللہ ﷺ نے اس سے منہ پھیر لیا اور اسے اجازت دے دی [۹۸] عبداللہ بن ابی نے مدینہ کے مضافات میں اپنے ساتھیوں اور حلیفوں کے ساتھ پڑاؤ ڈال دیا۔ جب نبی ﷺ تبوک کے ارادے سے مدینہ سے نکلے تو وہ اپنے تمام لوگوں کے ساتھ پیچھے رہ گیا۔

ان لوگوں کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ. (التوبہ:۸۱)

جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان ومال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا "کہ اس سخت گرمی میں نہ نکلو" ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ، اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا، وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكَافِرِيْنَ. (التوبہ:۴۹)

ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ "مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھ کو فتنے میں نہ ڈالیے" سن

---

[۹۷] اس منافق کا نام جد بن قیس تھا۔

[۹۸] اس روایت کو ابن اسحاق اور ابن مردویہ نے ضحاک عن ابن عباس کی سند سے اور عبدالرزاق نے معمر عن قتادہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ مزید دیکھئے الاصابہ ۱/۲۳۰

رکھو! فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔

رہے اہل ایمان تو وہ ہر چہار جانب سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقعے پر آپؐ نے اہل ثروت کو انفاق پر اکسایا اور انہیں ترغیب دی کہ سواری کے جانور دیں۔ بہت سے لوگوں نے اپنے مال واسباب پیش کیے۔ حضرت عثمانؓ تین سو اونٹ کجاوے کے ساتھ لے کر آئے۔ [۹۹] اس کے علاوہ ایک ہزار دینار لاکر آں حضرت ﷺ کی گود میں ڈال دیے۔ آپؐ نے فرمایا: "آج کے بعد عثمان جو کچھ کریں انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچے گا۔" [۱۰۰]

اس موقعے پر حضرت ابو بکرؓ نے اپنا پورا مال اور حضرتؓ عمر نے نصف مال پیش کیا۔ امام ترمذی نے زید بن اسلم سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں حکم دیا کہ ہم صدقہ کریں۔ اس وقت میرے پاس خوب مال تھا۔ میں نے سوچا: اگر میں کبھی ابو بکر سے بڑھ سکتا ہوں تو وہ آج کا دن ہو سکتا ہے (اگر آج میں نے یہ موقع گنوادیا تو پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا) میں اپنا نصف مال لے کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت کیا: گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا؟ میں نے عرض کیا: اتنا ہی۔ ابو بکرؓ کے پاس جو کچھ تھا سب لے آئے۔ آں حضرت ﷺ نے ان سے بھی دریافت فرمایا: ابو بکر گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: میں ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول چھوڑ کر آیا ہوں" میں نے کہا: میں کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔" [۱۰۱]

---

[۹۹] طبرانی، ترمذی، حاکم، احمد، بروایت عبدالرحمن بن خباب

[۱۰۰] اس حدیث کو امام ترمذی نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں عبدالرحمن بن سمرہ سے روایت کیا ہے۔

[۱۰۱] اسے ترمذی، حاکم اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ہشام بن سعد ہے۔ اس نے اس روایت کو زید بن اسلم سے روایت کیا ہے۔ ہشام کو امام احمد اور کسائی نے ضعیف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کا شمار پانچویں درجے میں کیا ہے اور اس کے بارے میں کہا ہے: "وہ سچا ہے لیکن بعض روایتوں میں اسے وہم ہو گیا ہے" ذہبی نے اس کے بارے میں ابو داؤد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "وہ معتبر ہے اگر زید بن اسلم سے روایت کرے جیسا کہ اس حدیث میں ہے۔" اسی طرح انہوں نے حاکم سے روایت کیا ہے کہ "امام مسلم نے بطور شواہد اس سے تخریج کی ہے۔"

اگر یہ حدیث صحیح ہے تو یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقعے کا معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ علماء کے ایک گروہ کا خیال ہے۔

کچھ مسلمان جنہیں "بکاؤون" (گریہ وزاری کرنے والے) کہا جاتا تھا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ سے سواریوں کا مطالبہ کرنے لگے، تاکہ آپؐ کے ساتھ وہ بھی جہاد میں شریک ہو سکیں۔ آپؐ نے ان سے فرمایا: "میرے پاس تمہارے لیے سواریوں کا بندوبست نہیں ہے۔" چنانچہ وہ مجبوراً واپس گئے اور ان کا حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی قدرت نہیں رکھتے۔

رسول اللہ ﷺ تقریباً تیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ نکلے۔[۱۰۲] اس موقعے پر چند مسلمان پیچھے رہ گئے حالانکہ ان کے ایمان واخلاص شبہ سے بالاتر تھے۔ ان میں حضرت کعب بن مالکؓ، حضرت مرارہ بن الربیعؓ، حضرت ہلال بن امیہ اور حضرت ابو خیثمہؓ بھی تھے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ یہ مخلص لوگ تھے اور ان کے اسلام میں کچھ بھی شبہ نہ تھا۔ ان میں سے حضرت ابو خیثمہؓ بعد میں رسول اللہ ﷺ سے تبوک میں جا ملے۔

طبرانی، ابن اسحاق اور واقدی نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تبوک روانہ ہوئے چند دن گزر گئے تھے کہ ایک دن جب سخت گرمی تھی، حضرت ابو خیثمہؓ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آئے۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں نے ان کے باغ میں خیمے لگا رکھے تھے۔ ہر ایک نے اپنے خیمے میں پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا، پینے کا پانی ٹھنڈا کر رکھا تھا اور ان کے لیے کھانا بنایا تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے اور اپنی بیویوں اور استقبال کے لیے ان کی تیاریوں پر نظر پڑی تو بول اٹھے: "رسول اللہ ﷺ شدید دھوپ اور تپش میں گرم ہوا کے تھپیڑے کھائیں اور ابو خیثمہ ٹھنڈی چھاؤں، لذیذ کھانے، حسین بیویوں اور مال ودولت کے ساتھ رہے، اللہ کی قسم! یہ انصاف نہیں ہے۔" پھر اپنی دونوں بیویوں کو مخاطب کر کے کہا: "اللہ کی قسم میں تم دونوں میں سے کسی کے خیمے میں نہیں آؤں گا جب تک کہ میں رسول اللہ ﷺ سے نہ ملوں۔" دونوں بیویوں نے ان کے لیے زاد راہ تیار کیا۔ وہ اپنے اونٹ پر سوار ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جا ملنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ اس وقت پہنچے جب رسول اللہ ﷺ نے تبوک

۱۰۲ اسے ابن سعد، ابن اسحاق اور دیگر اصحاب سیر نے روایت کیا ہے۔

پہنچ کر پڑاؤ ڈال دیا تھا۔ جب ابو خیثمہؓ قریب پہنچے تو مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کو خبر دی کہ اس راستے پر ایک سوار چلا آ رہا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ابو خیثمہ ہو سکتے ہیں" وہ اور قریب پہنچے تو صحابہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! واللہ، ابو خیثمہ ہیں" وہاں پہنچ کر انہوں نے اپنے اونٹ کو بٹھایا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے فرمایا: "ابو خیثمہ! تم پر افسوس ہے" انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنا پورا واقعہ سنایا تو آپؐ نے ان کے لیے دعائے خیر کی۔

اس سفر میں مسلمانوں کو سخت تکلیفیں اور مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

امام احمدؒ اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے کہ اس سفر میں دو دو تین تین آدمی پے در پے ایک اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ راستے میں انہیں شدید پیاس لگی اور پینے کے لیے پانی نہیں ملا تو اونٹوں کو ذبح کرنے لگے تاکہ ان کی اوجھ سے پانی حاصل کر کے پئیں۔"[۱۰۳]

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: "غزوہ تبوک کے موقع پر قحط کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کریں، ان کا گوشت کھائیں اور ان کی چربی استعمال کریں" آپؐ نے اجازت مرحمت فرمادی۔ تب حضرت عمرؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اگر یہ لوگ ایسا کریں گے تو سواریاں کم ہو جائیں گی۔ اس کے بجائے آپ ان کی ضرورت سے زائد زاد راہ منگوائیے اور اس میں برکت کی دعا کیجیے۔ شاید اس طرح ان کی غذائی ضرورت پوری ہو جائے۔" آپؐ نے ان کی تجویز مان لی۔ چمڑے کا ایک فرش منگوا کر بچھوایا۔ پھر صحابہ کو حکم دیا کہ جن جن لوگوں کے پاس ان کی ضرورت سے زائد زاد راہ ہو، لے آئیں۔ کوئی ایک لپ کھانا، کوئی ایک لپ کھجور اور کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا لے کر آیا۔ اس طرح فرش پر جو کچھ اکٹھا ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس میں برکت کی دعا کی پھر فرمایا: اسے اپنے اپنے برتنوں میں بھر لو۔ تمام صحابہ نے ان چیزوں کو اپنے برتنوں میں بھر لیا یہاں تک کہ پوری فوج میں ایک برتن بھی خالی نہ بچا۔ تمام صحابہ نے شکم سیر ہو کر کھایا، پھر بھی کچھ بچ رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس موقعے پر فرمایا: "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس

۱۰۳ اسے ابن سعد نے بھی اپنی طبقات میں روایت کیا ہے دیکھیے ۳/۲۲۰

حال میں حاضر ہو کہ اسے ان دونوں باتوں میں ذرا بھی شک نہ ہو وہ جنت سے محروم نہیں رہ سکتا۔" ۱۰۴

جب مسلمان تبوک پہنچے تو وہاں انہیں کوئی سازش دکھائی نہیں دی اور قتال کی نوبت نہیں آئی۔ دراصل جو لوگ مسلمانوں سے جنگ کے مقصد سے اکٹھے ہوئے تھے وہ مسلمانوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی روپوش اور منتشر ہو گئے۔ اس موقعے پر ایلہ کا حاکم یوحنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر مصالحت کی۔ جرباء اور اذرح کے لوگ بھی حاضر ہوئے اور انہوں نے جزیہ ادا کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں پروانۂ امن و مصالحت عطا فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کا لشکر حجر (قوم ثمود کے علاقوں) سے گزرا تو آپؐ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: "جب ان لوگوں کے مکانات میں داخل ہو جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو روتے ہوئے داخل ہو۔ اس ڈر سے کہ کہیں تم پر بھی وہی مصیبت نہ آجائے جو ان پر آئی تھی" پھر آپؐ نے اپنا سر ڈھک لیا اور سواری کی رفتار تیز کر دی یہاں تک وادی پار کر گئے۔ ۱۰۵

پھر نبی ﷺ مدینہ لوٹ آئے۔ جب مسلمان مدینہ کے بالکل قریب پہنچ گئے تو آں حضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: "یہ طیبہ ہے اور یہ جبل احد ہے۔ یہ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔" ۱۰۶

اس موقعے پر آپؐ نے صحابہ سے یہ بھی فرمایا: "مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم جہاں بھی گئے اور جو وادی بھی سر کی وہ تمہارے ساتھ تھے۔" صحابہ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! کیا مدینہ میں رہتے ہوئے؟" فرمایا: "ہاں مدینہ میں رہتے ہوئے۔ وہ عذر کی بنا پر تمہارے ساتھ نہیں جا سکے تھے۔" ۱۰۷

آں حضرت ﷺ کی مدینہ واپسی اسی سال رمضان میں ہوئی۔ اس طرح آپ تقریباً دو ماہ مدینہ سے باہر رہے۔

---

۱۰۴ اسے امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: "اس حدیث کو امام مسلم نے ابو کریب عن ابی معاویہ عن الاعمش کی سند سے روایت کیا ہے۔"

۱۰۵ بخاری و مسلم ۱۰۶ بخاری و مسلم ۱۰۷ بخاری و مسلم

پیچھے رہ جانے والوں کا معاملہ

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے مسجد تشریف لے گئے اور وہاں دو رکعت نماز ادا کی، پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے تشریف فرما ہوئے۔ جو لوگ غزوہ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قسمیں کھا کھا کر آپؐ سے معذرت کرنے لگے۔ یہ اسی ۸۰ سے کچھ اوپر لوگ تھے۔ آں حضرت ﷺ نے ان کی ظاہری معذرت قبول فرمائی اور اللہ سے ان کی مغفرت کی دعا کی۔ البتہ حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں کا معاملہ ملتوی کر دیا، یہاں تک کہ ان کی توبہ کی مقبولیت کے سلسلہ میں آیات نازل ہوئیں۔

حضرت کعبؓ نے اپنا واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"میرا واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں میں غزوہ تبوک میں شرکت کرنے سے قاصر رہا اس سے زیادہ اچھی اور فارغ البالی کی حالت میں کبھی نہیں تھا...... میں روزانہ اس ارادہ سے نکلتا کہ میں بھی ضروری سامان لے لوں، مگر بغیر کچھ لیے واپس آجاتا۔ میں اپنے دل میں کہتا: ابھی کیا ہے، جب چاہوں گا، لے لوں گا۔ اسی طرح بات ٹلتی رہی، یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ اور مسلمان کوچ کر گئے اور اس وقت تک میری کچھ بھی تیاری نہ ہو سکی تھی۔ میں برابر اسی لیت و لعل میں رہا اور لشکر تیز رفتاری سے آگے بڑھتا رہا اور معاملہ بہت آگے نکل گیا۔ میں نے اس کے بعد بھی ارادہ کیا کہ روانہ ہو کر لشکر کو جا لوں ــــ اور کاش میں نے ایسا کیا ہوتا ــــ لیکن مجھے اس کی توفیق نہیں ہوئی، اس زمانے میں جب کہ میں مدینہ میں رہا، میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بہت کڑھتا تھا کہ اس موقع پر مدینہ میں صرف وہی لوگ نظر آتے تھے جو منافق یا ضعیف اور معذور تھے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ آپؐ واپس تشریف لا رہے ہیں تو میں فکر مند ہو گیا اور جھوٹ کا خیال دل میں لانے لگا۔ میں کہنے لگا کہ کل آپؐ کی ناراضی سے کس طرح بچوں گا؟!... اس سلسلے میں میں نے اپنے گھر کے ہر صاحب رائے سے مشورہ کیا، مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لا چکے ہیں تو جھوٹ بولنے کا خیال کافور ہو گیا اور میں نے سچ بولنے کا تہیہ کر

لیا۔ میں نے خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کیا۔ مجھے دیکھ کر آپ خفگی کے انداز میں مسکرائے اور فرمایا: آؤ۔ میں آگے بڑھ کر آپؐ کے روبرو بیٹھ گیا۔ آپؐ نے فرمایا: تم کیوں پیچھے رہ گئے تھے؟ کیا تم نے سفر کے لیے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے عرض کیا: "جی ہاں، اللہ کی قسم، اگر میں آپ کے علاوہ کسی اور کے سامنے حاضر ہوا ہوتا تو ضرور کوئی نہ کوئی عذر بنا کر اس کی ناراضی سے بچ جاتا، باتیں بنانا تو مجھے خوب آتی ہیں، لیکن اللہ کی قسم مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپ کو راضی کر بھی لیا تو اللہ ضرور آپ کو مجھ سے ناراض کر دے گا۔ البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت پیدا فرما دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے کوئی عذر نہ تھا۔ اللہ کی قسم! جس وقت میں پیچھے رہ گیا تھا اس سے زیادہ کبھی صحت مند اور فارغ البال نہ تھا۔" اس پر آں حضرت ﷺ نے فرمایا: یہ شخص ہے جس نے سچ بات کہی ہے۔ اچھا اٹھ جاؤ اور انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے معاملے میں کوئی فیصلہ کر دے۔ میں اٹھ گیا۔ میرے قبیلے بنو سلمہ کے لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ میرے پیچھے پڑ گئے اور دوسروں کی طرح کوئی عذر نہ پیش کرنے پر مجھے ملامت کرنے لگے۔ میں نے ان لوگوں سے دریافت کیا کہ کیا میرے ہی جیسا سلوک اور لوگوں کے ساتھ ہوا ہے؟ انہوں نے بتایا: ہاں دو لوگوں نے تمہاری ہی جیسی بات کہی تھی، اس لیے ان کو بھی وہی حکم دیا گیا ہے جو تم کو دیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا: وہ کون ہیں؟ لوگوں نے بتایا: مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ۔ یہ دونوں نیک آدمی تھے۔ دونوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ ان کا اسوہ اختیار کیا جا سکتا تھا..... رسول اللہ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو ہم تینوں آدمیوں سے بات چیت کرنے سے منع کر دیا تھا اور ہمارے بائیکاٹ کا حکم دیا تھا۔ لوگ ہم سے کترانے لگے تھے اور ہمارے بارے میں ان کا رویہ بالکل بدل گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے اور یہاں میں اجنبی ہوں۔ اسی حالت میں ہم نے پچاس راتیں گزار دیں۔ میرے دونوں ساتھی تو گھر بیٹھ رہے اور رو رو کر وقت کاٹنے لگے۔ میں نوجوان اور تنو مند تھا، میں باہر نکلتا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا، بازاروں میں چلتا پھرتا، مگر کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ نماز کے بعد آپؐ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سلام کرتا، پھر سوچتا کہ جواب میں آپ کے ہونٹ ہلے ہیں یا نہیں؟ پھر میں آپؐ

کے قریب ہی نماز پڑھنے لگتا۔ دوران نماز نظریں چرا کر آپ کو دیکھتا کہ آپ کی نگاہیں مجھ پر کیسی پڑتی ہیں؟ جب تک میں نماز میں محو ہوتا آپؐ میری طرف دیکھتے رہتے اور جوں ہی میری توجہ آپ کی طرف ہوتی آپ نگاہیں پھیر لیتے۔ انہی دنوں ایک روز میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک شخص جو غلہ بیچنے مدینہ آیا ہوا تھا، پکار پکار کہہ رہا تھا: "کوئی مجھے کعب بن مالک کا پتا بتا دے۔" لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے۔ میرے پاس آکر اس نے مجھے شاہِ غسان کا خط دیا جس میں لکھا ہوا تھا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے صاحب نے تمہارے ساتھ جفا کا معاملہ کیا ہے۔ تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو، نہ اس لائق ہو کہ تمہیں ضائع کر دیا جائے۔ تم ہمارے پاس آ جاؤ، ہم تمہارے ساتھ اچھا معاملہ کریں گے" خط پڑھ کر میں نے کہا: "یہ ایک اور بلا نازل ہوئی۔" میں ایک تنور کے پاس گیا اور اس خط کو اس میں جھونک دیا۔

چالیس دن اسی حالت میں گزر گئے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کا ایک قاصد میرے پاس آیا اور اس نے کہا: "رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جاؤ۔" میں نے کہا: کیا طلاق دے دوں؟ جواب ملا: نہیں بس الگ ہو جاؤ۔ یہی حکم آپؐ نے بقیہ دونوں لوگوں کو بھی دیا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ کا فیصلہ کر دے..... اس حالت میں دس راتیں مزید گزر گئیں اور ہمارے بائیکاٹ کو پچاس راتیں مکمل ہو گئیں۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور میری حالت ویسی ہی تھی جس کا نقشہ قرآن نے کھینچا ہے۔ میں اپنی جان سے بے زار تھا اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود میرے اوپر تنگ تھی کہ یکایک میں نے ایک شخص کی آواز سنی جو جبل سلع پر چڑھ کر زور سے پکار رہا تھا "مبارک ہو کعب بن مالک" یہ سنتے ہی میں سجدے میں گر پڑا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم آگیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد ہم لوگوں کی توبہ کے بارگاہ الٰہی میں مقبول ہونے کا اعلان فرمایا۔ یہ سنتے ہی لوگ ہمیں اس کی خوش خبری دینے کے لیے آنے لگے اور ہمارے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی گئے۔ جب وہ شخص جس نے پہاڑی پر چڑھ کر مجھے خوش خبری دی تھی، میرے پاس آیا تو جو جوڑا میں اس وقت زیب تن کیے ہوئے تھا اسے اتار کر میں نے اسے انعام میں دے دیا۔ اس وقت میرے پاس یہی جوڑے تھے۔ میں نے

ایک جوڑا عاریۃً لے کر پہنا اور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لیے چلا۔ راستے میں لوگ جوق درجوق مجھ سے ملتے اور قبولیتِ توبہ پر مجھے مبارک باد دیتے۔ میں مسجد نبوی میں داخل ہوا تو دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں اور لوگ آپ کے گرد حلقہ بنائے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی طلحہ بن عبیداللہؓ بھاگتے ہوئے آئے، مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ ان کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی نہیں اٹھا۔ میں طلحہ کا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا۔ اس وقت آپ کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "مبارک ہو۔ آج کا دن تمہاری زندگی کا سب سے بہتر دن ہے۔" میں نے عرض کیا: یہ معافی آپ کی طرف سے ہے اے اللہ کے رسول! یا اللہ کی طرف سے ہے؟ فرمایا: اللہ کی طرف سے ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! قبولیتِ توبہ پر میری خواہش ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے لیے اپنا سارا مال خیرات کردوں۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: بہتر ہے کہ کچھ مال روکے رکھو۔ میں نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول! میری نجات صرف سچ بولنے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اب میں آئندہ زندگی میں بھی ہمیشہ سچ بولوں گا۔" اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئی:

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ إِنَّهُ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا أَنْ لَّا مَلْجَأَ مِنَ اللّٰهِ إِلَّا إِلَيْهِ، ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا إِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ. (التوبہ: ۱۱۷-۱۱۹) [۱۰۸]

اللہ نے معاف کردیا نبی کو اور ان مہاجرین وانصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چکے تھے (مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا بلکہ نبی کا ساتھ دیا تو) اللہ نے انہیں معاف کردیا۔ بے شک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت ومہربانی کا ہے۔ اور ان تینوں

[۱۰۸] بخاری، مسلم (باختصار)

کو بھی اس نے معاف کردیا جن کے معاملہ کو ملتوی کردیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامن رحمت کے سوا نہیں ہے تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ کر آئیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

دروس ونصائح

ا۔ غزوۂ تبوک میں جنگ نہ ہونے کی حکمت:

اسلام کو جزیرۃ العرب میں استقرار ملنے لگا تھا اور اس کا اقتدار دلوں اور جسموں پر قائم ہو رہا تھا۔ اس چیز کو روم کے نصاریٰ دور سے خوف اور تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔

رومیوں نے نصرانیت کو اس لیے نہیں قبول کیا تھا کیونکہ وہ سچے دل سے اس پر ایمان لائے تھے، بلکہ اسے انہوں نے اس علاقہ کی قوموں کو زیر نگیں کرنے کے لیے ذریعہ بنایا تھا۔ اس بنا پر انہوں نے اس کے ساتھ حسب منشا خوب کھلواڑ کیا تھا، اس میں خوب ہیر پھیر کی تھی، اس کی بچی تعلیمات میں اپنی بت پرستی کی آمیزش کردی تھی اور بہت سی بے بنیاد اور باطل چیزوں کا اضافہ کردیا تھا۔

اسلام — جس کی طرف تمام انبیاء ورسل دعوت دیتے آئے ہیں — اس لیے آیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگر ہر اقتدار کی ماتحتی سے نکال دے اور ان پر اللہ کے حکم کے علاوہ کسی کا حکم اور اللہ کے اقتدار کے علاوہ کسی کا اقتدار نہ چلے۔

یہ رومی جنھیں نصرانیت کے تمام حقائق کا علم تھا، اس اخیر پیغام کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، اور انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کی تہہ میں سرکشوں کی حکومت، زور آوروں کے اقتدار اور باغیوں کی بغاوت کے خلاف کتنی زبردست دھمکی موجود ہے۔

اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دین سے، جسے جزیرۃ العرب میں استقرار مل گیا تھا، روم کے ان سرکشوں اور ان کے متبعین کو سخت تشویش لاحق ہو۔ یہ وہ لوگ

تھے جنہوں نے محض دکھاوے کے لیے نصرانیت قبول کر رکھی تھی، ورنہ حقیقت میں اس سے ان کا مقصد کمزور لوگوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنا تھا۔

اسی وجہ سے انہوں نے مکہ کی فتح اور جزیرۃ العرب میں اسلام کے غلبے کی خبر کو خوف کے ساتھ سنا، پھر شام اور حجاز کے درمیان اپنی فوجیں جمع کرنے لگے۔ شاید کہ اس طرح اس دین کی پیش رفت میں رکاوٹ ڈال سکیں، کیونکہ اس کی اشاعت سے ان کا اور ان کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔

رومیوں کی اس تیاری کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان زبردست جھڑپ ہو۔ لیکن اللہ کی حکمت یہ ہوئی کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کا جانی نقصان نہ ہو، بلکہ انہیں صرف مدینہ سے تبوک تک طویل اور تھکا دینے والی مسافت طے کرنے اور وہاں سے واپس آنے میں شدید جسمانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں۔ پیچھے گزرا کہ مشقتوں، پریشانیوں اور تنگیوں کے اعتبار سے یہ ایک عجیب وغریب سفر تھا۔ جہاد جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کے علاوہ اور کیا ہے؟ کیا یہ اللہ کے دین اور شریعت کی راہ میں جان ومال کی قربانی کے علاوہ کسی اور چیز کا نام ہے؟ یقیناً اللہ اپنے بندوں سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ معاذ اللہ اس کے ذریعے اس کا مقصد کافروں کی سازشوں کا توڑ کرنے یا منکرین کے دلوں میں ہدایت اور ایمان داخل کرنے کے لیے ان کی مدد حاصل کرنا نہیں ہے۔

اس پُر مشقت غزوہ میں شریک ہونے والوں نے اپنا مال خرچ کیا اور پریشانی اٹھائی۔ انہوں نے عیش وآرام کے بہترین اوقات میں اپنا آرام تج دیا اور اس کے بجائے سخت تکلیفیں اٹھانی گوارا کرلی۔ اس طرح انہوں نے اللہ پر ایمان اور اس سے محبت کی سچائی کا ثبوت پیش کیا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے بہرہ ور ہوئے۔ اس نے ان کے دشمنوں کے دلوں میں ان کا رعب ڈال دیا اور جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی، اس سے پہلے ہی وہ منتشر ہو گئے۔

اس طرح جب مسلمانوں نے اپنے رسول ﷺ کے ساتھ خوشنودیٔ رب کے لیے تکلیف اٹھائی تو رومی بہت آسانی سے جزیہ دینے پر تیار ہو گئے اور اس کی شروط وقیود کو تسلیم کرلیا۔

۲۔ جہاد بالمال کی اہمیت:

دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد صرف جنگ کے لیے نکلنے میں محصور نہیں ہے اور اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اگر کسی موقعے پر جہاد بالسیف کے لیے انفاق اور مالی قربانی کی ضرورت ہو تو تمام مسلمانوں پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے اتنا مال پیش کریں جس سے وہ ضرورت پوری ہو جائے۔ ہر مسلمان پر اس کے حسب حیثیت انفاق لازم ہے۔

فقہاء نے بیان کیا ہے کہ حکومت اگر کسی موقع پر جہاد کے لیے سرمایہ فراہم کرنے پر مجبور ہو جائے تو اسے اختیار ہے کہ مذکورہ بالا صورت میں بقدر ضرورت لوگوں پر مال کی ادائیگی لازم کردے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے بالاتفاق یہ شرط بھی عائد کی ہے کہ حکومت اپنا مال غیر ضروری یا ناجائز کاموں میں نہ خرچ کرتی ہو۔ اس لیے کہ فوج کی ضرورتوں اور جنگ کے لیے، حکومت کے اموال کے بجائے لوگوں کے اموال خرچ کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔

پیچھے گزرا کہ کس طرح حضرت عثمانؓ نے تین سو اونٹ کجاوہ کے ساتھ اور دو سو اوقیہ چاندی لا کر نبی ﷺ کی خدمت میں پیش کی۔ اس موقعے پر آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "آج کے بعد عثمان جو کچھ کریں انہیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔" اس سے حضرت عثمانؓ کی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس جملہ میں ان لوگوں کے لیے زجر وتوبیخ موجود ہے جو حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں ان کی سیاست پر تنقید کرتے ہوئے زبانِ طعن دراز کرتے ہیں۔ وہ ان کی سیاست میں ضعف یا جانب داری کے مظہر پر صفحات کے صفحات لکھ ڈالتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ طریقہ اپناتے ہیں جو مستشرقین ہی کو زیب دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک متعین اور معروف مقصد تک رسائی کے لیے اسلامی تاریخ پر تنقید اور بہتانوں کی بارش کرتے ہیں۔

یہ لوگ جو پارسائی کے بلند برجوں میں رہتے ہیں، تاکہ وہاں سے حضرت عثمانؓ اور ان کی سیاست پر حکم لگا سکیں، انہیں اس کی زیادہ ضرورت ہے کہ اپنے مختلف امراض کا پتا لگائیں، پھر اس خلیفۂ عظیم کے مناقب کا مطالعہ کرکے اور ان کی سیرت اور کردار سے فیض اٹھا کر ان کا علاج کریں۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں کچھ بھی کیا ہو لیکن جو شخص ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سنے "آج کے بعد عثمان جو کچھ کریں انہیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا" اس کے بعد بھی وہ ان پر تنقید کرے اور ان کی سیاست کو غلط قرار دے تو اس نے ان کا کیا ادب ملحوظ رکھا؟!

۳۔ حضرت ابو بکرؓ کے واقعہ میں من گھڑت اضافہ:

ہم نے پیچھے ترمذیؒ اور ابوداوٗدؒ کی روایت کردہ یہ حدیث ذکر کی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنا سارا مال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کردیا اور جب آپؐ نے دریافت کیا کہ "اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑا ہے؟" تو جواب دیا کہ "میں ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر آیا ہوں۔"

بعض لوگوں نے اس حدیث میں یہ اضافہ گھڑلیا ہے کہ "نبی ﷺ نے ان سے فرمایا: اے ابو بکر! اللہ تم سے راضی ہے، کیا تم بھی اس سے راضی ہو؟" یہ سن کر ان پر سرور اور وجد طاری ہوگیا، وہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے رقص کرنے لگے اور کہتے جاتے تھے "میں کیونکر اللہ سے راضی نہ ہوں گا؟!" پھر اس گھڑے ہوئے اضافے کو وہ ذکر کے حلقوں میں رقص اور سرمستی کی مشروعیت کی دلیل قرار دیتے ہیں، جیسا کہ "مولویہ" اور متصوفین کے دیگر فرقے کرتے ہیں۔

یہ لوگ جو دلیل پیش کرتے ہیں وہ سراسر گھڑی ہوئی ہے۔ کسی صحیح یا ضعیف حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے ایسا کیا تھا۔ اس سلسلے میں جو کچھ مروی ہے اسے میں ترمذیؒ، حاکمؒ اور ابوداوٗدؒ کے حوالے سے پیچھے بیان کرچکا ہوں۔ اس میں بھی ضعف کے احتمالات ہیں جنہیں حدیث کی تخریج کے ضمن میں بیان کردیا گیا ہے۔

رہا دلول تو اس کے بارے میں ہم صرف یہی نہیں کہیں گے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی حرمت پر دلیل موجود ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

جمہور کی متفقہ رائے ہے کہ رقص اگر اعضائے بدن کو حرکت دے کر اور مٹکا کر ہو تو حرام اور اگر اس کے بغیر ہو تو مکروہ ہے۔ بہر حال اس کی جو بھی کیفیت ہو اسے ذکر الٰہی میں شامل کرنا عبادت میں مکروہ یا حرام فعل کو زبردستی داخل کرنا ہے، اور اس کو بلا دلیل ایک ایسی عبادت کا درجہ دے دینا ہے جس کے ذریعے اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ یہ "ذاکرین" اپنے منہ سے ایسی آوازیں نکالتے ہیں جن کا ذکر کے الفاظ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بلکہ حلق سے موٹی اور بھدی آوازیں نکال کر وہ ایسی گونج پیدا کرنا چاہتے ہیں جو گانے بجانے اور قوالی کرنے والوں کی آواز سے ہم آہنگ ہوسکے اور اس طرح لوگوں کے دلوں میں مزید طرب اور مدہوشی پیدا ہو۔

پھر یہ عمل کیوں کر اللہ تعالیٰ کا ویسا ذکر ہوسکتا ہے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے اور جسے رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے اصحاب انجام دیتے تھے؟! اور یہ عمل کیوں کر عبادت قرار پاسکتا ہے، جب کہ عبادت — جیسا کہ آپ جانتے ہیں — اس چیز کا نام ہے جس کا اللہ تعالیٰ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت میں حکم دیا گیا ہو۔ اور نہ اس پر کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہو، نہ کچھ کمی کی جاسکتی ہو؟!

ہماری اس بات پر مختلف زمانوں میں اسلامی شریعت کے تمام علماء کا اتفاق رہا ہے۔ اس سے ہٹ کر کسی نے کوئی بات نہیں کہی ہے۔ سوائے ایک انتہائی مختصر گروہ کے جو بدعت کا شکار ہے۔ انہوں نے دین میں ایسی چیزوں کو شامل کرلیا ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا۔ انہوں نے دین کے نام پر نہ جانے کتنے حرام کاموں کو حلال کرلیا ہے اور کتنی موجب ہلاکت چیزوں کا ارتکاب کر بیٹھے ہیں۔ انہیں وہ کبھی وجد کا نام دیتے ہیں اور کبھی فرائض کے مکلف ہونے سے آزادی قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہاں ہم ایک ایسے عالم کا قول نقل کرتے ہیں جن کا شمار دین، علم، ورع و تقویٰ اور تصوف و زہد ہر اعتبار سے مسلمانوں کے عظیم ائمہ میں ہوتا ہے، اور وہ ہیں عزبن عبدالسلامؒ۔ وہ فرماتے ہیں:

> "جہاں تک رقص کرنے اور تالی بجانے کا معاملہ ہے تو یہ ہلکے پن اور کم عقلی کی دلیل ہے اور یہ عورتوں کے عمل کے مشابہ ہے۔ اسے وہی مرد کرسکتا ہے جو بے وقوف، بناوٹی اور جھوٹا ہو۔ اور جس شخص کی عقل گم ہوگئی ہو اور ذہن کام نہ کررہا ہو وہ گانوں کے زیر و بم کے ساتھ کیوں کر رقص کرسکتا ہے؟ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے: سب سے بہتر لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں" اور ان لوگوں میں سے کوئی بھی ایسے کام نہیں کرتا تھا۔"[۱۰۹]

ایسی ہی بات ابن حجر نے اپنی کتاب "کف الرعاع" میں اور ابن عابدین نے اپنے مشہور حاشیہ میں جسے حضرات احناف معتبر سمجھتے ہیں، کہی ہے۔ انہوں نے فطری وجد اور بناوٹی وجد میں فرق کیا ہے۔

۱۰۹۔ قواعد الاحکام فی مصالح الانام ۲/۱۸۶

رہے امام قرطبیؒ تو انہوں نے اس بدعت سے ہوشیار کرنے اور اس کی حرمت بیان کرنے کے لیے بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بحث کے لیے ان کی تفسیر میں درج ذیل آیات کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا. (آل عمران :۱۹۱)

جو خدا کو یاد کرتے ہیں اٹھتے بیٹھتے....الخ)

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا.

(الاسراء: ۳۷)

زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

اگر غیر ضروری طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اس موضوع پر بہت سے ائمہ کے نصوص پیش کرتا، جن سے بالکل عیاں ہو جاتا کہ یہی بات برحق ہے۔ اس پر سلف و خلف کے تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔ اس سے کسی کا اختلاف نہیں ہے۔[۱۱۰]

[۱۱۰] میرے اس نقطہ نظر پر بعض حضرات تعجب کا اظہار کریں گے۔ ان کا یہ تعجب مسلمان کے مطلوبہ رویہ کے بارے میں غلط تصور کا نتیجہ ہے۔ مسلمان کے شایانِ شان یہ ہے کہ وہ کسی بھی چیز کی تحقیق کرتے وقت اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو اپنے پیش نظر رکھے اور اپنے نفس اور فکر پر ان دونوں کے علاوہ کسی چیز کو اثر انداز نہ ہونے دے۔ خواہ اس کا نتیجہ تحقیق کسی کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو۔ میں نے بھی اسی کی کوشش کی ہے۔

زیر بحث مسئلہ میں میں نے بہت سے مسلمان عوام اور صوفیوں کی مخالفت کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حضرات میں سے بہت سوں کی نیت صحیح ہوگی، لیکن محض نیت کی درستگی اس بات کا جواز فراہم نہیں کرتی کہ نصوص یا اصول سے تجاوز کیا جائے، یا ان کی بے جا تاویل کی جائے۔ اگر مسلمان اس میزان کے واسطے سے حق کی اتباع کریں تو ان کے مختلف گروہوں کے مابین رائے اور اجتہاد کا اختلاف تو ہوگا لیکن ان کے درمیان جھگڑے، کشمکش اور آویزشیں نہیں ہوں گی۔ یہ عصبیت اور غلو ہی ہے جس نے مسلمانوں کو اس پست مقام تک پہنچا دیا ہے۔ صوفیہ دین کے معاملے میں غلو اور بدعتوں کا شکار ہیں جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو برسرِ حق اور دوسروں کو برسرِ باطل سمجھتے ہیں۔ کسی معاملے میں غلو کے نتیجے میں دوسرا غلو پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کے دین اور اس کے رسول کے طریقہ کی حمایت اور مدافعت چاہتا ہے اسے ہر طرح کے غلو، اختراع اور بدعت کی جڑ کاٹ دینی چاہیے۔ یہی بہترین علاج ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا حکم کے عموم سے یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ ذاکر اپنے آپے سے باہر ہو جائے اور اس پر ایسا حال طاری ہو جائے کہ اپنے شعور کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ ایسی صورت میں انسان مکلف نہیں رہتا ہے۔ اسی پر اس بیان کو محمول کیا جائے کہ خود عز بن عبد السلام ایک مرتبہ ایسے وجد میں آئے کہ بے قابو ہو کر اچھلنے کودنے لگے۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہ اپنے قصد و ارادہ سے ایسا کیوں کر کرتے جب کہ خود انہوں نے اسے بے عقلی قرار دیا ہے اور اس کی مخالفت کی ہے۔[۱۱۱]

۴۔ منافقین کا مزاج اور اسلام کے خلاف ان کی سازشیں:

کتاب اللہ میں اس غزوہ کو جتنی اہمیت دی گئی ہے اتنی کسی اور غزوہ کو حاصل نہیں ہوئی ہے۔ سورۂ توبہ میں اس کے بارے میں متعدد آیات بلکہ بہت سے صفحات ہیں۔ بیشتر آیات میں اللہ کی راہ میں جان اور مال کے ذریعے جہاد کی اہمیت بیان کی گئی ہے، اور واضح کیا گیا ہے کہ یہی مسلمان کے اسلام کی صداقت کی واحد دلیل اور مومنین اور منافقین کے درمیان بنیادی فرق ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ اگر وہ واقعی مسلمان ہیں تو عیش و آرام تج دیں اور اللہ کی راہ میں جو تکلیفیں اور پریشانیاں آتی ہیں انہیں ہیچ سمجھیں۔ اسی طرح ان آیات میں منافقین کے بارے میں تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان کی سازشوں اور پوشیدہ مقاصد کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔

اس سے مقصود یہ ہے کہ ہر زمانے کے مسلمانوں پر نفاق اور اہل نفاق کی خطرناکی عیاں کر دی جائے، اور واضح کر دیا جائے کہ اسلام ایک دعویٰ ہے اور ضروری ہے کہ جہاد اور آزمائشوں کے ذریعے اس کی تصدیق ہو، یہاں تک کہ سچے اور جھوٹے الگ الگ ہو جائیں اور مومنین کا ایمان منافقین کے دجل و فریب سے ممتاز ہو جائے۔ غزوۂ تبوک نے اس قرآنی درس کے لیے ایک عظیم بنیاد فراہم کر دی۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جانب سے مسلمانوں کی شدید آزمائش ہوئی۔ اس آزمائش نے مدینہ میں نفاق کو بالکل بے نقاب کر دیا اور منافقین کو سچے مسلمانوں سے بالکل الگ چھانٹ کر رکھ دیا۔ پھر کتاب اللہ کی آیات نازل ہوئیں جن میں ان کے

[۱۱۱] ملاحظہ کیجیے کتاب کف الرعاع ص ۴۸ برحاشیہ الزواجر لابن حجر

جرائم کی فہرست پیش کی گئی اور ان کے خفیہ منصوبوں کو مسلمانوں کے سامنے واشگاف کیا گیا تاکہ وہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ ان سے ہوشیار رہیں۔ ان کے بارے میں نازل ہونے والی چند آیات یہ ہیں:

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ، فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ، فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَائِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِيْنَ. (التوبہ:۸۱۔۸۳)

جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ "اس سخت گرمی میں نہ نکلو" ان سے کہہ دو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے، کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔ اب چاہیے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کر دیں اور روئیں زیادہ، اس لیے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزا ایسی ہی ہے (کہ انہیں اس پر رونا چاہیے) اگر اللہ ان کے درمیان تمہیں واپس لے جائے اور آئندہ ان میں سے کوئی گروہ جہاد کے لیے نکلنے کی تم سے اجازت مانگے تو صاف کہہ دینا "اب تم میرے ساتھ ہرگز نہیں چل سکتے اور نہ میری معیت میں کسی دشمن سے لڑ سکتے ہو۔ تم نے پہلے بیٹھ رہنے کو پسند کیا تھا اب گھر بیٹھنے والوں ہی کے ساتھ بیٹھے رہو۔

ان آیات کے سیاق و سباق کو دیکھیے تو آپ پائیں گے کہ ان میں منافقین کا تذکرہ غیر معمولی اہتمام سے کیا گیا ہے اور ان کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے ہوشیار کیا گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کو اکثر اوقات منافقین ہی کی وجہ سے ہزیمتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ ان کے دشمن کو نفاق اور منافقین کے درزوں ہی سے دراندازی کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنے دشمن سے اس طرح دھوکہ نہیں کھاتے جس طرح اپنی صفوں میں موجود منافقوں سے دھوکہ کھا جاتے ہیں اور محض انہی کی وجہ سے ضعف، اضمحلال اور انتشار جیسے امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

کا ارشاد ہے:

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَوْضَعُوْا خِلَالَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ. (التوبہ:۴۷)

اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے تو تمہارے اندر خرابی کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان فتنہ پردازی کے لیے دوڑ دھوپ کرتے۔ اور تمہارے گروہ کا حال یہ ہے کہ ابھی ان میں سے بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو ان کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

منافقین کی خطرناکی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کا نام لے کر اسلام سے جنگ کرتے ہیں، اس کے ہتھیار سے اس کے خلاف سازشیں کرتے ہیں، اصلاح، لچک اور روح شریعت کی پاسداری کے نام پر اس کے احکام کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل یا اپنے آقاؤں اور خداوندانِ نعمت کا تقرب حاصل کرنے کے لیے جھوٹے اور نام نہاد فتوے گھڑ کر پیش کرتے ہیں۔

اس سے مسلمانوں کو یہ درس حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے بیرونی دشمنوں سے ایک بار ہوشیار رہیں تو اپنی صفوں میں پائے جانے والے منافقین سے ایک ہزار بار ہوشیاری برتیں، اور سب سے پہلے اپنے درمیان پنپنے والے نفاق کا صفایا کریں۔

۵۔ جزیہ کا مفہوم اور اس کی مشروعیت کی حکمت:

رسول اللہ ﷺ جب تبوک پہنچے تو رومی چھپ گئے اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ اس موقع پر عیسائیت قبول کر لینے والے بعض عرب قبائل کے سردار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جزیہ کی شرط پر آپؐ سے مصالحت کر لی۔ آں حضرت ﷺ نے انہیں مصالحت کی دستاویز عطا فرمائی۔

جزیہ اہل کتاب سے لیا جانے والا مالی ٹیکس ہے۔ اس کی وہی حیثیت ہے جو مسلمانوں کے تعلق سے زکوٰۃ کی ہے۔ دونوں کے درمیان بس یہ فرق ہے کہ جزیہ محض قضا کی بنیاد پر عائد ہوتا ہے جب کہ زکوٰۃ کی مشروعیت کی بنیاد مذہب اور قضا دونوں پر ہے۔

جن لوگوں پر جزیہ عائد ہوتا ہے وہ اسلامی معاشرے میں اسلام کے قضائی حکم میں داخل سمجھے جاتے ہیں، خواہ وہ اسے بطور عقیدہ تسلیم نہ کرتے ہوں۔ اسی لیے ان پر لازم ہوتا ہے کہ اس کے عام احکام و قوانین میں سے کسی چیز کی علانیہ مخالفت نہ کریں الّا یہ کہ ان کے دعویٰ کے مطابق اس کے برخلاف ان کے مذہب میں جائز ہو مثلاً شراب نوشی وغیرہ۔

جزیہ کے معاملے میں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب مثلاً ملحدین اور بت پرستوں کے درمیان فرق اس وجہ سے کیا گیا ہے کیونکہ اہل کتاب اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اسلامی معاشرے اور اس کے عام نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، رہے ملحدین، بت پرست اور ان جیسے دیگر لوگ تو ان کے اور اسلامی معاشرے کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے جو ہم آہنگی کی ضامن ہو۔ الحاد و بت پرستی اور اسلامی نظام کے درمیان بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں، اس لیے دونوں میں کسی بھی معاملے میں ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔

۶۔ گزشتہ قوموں کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے وقت مسلمان کا رویہ:

رسول اللہ ﷺ نے قوم ثمود کے علاقے سے گزرتے ہوئے صحابہ کرام کو جو ہدایت فرمائی اس سے اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان جب ان گزشتہ قوموں کے (جنہیں اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے تباہ و برباد کردیا) علاقوں میں جائے یا ان کے آثار سے گزرے تو اسے چاہیے کہ ان کے حال سے عبرت حاصل کرے، ان کے انجام کے بارے میں غور و فکر کرے اور اللہ سے اپنے اور تمام مسلمانوں کے لیے عافیت اور رحمت کا خواستگار ہو۔ یہ ایسے مساکن ہیں جنہوں نے غضب الٰہی کا مشاہدہ کیا ہے۔ ان کے کھنڈرات پر اس غضب کے آثار نقش ہیں۔ یہ آثار ان پر تاقیامت باقی رہیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر ان آثار کو اس لیے باقی رکھ چھوڑا ہے تاکہ اصحاب بصیرت اور اہل دانش ان سے عبرت حاصل کریں، جیسا کہ بہت سی قرآنی آیات میں یہ وضاحت کی گئی ہے۔ اس لیے یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ انسان ان پر سے بے پروائی کے ساتھ گزر جائے، اور ان کے ظاہری منظر، بناوٹ اور نقوش کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف اس کی توجہ منعطف نہ ہو۔

روئے زمین پر اس قبیل کی عبرت و نصیحت کی بہت سی چیزیں ہیں جو زبانِ حال سے

لوگوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اے دیدۂ بینا رکھنے والو! عبرت حاصل کرو۔ لیکن لوگ ان کی پکار نہیں سنتے۔ انہیں دیکھ کر ان کے دلوں میں وہی خیالات آتے ہیں جن کا ان کے شیاطین القا کرتے ہیں اور ان کے فنی مظاہر اور اثری اور تاریخی اہمیت کے علاوہ اور کسی چیز کی طرف ان کا ذہن نہیں جاتا۔

۷۔ منافقین اور سچے اہل ایمان کے ساتھ نبی ﷺ کے مختلف رویے:

اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ آں حضرت ﷺ نے منافقین اور اپنے سچے مومن اصحاب کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیوں فرمایا؟

اس غزوہ میں بہت سے منافقین شریک نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مختلف عذر تراشے۔ آپؐ نے ان سے درگزر فرمایا، ان کی ظاہری معذرتوں کو قبول فرمایا اور ان کے دل کا معاملہ اللہ کے حوالے کردیا۔ اہل ایمان کی بھی ایک مختصر تعداد پیچھے رہ گئی تھی، حالانکہ ان کے دل شک اور نفاق سے پاک تھے۔ انہوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر نہ عذر تراشا نہ جھوٹ بولا بلکہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کرتے ہوئے عفو و درگزر کے طالب ہوئے، اس کے باوجود آپؐ نے انہیں معاف نہیں کیا بلکہ سزا دی اور سزا بھی کتنی سخت؟!

آخر کیوں؟.... آپ نے کیوں منافقین کے ساتھ نرمی اور درگزر کا اور سچے مسلمانوں کے ساتھ سختی اور سزا کا معاملہ کیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس موقعے پر سختی اور کرختگی اعزاز اور قدر افزائی کا مظہر تھا اور منافقین اس کے مستحق نہیں تھے۔ وہ کیسے اس کے مستحق ہو سکتے ہیں کہ قرآنی آیات نازل ہو کر ان کی توبہ اور مغفرت کی خوش خبری سنائیں۔

پھر یہ کہ منافقین کے بارے میں یہ طے شدہ ہے کہ وہ ہر حال میں کافر ہیں۔ وہ دنیا میں جن چیزوں کا دکھاوا کرتے ہیں ان میں سے کوئی بھی انہیں قیامت کے دن جہنم کے سب سے نچلے گڈھے سے نہیں نکال سکتی۔ اللہ عزوجل نے حکم دیا ہے کہ ہم انہیں ان کے ظاہری حال پر چھوڑ دیں اور ان کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے دنیوی احکام کا ان پر انطباق کریں۔ تو جب ہم ان

کے ساتھ ظاہری احکام اور معاملات روا رکھتے ہیں، جس طرح کہ وہ ہمارے سامنے اپنے احوال اور عقائد کا ظاہر پیش کرتے ہیں، تو ان کے عذروں کے باطن اور ان کے اقوال کی حقیقت جاننے کی کوشش کیوں کی جائے اور ان کے جھوٹ پر انہیں دنیا میں کیوں سزا دی جائے؟

ابن قیمؒ فرماتے ہیں: "اللہ سبحانہ اپنے بندوں کے گناہوں پر ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتا ہے۔ اس کا مومن بندہ، جس سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ اس کی بارگاہ میں معزز ہوتا ہے، اگر اس سے معمولی سی بھی لغزش ہو جائے تو اس کی سرزنش کرتا ہے، تاکہ وہ آئندہ ہمیشہ بیدار اور ہوشیار رہے۔ رہا وہ شخص جو اللہ کی نگاہوں سے گر جائے اور اس کے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہ ہو تو وہ گناہوں کے لیے اسے کھلی چھوٹ دے دیتا ہے۔ جب بھی وہ کوئی گناہ کرتا ہے اس پر اسے سزا دینے کے بجائے انعام دیتا ہے"[۱۲]

۸۔ حضرت کعبؓ کے واقعہ سے مستنبط ہونے والے امور:

حضرت کعب بن مالکؓ کے واقعے سے متعدد نصیحتیں اور نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(الف) کسی دینی سبب سے ترکِ تعلق کی مشروعیت:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی دینی سبب سے کسی شخص سے ترکِ تعلق جائز ہے۔ نبی ﷺ نے اس پوری مدت میں مسلمانوں کو حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں سے بات چیت کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ ابن قیم فرماتے ہیں: "اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ جو شخص ترکِ تعلق کا مستحق ہے اس کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے"[۱۳] حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنا واقعہ سناتے ہوئے یہ بھی بتایا: "میں باہر نکلتا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا، نماز کے بعد آپؐ مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور سلام کرتا، پھر سوچتا کہ جواب میں آپؐ کے ہونٹ ہلے ہیں یا نہیں؟" اگر سلام کا جواب دینا واجب ہوتا تو آپؐ ضرور اتنی زور سے جواب دیتے کہ حضرت کعب بن مالکؓ سن لیتے۔

---

[۱۲] زاد المعاد ۳/۲۰

[۱۳] حوالہ سابق

(ب) حضرت کعبؓ کی دوسری آزمائش:

اللہ تعالیٰ نے حضرت کعبؓ کی ایک دوسری آزمائش کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں غور کیا جائے، تاکہ واضح ہو سکے کہ ایک مسلمان کا اپنے رب پر کیسا ایمان ہونا چاہیے۔ شاہ غسان نے انہیں کہلا بھیجا کہ "جن لوگوں نے انہیں تکلیف پہنچائی ہے اور ان سے منہ پھیر لیا ہے انہیں چھوڑ کر وہ اس کے پاس آ جائیں، یہاں ان کی قدر و منزلت ہوگی اور وہ دنیاوی عیش و آرام سے لطف اندوز ہوں گے۔" یہ پیش کش حضرت کعبؓ کے لیے انتہائی کرب واذیت کا باعث تھی۔ لیکن اس آزمائش سے اپنے رب پر ان کے ایمان میں اضافہ ہوا اور اللہ کے لیے اخلاص اور محبت کا مزید اظہار ہوا۔

حضرت کعب کی ابتلاء و آزمائش کے لیے جو زمین تیار کی گئی تھی اس میں کتنے قدم آئے دن پھسلتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے اوپر سے گزر گئے، ان کا اسلام صحیح سلامت رہا، اس میں ذرا بھی ضعف نہیں آیا۔ وہ اس خوش نما جال سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور اس میں نہیں جا گرے۔

(ج) سجدۂ شکر کی مشروعیت:

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے سجدہ کرنا مشروع ہے۔ حضرت کعبؓ نے جب سنا کہ کوئی شخص بارگاہ الٰہی میں ان کی توبہ کی قبولیت کا مژدہ دے رہا ہے تو فوراً سجدے میں گر پڑے۔ ابن قیمؒ نے سجدۂ شکر کی بعض اور مثالیں دی ہیں۔ فرماتے ہیں: "حضرت ابو بکرؓ کو جب مسیلمہ کذاب کے قتل ہونے کی خبر ملی تو انہوں نے سجدہ کیا۔ حضرت علی بن ابی طالبؓ نے جب خوارج میں ذوالثدیہ کو مقتولین میں پایا تو اللہ کا شکر بجالائے اور سجدہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب حضرت جبرئیل نے یہ بشارت سنائی کہ جو شخص آپ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کے بدلے اس پر دس رحمتیں نازل فرمائے گا تو آپ سجدہ ریز ہو گئے۔"[۱۴]

(د) نذر ماننے کی صورت میں پورے مال کا صدقہ لازم نہیں:

احناف (ماسوا امام زفرؒ) کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ نذر مان لے کہ وہ اپنا سارا مال مساکین پر خرچ کر دے گا تو اس پر صرف ان اموال کا صدقہ لازم ہوگا جن کی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے، سارے مال کا صدقہ ضروری نہیں۔ اس کی وہ متعدد دلیلیں دیتے ہیں۔ ان کی ایک دلیل

---

[۱۴] حوالہ سابق ۳/۲۲

شاید یہ بھی ہے کہ جب حضرت کعبؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ "قبولیتِ توبہ پر میری خواہش ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے لیے اپنا سارا مال خیرات کر دوں" تو آپؐ نے جواب دیا: "بہتر ہے کہ کچھ مال روکے رکھو۔"

جن ائمہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے سارے مال کو صدقہ کرنے کی نذر مان لے تو اس پر عمل لازم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت کعبؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جو کچھ عرض کیا تھا اس سے ان کا مقصد نذر ماننا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے آں حضرت ﷺ سے مشورہ طلب کرنے کی غرض سے ایسا کہا تھا۔ آپؐ نے ان سے بتایا کہ کچھ مال کا صدقہ کافی ہے۔[۵۱۱] حضرت کعبؓ کی بات اور رسول اللہ ﷺ کے جواب کا یہی قریب ترین مفہوم ہے۔

۵۱۱ ملاحظہ کیجیے سرخسی کی المبسوط ۱۲/ ۹۳، ابن قیم کی زاد المعاد ۳/ ۲۳ اور مؤلف کی کتاب ضوابط المصلحہ ص ۲۴۴، ۳۸۴

حضرت ابو بکرؓ کی سربراہی میں حج

جب رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس تشریف لائے تو آپ نے حج کا ارادہ کیا، پھر فرمایا: "وہاں مشرکین بھی ہوں گے جو عریاں ہو کر طواف کرتے ہیں، اور جب تک ایسا ہوتا رہے گا میں حج نہیں کر سکتا۔" آپؐ نے حضرت ابو بکرؓ کو بھیجا اور حضرت علیؓ کو بھی ان کا ساتھ دینے کا حکم دیا۔ دونوں نے وہاں جا کر اعلان کر دیا کہ آئندہ سے مشرکین کو حج کرنے کی ممانعت ہے۔ انہیں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے لیے چار ماہ کی مہلت دی جاتی ہے، اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے گی۔

امام بخاریؒ نے کتاب المغازی میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے حجۃ الوداع سے پہلے والے سال مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ کو امیر الحج بنا کر بھیجا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لوگوں کے درمیان اعلان کر دیا کہ "اب کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کر سکے گا۔"

محمد بن کعب قرظی اور بعض دیگر راویوں نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے ۹ھ میں حج کے موقعے پر حضرت ابو بکرؓ کو امیر بنا کر بھیجا۔ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کو سورۂ براءت (توبہ) کی تیس یا چالیس آیتوں کے ساتھ ارسال فرمایا۔ انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ آیات پڑھ کر سنائیں۔ ان میں مشرکین کو چار ماہ کی مہلت دی گئی تھی۔ یہ آیات انہوں نے یوم عرفہ (۹/ ذی الحجہ) میں سنائیں۔ اس طرح مشرکین کو ملنے والی مہلت کی مدت ذی الحجہ کے آخری بیس دن، محرم، صفر اور ربیع الاول کے پورے مہینے اور ربیع الآخر کے ابتدائی دس دن تھے۔ حضرت علیؓ نے مشرکین کو یہ آیات ان کے گھروں میں جا کر سنائیں اور اعلان کر دیا کہ "آئندہ سال سے کوئی مشرک حج نہ کر سکے گا اور نہ کوئی برہنہ ہو کر طواف کر پائے گا۔"

امام احمدؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت علی بن ابی طالبؓ کو اہل مکہ کے پاس سورۂ براءت کی آیات سنانے کے لیے بھیجا تو میں ان کے ساتھ تھا۔" حضرت ابوہریرہ کے صاحب زادے حضرت محرزؒ نے ان سے دریافت کیا: "آپ لوگ اس موقعے پر کیا اعلان کرتے تھے؟" انہوں نے جواب دیا: "ہم لوگ یہ اعلان کرتے تھے کہ جنت میں صرف صاحب ایمان داخل ہوگا۔ اور یہ کہ آئندہ کوئی شخص بیت اللہ کا برہنہ طواف نہیں کرے گا۔ اور رسول اللہ ﷺ کا اگر کسی کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے تو اس کی مدت صرف چار ماہ ہے۔ یہ مدت گزر جانے کے بعد آئندہ سال سے کوئی مشرک بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔" حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ اس اعلان کی میں نے اتنی زور زور سے منادی کی کہ میرا گلا بیٹھ گیا۔" درج ذیل آیت کریمہ سے یہی مقصود ہے:

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبہ: ۳)

اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

ابن سعدؒ نے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے جب حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج بنا کر بھیجا تو وہ مدینہ کے تین سو مسلمانوں کے ساتھ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ قربانی کے بیس اونٹ بھی بھیجے۔

دروس ونصائح

۱۔ حج کے مشرکانہ رسوم:

پیچھے گزرا کہ بیت اللہ کا حج عربوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کا شمار ان بقایائے حنیفیت میں ہوتا ہے جن پر وہ برابر عمل پیرا تھے۔ البتہ اس میں جاہلیت کی

بہت سی گندگیاں اور شرک کی بہت سی خرافات سرایت کر گئی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ عقیدۂ توحید پر مبنی ایک عبادت سے زیادہ شرک کا ایک مظہر بن کر رہ گیا تھا۔

ابن عائذ نے بیان کیا ہے کہ مشرکین مسلمانوں کے ساتھ حج کرتے تھے۔ جب مسلمان تلبیہ پڑھتے تو وہ ان کی آواز میں آواز ملا کر زور زور سے بولنے لگتے تھے اور کہتے تھے "تیرا کوئی شریک نہیں، مگر وہ جسے تو نے شریک بنایا ہے، تو اس کا مالک ہے اور اس چیز کا بھی جس کا وہ مالک ہے" بعض لوگ برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑے کا ایک تار نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے بیت اللہ کی تعظیم خیال کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص کہتا تھا "میں اس طرح (برہنہ ہو کر) بیت اللہ کا طواف کروں گا جس طرح میری ماں نے مجھے جنا ہے۔ میرے بدن پر دنیا کی کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جس میں ظلم کی آمیزش ہو۔"[۱۶]

یہ نجاستیں ۹ھ کے آخر تک باقی رہیں۔ یہاں تک کہ اس سال حج کے موقعے پر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ نے تمام مشرکین کو الٹی میٹم دے دیا اور مسجد حرام کو ان نجاستوں سے ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا۔

۲۔ اعلان جنگ کے ذریعے معاہدہ کا خاتمہ:

محمد بن اسحاقؒ اور دیگر اصحاب سیر نے بیان کیا ہے کہ اس وقت مشرکین کی دو قسمیں تھیں۔ کچھ لوگوں سے رسول اللہ ﷺ کے چار ماہ سے کم مدت کے معاہدے تھے۔ انہیں مدت کے خاتمے تک کی مہلت دی گئی۔ کچھ مشرکین سے کھلے معاہدے تھے، یعنی ان کے سلسلے میں کسی مدت کی تخصیص نہیں تھی۔ ان کے بارے میں قرآن نے سورۂ براءت میں چار ماہ کی مدت متعین کر دی، اور بتا دیا کہ اس کے بعد مشرکین سے جنگ کی جائے گی اور انہیں جہاں پایا جائے گا قتل کر دیا جائے گا، اِلّا یہ کہ وہ توبہ کر کے دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اس مدت کا آغاز ۹ھ میں یوم عرفہ (۹/ذی الحجہ) سے ہوا، اور اس کی تکمیل ۱۰ھ میں ۱۰/ربیع الآخر کو ہوئی۔

ایک رائے یہ ہے (اور یہ کلبی کی رائے ہے) کہ چار ماہ کی مدت ان لوگوں کے لیے تھی جن کے رسول اللہ ﷺ سے چار ماہ سے کم مدت کے معاہدے تھے۔ لیکن جن کے معاہدے اس

[۱۶] ملاحظہ کیجیے عیون الاثر، ابن سید الناس ۲/۲۳۱

سے زیادہ مدت کے تھے ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ طے شدہ مدت تک ان معاہدوں کی پاسداری کی جائے۔ درج ذیل ارشاد باری کا یہی مطلب ہے:

إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبہ: ۴)

بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدتِ معاہدہ تک وفا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔

مذکورہ دونوں اقوال میں سے پہلا قول زیادہ صحیح اور قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کلبی کی رائے تسلیم کر لی جائے تو سورۂ برأت میں کوئی نئی چیز نہیں رہتی، بلکہ اس سے رسول اللہ ﷺ اور مشرکین کے درمیان قائم معاہدوں کے بارے میں صرف تاکید کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر حضرت علیؓ کو یہ سورت مشرکین کو سنانے کی ضرورت کیا تھی؟ اور کیا نئی بات تھی جس کی خبر دینے کے لیے نبی ﷺ نے انہیں بھیجا تھا؟

۳۔ جہاد کا مطلب محض دفاعی جنگ نہیں ہے:

اس سے اس بات کی مزید تاکید ہوتی ہے کہ اسلامی شریعت میں جہاد کا مطلب محض دفاعی جنگ نہیں ہے، جیسا کہ مستشرقین بیان کرتے ہیں!...

درج ذیل آیات کریمہ میں غور کیجئے کہ ان میں مکہ کے اردگرد باقی رہ جانے والے، نجد اور دیگر علاقوں کے مشرکین کو خبردار کیا گیا ہے:

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ، فَسِيْحُوْا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ وَأَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكَافِرِيْنَ، وَأَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْأَكْبَرِ أَنَّ اللّٰهَ بَرِيْءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَإِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْا أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ، وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ، إِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ

ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوْا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلٰى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ، فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ.

(التوبہ: ۱۔۵)

اعلان برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کیے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے اور چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور یہ کہ اللہ منکرین حق کو رسوا کرنے والا ہے۔ اطلاع عام ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن تمام لوگوں کے لیے کہ اللہ مشرکین سے بری الذمہ ہے اور اس کا رسول بھی۔ اب اگر تم لوگ توبہ کر لو تو تمہارے ہی لیے بہتر ہے اور جو منہ پھیرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور اے نبی انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ بجز ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدے کیے پھر انہوں نے اپنے عہد کو پورا کرنے میں تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ایسے لوگوں کے ساتھ تم بھی مدت معاہدہ تک وفا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کو پسند کرتا ہے۔ پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر کرنے والا ہے اور رحم فرمانے والا ہے۔

ان واضح اور قطعی آیات سے یہ تصور قائم کر لینے کی کوئی گنجائش نہیں باقی رہتی کہ اسلام میں جہاد کا مفہوم صرف دفاعی جنگ ہے۔

اور یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ سورۂ برأت قرآن کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ اس لیے اس کے احکام، جن میں سے بیشتر جہاد سے متعلق ہیں، ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں۔

قرآن کی بعض آیات سے دفاعی جہاد کا ثبوت ملتا ہے مثلاً:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ. (الحج:۳۹)

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ تعالیٰ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔

میں یہ نہیں کہوں گا کہ یہ اور اس جیسی تمام آیات سورۂ توبہ کی ان آیات سے منسوخ ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ جہاد کی اصل مشروعیت میں اقدام یا دفاع پیش نظر نہیں رہا ہے، بلکہ اس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ، پاکیزہ اسلامی معاشرے کے قلعے کی تعمیر اور روئے زمین پر حکومت الٰہیہ کا قیام ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے جو ذرائع بھی ممکن ہوں انہیں اختیار کرنا ضروری ہے۔ بعض حالات میں صلح جوئی، نصیحت، تعلیم اور رہنمائی کے ذریعے یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اسی کو جہاد کہا جائے گا۔ بسا اوقات نصیحت اور رہنمائی کے ساتھ دفاعی جنگ کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس صورت میں یہی مشروع ہو گا۔ اور بعض دیگر حالات میں اقدامی جنگ ناگزیر ہوتی ہے۔ اُس وقت یہی اعلیٰ واشرف جہاد ہو گا۔ حالات کا صحیح اندازہ اور ذرائع کی صحیح تعیین صاحب بصیرت، ہوش مند اور اللہ، رسول اور تمام مسلمانوں کا خیر خواہ مسلمان حکمران کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے سلسلے میں مذکورہ بالا تینوں ذرائع و وسائل مشروع ہیں۔ مخلص حکمران جس ذریعے کو تقاضائے مصلحت کے مطابق پائے گا اسی کو اختیار کرلے گا۔

اور یہ نسخ ہرگز نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کی سربراہی میں جو حج ادا کیا گیا اس میں مسلمانوں کو اس کے مناسک کی تعلیم دی گئی اور اس کی ادائیگی کا طریقہ سکھایا گیا۔ پھر یہ اس حجۃ الاسلام اور حجۃ الوداع کی تمہید تھا جسے اگلے سال اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی میں ادا کیا جانے والا تھا۔

مسجدِ ضرار

ابن کثیرؒ نے سعید بن جبیرؒ، قتادہؒ اور عروہؒ وغیرہ سے روایت کیا ہے کہ مدینہ میں قبیلۂ خزرج کا ایک آدمی تھا جس نام ابو عامر الراھب تھا۔ عہد جاہلیت میں اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ قبیلۂ خزرج میں اسے بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے، مسلمانوں کی ایک اجتماعیت قائم ہو گئی اور اسلام کا بول بولا ہو گیا تو ابو عامر کے پَر پُرزے نکل آئے اور وہ کھل کر رسول اللہ ﷺ کی دشمنی پر اتر آیا۔ پھر وہ بھاگ کر کفار مکہ کے پاس پہنچا اور انہیں رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ پر اکساتا رہا۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ برابر ترقی کر رہا ہے تو وہ شاہِ روم ہرقل کے پاس پہنچا اور نبی ﷺ کے خلاف اس سے مدد چاہی۔ ہرقل نے اس سے وعدہ کیا اور اپنے تعاون کا یقین دلایا تو وہ اس کے پاس ٹھہر گیا۔ اس نے منافقینِ مدینہ کی اپنی جماعت کو ہرقل کے وعدے کی خبر دی اور انہیں حکم دیا کہ اس کے خطوط کے ساتھ جو شخص ان کے پاس پہنچے اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تعمیر کردیں جو اس کی واپسی کے بعد اس کے لیے بھی پناہ گاہ کا کام دے۔

ان لوگوں نے مسجد قبا سے قریب ایک مسجد کی تعمیر شروع کی اور ایک مضبوط عمارت کھڑی کردی۔ یہ رسول اللہ ﷺ کے سفر تبوک سے قبل کا واقعہ ہے۔ تعمیر سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ چل کر اس مسجد میں ایک دفعہ نماز پڑھا دیں تاکہ وہ معتبر ہو جائے۔ انہوں نے بیان کیا کہ یہ مسجد انہوں نے اس لیے تعمیر کی ہے کہ جو کمزور اور بیمار لوگ ٹھنڈی راتوں میں مسجد نبوی میں حاضری نہ دے سکیں، وہ یہیں نماز ادا کرلیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مسجد میں نماز ادا کرنے سے بچالیا۔ آپؐ نے اس وقت فرمایا: ”اس وقت ہم سفر پر جا رہے ہیں۔ واپسی میں انشاء اللہ ایسا کریں گے۔“ جب آپؐ تبوک

سے واپس ہوئے تو ابھی مدینہ پہنچنے میں ایک دن یا اس سے کچھ کم کی مسافت باقی تھی کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور آپ کو خبر دی کہ ان لوگوں نے یہ مسجد کفر کرنے اور اہل ایمان کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے مقصد سے بنائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کچھ صحابہ کو بھیجا جنہوں نے آپ کے مدینہ پہنچنے سے قبل اسے منہدم کر دیا۔ [ے۱۱] اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ.

(التوبہ: ۱۰۷-۱۰۸)

کچھ اور لوگ ہیں جنہوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ (دعوت حق کو) نقصان پہنچائیں اور (خدا کی بندگی کرنے کے بجائے) کفر کریں اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرپیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقوی پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔

ان آیات میں "لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ" (وہ مسجد جو اول روز سے تقوی پر قائم کی گئی تھی) سے مسجد قبا کی جانب اشارہ ہے۔ اور "ضرارا" سے مراد یہ ہے کہ ان منافقین نے مسجد قبا کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ دوسری مسجد تعمیر کی تھی۔

ے۱۱ تفسیر ابن کثیر ۲/ ۳۸۷-۳۸۸، ابن ہشام نے بھی اسے اپنی سیرت میں ملتے جلتے الفاظ میں روایت کیا ہے ۲/ ۳۲۲

دروس و نصائح

۱۔ منافقین کی سازش کی انتہاء:

اس مسجد کا واقعہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف اس سازش کی انتہاء ہے جہاں تک منافقین کو رسائی حاصل ہو گئی تھی۔ اس مرتبہ یہ صرف نفاق کا معاملہ نہ تھا، بلکہ ریشہ دوانی اور سازش تھی جو مسلمانوں کے خلاف رچی گئی تھی۔ اسی لیے نبی ﷺ نے اس مرتبہ ان سے تجاہل نہیں برتا اور انہیں نظر انداز نہیں کیا، بلکہ ان کے سلسلے میں وحی الٰہی کی روشنی میں ایک دوسرا موقف اختیار فرمایا۔

وہ موقف یہ تھا کہ منافقین کی حقیقت کو بے نقاب کر دیا گیا اور انہوں نے اپنے مقاصد پر جو پردے ڈال رکھے تھے، انہیں ہٹا دیا گیا۔ پھر انہوں نے جس عمارت کے بارے میں مسجد ہونے کا دعوی کیا تھا اسے جلا کر خاکستر کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ اس لیے کہ انہوں نے اس کی تعمیر اس مقصد سے کی تھی کہ اس کی آڑ میں منافقین کا نفاق چھپ جائے، وہاں سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کو منظم کیا جا سکے اور ان کے درمیان پھوٹ ڈالی جا سکے۔

منافقین کی اس آخری سازش کے واقعے کو ان کے نفاق اور ریشہ دوانیوں کے گذشتہ واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ہمارے سامنے ان کے بارے میں اسلامی شریعت کے مجموعی حکم کی مکمل تصویر آ جاتی ہے۔

وہ جو کچھ جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے دلوں میں پائے جانے والے عقائد اور خیالات کے خلاف جو کچھ ظاہر کرتے ہیں ان کے سلسلے میں دنیا میں ان کے ظاہری حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان کے اسرار کو اللہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو قیامت کے دن ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔ لیکن وہ مسلمانوں کے خلاف جو سرگرمیاں دکھاتے اور جو ریشہ دوانیاں کرتے ہیں ان پر ان کی سخت گرفت کی جاتی ہے، ان کے جرائم پر انہیں رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا ہے اور ان کی سازشوں کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی ہے اور اسے پیوند خاک کر دیا جاتا ہے۔ اس کا اثبات ان منافقین کے ساتھ آں حضرت ﷺ کی مجموعی پالیسی سے ہوتا ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر تمام ائمہ محققین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔

منافقین کی جانب سے برپا کی جانے والی اس سازش کے مراحل، اس کی کیفیت اور اس

کے وسائل وذرائع میں غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر زمانے میں نفاق کا ایک مزاج رہا ہے اور منافقین کے وسائل وذرائع میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ان کی جانب سے ہمیشہ انتہائی بزدلی اور گھناؤنی سازش کا مظاہرہ ہوتا ہے، روشنی میں ان کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اندھیرے میں انہیں سجھائی دیتا ہے۔

وہ ہمیشہ بیرونی سامراج کے قدموں میں اپنی پیشانیاں رگڑتے ہیں، تاکہ اپنے ملک میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری جنگ میں ان سے مدد حاصل کر سکیں۔ پھر جب وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے پاس جاتے ہیں تو ان کے سامنے اسلام کا دکھاوا کرتے ہیں اور بناوٹی طور پر اسلام سے گہرا تعلق رکھنے اور اس کی طرف دعوت دینے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور اگر کبھی موقع پا جاتے ہیں کہ اس دین کی کسی حقیقت کا گلا گھونٹ دیں اور اس کے بعض مخلص داعیوں کا خاتمہ کر دیں تو اس سے ذرا نہیں ہچکچاتے اور برملا کہتے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا فریضہ انجام دینے والے وہ خود ہیں اور جن لوگوں کا وہ خاتمہ کر رہے ہیں وہ امت کے دشمن ہیں جو اس کا استحصال کر رہے ہیں۔

۲۔ فواحش ومنکرات کی جگہوں کا حکم:

رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے واضح ہوتا ہے کہ جن جگہوں پر اللہ اور اس کے رسول کی معصیت کے کام کیے جاتے ہیں انہیں ویران کر دینا، ڈھا دینا یا نذر آتش کر دینا ضروری ہے، خواہ ان جگہوں کی حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو اور وہ انہیں خیر اور نیکی کی جگہیں سمجھ رہے ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے مسجد ضرار کے ساتھ جو معاملہ کیا تھا اگر اس کا سبب یہی تھا تو فواحش ومنکرات کی ان جگہوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جہاں کھلے عام اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے؟ حضرت عمر بن الخطابؓ نے وہ پوری بستی جلا دی تھی جہاں شراب کی خرید وفروخت ہوتی تھی۔ اسی طرح انہوں نے رویشد ثقفی کی شراب کی دوکان کو بھی نذر آتش کروا دیا اور اسے "رویشد" کے بجائے "فویسق" نام دیا تھا[۱۱۸]۔ اس سلسلے میں علمائے اسلام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

[۱۱۸] ملاحظہ کیجئے ابن قیم کی زاد المعاد ۳/۱۷

قبیلۂ ثقیف کی آمد اور قبولِ اسلام

ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ آں حضرت ﷺ تبوک سے ماہ رمضان میں مدینہ واپس تشریف لائے تھے اور اسی ماہ میں قبیلۂ ثقیف کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

ثقیف نے باہم مشورہ کیا۔ ان کی رائے یہ ہوئی کہ اطراف میں پائے جانے والے عرب سے جنگ کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ اور ان سب نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے اور اسلام قبول کر لیا ہے۔ انہوں نے کنانہ بن عبد یالیل کی سربراہی میں ایک وفد بھیجا۔ جب یہ لوگ مدینہ کے قریب پہنچے تو ان کی ملاقات حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے ہوئی۔ ان کا تعلق بھی اسی قبیلے سے تھا۔ انہوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کے وقت آپ کو سلام کرنے کا ادب سکھایا۔ لیکن وہ لوگ جب وہاں پہنچے تو جاہلی طریقے پر ہی سلام کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے وفد ثقیف کو مسجد میں ٹھہرایا اور ان کے لیے وہاں خیمے لگوائے تاکہ وہ لوگ قرآن سن سکیں اور لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ سکیں۔ یہ وفد چند دن ٹھہرا۔ اس عرصے میں وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا رہا اور آپؐ بھی ان کے پاس آتے جاتے رہے اور انہیں اسلام کی دعوت دیتے رہے۔[۱۱۹]

ابن سعدؒ کی روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ ان لوگوں کے پاس ہر رات عشاء کے بعد تشریف لے جاتے تھے اور کھڑے کھڑے ان سے گفتگو فرماتے تھے۔ زیادہ دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے آپ تھکن محسوس کرتے تو پہلو بدل لیتے تھے۔[۱۲۰]

موسیٰ بن عقبہؒ نے اپنی مغازی میں روایت کیا ہے کہ "اس وفد میں عثمان بن ابی العاص

[۱۱۹] سیرت ابن ہشام ۲/۳۲۴

[۱۲۰] طبقات ابن سعد ۲/۷۸

نامی ایک نوجوان بھی تھا۔ اس کی عمر تمام ارکان وفد میں سب سے کم تھی۔ جب وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں حاضری کے لیے جاتے تو اسے اپنے خیمے میں چھوڑ جاتے۔ پھر جب وہاں سے واپس آکر دوپہر میں آرام کرتے تو عثمان آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپؐ سے دین کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور قرآن سن کر یاد کرتا۔ اس طرح اسے خدمتِ نبوی میں متعدد مرتبہ حاضر ہونے کا موقع ملا۔ یہاں تک کہ اسے دین کا فہم حاصل ہو گیا۔ کسی موقعے پر اگر وہ رسول اللہ ﷺ کو سوتا ہوا پاتا تو حضرت ابو بکرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے دین کی تعلیم حاصل کرتا۔ یہ کام وہ اپنے قبیلے والوں سے چھپا کر کرتا تھا۔ اس کا یہ ذوق و شوق دیکھ کر رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے اور اس سے محبت کرنے لگے۔

بالآخر اسلام ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔ اس موقعے پر سربراہ وفد کنانہ بن عبدیالیل نے رسول اللہ ﷺ سے چند سوالات کیے۔ اس نے کہا: ''زنا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ہم لوگوں کو کثرت سے سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ ہمارے لیے ضروری ہے۔'' آں حضرت ﷺ نے جواب دیا: وہ تم پر حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاۗءَ سَبِيْلًا ۔ (بنی اسرائیل: ۳۲)

زنا کے قریب مت پھٹکو۔ وہ بہت برا فعل ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔

ان لوگوں نے عرض کیا: ''سود کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ ہمارا تو سارا مال سود ہے۔'' آپؐ نے جواب دیا: تمہیں صرف اصل سرمایہ لینے کا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

(البقرہ: ۲۷۸)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو۔

ان لوگوں نے دریافت کیا: ''شراب کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ اسے تو ہمارے علاقے میں بڑے اہتمام سے کشید کیا جاتا ہے اور وہ ہمارے لیے ضروری ہے۔'' آپؐ نے فرمایا: اللہ نے اسے حرام کیا ہے۔ پھر آپؐ نے تحریم خمر والی آیت کی تلاوت فرمائی۔[۱۲۱]

[۱۲۱] ملاحظہ کیجیے زاد المعاد ۳/۲۶-۲۸

ابن اسحاقؒ نے بیان کیا ہے کہ اس موقعے پر ان لوگوں نے نماز سے بھی رخصت چاہی تو آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہ ہو''

اس پر وہ لوگ باہم مشورہ کرنے کے لیے ایک طرف چلے گئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کی تمام باتیں تسلیم کرلیں، لیکن درخواست کی کہ آپ ان کے بت ''لات'' کو، جس کی وہ پوجا کرتے تھے تین سال کے لیے چھوڑ دیں اور اسے منہدم نہ کریں۔ وہ ایک ایک سال کم کرتے گئے، مگر آپ نے ان کی یہ درخواست منظور نہیں فرمائی۔ آخر میں انہوں نے گزارش کی کہ اپنے قبیلے میں ان کے واپس پہنچنے کے بعد ایک مہینہ کے لیے اس بت کو چھوڑ دیں۔ آپ نے انہیں کوئی مہلت نہیں دی۔ ابن اسحاقؒ کا بیان ہے کہ ''بت توڑنے کے لیے کچھ مہلت لینے کا مقصد یہ تھا کہ اپنے قبیلے کے نادانوں، عورتوں اور بچوں کی تکلیفوں سے انہیں نجات مل جائے اور اس بت کے اچانک ٹوٹنے سے ان کی قوم گھبرا نہ جائے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب اسلام ان کی قوم کے دلوں میں راسخ ہو جائے گا تب اس بت کو توڑ دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں کچھ بھی مہلت دینے سے انکار کیا تو انہوں نے کہا: ''پھر آپ ہی اسے توڑ ڈالیں۔ بہر حال ہم اسے کبھی نہیں توڑ سکتے۔'' آں حضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں کسی کو تمہارے پاس بھیج دوں گا جو یہ کام کرے گا۔'

پھر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے رخصت کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت دے دی اور ان کا پورا اکرام کیا۔ آپؐ نے عثمان بن ابی العاصؓ کو ان کا امیر مقرر فرمایا۔ اس لیے کہ علم دین سے ان کی دلچسپی آپ کے علم میں تھی۔ انہوں نے چند دنوں کے قیام میں قرآن کی کچھ سورتیں یاد کرلی تھیں۔

اس وفد کی واپسی کے فوراً بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن الولیدؓ کی سربراہی میں کچھ صحابہ کو ان کے یہاں بھیجا۔ ان میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت ابو سفیان بن حربؓ بھی تھے۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر ''لات'' کو ڈھادیا۔ ثقیف کی عورتوں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ ننگے سر نکل پڑیں اور آہ و بکا کرنے لگیں۔ حضرت مغیرہؓ جوں جوں اس پر اپنی کلہاڑی سے وار کرتے تھے حضرت ابو سفیانؓ کہتے جاتے تھے: ''ہائے لات، آہ لات''[۱۲۲] اس سے ان کا مقصد

[۱۲۲] سیرت ابن ہشام ۲/۳۲۷

اس بت کا مذاق اڑانا اور ان عورتوں کی نقل اتارنا تھا جو اس موقعے پر روپیٹ رہی تھیں اور چیخ وپکار کر رہی تھیں۔

ابن سعدؒ نے طبقات میں حضرت مغیرہؓ سے روایت کیا ہے کہ "اس طرح ثقیف کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ عرب کا کوئی قبیلہ جو ایک باپ کی نسل سے ہو، اس کا اسلام اتنا راسخ اور اس کے عقائد اتنے بے آمیز ہوں جتنے اس قبیلے کے تھے۔"[۱۲۳]

وفود کی مسلسل آمد اور قبولِ اسلام

ابن اسحاقؒ نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کر لیا اور تبوک سے واپس تشریف لے آئے اور قبیلۂ ثقیف نے بھی اسلام قبول کر کے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو ہر چہار جانب سے قبائلِ عرب کے وفود آنے لگے۔ دراصل قبائلِ عرب اس بات کے منتظر تھے کہ اسلام کے بارے میں قریش کیا رویہ اختیار کرتے ہیں؟ اس لیے کہ انہیں امامت کا درجہ حاصل تھا، وہ بیت اللہ اور حرم کے متولی تھے، ان کا نسلی تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تھا اور وہ عربوں کے سردار تھے۔ جب مکہ فتح ہو گیا، اسلام کو غلبہ حاصل ہو گیا اور قریش نے اس کے سامنے خود سپردگی اختیار کر لی تو عربوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ سے جنگ اور ان سے سرتابی کرنے کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ اسی لیے وہ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا، فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا. (سورۃ النصر)

جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح نصیب ہو جائے اور (اے نبی) تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو، بے شک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہاں ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ان وفود کی تفصیلات اور ان کے حالات بیان کیے جائیں۔ اس لیے کہ اس کا ہمارے مقصد سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔

---

[۱۲۳] طبقات ابن سعد ۲/۷۸

دروس ونصائح

ا۔ وہ دن اور یہ دن:

کیا آپ کو یاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے سفر طائف میں اس قبیلے والوں کے پاس تشریف لے گئے تھے تو انہوں نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا۔ وہ آپ کے ساتھ بہت بری طرح پیش آئے تھے، اپنے گھروں سے انتہائی بدخلقی اور بدسلوکی کے ساتھ نکال دیا تھا اور آپ کے پیچھے اوباش لڑکوں کو لگا دیا تھا جو آپ پر پتھر برساتے، تکلیفیں پہنچاتے اور مذاق اڑاتے تھے۔ وہی لوگ آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور مطیع بن کر صدق دلی سے اللہ کے دین میں داخل ہو گئے تھے۔

کیا آپ کو یاد ہے کہ طائف سے مکہ واپس ہوتے ہوئے حضرت زید بن حارثہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا "اے اللہ کے رسول! آپ وہاں دوبارہ کیسے داخل ہوں گے جب کہ قریش آپ کو نکال چکے ہیں؟" اس کے جواب میں آں حضرت ﷺ نے فرمایا تھا: "اے زید! جو حالات تم دیکھ رہے تھے ان سے نکلنے کے لیے اللہ ضرور کوئی راستہ پیدا کرے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی وناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔"

آج رسول اللہ ﷺ کا وہ ارشاد پورے طور پر صادق آ رہا تھا۔ وہ طائف، یہ مکہ اور عرب کے دیگر قبائل خدمتِ نبوی میں حاضری دے رہے تھے اور جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہو رہے تھے۔

غور کیجیے! رسول اللہ ﷺ اپنے قدموں پر چل کر، دور دراز پہاڑیوں اور وادیوں کو طے کرتے ہوئے ان کے پاس یہ امید لے کر پہنچے تھے کہ وہ آپ کا پرتپاک استقبال کریں گے اور آپ کی دعوت پر لبیک کہیں گے۔ لیکن اس کے بجائے آپ کو ان کی جانب سے اذیتیں ملیں اور ناکامی ہاتھ آئی۔ غور کیجیے۔ اس کا کم سے کم اثر کسی انسان پر (خواہ وہ کوئی بھی ہو) یہ پڑے گا کہ موقع ملنے پر وہ ان سے انتقام لینے یا ان کے ساتھ اسی طرح کا برتاؤ کرنے کو سوچے گا۔

لیکن ثقیف کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ کے دل میں اس کا شائبہ تک نہیں پایا گیا۔ آپؐ نے چند دنوں تک طائف کا محاصرہ جاری رکھا، پھر صحابہ کو واپس ہو جانے کا حکم دے دیا۔ کسی نے آپؐ سے عرض کیا: "ثقیف کے لیے بددعا کر دیجیے۔" آپؐ نے انکار کیا اور ہاتھ اٹھا کر دعا

کی "اے اللہ ثقیف کو ہدایت دے اور انہیں توفیق دے کہ وہ میرے پاس آکر اسلام قبول کریں"!....

رسول اللہ ﷺ کی یہ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوئی اور ثقیف کا وفد مدینہ آیا۔ یہ خوش خبری دینے کے لیے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ دونوں دوڑ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ اس لیے کہ دونوں بخوبی جانتے تھے کہ ثقیف کے مسلمان ہونے اور ہدایت پانے کی خبر سے آپ بہت خوش ہوں گے۔ آپ کو اطلاع ملی تو نکل کر مسرت اور اعزاز کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور اپنا پورا وقت ان کی تعلیم، رہنمائی اور نصیحت میں لگا دیا۔

انہوں نے تو ہمیشہ آپؐ کے خلاف سازشیں کی تھیں اور آپ کو اذیتیں دے کر اپنے بغض و نفرت کی پیاس بجھائی تھی۔ لیکن آپ ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ بھلائی، سعادت اور ہدایت چاہتے تھے۔ انہیں ہمیشہ آپؐ کو کسی پریشانی اور مصیبت کا شکار دیکھ کر خوشی ہوتی تھی لیکن آپ کو اس وقت خوشی ہوئی جب انہیں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور دیکھا۔

کیا یہ کسی انسان کا بشری مزاج ہو سکتا ہے، اور وہ بھی ایسے انسان کا جو کسی اصول اور کسی عقیدے کی طرف دعوت دیتا ہو!

یقیناً یہ صرف نبوت کا مزاج ہے اور اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ آپ کے پیشِ نظر صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ یہ دعوت برگ و بار لے آئے اور آپؐ اپنے رب کی بارگاہ میں پہنچیں تو وہ آپؐ سے راضی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے راستے میں تمام تکلیفیں اور مصیبتیں ہیچ ہیں، اور بندہ جب اس راہ کی تمام رکاوٹیں پار کر کے اس عظیم مقصد تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو خوشی و مسرت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

یہ اسلام ہے جو بغض و نفرت اور کینہ سے واقف نہیں اور جو کسی انسان کا برا نہیں چاہتا۔

وہ جہاد کا حکم دیتا ہے لیکن بغض اور نفرت کے بغیر۔ وہ طاقت و قوت حاصل کرنے کی تاکید کرتا ہے لیکن انانیت اور گھمنڈ کے بغیر۔ وہ رحم و کرم کی تعلیم دیتا ہے مگر اس کا مطلب ذلت اور کمزوری نہیں۔ وہ محبت کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن صرف اللہ کے لیے۔

معلوم ہوا کہ وفد ثقیف اور دیگر وفود کی مسلسل مدینہ آمد اور ان کا قبول اسلام اس "زبردست نصرت" کی تکمیل تھی جس کا اللہ نے اپنے رسول سے وعدہ کیا تھا۔

۲۔ کسی مشرک کے قبول اسلام کی امید ہو تو اسے مسجد میں ٹھہرانا جائز ہے:

پیچھے گزرا کہ نبی ﷺ نے وفد ثقیف کو مسجد میں ٹھہرایا اور وہیں ان سے گفتگو کی اور انہیں دین کی تعلیم دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مشرک کے اسلام قبول کرنے اور ہدایت یاب ہونے کی امید ہو تو اسے مسجد میں ٹھہرانا جائز ہے۔ اور اگر ایسا مشرک کے لیے جائز ہے تو کتابی (یہودی یا نصرانی) کے لیے بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔ نجران کے نصاریٰ کا وفد جب حق کی تعلیمات سننے اور اسلام کو سمجھنے کے ارادے سے خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا تھا تو آپؐ نے اسے مسجد میں ٹھہرایا تھا۔

زرکشیؒ نے اس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا ہے، فرماتے ہیں:

"رافعیؒ اور نوویؒ نے چند شرائط کے ساتھ، مسلمان کی اجازت سے، حرم کے علاوہ دیگر مساجد میں کافر کا داخلہ جائز قرار دیا ہے:

اول: یہ کہ عقدِ ذمہ میں یہ شرط نہ ہو کہ مساجد میں کافر کا داخلہ ممنوع ہے، لیکن اگر اس میں یہ شرط موجود ہو تو اس کی اجازت نہ ہوگی۔

دوم: یہ کہ جس مسلمان نے اسے اس کی اجازت دی ہو وہ مکلّف اور اس کا اہل ہو۔

سوم: یہ کہ مسجد میں اس کے داخلے کا مقصد قرآن سننا اور دین کا علم حاصل کرنا ہو اور اس کے اسلام قبول کرنے کی امید ہو، یا وہ مسجد کی عمارت کی مرمت یا اسی طرح کے کسی اور کام سے اس میں گیا ہو۔ قاضی ابو علی الفارقیؒ کی بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس کے داخلے کا مقصد قرآن سننا یا علم حاصل کرنا ہو لیکن اس کے اسلام قبول کرنے کی امید نہ ہو تو اسے داخلے سے روکا جائے گا اور اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اسی طرح اگر بظاہر معلوم ہوتا ہو کہ اس کے داخلے کا مقصد استہزاء ہے، یا کسی خاص مقصد سے سیاسی تعلقات استوار کرنا اس کے پیشِ نظر ہے، جیسا کہ آج کل بہت سے بیرونی لوگ کرتے ہیں، تو اس سے روکا جائے گا۔

اگر کوئی کافر مسجد میں جا کر سونے یا کھانے یا اسی طرح کے کسی اور کام کی اجازت مانگے تو صاحب الروضہ نے لکھا ہے کہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اس کی اجازت نہ دی جائے، حالانکہ بظاہر اس کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ ان کے (یعنی امام نوویؒ کے) علاوہ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ ان کاموں کے لیے مسجد میں داخلے کی اجازت دینا جائز نہیں۔ فارقیؒ نے لکھا ہے

کہ یہی بات اس وقت کہی جائے گی جب اس کے داخلے کا مقصد حساب اور زبان وغیرہ سیکھنا ہو۔
اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ غیر مسلم کا مسجد میں داخلہ ان صورتوں میں جائز قرار دیا گیا ہے جب مسجد کو کوئی ضرر نہ پہنچے، نہ وہ ناپاک ہو اور نہ نمازیوں کی نماز میں خلل ہو۔ [۲۴]

خلل اندازی کے ضرر سے زیادہ اہم اس فتنے کا ضرر ہے جس میں نمازی مبتلا ہوں گے جب کافر عورتیں اپنے نیم عریاں جسموں کے ساتھ مسجد میں جائیں گی۔ اور جس طرح مسجد میں سونے یا کھانے کے لیے کافروں کے جانے کی اجازت نہیں، اسی طرح اس کا فنِ تعمیر اور نقش ونگار دیکھنے کے مقصد سے ان کا داخلہ ممنوع ہے۔

۳۔ وفود اور مستامنین کے ساتھ حسنِ معاملہ :

وفد اور **مستامن** کے درمیان فرق ہے۔ وفد اپنی قوم کا نمائندہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ چند افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ رہا مستامن تو وہ صرف اپنی ذات کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہ اپنے لیے مسلمانوں کے ملک میں امان کا طالب ہوتا ہے، تاکہ وہاں رہ کر اسلام کا علم اور مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے۔

مستامن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اسے خوش آمدید کہا جائے، جب تک وہ مسلمانوں کے درمیان رہے اس کی حفاظت کی جائے اور جب وہ واپس جانا چاہے تو اسے بحفاظت اس کے علاقے میں پہنچا دیا جائے۔ ارشاد ہے:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ. (التوبہ:۶)

اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے مامن تک پہنچا دو۔

رہے وفود تو مستامن پر قیاس کرتے ہوئے ان کے حق میں بھی اسی حکم کا اثبات ہوتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ان کے ساتھ حسن سلوک اور خوش معاملگی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ پیچھے گزرا کہ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ثقیف کو خوش آمدید کہا تھا اور اعزاز واکرام کے

[۲۴] اعلام الساجد، زرکشی ص ۳۱۹-۳۲۱ باختصار

ساتھ انہیں ٹھہرایا تھا۔

۴۔ امارت کا مستحق وہ شخص ہے جو کتاب اللہ کے علم میں سب سے فائق ہو:

نبی ﷺ نے حضرت عثمان بن ابی العاصؓ کو وفدِ ثقیف کا امیر مقرر فرمایا۔ اس لیے کہ ان میں کتاب اللہ کے فہم کا شوق دیکھ کر آپؐ کو بہت خوشی ہوئی۔ مدینہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ جتنی مدت ٹھہرے اس میں کتاب اللہ کا سب سے زیادہ علم حاصل کر لیا تھا اور اسلام کی سوجھ بوجھ میں فائق ہو گئے تھے۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ امارت اور ولایت کا مستحق وہ شخص ہے جو کتاب اللہ کے علم میں سب سے فائق ہو۔ اس لیے کہ یہ ایک دینی ذمہ داری ہے جس کا مقصد اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرے کا قیام ہے اس لیے امیر میں اس شرط کا پایا جانا ضروری ہے۔

۵۔ بتوں اور مجسموں کو توڑنا واجب ہے:

آں حضرت ﷺ نے قبیلہ ثقیف کے بت توڑنے کا حکم فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بتوں اور مجسموں کو توڑنا واجب ہے۔ اس کے وجوب کی یہ شرط نہیں ہے کہ ان کی پرستش کی جاتی ہو یا انہیں مقدس سمجھا جاتا ہو، بلکہ اس کا حکم عام ہے اور اس کا انطباق تمام حالتوں پر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے وفدِ ثقیف کے اسلام قبول کرنے کے موقعے پر جو حکم دیا تھا وہ عام ہے۔ اسی طرح آپؐ نے ان مجسموں کو توڑے جانے کا حکم دیا تھا جو فتح مکہ کے موقعے پر اندرون کعبہ سے نکلے تھے، حالانکہ ان مجسموں کی دیگر بتوں کی طرح پرستش نہیں کی جاتی تھی، اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے جس کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں کہ مجسمہ سازی حرام ہے، خواہ وہ کسی قسم کا اور کسی شکل میں ہو۔ اسی طرح مجسموں کو رکھنا حرام ہے خواہ اس کے جو بھی اسباب ہوں [۲۵]

۶۔ وفدِ نجران کی آمد:

اس سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں وفدِ ثقیف کے علاوہ دیگر بہت سے وفود آئے۔

[۲۵] ملاحظہ کیجیے فتح مکہ کے ضمن میں بحث بعنوان "تصویر بنانے، کھینچنے اور رکھنے کا حکم"

ان کا تذکرہ ہم قلم انداز کر رہے ہیں، اس لیے کہ ان کی تفصیل ہمارے پیش نظر مقصد سے زیادہ متعلق نہیں ہے۔

البتہ یہاں یہ جاننا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان وفود کے بحیثیت مجموعی دو گروہ تھے۔ ایک گروہ مشرکین کا تھا اور دوسرا اہل کتاب کا۔

جہاں تک مشرکین کا تعلق ہے ان کے جتنے وفود آئے سب نے اسلام قبول کرلیا اور ایمان اور توحید کی مشعل لے کر اپنی قوم کی طرف واپس ہوئے۔ رہے اہل کتاب تو ان میں سے بیشتر اپنے مذہب یہودیت یا نصرانیت پر قائم رہے۔

نجران کے نصاریٰ کا جو وفد آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا وہ ساٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ وہ چند دن ٹھہرا اور آپؐ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور توحید باری تعالیٰ کے بارے میں بحث و مباحثہ کرتے رہے۔ سب سے آخر میں آپؐ نے ان کے سامنے یہ آیت تلاوت فرمائی:

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ، الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ، فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ، ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ . (آل عمران: ۵۹-۶۱)

اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے تو اے نبی اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔

چنانچہ جب وہ اپنے عقائد پر قائم رہے تو آں حضرت ﷺ نے حکم الٰہی کے مطابق انہیں "مباہلہ" ۱۲۶ کے لیے بلایا۔ آپؐ خود اس حال میں نکلے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو اپنی

۱۲۶ مباہلہ کا مطلب یہ ہے کہ دونوں فریق بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کریں کہ ان میں سے جو جھوٹا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔

چادر میں چھپائے ہوئے تھے اور حضرت فاطمہؓ آپ کے پیچھے تھیں۔

لیکن وفد کے سردار شرحبیل بن وداعہ نے مباہلہ سے بھی انکار کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کے برے انجام سے ڈرایا۔ چنانچہ انہوں نے آپؐ کے سامنے یہ بات رکھی کہ آپؐ اسلام اور مباہلہ کے علاوہ کسی اور چیز کا حکم دیں تو وہ اسے تسلیم کرلیں گے۔ آپؐ نے ان سے جزیہ پر مصالحت کرلی اور انہیں معاہدۂ مصالحت کی دستاویز لکھوا کر دے دی۔ آپؐ نے ان سے وعدہ کیا کہ اگر وہ جزیہ ادا کرتے رہیں گے تو ان کے عبادت خانے منہدم نہیں کیے جائیں گے، اور اگر ان کی جانب سے غداری یا بدعہدی کا مظاہرہ نہیں ہوگا اور وہ سودی کاروبار نہیں کریں گے تو انہیں ان کے مذہب پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔ ۱۲۷

۱۲۷ اس روایت کو حاکم نے اور بیہقی نے دلائل النبوۃ میں بہت تفصیل سے نقل کیا ہے۔ جزیہ پر مصالحت ہونے کا تذکرہ ابوداؤد نے بھی کتاب الخراج، باب اخذ الجزیۃ میں کیا ہے۔ نیز نصاریٰ نجران کے وفد کی آمد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے تفسیر ابن کثیر ۱/۳۶۸-۳۶۹

عدی بن حاتم کا قبولِ اسلام

حضرت عدی بن حاتمؓ پہلے نصرانی تھے۔ وہ مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے تھے۔ انہیں اپنے قبیلے میں عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اپنے قبیلے سے جنگوں میں حاصل ہونے والے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ وصول کرتے تھے۔ (عرب اپنے سردار کو یہ حصہ دیتے تھے) جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی دعوت کا چرچا سنا تو اسے ناپسند کیا اور اپنے قبیلے کو چھوڑ کر شام کے نصاریٰ کے پاس چلے گئے۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں: "شام پہنچ کر مجھے اس سے زیادہ وحشت اور ناگواری ہونے لگی جتنی اپنے قبیلے میں رسول اللہ ﷺ کے تذکرے سے ہوتی تھی۔ میں نے سوچا کہ مجھے آپؐ سے ملاقات کرنی چاہیے۔ اگر آپؐ دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح ایک بادشاہ یا نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے ہوں گے تو یہ چیز مجھ سے مخفی نہ رہ سکے گی اور اگر آپؐ نبی برحق ہوں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا اور اتباع کرلوں گا۔

میں اس ارادے سے نکلا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مدینہ پہنچ گیا۔ اس وقت آپ مسجد میں تھے۔ میں نے سلام کیا۔ فرمایا: کون؟ میں نے عرض کیا: عدی بن حاتم۔

یہ سن کر رسول ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں ایک ضعیف اور بزرگ عورت ملی۔ اس نے آپ کو روک لیا اور آپ کھڑے ہو کر اس کی باتیں سننے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ بادشاہ نہیں ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ مجھے لے کر اپنے گھر پہنچے۔ اندر جا کر چمڑے کا ایک تکیہ (چھوٹا گدا) لائے جس میں پتیاں بھری ہوئی تھیں۔ اسے میری طرف پھینک کر فرمایا: اس پر بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا: نہیں، آپ تشریف رکھیں۔ آپؐ نے اصرار کیا تو میں اس پر بیٹھ گیا اور آپ خود زمین پر تشریف فرما ہوئے۔

میں نے اپنے جی میں کہا اللہ کی قسم، یہ بات کوئی بادشاہ نہیں کہہ سکتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اے عدی بن حاتم! کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ کوئی اللہ سے بڑھ کر ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ فرمایا: کیا تم رکوسی (ایک قوم جس کا مذہب نصاریٰ اور صابئہ کے بین بین ہے) نہیں تھے؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: کیا تم اپنے قبیلے سے مال غنیمت کا چوتھائی حصہ نہیں وصول کرتے تھے؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔ فرمایا: لیکن یہ تو تمہارے مذہب میں جائز نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا: آپؐ صحیح فرماتے ہیں۔

اس کے بعد آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "اے عدی! شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہو کیونکہ تم اس کے ماننے والوں کو غریب دیکھ رہے ہو؟ اللہ کی قسم، ان کے پاس مال کی اتنی بہتات ہو جائے گی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہ بچے گا۔ شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ تم ان کی تعداد کم اور ان کے دشمنوں کی تعداد زیادہ دیکھ رہے ہو۔ اللہ کی قسم، ایک وقت ایسا آئے گا جب ایک عورت قادسیہ سے تن تنہا سفر کرتے ہوئے آکر بیت اللہ کی زیارت کرے گی اور اسے راستے میں کوئی خوف نہیں ہوگا۔ شاید تم اس دین کو قبول کرنے سے اس لیے ہچکچا رہے ہو کہ تم حکومت اور اقتدار پر دوسرے لوگوں کو قابض دیکھ رہے ہو، اللہ کی قسم، وہ وقت جلد آئے گا جب سرزمین بابل کے سفید محلات ان کے ہاتھوں فتح ہوں گے۔" اس کے بعد حضرت عدیؓ نے اسلام قبول کر لیا۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں: "دو نشانیاں میں نے دیکھ لی ہیں۔ عورت اب بے خوف وخطر سفر کرنے لگی ہے اور کسریٰ کے خزانوں پر حملہ کرنے والے پہلے لشکر میں میں بھی شریک رہا ہوں۔ اور میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تیسری نشانی بھی جلد پوری ہو کر رہے گی۔ [۱۲۸]

دروس ونصائح

آں حضرت ﷺ کی شخصیت کے نبوی خصائص:

حضرت عدی بن حاتمؓ کی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آمد اور قبول اسلام اس زمانہ

[۱۲۸] اسے ابن اسحاق اور امام احمد نے اور بغوی نے اپنی معجم میں ملتے جلتے الفاظ میں روایت کیا ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے الاصابہ، حافظ ابن حجر ۲/۴۶۱ اور ترتیب مسند احمد ۲۱/۱۰۸

سے تعلق رکھتا ہے جب آپ کے پاس ہر چہار جانب سے وفود آ رہے تھے۔ ہم ان کی آمد کو بھی ان بہت سے وفود میں سے ایک شمار کر سکتے ہیں جنہوں نے خدمت نبوی میں حاضری دے کر قبولِ اسلام کا اعلان کیا تھا۔

لیکن ہم نے ان کے واقعے کو الگ سے مفصل بیان کر کے اس میں غور و خوض کرنے کو اس لیے ترجیح دی کیونکہ اس سے اسلامی عقیدے کی بنیادوں سے متعلق اہم نکات کی وضاحت ہوتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا دقیق تجزیہ اور واضح تصویر کشی ہوتی ہے۔ وہ شخصیت جس کا حضرت عدی بن حاتمؓ پر بہت نمایاں اظہار ہوا کہ وہ لیڈری، حکومت اور امارت کی خواہش یا گھمنڈ اور جاہ کے تمام شوائب سے پاک ہے۔ اس میں اس چیز کے اظہار کے علاوہ اور کوئی خواہش دکھائی نہیں دیتی کہ وہ تمام انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہے۔ یہی چیز ان کے ایمان اور ہدایت کا سبب بنی۔

ہمیں بھی ان باتوں میں غور کرنا چاہیے جن میں حضرت عدیؓ نے غور کیا اور ان چیزوں سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے جن سے انہوں نے نصیحت حاصل کی۔ تاکہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ہمارے ایمان و یقین میں اضافہ ہو اور ہم اس سازش کو اچھی طرح سمجھ لیں جو عالم اسلامی میں فکری محاذ پر یلغار کرنے والوں کے مطالعات میں پوشیدہ ہے۔

ہمیں تھوڑی دیر ٹھہر کر ان امتیازی خصوصیات میں غور کرنا چاہیے جن سے حضرت عدی بن حاتمؓ نے نبی ﷺ کی شخصیت کو متصف قرار دیا تھا اور ان سے متاثر ہو کر ایمان لے ائے تھے۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں ایک ضعیف اور بزرگ عورت ملی۔ اس نے آپ کو روک لیا اور آپ کھڑے ہو کر اس کی باتیں سننے لگے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: اللہ کی قسم! یہ بادشاہ نہیں ہے۔"

جی ہاں، حکومت کا خواہش مند یا لیڈری اور دنیوی عظمت چاہنے والا ایسے موقعے پر اس رویہ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، اور اگر بہ تکلف ایسا کرے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے نفس کو اس پر مجبور کرے تو بناوٹ کے آثار، بے قراری اور بے چینی کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا، لیکن رسول اللہ ﷺ کی تو یہ فطرت اور عادت ثانیہ تھی اور کسی بھی حال میں اس میں فرق نہ آتا تھا۔ آپؐ کسی مجلس میں ظاہری طور پر صحابہ کرام سے نمایاں نہ ہوتے تھے۔ آپ کی معیشت اور طرزِ زندگی غریبوں

اور مسکینوں سے بڑھ کر نہ تھا۔ آپؐ نے کبھی دستر خوان پر کھانا نہیں کھایا۔ آپؐ کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا گیا کہ صحابہ تو محنت و مشقت کے کسی کام میں لگے ہوں اور آپؐ ان سے الگ تھلگ ہوں۔ زندگی کے آخری لمحے تک آپ کا یہی حال تھا۔ آخر نبوت کے علاوہ اور کون سی چیز تھی جو آپ کو اس حال پر قائم رکھے ہوئے تھی، حالانکہ آپ ایسی خصلتوں سے بہرہ ور تھے کہ اگر ان کو اختیار کرتے تو آپ کا طرزِ زندگی اتنا اونچا ہوتا کہ کوئی دوسرا اس تک پہنچ نہ سکتا تھا۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ مجھے لے کر اپنے گھر پہنچے۔ اندر جا کر چمڑے کا ایک تکیہ (چھوٹا گدا) لائے جس میں پتیاں بھری ہوئی تھیں۔ اسے میری طرف پھینک کر فرمایا: اس پر بیٹھ جاؤ۔ میں نے عرض کیا: نہیں آپ تشریف رکھیں۔ آپؐ نے اصرار کیا تو میں اس پر بیٹھ گیا اور آپ خود زمین پر تشریف فرما ہوئے۔ میں نے اپنے جی میں کہا: اللہ کی قسم! یہ بات کوئی بادشاہ نہیں کہہ سکتا۔"

شاید حضرت عدیؓ، جنہیں اپنے قبیلے میں عظمت کا مقام حاصل تھا، توقع رکھتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے گھر سے بھی اسی عظمت کا اظہار ہو گا جس سے وہ بہرہ ور تھے، لیکن اس کے برعکس صورتِ حال دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ زندگی میں تکلف و تصنع نام کو نہیں۔ آپؐ ان کے سامنے خشک زمین پر چار زانو ہو کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ آپؐ کے گھر سے اس چیز کا اظہار ہو رہا تھا کہ آپؐ ان مظاہر سے بہت دور ہیں جن کی وہ توقع رکھتے تھے!.... پھر کیا اس کے باوجود اپنی اس دعوت کے ذریعہ آپؐ حکومت کے خواہاں تھے، یا دولت یا عظمت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھے؟!

اس کے بعد حضرت عدیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے چند ارشادات سنائے جن میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں چند پیشین گوئیاں کی گئی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا "مسلمانوں کے پاس مال کی اتنی بہتات ہو جائے گی کہ اسے کوئی قبول کرنے والا نہ بچے گا" آپ کی یہ پیشین گوئی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں پوری ہو گئی۔ انہوں نے اپنے گورنر کو اموالِ زکوٰۃ کے ساتھ بھیجا کہ انہیں افریقہ کے مختلف علاقوں میں غریبوں میں تقسیم کر دے۔ لیکن وہ ان کے ساتھ واپس آ گیا۔ اس لیے کہ کوئی انہیں لینے والا نہ تھا۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان سے غلام خرید کر آزاد کر دیے۔

آں حضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب ایک عورت قادسیہ سے تن تنہا سفر کرتے ہوئے آکر بیت اللہ کی زیارت کرے گی اور اسے راستے میں کوئی خوف نہیں ہوگا" آپ کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی۔ اس پورے علاقے میں امن وامان ہوگیا۔ چنانچہ کسی مسافر کو اللہ کے علاوہ اور اپنے ریوڑ پر بھیڑیے کے علاوہ اور کسی کا خوف نہ تھا (جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آں حضرت ﷺ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے)

آں حضرت ﷺ نے اس موقعے پر ایک پیشین گوئی یہ بھی فرمائی تھی: "اللہ کی قسم! وہ وقت جلد آئے گا جب سرزمین بابل کے سفید محلات مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوں گے۔" آپ کی یہ پیشین گوئی بھی حرف بحرف پوری ہوئی۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے رسول اللہ ﷺ سے جو وعدہ کیا اسے پورا کیا۔

حضرت عدیؓ نے آں حضرت ﷺ کی حیات طیبہ اور طرز رہائش میں نبوت کی علامتیں پالیں۔ اسی طرح آپ کے انداز گفتگو اور ارشادات میں بھی انہیں محسوس کر لیا اور بعد کے واقعات میں ان کا مصداق پالیا۔ ان علامتوں کو دیکھ کر وہ اسلام لے آئے اور عیش وعشرت کے ان مظاہر سے دامن کش ہوگئے جن میں انہیں ان کے قبیلے والوں نے غرق کر رکھا تھا۔

اگر کوئی شخص عقل ودانش سے بہرہ ور ہو اور اسے سوچنے سمجھنے کی آزادی بھی حاصل ہو تو وہ حق کو قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے سے پہلو تہی نہیں کرسکتا، خواہ یہ راہ کتنی ہی دشوار گزار اور کانٹوں بھری ہو۔ لیکن اگر آزادیٔ فکر مفقود ہو، عقل کا تقدس پامال ہو اور اس کی جگہ بغض ونفرت اور خواہشات نفس نے لے لی ہو تو آدمی باطل میں غلطاں وپیچاں اور جہالت سے چمٹا رہے گا اور اندھے پن کو سب سے بڑی نعمت تصور کرے گا۔ اللہ رب العالمین نے ایسے لوگوں کی یہ صفات بیان کی ہیں:

وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ. (حم السجدہ: ۵)

وہ کہتے ہیں "جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہوگئے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہوگیا ہے، تو اپنا کام کر، ہم اپنا کام کیے جائیں گے"

تعلیم وتبلیغ کے لیے نمائندوں کی روانگی

جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مختلف وفود حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کرنے لگے تو آپؐ نے بھی مختلف سمتوں میں اور خاص کر جزیرہ کے جنوب میں اپنے نمائندے بھیجنے شروع کیے، تاکہ وہ لوگوں کو اسلام کے اصول ومبادی اور احکام کی تعلیم دیں۔ جزیرہ اور اس کے مختلف اطراف میں اسلام پھیل چکا تھا اور ضرورت تھی کہ ان علاقوں میں معلمین، داعیوں اور رہنماؤں کو بھیجا جائے، تاکہ وہ لوگوں کے سامنے اسلام کے حقائق واضح کریں اور اسے ان کے دلوں میں جاگزیں کریں۔

آں حضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو نجران بھیجا تاکہ وہاں کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دیں اور انہیں اس کے اصول ومبادی اور احکام سے واقف کرائیں۔ اسی طرح آپؐ نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجا۔[۱۲۹]

آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو بھی یمن بھیجا۔ ان دونوں کو آپؐ نے یمن کے ایک ایک علاقے میں بھیجا تھا اور انہیں تاکید کی تھی کہ "لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، انہیں مشقت میں نہ ڈالو، انہیں خوش خبری دو، تنفر نہ کرو، اور استطاعت بھر کام کرو"[۱۳۰] آپؐ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا: "تم عنقریب ایسے لوگوں کے پاس جاؤ گے جو اہل کتاب میں سے ہیں۔ جب ان کے پاس پہنچو تو انہیں اس چیز کی گواہی دینے پر آمادہ کرو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں

---

۱۲۹ طبقات ابن سعد، سیرت ابن ہشام۔ بخاری میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت خالد بن الولیدؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ دونوں کو یمن بھیجا تھا۔ ملاحظہ کیجیے صحیح بخاری ۵/ ۱۱۰

۱۳۰ بخاری ومسلم

توان سے بتاؤ کہ اللہ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ اگر وہ یہ بات بھی مان لیں تو ان سے بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مال داروں سے لی جاتی ہے۔ اور ان کے غریبوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ اگر وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو زکوٰۃ میں ان کے صرف اچھے مال نہ لو۔ اور مظلوم کی بد دعا سے بچو، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا۔" [۱۳۱]

مسند احمد میں ہے کہ آں حضرت ﷺ حضرت معاذؓ کو بھیجنے کے لیے مدینہ سے باہر تک گئے۔ حضرت معاذؓ سواری پر تھے اور رسول اللہ ﷺ ان کے ساتھ پیدل چلتے ہوئے انہیں ہدایات دیتے جاتے تھے۔ اس موقع پر آں حضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا: "اے معاذؓ، شاید آئندہ سال مجھ سے تمہاری ملاقات نہ ہو اور شاید تم میری مسجد اور قبر کے پاس سے گزرو" یہ سن کر حضرت معاذؓ رسول اللہ ﷺ کی جدائی کا تصور کر کے رو پڑے۔" [۱۳۲]

حضرت معاذؓ یمن میں رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد تک رہے۔ اس طرح آں حضرت ﷺ کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

دروس ونصائح

۱۔ دعوت کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے:

رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی طرف دعوت اور اس کے اصول و مبادی اور احکام کی تعلیم دینے کے لیے اپنے نمائندوں کو مختلف علاقوں میں بھیجا تھا۔ آپؐ کے اس عمل سے سب سے اہم بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہر عہد اور ہر زمانے میں عائد ہوتی ہے۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، جیسا کہ آج بہت سے مسلمان سمجھتے ہیں۔

محض یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم اپنی زبانوں سے اسلام کا دعویٰ کر لیں۔ اسی طرح یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ہم بعض ہلکے پھلکے کاموں پر اکتفا کر لیں۔ ایسے کام جو اپنی اصل کے اعتبار سے تو بڑے اہم تھے، لیکن ہماری زندگی میں ان کی حیثیت رسوم اور روایات کی ہو گئی ہے۔ اسی

۱۳۱ بخاری و مسلم

۱۳۲ مسند امام احمد ۲۱/۲۱۴

طرح یہ بھی کافی نہیں ہے کہ ہم اسلام کو اپنی ذات تک محدود رکھیں اور دوسروں کے لیے اس کے دروازے بند کر لیں۔

یہ وہ امانت ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے اور یہ وہ ذمہ داری ہے جس سے کسی زمانے میں اور کسی جگہ مفر نہیں۔ تمام علماء اور ائمہ اربعہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس علاقے میں مسلمان رہتے ہوں وہاں اور اس سے باہر بھی دعوت کی ذمہ داری انجام دینا تمام مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ اس ذمہ داری سے وہ اسی وقت عہدہ برا ہو سکتے ہیں جب ان کی بڑی تعداد اسے انجام دے۔ وہ مختلف سمتوں اور مختلف علاقوں میں پھیل کر وہاں کے باشندوں کو اللہ کی طرف بلائیں۔ ان کے سامنے ایمان اور اسلام کے دلائل پیش کریں اور اس سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو مختلف شبہات اور وساوس پیدا ہوتے ہیں، انہیں دور کریں۔ اور ان کی کوششیں اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے کفایت کرتی ہوں۔ اگر یہ گروہ مسلمانوں کے کسی علاقے میں نہیں پایا جائے گا تو تمام علاقوں کے مسلمان گناہ گار ہوں گے۔

صحیح بات یہ ہے (جس کی صراحت تمام ائمہ اور فقہاء نے کی ہے) کہ یہ اہم ذمہ داری صرف مسلمان مردوں پر ہی نہیں عائد ہوتی ہے بلکہ مرد، عورت، آزاد اور غلام سب اس میں شامل ہیں جب تک وہ مکلف اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری سر انجام دینے پر قادر ہیں۔ یہ ذمہ داری ہر شخص پر اس کی استطاعت اور قدرت کے مطابق عائد ہوتی ہے۔ [۱۳۳]

۲۔ اسلامی دعوت کے چند آداب:

رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذؓ اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو روانہ کرتے وقت انہیں جو ہدایات دی تھیں ان سے بعض ان آداب کا علم ہوتا ہے جن سے ایک داعی کو تعلیم و تبلیغ کی ذمہ داری انجام دیتے وقت متصف ہونا چاہیے۔

مثلاً اسے مشقت اور تنگی کے مقابلے میں آسانی کے پہلو کو ترجیح دینی چاہیے اور ڈرانے دھمکانے سے زیادہ اچھے کاموں پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کا تذکرہ کرنا چاہیے۔ "ڈرانے دھمکانے" کو آں حضرت ﷺ نے "متنفر کرنے" سے تعبیر فرمایا ہے۔

۱۳۳ ملاحظہ کیجئے مغنی المحتاج ۴/۲۱۱، اور الاحکام السلطانیہ، ماوردی

اس کی وضاحت رسول اللہ ﷺ نے ایک مثال سے کی ہے۔ آپؐ نے حضرت معاذؓ کو حکم دیا کہ لوگوں کو پہلے کلمۂ شہادت کا اقرار کرنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ ایسا کرلیں تب انہیں نماز قائم کرنے کو کہیں۔ اگر وہ اسے بھی کرلیں تب انہیں زکوٰۃ ادا کرنے کو کہیں۔ اسی ترتیب سے دیگر کاموں کا حکم دیں۔

البتہ یہ ملحوظ رہے کہ "تیسیر" اور تبشیر" کے مظاہر کو جائز اور مباح کے حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے۔ مطلوب یا جائز "تیسیر" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت کے بعض احکام میں تبدیلی کردی جائے یا لوگوں کی آسانی کے لیے اسلامی اقدار و مفاہیم کے ساتھ کھلواڑ کیا جائے۔ اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انہیں معصیت پر قائم رہنے دیا جائے، خواہ وہ کسی درجے کی ہو۔ اگرچہ جائز تیسیر میں یہ بات داخل ہے کہ اس معصیت کی مذمت بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب طریقہ اختیار کیا جائے۔

دعوت الی اللہ کے آداب میں سے یہ ہے (اور یہ امارت اور ولایت کے آداب میں سے بھی ہے) کہ کسی انسان پر ظلم کرنے سے احتراز کیا جائے۔ خاص طور پر ایسا ظلم جو اس کا مالِ ناحق لینے سے ہو۔ یہ ظلم کی ایک بھیانک قسم ہے جسے بسا اوقات دعوت کا کام انجام دینے والے اس وقت کرنے لگتے ہیں جب وہ اپنی ذمہ داریوں کی حقیقت سے غافل ہو جاتے ہیں اور یہ تصور ان کے ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ اللہ انہیں دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات اقتدار اور حکومت کے حاملین کی جانب سے بھی یہ ظلم ہونے لگتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت معاذؓ کو یمن بھیجا اس وقت ان میں یہ دونوں اوصاف پائے جاتے تھے۔ وہ داعی بھی تھے اور امیر بھی۔ اس لیے نبی ﷺ نے انہیں لوگوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے سے سختی سے منع کیا۔ فرمایا:

"مظلوم کی بددعا سے بچو، اس لیے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا"

حجّة الوداع

امام مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے نو سال تک حج نہیں کرسکے تھے۔ ہجرت کے دسویں سال، آپؐ نے لوگوں میں اعلان کرادیا کہ آپؐ حج کرنے والے ہیں۔ یہ اعلان سن کر لوگ بہت بڑی تعداد میں مدینہ پہنچ گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ آپؐ کے ساتھ حج کے لیے نکلیں اور آپ کی رہنمائی میں مناسک ادا کریں۔

ذی قعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے کہ آں حضرت ﷺ مدینہ سے نکلے [۱۳۴]

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ "آں حضرت ﷺ اپنی اونٹنی پر سوار ہوئے تو آپ کے سامنے، پیچھے، دائیں، بائیں ہر چہار جانب تاحدِ نگاہ سواروں اور پاپیادہ لوگوں کا ہجوم تھا۔ رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان تھے اور آپ پر قرآن نازل ہو رہا تھا۔"

راویوں کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ آپؐ کا حج کس نوعیت کا تھا؟ اہل مدینہ کا خیال ہے کہ آپ نے "افراد" کیا تھا۔ بعض لوگوں کی رائے کے مطابق آپ نے "قِرآن" اور

---

[۱۳۴] رسول اللہ ﷺ مدینہ سے کس دن نکلے تھے؟ اس کی تعیین میں راویوں کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن حزم نے بیان کیا ہے کہ وہ جمعرات کا دن تھا۔ بعض دوسرے لوگوں نے جمعہ کا دن قرار دیا ہے۔ صحیح یہ ہے جسے ابن سعد نے طبقات میں روایت کیا ہے کہ وہ شنبہ کا دن تھا۔ اسی کو ابن حجر نے بھی فتح الباری میں قطعیت سے بیان کیا ہے۔ جمعرات کو یکم ذی الحجہ تھا۔ اس اعتبار سے ذی قعدہ کا مہینہ انتیس دن کا تھا۔ جن لوگوں نے بیان کیا ہے کہ "ذی قعدہ کا مہینہ ختم ہونے میں پانچ دن باقی تھے تب آں حضرت ﷺ مدینہ سے نکلے تھے۔" ان کے قول کو اس گمان پر محمول کیا گیا ہے کہ مہینہ تیس دن کا رہا ہوگا۔

بعض کے مطابق "تمتع" کیا تھا۔ ۳۴ الف

مکہ میں آپؐ کا داخلہ بالائی حصے کی طرف سے کداء کے راستے سے ہوا۔ یہاں تک کہ جب آپ باب بنی شیبہ تک پہنچے اور بیت اللہ نظر آنے لگا تو آپ نے یہ دعا کی:

"اے اللہ! اپنے اس گھر کی عزت و شرف، تعظیم و تکریم اور رعب و ہیبت میں اضافہ فرما۔ اسی طرح جو لوگ اس کا حج اور عمرہ کریں اور اس کی تعظیم کریں ان کی عزت و شرف، تکریم، ہیبت، تعظیم اور صالحیت میں اضافہ فرما۔" ۳۵

پھر رسول اللہ ﷺ حج کرنے لگے۔ آپؐ نے لوگوں کو ان کے مناسک سکھائے اور حج کا طریقہ بتایا۔ ۳۶

رسول اللہ ﷺ نے عرفہ کے دن ان مسلمانوں کے مجمع میں جو وقوف کی جگہ آپ کے گرد اکٹھا تھے، ایک جامع خطبہ دیا۔ اس کا متن درج ذیل ہے:

"لوگو! میری بات غور سے سنو۔ مجھے نہیں معلوم، شاید تم سے اس سال کے بعد اس جگہ کبھی ملاقات نہ ہو۔ لوگو! تمارا خون اور تمہارا مال اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر حرام ہے۔ یاد رکھو، ہر جاہلی امر باطل ہے، اور جاہلیت کے تمام (انتقامی) خون باطل کر دیے گئے ہیں، اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان میں سے ابن ربیعہ بن الحارث کا خون باطل کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیے گئے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان میں سے عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔ یہ سب کا سب باطل ہے۔

---

۳۴ الف "افراد" صرف حج کا احرام باندھنے کو کہتے ہیں۔ "تمتع" اس طریقہ حج کو کہتے ہیں جس میں حج کے زمانے میں احرام باندھ کر عمرہ کرلیا جائے اور اس کے بعد کچھ دنوں کے لیے احرام کھول دیا جائے، پھر حج کے فرائض ادا کرنے کے لیے آٹھویں ذی الحجہ کو دوبارہ احرام باندھ لیا جائے۔ اور "قران" اس طریقے کو کہا جاتا ہے جس میں حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھا جائے اور پہلے عمرہ پھر حج کیا جائے۔ (مترجم)

۳۵ طبرانی، ابن سعد

۳۶ ملاحظہ کیجیے حدیث حجۃ رسول اللہ ﷺ بروایت جابر، صحیح مسلم ۴/ ۳۷

لوگو! شیطان اس سے تو مایوس ہو چکا ہے کہ تمہاری اس سرزمین میں اس کی آئندہ کبھی پرستش کی جائے گی، لیکن وہ اس پر تیار ہو گیا ہے کہ تم ان کاموں میں، جنہیں معمولی سمجھتے ہو، اس کی اطاعت کرو گے، اس لیے اپنے دین کے معاملے میں اس کے فتنے سے بچو۔ لوگو! "نسی" تو کفر میں ایک مزید کافرانہ حرکت ہے جس سے یہ کافر لوگ گمراہی میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ کسی سال ایک مہینے کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں، تاکہ اللہ کے حرام کیے ہوئے مہینوں کی تعداد پوری کر دیں اور جس چیز کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال کرلیں اور جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام کر دیں۔ ابتداء میں اللہ نے جب آسمان اور زمین کو پیدا کیا تھا، زمانہ گھوم پھر کر آج دوبارہ اسی نقطے پر آگیا ہے۔ سال بارہ مہینوں کا ہوتا ہے، ان میں سے چار محترم ہیں، تین پے در پے: ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم اور چوتھا رجب جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔

عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو، اس لیے کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کی بات کے ساتھ حلال سمجھا ہے۔ تمہارا ان پر حق ہے اور ان کا تم پر حق ہے۔ تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو، جس کا آنا تمہیں ناگوار ہو، نہ آنے دیں۔ ۳۷ اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو۔ اور ان کا حق تمہارے اوپر یہ ہے کہ معروف طریقے پر ان کی خوراک و پوشاک کا انتظام کرو۔

لوگو! میری بات سمجھو! میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔ میں تمہارے درمیان جو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے انہیں مضبوطی سے پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ چیزیں کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

لوگو! سنو اور اطاعت کرو، خواہ کسی نکٹے حبشی غلام کو بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے جب تک کہ وہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلے کرے۔

اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ جو خود کھاتے ہو وہ انہیں بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہ انہیں بھی پہناؤ۔ اور اگر ان سے کوئی ایسی غلطی سرزد ہو جائے جسے تم

---

۳۷ اس سے مقصود یہ ہے کہ جن لوگوں کا گھر میں آنا شوہر ناپسند کرتا ہو ان کو بیوی گھر میں نہ آنے دے۔ "بستر پر آنے دینا" زنا سے کنایہ نہیں ہے جیسا کہ گمان ہوتا ہے۔

معاف نہ کرنا چاہو تو اے اللہ کے بندو! انہیں بیچ دو لیکن انہیں اذیتیں نہ دو۔ [۱۳۸]

لوگو! میری بات سنو اور سمجھو! اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ بخوشی کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں۔ لوگو! ایک دوسرے پر ہرگز ظلم نہ کرو۔ اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟ عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے۔ اس لیے میرے بعد گمراہی کی طرف نہ پلٹ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ سن لو! جو یہاں حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ باتیں پہنچا دیں۔ اس لیے کہ بسا اوقات جس شخص تک کوئی بات پہنچائی جاتی ہے وہ اسے براہ راست سننے والے سے زیادہ اچھی طرح محفوظ کر لیتا ہے۔ تم سے (بارہ گاہ الٰہی میں) میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟ صحابہ نے عرض کیا: ہم گواہی دیں گے کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض پورا کر دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کی، پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا: "اے اللہ تو گواہ رہنا۔" [۱۳۹]

پھر نبی ﷺ عرفات ہی میں رہے یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا، تب آپ صحابہ کے ساتھ مزدلفہ روانہ ہوئے۔ آپ داہنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے فرماتے جاتے تھے۔ "لوگو سکون اور اطمینان کے ساتھ چلو" مزدلفہ پہنچ کر آپؐ نے مغرب اور عشاء ایک ساتھ ادا فرمائی۔ وہ رات آپؐ نے مزدلفہ میں گزاری۔ اگلے دن سورج طلوع ہونے سے پہلے آپ منیٰ روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچ کر آپؐ نے جمرۃ العقبہ پر سات کنکریاں ماریں۔ ہر مرتبہ کنکری پھینکنے کے ساتھ اللہ اکبر کہتے تھے۔ پھر منحر (قربانی کی جگہ) تشریف لے گئے اور وہاں تریسٹھ اونٹ اپنے دستِ مبارک سے ذبح کیے۔ پھر حضرت علیؓ سے فرمایا کہ سو میں جتنے باقی رہ گئے ہیں وہ ذبح کر دیں۔ پھر سواری پر مکہ روانہ ہوئے۔ طوافِ افاضہ کیا۔ مکہ میں ظہر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد بنو عبدالمطلب کے پاس گئے۔ وہ لوگوں کو زم زم پلا رہے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: "بنو عبدالمطلب! پانی

---

۱۳۸ یہ دونوں جملے طبقات ابن سعد میں مروی ہیں۔

۱۳۹ ہم نے اس خطبہ کا متن صحیح مسلم سے نقل کیا ہے۔ البتہ صحیح بخاری، سیرت ابن اسحاق اور طبقات ابن سعد وغیرہ سے کہیں کہیں معمولی اضافے کیے ہیں۔

نکال نکال کر لوگوں کو خوب پلاؤ۔ اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ مجھے پانی نکالتا دیکھ کر دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے کے لیے ٹوٹ پڑیں گے، تو تمہارے ساتھ میں بھی پانی نکال کر لوگوں کو پلاتا۔" ان لوگوں نے ایک ڈول نکال کر دیا۔ آپؐ نے اس سے پانی نوش فرمایا۔ [۱۴۰] پھر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

دروس ونصائح

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے کتنے حج کیے؟ اور حج کب فرض ہوا؟

کیا رسول اللہ ﷺ نے بعثت کے بعد اس حج کے علاوہ اور بھی حج کیے ہیں؟ اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے۔

ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ نے روایت کیا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ہجرتِ مدینہ سے قبل تین حج کیے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ یہ تعداد اس پر مبنی ہے کہ انصار کے وفود حج کے بعد آں حضرت ﷺ سے عقبہ میں تین بار ملے تھے۔ پہلے سال ان کی آپؐ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آئندہ سال ملنے کا وعدہ کیا۔ دوسرے سال ملاقات ہوئی تو اس موقعے پر بیعتِ عقبہ اولیٰ ہوئی، پھر تیسرے سال آئے تو بیعت عقبہ ثانیہ ہوئی۔ [۱۴۱] (اس سے اشارہ ملتا ہے کہ تینوں سال آں حضرت ﷺ نے بھی حج کیے ہوں گے) بعض حضرات سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ ہجرت سے قبل ہر سال حج کرتے تھے۔ جو بھی ہو، بہر حال یہ طے شدہ ہے کہ حج کی فرضیت ہجرت کے دسویں سال ہوئی ہے، اس سے پہلے یہ فرض نہیں تھا۔ اور نبی ﷺ نے ہجرت کے بعد اس حج کے علاوہ اور کوئی حج نہیں کیا تھا۔ اسی لیے بہت سے صحابہ اس حجۃ الوداع کو حجۃ الاسلام "یا حجۃ رسول اللہ" بھی کہا کرتے تھے۔ اور اس حج کی تفصیل پیش کرنے والی حدیث پر امام مسلم نے یہی عنوان قائم کیا ہے۔

حج کی فرضیت ۱۰ھ میں ہونے کی ایک دلیل وفدِ عبدالقیس کی آمد سے متعلق وہ حدیث

---

۱۴۰ حضرت جابرؓ نے آں حضرت ﷺ کا طریقۂ حج تفصیل سے بیان کیا ہے جسے امام مسلم اور دیگر محدثین نے روایت کیا ہے۔ یہ تفصیل اسی سے ماخوذ ہے۔

۱۴۱ ملاحظہ کیجیے فتح الباری ۸/ ۷۴

ہے جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ ارکانِ وفد نے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: "ہمیں کسی قطعی چیز کا حکم دیں جسے ہم اختیار کرلیں اور اپنے قبیلے والوں کو بھی اس کا حکم دیں تو ہم جنت سے بہرہ ور ہوں" آپؐ نے فرمایا: "میں تمہیں چار چیزوں کا حکم دیتا ہوں اور چار چیزوں سے روکتا ہوں۔" پھر آپؐ نے چار چیزوں کو اس طرح گنایا: "میں تمہیں حکم دیتا ہوں اللہ پر ایمان لانے کا، نماز قائم کرنے کا، زکوٰۃ دینے کا، رمضان کے روزہ رکھنے کا، اور مالِ غنیمت میں سے خمس ادا کرنے کا۔" بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے ایمان کا تذکرہ چار اوامر کے علاوہ کیا تھا۔ اس لیے کہ وہ معروف تھا۔ لیکن آپ نے محض تاکید کی غرض سے اس کا تذکرہ فرمایا، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ایمان مذکورہ چار اوامر کی بنیاد ہے۔ وفد عبدالقیس ۹ھ میں آیا تھا۔ اگر اس وقت تک حج فرض ہو چکا ہوتا تو آں حضرت ﷺ انہیں دیے جانے والے حکموں میں اس کا تذکرہ ضرور فرماتے۔

۲۔ حجۃ الوداع کی اہمیت:

رسول اللہ ﷺ کے اس حج کو اسلام کی دعوت، آں حضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور اسلامی نظام کے عام منہاج کے سلسلے میں بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور دیگر عبادات اور فرائض کے طریقے سیکھ لیے تھے۔ اب صرف آپؐ سے مناسکِ حج کی ادائیگی کا طریقہ سیکھنا باقی رہ گیا تھا۔ عرب عہدِ جاہلیت میں عریاں ہو کر طواف کرتے تھے اور دورانِ طواف شور و غل کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔ آں حضرت ﷺ نے بتوں کا خاتمہ کرنے اور بیت اللہ کو ان سے پاک و صاف کرنے کے ساتھ ساتھ ان موروثی رسوم و روایات کا بھی خاتمہ کر دیا تھا، اس لیے ضرورت تھی کہ انہیں شعائرِ حج کی ادائیگی کا صحیح طریقہ بتایا جائے۔

بیت اللہ کی طرف حج کی دعوت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس کی طرف دعوت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم سے دی تھی۔ لیکن جاہلیت کے انحرافات اور بت پرستی کی گمراہیوں نے اس میں باطل رسوم کا اضافہ کر دیا تھا اور اسے کفر و شرک کے بہت سے مظاہر کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اسلام نے اس عبادت کو ان گندیوں سے

پاک کیا اور اسے اتنا صاف ستھرا کر دیا کہ اس سے نورِ توحید جھلکتا تھا اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی مطلق عبودیت پر استوار ہو گئی تھی۔

اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے لوگوں میں اعلان کر دیا کہ آپؐ حج کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اعلان سن کر لوگ گوشے گوشے سے امڈ آئے۔ تاکہ آپ کی اقتداء میں حج کے صحیح اعمال سیکھ سکیں اور فرسودہ جاہلی روایات کے جال میں نہ پھنسیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب روئے زمین پر آپ کا مشن پورا ہونے کو ہے۔ جو امانت آپ کے سپرد کی گئی تھی اسے آپ نے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ جزیرۃ العرب میں شجرِ توحید برگ و بار لانے لگا ہے اور اسلام ہر جگہ دلوں کو فتح کر رہا ہے۔

آں حضرت ﷺ کو احساس ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو، جو آج بہت بڑی تعداد میں اور مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں، اپنے رسول سے مزید ملاقات کرنے اور اس کی تعلیمات ونصائح سے استفادہ کرنے کا شوق ہے۔ خود آں حضرت ﷺ بھی ان سے ملاقات کے مشتاق تھے۔ خاص طور سے وہ جمِ غفیر جو جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں میں حال ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوا تھا اور اسے آں حضرت ﷺ سے شرفِ ملاقات کے مواقع نہیں مل سکے تھے، اس سلسلے میں بہت بے چین تھا۔ اس کا بہترین موقع حجِ بیت اللہ میں میدانِ عرفات میں حاصل ہو سکتا تھا جہاں امت اس عبادت کے زیرِ سایہ، جسے شعائرِ اسلام میں سب سے زیادہ عظمت حاصل تھی، اپنے رسول سے ملاقات کر سکتی تھی۔ اور جس کے بارے میں علمِ الٰہی میں یہ بات تھی اور اس نے اپنے رسول کو بھی اس کا الہام کر دیا تھا کہ یہ الوداعی ملاقات ہے۔

رسول اللہ ﷺ بھی چاہتے تھے کہ ان مسلمانوں سے ملاقات کریں جو تئیس سال تک جاری رہنے والے جہاد کا حاصل ہیں، تاکہ جامع کلمات اور مختصر وعظ کے ذریعے اسلام کی تعلیمات اور اس کے نظام کا خلاصہ ان کے سامنے پیش کریں، ایسا وعظ جس سے امت سے آپ کی محبت کا اظہار ہو۔ اور تاکہ ان کے چہروں میں آپ ان کی نسلوں اور ان کے بعد آنے والوں کی تصویر دیکھ لیں اور زمانوں اور صدیوں کے پس پردہ ان تک اپنی نصیحتیں اور ہدایتیں پہنچا دیں۔

یہ تھا حجۃ الوداع کا پیغام۔ اس کی مکمل تصویر کشی اس خطبہ سے ہوتی ہے جو رسول اللہ

ﷺ نے یوم عرفہ میں وادی عُرنہ میں دیا تھا۔

۳۔ خطبۂ حجۃ الوداع۔ غور و فکر کے چند پہلو:

رسول اللہ ﷺ نے امانت پہنچادینے، امت کی خیر خواہی کرنے اور تیئیس ۲۳ سال تک بغیر سستی کا مظاہرہ کیے اور بغیر اکتائے دعوت الی اللہ کے راستے میں مسلسل جہاد کرنے کے بعد میدانِ عرفات میں جو خطبہ دیا تھا اور اس کے ذریعے آنے والی نسلوں کو مخاطب کیا تھا، وہ کتنے دل آویز کلمات پر مشتمل تھا۔ وہ گھڑی کتنی دل کش تھی جب رسول اللہ ﷺ کے گرد ہزاروں افراد اکٹھا ہو کر اپنے رب کے حضور خشوع، تضرع اور مناجات میں مصروف تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اس سے پہلے عرصہ تک آپ کی بدخواہی کی تھی اور آپ سے جنگ جاری رکھی تھی۔ ہزاروں افراد، جو ہر چہار جانب تاحدِ نظر دکھائی دے رہے تھے، زبان حال سے یہ ارشاد باری دہرا رہے تھے:

إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْأَشْهَادُ.

(مومن:۵۱)

یقین جانو کہ ہم اپنے رسولوں اور ایمان لانے والوں کی مدد اس دنیا کی زندگی میں بھی لازماً کرتے ہیں اور اس روز بھی کریں گے جب گواہ کھڑے ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ ان کے چہروں میں آنے والی نسلوں کو دیکھنے لگے۔ آپ کے سامنے اس عظیم عالم اسلام کی نمائندگی ہو رہی تھی جس سے عنقریب مشرق و مغرب بھر جائیں گے۔ آپ اس کے سامنے اپنا الوداعی خطبہ دینے لگے:

”لوگو! میری بات غور سے سنو۔ مجھے معلوم نہیں، شاید تم سے اس سال کے بعد اس جگہ کبھی ملاقات نہ ہو......“

پوری دنیا گوش بر آواز تھی۔ پتھر، صحراء اور کائنات کی دوسری چیزیں خاموشی سے رسول اللہ ﷺ کا الوداعی خطاب سن رہی تھیں۔ جس ذات کا وجود ترسٹھ ۶۳ سال تک دنیا کی خوش بختی کا باعث بنا ہوا تھا وہ آج حکم الٰہی کی تعمیل اور روئے زمین پر ایمان کی شجر کاری کر کے جدائی کا اشارہ دے رہی تھی۔ اور جامع کلمات اور متعین دفعات کی صورت میں دنیا کے سامنے ان

اصول و مبادی کا خلاصہ پیش کر رہی تھی جن کے ساتھ اس کی بعثت ہوئی تھی اور جن کے لیے اس نے جہاد کیا تھا۔

اس کی پہلی دفعہ کیا تھی؟

سبحان اللہ! کتنی عظیم اور کتنی اہم بات ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ کو ان کھائیوں کا احساس ہو گیا تھا جن میں آپ کی امت کے کچھ افراد گرنے والے ہیں۔ آپ کو احساس ہو گیا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب یہ لوگ دوسروں کے پیچھے دیوانہ وار بھاگیں گے اور اس روشنی سے اپنی آنکھیں موند لیں گے جسے آپ ان کے درمیان چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ کے خطاب کی پہلی دفعہ یہ تھی۔

”لوگو! تمہارا خون اور تمہارا مال اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر تم پر حرام ہے۔“

آپ نے یہ ہدایت دوبارہ اپنے خطاب کے آخر میں بھی فرمائی اور اسے ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنے پر زور دیا۔ آپ نے فرمایا:

”اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اپنے بھائی کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں۔ ہاں اگر وہ بخوشی کچھ دے دے تو کوئی حرج نہیں۔ لوگو! ایک دوسرے پر ہرگز ظلم نہ کرو۔ سن لو۔ کیا میں نے پہنچادیا؟

ہم جواب دیتے ہیں:

جی ہاں! واللہ آپ نے پہنچادیا اے ہمارے آقا! آج ہم آپ کو یہی جواب دے سکتے ہیں“

جی ہاں آپ نے پہنچادیا“ اگرچہ اس جواب کے ذریعے ہم اپنی ایسی ذمہ داری کا اقرار کر رہے ہیں جس کی انجام دہی میں ہم سے سر تا سر کوتاہی ہوئی ہے۔

رہی دوسری دفعہ تو یہ محض ایک ہدایت نہیں ہے بلکہ ایک قرار داد ہے جس کا اعلان آپ نے بھرے مجمع میں کیا تھا۔ آپ کا یہ اعلان ان لوگوں کے لیے بھی تھا جو آپ کے ارد گرد موجود تھے اور ان قوموں کے لیے بھی تھا جو آئندہ زمانوں میں آئیں گی۔

اس قرار داد کا متن یہ ہے۔

"یاد رکھو۔ ہر جاہلی امر باطل ہے!.. جاہلیت کے تمام خون باطل کر دیے گئے ہیں......
جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیے گئے ہیں"

اس قرارداد کا کیا مطلب ہے؟ آپؐ فرما رہے ہیں کہ تعصب اور قبائلی احساس برتری پر مبنی وہ تمام روایات جن پر عہدِ جاہلیت میں فخر کیا جاتا تھا اور ان پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا، زبان، نسب اور نسل کے امتیازات، انسان کا اپنے بھائی کو ظلم اور استحصال کی بیڑی میں جکڑنا، یہ سب چیزیں باطل اور بے اعتبار ہو گئی ہیں۔ ان کی حیثیت مُردار کی سی ہو گئی ہے جسے اسلامی شریعت نے زیرِ زمین دفن کر دیا ہے۔ آج وہ اتنی بے حیثیت ہو گئی ہیں کہ مسلمان انہیں اپنے پیروں سے روندے۔ یہ گندگی تھی جو زائل ہو گئی ہے، تاریکی تھی جو پیٹھ پھیر کر بھاگ گئی ہے، پردہ تھا جو اٹھ گیا ہے۔

اب کون ہے جو اس سڑے مردے کو اکھاڑ کر گلے لگانا چاہتا ہے؟ کون عقل مند ہوگا کہ جن گندگیوں سے وہ نجات پا چکا ہے ان سے دوبارہ اپنے بدن کو آلودہ کرلے؟ کون خوددار ہوگا کہ جن بیڑیوں کو وہ کل توڑ چکا ہے انہیں آج درست کر کے دوبارہ اپنے پیروں میں ڈال لے؟

رسومِ جاہلیت کی گندگیاں تھیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے انسانیت کے سرچشمے سے دور کر دیا اور اس کی فکری اور تہذیبی ترقی کی راہ کی تمام رکاوٹیں دور کر دیں۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ یہ تلچھٹ اب آپ کے پیروں تلے دفن کر دی گئی ہے، تاکہ پوری دنیا پر عیاں ہو جائے اور نسلیں سن لیں کہ اگر کوئی گم کردہ راہ اور فکری ترقی کا دعویدار اس قدیم مدفون کو کھود کر نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو درحقیقت یہ اس کی ترقیٔ معکوس ہے اور وہ قدیم تاریخ کی گھٹاٹوپ تاریکیوں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ خواہ وہ اس وہم کا شکار ہو کہ وہ ترقی کر رہا ہے اور اس کے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔

رہی تیسری دفعہ تو اس میں رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ زمانہ اب اسی ہیئت پر آگیا ہے جس پر اسے مہینوں کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا تھا۔ اہل عرب عہدِ جاہلیت اور آغاز اسلام میں ان مہینوں کے ساتھ کھلواڑ کرتے تھے۔ حضرت مجاہدؒ وغیرہ کے بقول وہ حج دو سال کسی مخصوص مہینے میں کرتے تھے، پھر اگلے دو سال کسی دوسرے مہینے میں، مثلاً دو سال وہ ذی الحجہ میں حج کرتے تھے پھر دو سال محرم میں۔ اسی طرح مہینہ بدلتے رہتے تھے۔ آپ نے اس موقع

پر اعلان فرمایا کہ زمانہ گھوم پھر کر آج دوبارہ اسی نقطہ پر آگیا ہے جس پر ابتداء میں تھا جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا تھا، یعنی مہینوں کو آگے پیچھے کر کے ان کے ساتھ کھلواڑ نہ کرو۔ آج کے بعد حج ہمیشہ اسی مہینے میں ہوگا جسے ذی الحجہ کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ مشرکین کے نزدیک سال بارہ ماہ پندرہ دن کا ہوتا تھا۔ اس بنا پر حج کا زمانہ ہر سال پندرہ دن آگے بڑھ جاتا تھا اور وہ رمضان، شوال، ذی قعدہ یا کسی بھی مہینے میں آسکتا ہے، اسی بنا پر ۹ھ میں جب حضرت ابوبکرؓ کی سربراہی میں حج ادا کیا گیا تو وہ ذی قعدہ کے مہینے میں ہوا تھا۔ اگلے سال جب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع ادا کیا تو وہ ذی الحجہ کے ابتدائی دس دن میں ہوا تھا۔ اس وقت آں حضرت ﷺ نے اعلان فرمایا کہ زمانہ کا قدیم حساب منسوخ کر دیا گیا ہے اور آج کے بعد سے سال کا شمار صرف بارہ مہینے ہوگا۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

"یہ قول نبی ﷺ کے اس ارشاد سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے کہ "زمانہ گھوم پھر کر دوبارہ اپنی اصل ہیئت پر آگیا ہے" یعنی حج کا زمانہ اپنے اصلی وقت پر آگیا ہے جس کی تعیین اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے وقت ہی کر دی تھی۔" [۱۳۲]

چوتھی دفعہ میں رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی وصیت فرمائی ہے۔ اور مختصر اور جامع کلام کے ذریعے تاکید فرمائی ہے کہ عورت پر عہد جاہلیت میں ہونے والے مظالم کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسے حقوق اور انسانی شرف کی وہ ضمانتیں فراہم کی جائیں جو اسلامی شریعت میں موجود ہیں۔

عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید اس لیے ضروری تھی کہ مسلمان قریبی زمانے تک ان جاہلی رسوم وروایات کے پابند رہے تھے جن میں عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور ان کے کسی حق کا اعتراف نہیں کیا جاتا تھا۔ اس وصیت اور اس تاکید کی ایک حکمت شاید یہ بھی تھی کہ مسلمانوں پر ہر زمانے اور ہر عہد میں یہ عظیم فرق واضح رہے کہ عورت کا شرف اور اس کے فطری حقوق کیا ہیں جن کی اسلامی شریعت نے ضمانت فراہم کی ہے؟ اور وہ مختلف وسائل وذرائع کیا ہیں جنہیں لوگوں نے اس کی عفت وعصمت کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے لیے جائز کر لیے ہیں لیکن اسلام انہیں حرام قرار دیتا ہے؟!

---

۱۳۲ ملاحظہ کیجیے الجامع لاحکام القرآن، قرطبی ۸/ ۱۳۷-۱۳۸

<u>پانچویں دفعہ</u> میں نبی ﷺ نے لوگوں کے سامنے ان کی زندگی میں پیش آنے والے تمام مسائل کے سلسلے میں دو سرچشموں کی نشان دہی کی ہے۔ اور انہیں ضمانت دی ہے کہ ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رہنے کی صورت میں وہ بدبختی اور گمراہی سے محفوظ رہیں گے۔ وہ دونوں سرچشمے ہیں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

آں حضرت ﷺ نے یہ یقین دہانی اور ضمانت اپنے بعد آنے والی تمام نسلوں کو کی ہے، تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ ان دونوں سرچشموں سے رہنمائی کسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے اور کوئی تہذیب خواہ کتنی ترقی کر جائے اور زمانہ کا عرف کیسا بھی ہو جائے لیکن ان دونوں کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

رہی <u>چھٹی دفعہ</u> تو اس میں آں حضرت ﷺ نے یہ وضاحت فرمائی ہے کہ حاکم یا خلیفہ یا سربراہ کا تعلق رعایا یا عوام کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے؟ حاکم کوئی بھی ہو، کیسے بھی حسب ونسب کا مالک ہو اور دیکھنے میں کیسا بھی لگتا ہو، لیکن جب تک وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق فیصلے کرے عوام پر سمع وطاعت لازم ہے۔ لیکن اگر وہ ان سے انحراف کرتا ہے تو پھر سمع وطاعت کا حق کھو بیٹھتا ہے۔ معلوم ہوا کہ حاکم سے تعلقِ خاطر اور اس کی اطاعت کی بنیاد کتاب وسنت کے دکھائے ہوئے راستے کی پیروی ہے، پھر خواہ وہ حبشی نکٹا غلام ہو، اس سے بارگاہ الٰہی میں اس کی حیثیت میں بال برابر بھی فرق نہیں آتا۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے یہ واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے حدود سے ماوراء حاکم کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔ اس کی حاکمیت اسے اسلامی نظام اور اسلامی حکم کی سطح سے بال برابر بھی بلند نہیں کرتی۔ حقیقت میں نہ وہ حاکم ہے اور نہ اسے حقیقی حاکمیت حاصل ہے، بلکہ وہ احکام الٰہی نافذ کرنے کے لیے مسلمانوں کا امین ہے۔ اسی لیے اسلامی شریعت میں حکومت یا قانون یا قضا کے معاملات میں مسلمانوں میں سے کسی طبقے کو تحفظ یا مراعات حاصل نہیں ہیں۔

آخر میں...... رسول اللہ ﷺ کو احساس ہوتا ہے کہ دعوت وتبلیغ کی جو ذمہ داری آپؐ کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی اسے آپؐ نے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے، اسلام کی اشاعت ہو گئی ہے، جاہلیت اور شرک کی گمراہیاں چھٹ گئی ہیں الٰہی شریعت کے احکام پہنچا دیے گئے ہیں اور یہ

وحی نازل ہو گئی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

لیکن آں حضرت ﷺ یہ اطمینان چاہتے ہیں کہ آپؐ کی امت قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہو گی اور اس سے سوال کیا جائے گا تو وہ کیا جواب دے گی؟ اس لیے آپؐ نے مذکورہ ہدایات دینے کے بعد لوگوں کے درمیان یہ اعلان فرمایا "تم سے (بارگاہ الٰہی میں) میری نسبت پوچھا جائے گا تو تم کیا جواب دو گے؟

آپؐ کے اردگرد زوردار آوازیں بلند ہوئیں "ہم گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا، اپنا فرض پورا کر دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔" تب جا کر رسول کریم ﷺ کو اطمینان ہوا۔

آپؐ اس گواہی کی توثیق چاہتے تھے جو بارگاہ الٰہی میں آپ کی نسبت دی جائے گی۔ صحابہ کا جواب سن کر آپ کو اطمینان ہو گیا، آپؐ کی آنکھوں سے خوشی ومسرت جھلکنے لگی، آپؐ نے نگاہیں اوپر اٹھائیں، شہادت کی انگلی آسمان کی طرف بلند کی، پھر لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اے اللہ تو گواہ رہنا.... اے اللہ تو گواہ رہنا........ اے اللہ تو گواہ رہنا"

کتنی عظیم سعادت ہے؟! اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے رب کی شریعت عام کرنے میں اپنی حیاتِ طیبہ کے بہترین ایام کھپادیے۔ اب آپؐ کی جدوجہد کا حاصل آپؐ کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ہزارہا آوازیں اللہ کی کبریائی کا اعلان کر رہی تھیں، ہزارہا جبینیں اللہ کے سامنے سجدہ ریز تھیں، ہزارہا دلوں میں اللہ کی محبت جوش مار رہی تھی۔ اللہ کے محبوب نے اس دین کو روئے زمین پر غالب کرنے کے لیے سخت گرمی میں بھوک وپیاس برداشت کی تھی، چٹیل میدانوں میں سفر کی صعوبتیں اٹھائی تھیں، ایذاء اور تمسخر کا عذاب جھیلا تھا۔ اب اللہ کے اطاعت گزار بندوں کا یہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر آپؐ خود کو کتنا صاحبِ سعادت محسوس کر رہے تھے۔

اے میرے آقا!اس منظر سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، آپ کو سرور وفرحت حاصل ہو اور آپ کا دل اپنے رب کی حمد سے سرشار ہو جائے۔

اے میرے آقا!اے اللہ کے رسول! یہ صرف آپؐ کے گرد موجود ہزاروں انسانوں کی شہادت نہیں ہے، بلکہ قیامت تک ہر نسل اور ہر زمانے کے مسلمانوں کی شہادت ہے۔ وہ زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں سے اعلان کر رہے ہیں کہ "ہم گواہی دیں گے اے اللہ کے رسول کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام پہنچادیا، اپنا فرض پورا کر دیا اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اللہ آپ کو ہماری طرف سے بہترین بدلہ دے، اس سے اچھا بدلہ جو کسی نبی کو اس کی امت کی طرف سے دیا جاسکتا ہو۔"

لیکن دعوت کی ذمہ داری آپؐ کے بعد اب ہمارے کندھوں پر آگئی ہے۔ لیکن ہم اس کی ادائیگی میں بڑے کوتاہ ہیں۔ اے ہمارے آقا! کل ہم آپ کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے؟ آپؐ کے پاکیزہ اور برگزیدہ اصحاب کا تو یہ حال تھا کہ ان کے جسم گواہی دے رہے تھے کہ انہوں نے اللہ کے دین کے لیے کتنا خون بہایا ہے اور کتنی جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے آپ کی لائی ہوئی شریعت کی حمایت، آپ کی دعوت کے دفاع اور آپ کی جدوجہد کی اتباع میں دنیا کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا تھا، لیکن ہم تن آسانی اور دوں ہمتی کا شکار ہیں اور ہمارے دل دنیاوی زندگی کی رنگینیوں کی طرف مائل ہیں۔

اے اللہ! ہمارا اور تمام مسلمانوں کا حال درست کردے، ہمیں دنیا کی مدہوشی اور خواہشاتِ نفس کے نشے سے بیدار کردے، اور ہمیں اپنے لطف وکرم اور نوازش سے ڈھانک لے۔



آں حضرت ﷺ نے حج مکمل فرمایا، زمزم کے پانی سے سیرابی حاصل کی، لوگوں کو مناسکِ حج کی تعلیم دی، پھر مدینہ لوٹ آئے تاکہ اللہ کے دین کے راستے میں اپنی جدوجہد جاری رکھیں۔

باب ہفتم

مرض اور وصال

لشکرِ اسامہ کی روانگی

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ واپس ہوتے ہی مسلمانوں کو روم پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کا حکم دیا اور اس لشکر کا امیر حضرت اسامہ بن زیدؓ کو بنایا۔ حضرت اسامہؓ کا ابھی آغازِ شباب تھا۔ آپؐ نے انہیں حکم دیا کہ وہ اپنے باپ حضرت زید بن حارثہؓ کی جائے قتل تک جائیں اور ان کے گھوڑے بلقاء اور داروم کی سرزمین تک ضرور پہنچیں، جو ارض فلسطین کا حصہ ہے۔ یہ حکم آپؐ نے مرضِ وفات شروع ہو جانے کے بعد دیا تھا۔

لیکن منافقین کو حضرت اسامہؓ کا امیر لشکر بنایا جانا پسند نہیں آیا۔ وہ کہنے لگے: "ایک نوعمر لڑکے کو جلیل القدر مہاجرین وانصار کا امیر بنایا گیا ہے"[۱]۔ رسول اللہ ﷺ سر پر پٹی باندھے باہر تشریف لائے اور یہ خطبہ دیا:

"اگر آج تم اسامہ کی امارت پر طعن کرتے ہو تو کل تم نے اس کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کیا تھا۔ اللہ کی قسم وہ (یعنی زیدؓ) امارت کا مستحق تھا اور اللہ کی قسم وہ مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اللہ کی قسم! یہ بھی (یعنی اسامہؓ) امارت کا مستحق ہے اور اللہ کی قسم یہ بھی مجھے لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب ہے۔ میں تمہیں اس کی اطاعت کی ہدایت کرتا ہوں۔ وہ تمہارے صالح لوگوں میں سے ہے۔"[۲]

لوگ تیاریوں میں مشغول ہوگئے۔ مہاجرین و انصار حضرت اسامہؓ کی امارت میں روانہ ہوئے۔ حضرت اسامہؓ اپنے لشکر کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلے اور "جُرف" (مدینہ سے ایک فرسخ کے فاصلے پر ایک مقام) میں پڑاؤ ڈالا۔

---

[۱] حضرت اسامہؓ کی عمر اس وقت باختلافِ روایات اٹھارہ یا بیس سال تھی۔
[۲] بخاری و مسلم۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں ۷/۱۳۱

ابتدائے مرض

اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ کے مرضِ وفات نے شدت اختیار کرلی۔ لشکر جرف میں رکا رہا کہ دیکھے اللہ تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

ابتدائے مرض کی تفصیل ابن اسحاقؒ اور ابن سعدؒ نے رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو موبہبہؓ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ نے مجھے نصف شب میں اٹھا کر فرمایا: "اے موبہبہ! مجھے حکم دیا گیا ہے کہ بقیع والوں کے لیے استغفار کروں۔ میرے ساتھ چلو۔ میں آپ کے ساتھ ہولیا۔ جب ہم بقیع پہنچے تو آپؐ نے فرمایا: **السلام علیکم یا اهل المقابر۔** تمہاری صبح بہتر ہو، فتنے سیاہ رات کی طرح امڈ آئے ہیں۔ ان کا تسلسل جاری ہے۔ ان کا آخری حصہ ابتدائی حصہ سے زیادہ شرانگیز ہے۔" پھر آپؐ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "مجھے دنیا کے خزانوں کی کنجیوں اور اس میں ہمیشہ رہنے کی پیش کش کی گئی اور اختیار دیا گیا کہ میں اسے پسند کرلوں یا اپنے رب سے ملاقات اور جنت کو ترجیح دوں۔" میں نے عرض کیا: "میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ دنیا کے خزانوں کی کنجیاں لے لیجیے۔ اس میں ہمیشہ رہیے۔ آخر میں آپ کے لیے جنت تو ہے ہی۔" آپؐ نے فرمایا: "نہیں، اللہ کی قسم، اے ابو موبہبہ! میں نے اپنے رب سے ملاقات اور جنت کو ترجیح دی ہے۔" پھر آپ اہل بقیع کے لیے استغفار کرکے لوٹ آئے۔ اسی روز سے آپ کی علالت شروع ہوگئی۔ [۳]

---

۳ سیرت ابن اسحاق، طبقات ابن سعد، مسند احمد، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ بروایت عائشہؓ وابوہریرہؓ۔

صحیح مسلم اور موطا باب الطہارۃ میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آں حضرت ﷺ قبرستان تشریف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر فرمایا: السلام علیکم اے ایمان والوں کی بستی کے مسکینو! ہم بھی انشاء اللہ بہت جلد تمہارے پاس آنے والے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو دیکھ لیتا۔ وہ کہتے: اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ فرمایا: تم لوگ میرے اصحاب ہو.....الخ

بعض لوگوں کو وہم ہوگیا ہے کہ یہ وہی روایت ہے جسے دوسرے لوگوں نے قربِ وفات کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ امام مسلمؒ اور امام مالکؒ نے اسی کو دوسرے انداز میں روایت کیا ہے، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دونوں روایات کا پس منظر الگ الگ ہے۔ آں حضرت ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ ہر رات بقیع جاکر وہاں مدفون لوگوں کے لیے دعا واستغفار کرتے تھے۔

سب سے پہلے آں حضرت ﷺ کے سر میں شدید درد ہوا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ ﷺ جب بقیع سے واپس آئے تو مجھے اس حال میں پایا کہ میرے سر میں شدید درد تھا۔ میں کہہ رہی تھی: "ہائے میرا سر" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "نہیں اے عائشہ! اللہ کی قسم، میرے سر میں شدید درد ہے۔" [۴] پھر آپ کے سر کی تکلیف میں مزید اضافہ ہوا اور وقفے وقفے سے شدید بخار رہنے لگا۔ اس کا آغاز ۱۱ھ میں ماہ صفر کے اواخر سے ہوا۔ اس دوران حضرت عائشہؓ معوذات پڑھ کر دم کرتی تھیں۔

بخاریؒ ومسلمؒ نے حضرت عروہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: "رسول اللہ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب آپ کو کوئی مرض لاحق ہوتا تو آپ اپنے اوپر معوذات پڑھ کر دم کرلیا کرتے تھے اور ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے۔ جب آپؐ کا مرضِ وفات شروع ہوا تو میں آپ کے اوپر معوذات پڑھ کر دم کرتی تھی اور آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے بدن پر پھیرتی تھی۔"

ازواجِ مطہرات نے محسوس کیا کہ آں حضرت ﷺ بیماری کا زمانہ حضرت عائشہؓ کے یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ آپؐ کو ان سے محبت ہے، ان کے یہاں آپؐ کو زیادہ سکون ملے گا۔ چنانچہ انہوں نے بخوشی اس کی اجازت دے دی۔ آپ حضرت فضل بن عباسؓ اور حضرت علی بن ابی طالبؓ کا سہارا لے کر حضرت میمونہؓ کے گھر سے حضرت عائشہؓ کے گھر آگئے۔

حضرت عائشہؓ کے گھر میں آپ کا مرض مزید بڑھ گیا۔ آپ کو احساس ہوا کہ آپ کی اس حالت سے صحابہ کو بہت تشویش اور رنج ہے۔ آپ نے فرمایا: "مجھ پر سات بھرے مشکیزے انڈیلو۔ شاید اس طرح میری حالت میں کچھ سدھار آئے اور میں لوگوں کے پاس جاسکوں (یعنی باہر نکل کر لوگوں سے گفتگو کرسکوں) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ہم نے آپ کو ایک ٹب میں بٹھا دیا۔ پھر ان مشکیزوں سے آپ کے اوپر پانی انڈیلنے لگے اور اس وقت تک انڈیلتے رہے جب تک کہ آپ نے خود منع نہیں کردیا۔ پھر باہر نکلے، نماز پڑھائی، اس کے بعد خطبہ دیا۔ [۵] اس وقت آپ کے سر مبارک میں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ سب سے پہلے

---

۴ سیرت ابن اسحاق، طبقات ابن سعد۔ امام احمد نے بھی ایک طویل حدیث میں اسی کے مثل روایت کیا ہے۔

۵ بخاری

غزوۂ احد میں شہید ہونے والوں کے لیے دعا و استغفار کیا، پھر فرمایا:

"ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ وہ دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا رہے یا اللہ کے اجر و انعام کو ترجیح دے۔ اس نے دنیا کے مقابلے میں اللہ کے اجر و انعام کو اختیار کر لیا" یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے (کیونکہ وہ نبی ﷺ کی مراد کو سمجھ گئے تھے) اور آپ کو مخاطب کر کے عرض کیا: "ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "ابوبکر! ٹھہرو۔ لوگو! کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اپنی جان اور مال سے مجھ پر اتنا احسان کیا ہو جتنا ابوبکر نے کیا ہے۔ اگر میں کسی کو اپنا خلیل (خاص دوست) بناتا تو وہ ابوبکر ہوتے۔ لیکن اسلامی اخوت سب سے بڑھ کر ہے۔ مسجد کا ہر دریچہ بند کر دو، صرف خوخہ ابوبکر کو باقی رہنے دو۔[۶] میں تمہارے آگے جانے والا ہوں اور تم پر گواہ ہوں۔ مجھے یہ ڈر نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے، مگر اس سے ڈرتا ہوں کہ تم حصولِ دنیا میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگو گے۔"[۷]

پھر رسول اللہ ﷺ گھر واپس تشریف لائے تو آپ کے درد میں اضافہ ہو گیا اور آپ کا مرض بڑھ گیا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض وفات میں ایک موقعے پر مجھ سے فرمایا: "اپنے باپ ابوبکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھ دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بعد میں کوئی شخص امید نہ قائم کر لے اور یہ نہ کہنے لگے کہ (خلافت کا) سب سے زیادہ مستحق میں ہوں، حالانکہ اللہ اور اہل ایمان ابوبکر کے علاوہ اور کسی کے لیے راضی نہ ہوں گے"[۸] حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: "جب رسول اللہ ﷺ کے مرض نے شدت اختیار کر لی تو آپ نے گھر میں موجود لوگوں سے فرمایا: "لاؤ میں تم لوگوں کے لیے ایک تحریر لکھ لوں تاکہ تم لوگ راہِ حق و صواب سے منحرف نہ ہو۔" بعض لوگوں نے کہا: "رسول اللہ ﷺ پر

---

۶ خوخہ دو گھروں کے درمیان چھوٹے دروازے کو کہتے ہیں۔ یہاں تک کی حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔

۷ بخاری و مسلم

۸ مسلم، باب فضل ابی بکر ۷/۱۱۰۔ اسی کے مثل بخاری میں بھی مروی ہے۔

تکلیف کا غلبہ ہے۔ (اس لیے ایسی بات فرما رہے ہیں) ہمارے پاس قرآن ہے، اور ہماری رہنمائی کے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے" افرادِ خانہ کے درمیان اختلاف ہو گیا اور وہ جھگڑنے لگے۔ بعض کہنے لگے کہ آں حضرت ﷺ سے تحریر لکھوا لینی چاہیے تاکہ تم لوگ بعد میں گمراہ نہ ہو۔ اور بعض دوسری بات کہتے تھے۔ جب اختلاف بڑھ گیا اور ہنگامہ زیادہ ہونے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے وہاں موجود سب لوگوں سے فرمایا: "میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔"[۹]

رسول اللہ ﷺ کی نقاہت اتنی بڑھ گئی کہ نماز کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا تو آپؐ نے فرمایا: "ابوبکر سے کہو وہ نماز پڑھائیں۔" حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! ابوبکر بڑے رقیق القلب ہیں۔ وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوں گے تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکیں گے اور ان کی آواز مقتدیوں تک نہ پہنچ سکے گی۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "تم عورتوں کی مثال عزیزِ مصر کی ان درباری عورتوں کی سی ہے جنھوں نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائی تھیں۔ ابوبکر سے کہو وہ نماز پڑھائیں۔"[۱۰]

اس کے بعد ابوبکرؓ لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے۔ ایک موقعے پر نبی ﷺ نے کچھ افاقہ اور طبیعت میں ہلکا پن محسوس کیا تو باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی آہٹ محسوس کی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ آپ نے اشارہ سے انھیں ہدایت کی کہ پیچھے نہ ہٹیں، پھر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے پہلو میں بیٹھ کر نماز ادا فرمائی اور حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے رہے۔"[۱۱]

آں حضرت ﷺ کے باہر نکل کر نماز ادا کرنے سے صحابہ کو بہت مسرت ہوئی، لیکن پھر آپ کے مرض میں اضافہ ہو گیا۔ یہ آں حضرت ﷺ کی آخری نماز تھی جو آپ نے مسجد میں ادا فرمائی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: "میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

---

۹ بخاری، باب مرض النبی ووفاته ۵/۱۳۸

۱۰ بخاری و مسلم

۱۱ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب من اقام الیٰ جنب الامام لعلة۔ مسلم، کتاب الصلوۃ، باب استخلاف الامام، مؤطا امام مالک، کتاب صلوۃ الجماعة، باب صلوۃ الامام وهو جالس۔

تعجب ہے کہ شیخ ناصر الدین البانی نے شیخ محمد الغزالی کی کتاب فقہ السیرۃ کی احادیث کی تخریج کرتے

(باقی اگلے صفحہ پر)

حاضر ہوا۔ اس وقت آپ کا جسم اطہر بخار میں تپ رہا تھا۔ میں نے اسے ہاتھ سے چھوا، پھر عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔" فرمایا: "مجھے اتنا بخار ہے جتنا تم لوگوں میں سے دو آدمیوں کو ہوتا ہے۔" میں نے عرض کیا: "آپ کے لیے دوگنا اجر بھی تو ہے۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہاں، کسی بھی مسلمان کو کوئی مرض لاحق ہوتا ہے یا کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑ جاتے ہیں جس طرح درخت سے پتے جھڑتے ہیں۔"[12]

جب رحلت کا وقت قریب آیا تو ایک چادر آپ کے جسم اطہر پر پڑی ہوئی تھی۔ جب تکلیف زیادہ ہونے لگتی تو اس کو چہرۂ مبارک سے ہٹا دیتے۔ اسی حال میں آپ نے ارشاد فرمایا: "یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔"[13] اس ارشاد کا مقصد مسلمانوں کو خبردار کرنا تھا کہ وہ ایسا نہ کریں۔

عالم جاں کنی

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کے بارے میں یہ فیصلہ فرمادیا ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ. (الزمر۔۳۰)

اے نبی! تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ کا)

ہوئے اس حدیث کو صرف امام احمد اور ابن ماجہ کی جانب منسوب کیا ہے۔ اور اس کی سند میں ایک راوی ابواسحاق السبیعی کی وجہ سے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں بھی ہے۔ اور اس کی جس سند کی تحقیق شیخ البانیؒ نے کی ہے اس کے علاوہ بھی وہ متعدد سندوں سے مروی ہے۔ البتہ احمد اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ جملہ بھی ہے۔ "ابوبکرؓ نے جس آیت تک قراءت کی تھی آں حضرت ﷺ نے اس سے آگے قراءت شروع کردی" جب کہ بخاری و مسلم کی روایت میں یہ موجود نہیں ہے۔

بہرحال واقعہ بھی ایک ہی ہے اور حدیث بھی۔ اس لیے مناسب نہیں کہ اس کی تخریج کرتے وقت صرف ضعیف سند کو بیان کیا جائے اور صحیح اور متفق علیہ سند سے سکوت اختیار کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ چیز ابہام کا باعث ہوتی ہے جس سے علماء حدیث احتراز کرتے ہیں۔

[12] بخاری و مسلم

[13] بخاری و مسلم

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دوشنبہ کے دن لوگ حضرت ابوبکرؓ کی اقتداء میں فجر کی نماز ادا کررہے تھے کہ اچانک حجرۂ عائشہؓ کا پردہ ہٹا اور رسول اللہ نمودار ہوئے۔ آپؐ نے صحابہ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو مسکرائے، پھر ہنس پڑے۔ حضرت ابوبکرؓ پیچھے ہٹ کر صف میں شامل ہوگئے۔ انہیں گمان ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے تشریف لارہے ہیں۔ صحابہ کرام آپؐ کو دیکھ کر نماز ہی میں بے قابو ہوئے جارہے تھے۔ آپؐ نے انہیں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنی نماز پوری کریں۔ پھر حجرہ میں داخل ہوکر پردہ گرادیا۔[14]

لوگ نماز سے فارغ ہوئے۔ انہیں خیال ہوا کہ آں حضرت ﷺ کے مرض میں افاقہ ہورہا ہے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صحابہ پر آپؐ کی الوداعی نگاہ تھی۔ واپس آکر آپ حضرت عائشہؓ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئے۔ انہوں نے آپؐ کا سرمبارک اپنے سینے سے لگالیا۔ آپؐ پر موت کے سکرات طاری ہونے لگے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "آپؐ کے سامنے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ آپ دونوں ہاتھ پانی میں ڈالتے، پھر چہرے پر پھیر لیتے اور فرماتے: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے شک موت کے سکرات ہوتے ہیں۔"[15] حضرت فاطمہؓ نے جب آپ کی یہ حالت دیکھی تو کہنے لگیں: "ہائے میرے ابا جان کی تکلیف۔" آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "آج کے بعد تمہارے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"[16]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "اللہ تعالیٰ نے آں حضرت ﷺ کی وفات کے وقت آپ کے

---

[14] بخاری و مسلم

[15] بخاری۔ باب مرض الرسول ﷺ ووفاتہ اور کتاب الرقاق، باب سکرۃ الموت ۷/۱۹۲۔ ترمذی، نسائی اور احمد نے اسے دوسری سند سے روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "اے اللہ موت کے سکرات برداشت کرنے میں میری مدد فرما۔" شیخ ناصرالدین البانی نے اس کی تخریج کرتے ہوئے لکھا ہے: "یہ ضعیف ہے۔ اسے ترمذی اور دیگر محدثین نے موسیٰ بن سرجس بن محمد عن عائشہ کی سند سے روایت کیا ہے... الخ۔ یہ صحیح ہے کہ ان الفاظ میں یہ روایت ضعیف ہے۔ لیکن اصل حدیث امام بخاری نے صحیح سند سے روایت کی ہے۔ اگر کسی حدیث کی دو سندیں ہوں تو اس کی تخریج کرتے ہوئے صرف ضعیف کو ذکر کرنا اور صحیح کے بارے میں سکوت اختیار کرنا مناسب نہیں ہے، جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا اگر واقعہ ایک ہو تو الفاظ کے معمولی اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

[16] بخاری

اور میرے تھوک کو یکجا کردیا۔ میرے بھائی عبدالرحمٰن گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں مسواک تھی۔ رسول اللہ ﷺ میری ٹیک لیے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی نگاہ ان کی طرف ہے۔ میں سمجھ گئی کہ آپؐ مسواک لینا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: کیا میں اسے آپؐ کے لیے لے لوں؟ آپؐ نے سر کے اشارے سے فرمایا: "ہاں"۔ میں نے اسے لے کر آپ کو دیا۔ وہ سخت تھی۔ میں نے کہا: کیا اسے ملائم کردوں؟ آپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے ملائم کر کے دیا۔ آپ نے مسواک کی۔ سامنے پانی کا ایک کٹورا تھا۔ آپؐ اس میں اپنے ہاتھ ڈال کر چہرے پر پھیر لیتے۔ اس کے بعد فرماتے: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بے شک موت کے سکرات ہوتے ہیں۔" پھر آپ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا: "فی الرفیق الاعلی" (سب سے اعلیٰ اور برتر رفیق کے پاس) یہاں تک کہ روح پرواز کر گئی اور آپ کا ہاتھ ایک طرف جھک گیا۔"[17]

آں حضرت ﷺ کی وفات کی خبر صحابہؓ کرام پر بجلی بن کر گری۔ اس وقت حضرت ابو بکرؓ مقام سنح میں اپنے گھر پر تھے۔ آں حضرت ﷺ کے مرض میں افاقہ دیکھ کر وہ وہاں چلے گئے تھے۔ انہیں خبر ملی تو گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً پہنچے۔ پہلے مسجد نبوی میں گئے، لیکن وہاں کسی سے بات نہیں کی۔ پھر حجرۂ عائشہ میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ جسم اطہر پر ایک دھاری دار چادر ڈھکی ہوئی ہے۔ اسے سرکایا اور جھک کر روئے انور کا بوسہ لیا اور رو پڑے، پھر کہا: "میرے ماں باپ آپ پر فدا۔ اللہ آپ پر دو موتیں اکٹھا نہیں کرے گا۔ جو موت آنی تھی وہ آچکی ہے۔"[18] اس کے بعد مسجد نبوی میں آئے۔ وہاں حضرت عمرؓ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال نہیں ہوا ہے، بلکہ آپ اپنے رب سے ملاقات کے لیے گئے ہیں جس طرح حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام گئے تھے، اور جب تک اللہ تمام منافقین کو فنا نہیں کردے گا آپ کو موت نہیں آسکتی۔ "حضرت ابو بکرؓ نے کہا: "عمر! ذرا ٹھہرو۔" لیکن جوشِ کلام میں حضرت عمرؓ نے ان کی بات نہیں سنی۔ جب حضرت ابو بکرؓ نے دیکھا کہ وہ خاموش نہیں ہو رہے ہیں تو مجمع کی طرف متوجہ ہو کر انہوں نے اپنی بات شروع کردی۔ لوگوں نے جب ان کو خطاب کرتے ہوئے دیکھا تو حضرت عمرؓ کی طرف سے رخ پھیر کر ان کی بات سننے لگے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اللہ کی حمد وثنا

[17] بخاری و مسلم۔ الفاظ بخاری کے ہیں۔

[18] بخاری

کے بعد فرمایا: "لوگو! اگر کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ بلا شبہ آپ کی وفات ہو گئی ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے تھے انہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اس پر کبھی موت طاری نہیں ہو گی۔

پھر انہوں نے یہ آیت تلاوت کی:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، اَفَاِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران۔ ۱۴۴)

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

جب حضرت ابو بکرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی تو لوگوں کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا یہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ ہر شخص اس کی تلاوت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: "میں نے ابو بکرؓ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو حیرت زدہ ہو کر بے ساختہ زمین پر گر پڑا۔ میرے پیروں کی طاقت ختم ہو چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ نبی ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے۔"[19]

تمام راویوں اور اہل علم کا اتفاق ہے کہ آں حضرت ﷺ کی وفات ترسٹھ سال کی عمر میں ہوئی۔ چالیس سال آپ نے بعثت سے قبل گزارے۔ تیرہ سال مکہ میں دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیتے رہے اور دس سال ہجرت کے بعد مدینہ میں گزارے۔ آپ کی وفات گیارہویں سال کے اوائل میں ہوئی۔

امام بخاریؒ نے حضرت عمرو بن الحرثؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: "رسول اللہ ﷺ دنیا سے اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ نے ایک دینار یا درہم، ایک غلام یا لونڈی اور کوئی چیز بھی پیچھے نہیں چھوڑی۔ صرف آپ کا ایک سفید خچر تھا، آپ کے ہتھیار تھے اور ایک قطعہ زمین تھا جس کو آپ نے مسافروں کے لیے صدقہ کر دیا تھا۔"

[19] ابن اسحاق وغیرہ۔ امام بخاری نے بعض الفاظ کے معمولی فرق سے اس کی روایت کی ہے۔

دروس ونصائح

۱۔ کائنات کی سب سے بڑی حقیقت:

سیرت مصطفیٰ ﷺ کے اس آخری باب کے واقعات سے اس کائنات کی عظیم حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، وہ حقیقت جس کے سامنے بڑے بڑے جباروں کا جبروت، ملحدین کی عداوت و دشمنی اور سرکشوں اور خدائی کا دعویٰ کرنے والوں کی سرکشی سپر ڈال دیتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو صفحۂ ہستی کو فنا اور خاتمہ کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے اور انسانوں کو آسمانوں اور زمین کی تخلیق کرنے اور ان کا انتظام چلانے والی ہستی کے سامنے عاجزی و فروتنی اختیار کرنے اور آداب بندگی بجالانے پر مجبور کردیتی ہے۔ نافرمان ہوں یا اطاعت گزار، سردار اور خدائی کا دعویٰ کرنے والے ہوں یا انبیاء و رسل اور مقربین و اصفیاء، امیر ہوں یا غریب، مدعیان علم ہوں یا ایجاد و اختراع کرنے والے، سب لوگوں کو طوعاً یا کرہاً اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

اس حقیقت نے ہر زمانے میں اور ہر جگہ، ہر سننے والے کے کان میں اور ہر سوچنے والے کے دماغ میں، برملا یہ اعلان کیا ہے کہ ”الوہیت صرف اللہ کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں، حاکمیت صرف اسی کو زیبا ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے، اس کا فیصلہ اٹل ہے، اس کے اختیارات لامحدود ہیں، اس کا قانون سب پر لاگو ہے اور اس کا حکم سب پر نافذ ہونے والا ہے۔“

موت اور اس کی تکلیف سے بڑھ کر اور کوئی حقیقت نہیں جو اس چیز کا اتنے واشگاف انداز میں اظہار کرتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش سے قیامت تک دنیا کے تمام باشندوں کو اس حقیقت کا پابند کیا ہے۔

دنیا کی اس گزرگاہ میں بہت سے ایسے فریب خوردہ لوگ آئے جو طاقت و قوت کے نشے میں چور رہے یا انہیں علوم و فنون اور ایجادات و اختراعات پر بڑا ناز رہا۔ لیکن اس عظیم حقیقت نے ان کی ساری ہیکڑی بھلادی اور انہیں عبودیت کے صحرا میں ڈال دیا، چنانچہ ان کا، طاقت و قوت کا نشہ ہرن ہوگیا؛ وہ آسمانوں اور زمین کے منتظم اور سارے جہاں کے مالک کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوگئے۔ انہوں نے اللہ سبحانہ کے آگے اپنی جبین نیاز ٹیک دی اور اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔

”ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے“!...

یہ بات مطلق کہی گئی ہے، اس میں کوئی قید نہیں۔ اس میں عموم ہے: کوئی تخصیص نہیں۔ اس میں جامعیت ہے، پوری دنیا مل کر بھی اس کی حد بندی نہیں کر سکتی۔ جدید علوم اور عصری ترقی کے دعویدار اور فضا کو تسخیر کرنے والے آگے بڑھیں، متفقہ طور پر اپنے تمام وسائل و ذرائع کو کام میں لائیں، مصنوعی سیاروں اور خلائی گاڑیوں کو استعمال کریں اور اپنی ذات سے موت کا تسلط ختم کرنے کی کوشش کریں جس کا خوف برابر ان پر طاری رہتا ہے اور اس الٰہی چیلنج (ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے) کا جزوی طور پر ہی سہی، توڑ کریں۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوجائیں تبھی انہیں زیب دے گا کہ اپنے لیے طاقت و جبروت، سرکشی و غرور، دعویٰ خدائی اور ناشکری کے بلند قلعے تعمیر کریں۔ ورنہ ان کے لیے مناسب یہ ہے کہ ذہن و دماغ کو فارغ کرکے ان قبروں کے بارے میں غور و فکر کریں جن میں انہیں جانا ہے، اس مٹی کے بارے میں سوچیں جو انہیں اپنے اندر سمالے گی اور اس گرفت کا تصور کریں جس سے وہ بچ نہیں سکتے۔

اللہ عزّ وجل کے لیے آسان تھا کہ اپنے رسول ﷺ کا مقام موت اور اس کی تکلیفوں سے پرے رکھتا۔ لیکن حکمتِ الٰہی کی مشیت یہ ہوئی کہ ہر شخص اس تلخ گھونٹ کو اپنے حلق سے اتارے، خواہ بارگاہ الٰہی میں اسے کتنا ہی تقرب کیوں نہ حاصل ہو؟! تاکہ لوگوں پر توحید کا مفہوم اور اس کی حقیقت اچھی طرح واضح ہوجائے اور وہ خوب جان لیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے، اسے رحمٰن کا بندہ بن کر اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ حکم عبودیت کے تابع رہے ہیں اور ان پر اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہا ہے تو دیگر لوگ بھی اس سے بلند نہیں ہو سکتے، اور جب اللہ کے محبوب ﷺ نے موت کی تکلیف اور اس کی شدت برداشت کی ہے تو دیگر لوگوں کو بھی چاہیے کہ کثرت سے موت اور اس کی تکلیف کو یاد کرتے رہیں۔

اسی حقیقت کو قرآن میں یوں واضح کیا گیا ہے:

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ. (الزمر۔ ۳۰)

(اے نبی) تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِنْ مِتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ. كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ

الْمَوْتِ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَّإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ. (الانبیاء: ۳۴-۳۵)

اور اے نبی! ہیشگی تو ہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے۔ اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہے اور ہم اچھے اور برے حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمہیں ہماری ہی طرف پلٹنا ہے۔

سیرتِ نبوی کے اس آخری باب سے ہمارے اوپر دو حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔ یہ دونوں ایمان باللہ بلکہ حقیقتِ کائنات کی بنیاد ہیں۔ ایک ہے اللہ عزّ و جل کی وحدانیت کی حقیقت اور دوسری اس ہمہ گیر عبودیت کی حقیقت جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی تخلیق کی ہے اور اس کے حکم اور فیصلے میں کوئی تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔

۲۔ اسلام میں برتری کی اساس عملِ صالح ہے:

حضرت اسامہؓ کی سربراہی میں لشکر بھیجنے سے اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں۔ اگر کسی کو برتری حاصل ہے تو صرف عملِ صالح کی بنیاد پر۔ حضرت اسامہؓ کے والد حضرت زید بن حارثہؓ غلام تھے اور ان کی حیثیت آزاد کردہ غلام کی تھی۔ اور ابھی وہ اٹھارہ بیس سال کے نوجوان تھے۔ اس کے باوجود ان کی نوعمری اور قدیم غلامی اس بات میں رکاوٹ نہیں بنی کہ رسول اللہ ﷺ ایک عظیم اور اہم غزوہ میں انہیں سپہ سالار بنائیں اور تمام صحابہ کو ان کی ماتحتی میں بھیجیں۔ اس پر منافقین کو تعجب اور ناگواری ہو تو ہو لیکن اسلامی شریعت میں یہ چیز باعثِ حیرت اور موجبِ ناپسندیدگی نہیں ہے۔ اسلام آیا ہی اس لیے ہے تاکہ وہ جاہلیت کے ان پیمانوں کو چکنا چور کر دے جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے پر فخر اور برتری جتایا کرتے تھے۔ شاید نبی ﷺ کو حضرت اسامہؓ کی کسی امتیازی خصوصیت کا علم رہا ہو جس کی بنا پر آپ نے انہیں اس غزوہ میں مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اہل سمجھا ہو۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کے لیے لازم تھا کہ وہ سمع و طاعت کا مظاہرہ کریں، خواہ کسی حبشی غلام کو ان کا امیر بنا دیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابو بکرؓ نے زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ لشکرِ اسامہ کو روانہ کیا۔ اس لشکر کے ساتھ خود کچھ دور تک تشریف لے گئے۔ سپہ سالار

حضرت اسامہؓ سواری پر تھے اور حضرت ابو بکرؓ پیدل چل رہے تھے۔ حضرت اسامہ نے عرض کیا: اے خلیفۂ رسول! آپ بھی سوار ہو جایئے یا میں اتر جاؤں۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا: اللہ کی قسم! نہ تم اترو گے، نہ میں سوار ہوں گا۔ اگر کچھ دیر میرے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟ حضرت اسامہؓ اس غزوہ سے فاتح و کامران بن کر لوٹے اور اس لشکر کی روانگی سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔[۲۰]

۳۔ جھاڑ پھونک کی مشروعیت:

جھاڑ پھونک کی مشروعیت کی دلیل بخاری و مسلم کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ آں حضرت ﷺ کو جب کوئی مرض لاحق ہوتا تو آپ "معوذات" پڑھ کر اپنے اوپر دم کرتے اور اپنا ہاتھ بدن پر پھیر لیا کرتے تھے... الخ۔

آں حضرت ﷺ کا یہ بھی معمول تھا کہ آپ کبھی قرآن کی کوئی آیت یا سورہ پڑھ کر اور کبھی دیگر اذکار اور دعاؤں کے ساتھ صحابہ پر جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ امام مسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں: ہم میں سے جب کسی شخص کو کوئی تکلیف ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس پر اپنا دستِ مبارک پھیرتے، پھر یہ دعا پڑھتے تھے:

"اذهب البأس رب الناس، واشف وانت الشافي، لا شفاء الا شفاؤك، شفاءً لا يغادر سقما"

اے انسانوں کے رب! اس تکلیف کو دور کر دے۔ شفا دے، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے علاوہ اور کوئی شفا نہیں دے سکتا۔ ایسی شفا دے کہ مرض کا کوئی اثر باقی نہ رہے۔

بخاری و مسلم نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ کو جب کوئی تکلیف ہوتی تو آپ "معوذات" پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرتے تھے۔ جب آپؐ کے مرضِ وفات نے شدت اختیار کی تو یہ سورتیں میں آپؐ پر پڑھتی تھی اور برکت کے خیال سے آپ کا ہاتھ پکڑ کر آپؐ کے جسمِ اطہر پر پھیرتی تھی۔"

جھاڑ پھونک کی مشروعیت کی واضح دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

---

[۲۰] تاریخ طبری ۳/۲۲

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۤءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا. (بنی اسرائیل۔۸۲)

ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔

دعا اور جھاڑ پھونک کے درمیان فرق ہے اور وہ یہ کہ جھاڑ پھونک میں دعا کے ساتھ منہ سے پھونک ماری جاتی ہے اور ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ پھونک میں تھوک کے ذرّات نہیں ہونے چاہئیں۔

مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ، اسحاقؒ اور ابو ثورؒ کا مسلک یہ ہے کہ جھاڑ پھونک پر اجرت لینی جائز ہے۔ ابو حنیفہؒ کے یہاں کچھ تفصیل ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم قرآن پر اجرت لینی جائز نہیں، لیکن جھاڑ پھونک پر جائز ہے۔[۲۱] اس کی دلیل بخاری و مسلم کی روایت کردہ یہ حدیث ہے کہ کچھ صحابہ ایک مرتبہ سفر میں تھے، وہ ایک قبیلے کے پاس سے گزرے۔ قبیلے والوں سے انہوں نے کچھ کھانے کے لیے مانگا، مگر انہوں نے نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس قبیلے کے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا: کیا تم میں کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہے۔ ہمارے قبیلے کے سردار کو کسی نے ڈس لیا ہے یا اسے کچھ ہو گیا ہے۔ ایک صحابی نے کہا: "ہاں میں ہوں۔" پھر وہ وہاں گئے اور سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا جس سے قبیلہ کا سردار شفایاب ہو گیا۔ اس نے اس صحابی کو بکریوں کا ایک ریوڑ اجرت میں دیا۔ صحابی نے کہا: میں اسے اس وقت تک نہ لوں گا جب تک نبی ﷺ سے اس کا تذکرہ نہ کر دوں اور آپؐ سے اس سلسلے میں دریافت نہ کر لوں۔ صحابہ واپس آئے تو اس صحابی نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر پورا واقعہ سنایا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم، میں نے صرف سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تھا۔ آں حضرت ﷺ مسکرائے اور فرمایا: تمہیں کیا معلوم، یہی تو جھاڑ پھونک ہے۔ پھر فرمایا: ان سے وہ ریوڑ لے لو اور اس میں میرا بھی حصہ لگاؤ۔

امام نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ وغیرہ نے تین شرطوں کے ساتھ جھاڑ پھونک کی مشروعیت پر اجماع نقل کیا ہے:

۲۱؎ ملاحظہ کیجئے شرح نووی بر صحیح مسلم ۱۴/۱۱۸

پہلی شرط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام یا اس کے اسماء اور صفات پڑھے جائیں۔

دوسری شرط یہ کہ جو کچھ پڑھا جائے وہ عربی زبان میں ہو یا اگر کسی دوسری زبان میں ہو تو اس کا مفہوم واضح ہو۔

تیسری شرط یہ کہ جھاڑ پھونک کو بذاتِ خود مؤثر نہ سمجھا جائے بلکہ یہ عقیدہ ہو کہ اس میں تاثیر اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے۔[۲۲]

ان شروط کا ثبوت صحیح احادیث میں موجود ہے۔ مثلاً امام مسلمؒ نے حضرت عوف بن مالک الاشجعیؓ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: ہم لوگ عہد جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ہم نے آں حضرت ﷺ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! اس کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا: اپنے جھاڑ پھونک کے کلمات میرے سامنے پیش کرو۔ (انہیں دیکھ کر میں ان کا حکم بتاؤں گا) اس جھاڑ پھونک میں کوئی حرج نہیں جس میں شرک نہ ہو۔"

۴۔ سحر کی حقیقت اور جھاڑ پھونک کے ذریعے اس کا علاج:

بخاری و مسلم کی روایت کردہ ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ لبید بن الاعصم نے رسول اللہ ﷺ پر جادو کر دیا تھا۔ اس کے توڑ کے لیے آپؐ نے اپنے اوپر معوذات کا دم کیا تھا۔

علماء نے ذکر کیا ہے کہ جمہور مسلمان سحر کے قائل ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ دیگر ثابت شدہ چیزوں کی طرح اس کی بھی ایک حقیقت ہے۔ اس کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے اور یہ ارشاد باری ہے:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ، وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ، وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ، وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (البقرہ۔۱۰۲)

۲۲؎ ملاحظہ کیجئے شرح نووی بر صحیح مسلم ۱۴/۱۶۹، فتح الباری، ابن حجر ۱۰/۱۵۲

اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین سلیمان کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے، حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت وماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر متنبہ کردیا کرتے تھے کہ "دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں۔ تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔" پھر بھی یہ لوگ وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر ہے کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو کو سیکھا جاسکتا ہے۔ اور یہ کسی ایسی چیز ہی میں ممکن ہے جس کی کوئی حقیقت ہو۔ اسی طرح زوجین کے درمیان تفریق ایک حقیقی چیز ہے۔

بعض لوگوں کو ہماری یہ بات تسلیم کرنے میں اشکال ہے۔ اس کے دو اسباب ہیں:

اول: سحر اگرچہ اپنی جگہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے لیکن بعض لوگوں کا وہم ہے کہ یہ توحید کے منافی ہے کیونکہ اس میں تاثیر کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں کی جاتی ہے۔

دوم: یہ کہ یہ کہا جائے کہ رسول اللہ ﷺ پر سحر کیا گیا تھا۔ اور یہ چیز ان کے وہم کے مطابق منصب نبوت کے منافی ہے اور لوگوں کی نظروں میں اسے مشکوک بنادیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ پہلے وہم کا جواب یہ ہے کہ سحر کو ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسے بذات خود مؤثر تسلیم کیا جارہا ہے، بلکہ وہ ایسے ہی ہے جیسے ہم کہیں کہ زہر کی ایک ثابت شدہ حقیقی تاثیر ہے۔ دوا کی ایک ثابت شدہ حقیقی تاثیر ہے۔ یہ درست بات ہے جس کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان ثابت شدہ امور میں تاثیر حقیقۃً اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے۔ سحر کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَمَا هُمْ بِضَارِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ. (ظاہر ہے کہ اذنِ الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے) اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سحر کی ذاتی تاثیر کی نفی کی ہے۔ لیکن اذنِ الٰہی سے اس سے ظاہر ہونے والی تاثیر اور نتیجہ کا اثبات کیا ہے۔

رہا دوسرا وہم تو اس کا جواب یہ ہے کہ آں حضرت ﷺ پر جو سحر کیا گیا تھا اس کا اثر

صرف آپ کے جسم اور ظاہری اعضاء وجوارح پر پڑا تھا۔ اس سے آپ کی عقل، دل اور اعتقاد متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس سے آپ بس اسی طرح متاثر ہوئے تھے جس طرح کوئی انسانی جسم کسی مرض سے متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ واضح ہے کہ عصمتِ نبوی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مختلف بشری امراض واعراض سے بھی محفوظ رہیں گے۔

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: "حدیث میں آیا ہے کہ سحر کے اثر سے آں حضرت ﷺ کو ایسا گمان ہوتا تھا کہ آپ نے فلاں کام کرلیا ہے، حالانکہ آپؐ نے اسے کیا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے تبلیغ دین کے معاملے میں آں حضرت ﷺ کی جانب سے کسی نقص یا عیب کا اثبات نہیں ہوتا ہے، اس لیے کہ اس معاملے میں آپؐ کی عصمت پر دلیل اور اجماع موجود ہے۔ یہ چیز ان امورِ دنیا میں سے ہے جن کا دیگر تمام انسانوں کی طرح آپ بھی شکار ہو سکتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ آپ کے تصور وخیال میں بعض ایسی چیزیں آئیں جن کی کوئی حقیقت نہ ہو اور پھر یہ خیال زائل ہو جائے۔"[۲۳]

آں حضرت ﷺ کی یہ کیفیت ویسی ہی تھی جیسی تیز بخار میں مریض پر طاری ہوتی ہے۔ اس کے طبعی اعراض میں سے یہ ہے کہ حرارت کی شدت سے ذہن میں غیر حقیقی اوہام وخیالات آتے ہیں۔ یہ اور ان جیسے انسانی اعراض کے طاری ہونے میں انبیاء ورسل اور دیگر انسان برابر ہیں۔

یہ واقعہ ان خوارق میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو سرفراز فرمایا تھا۔ یہ آپ کے نقص اور عیب کا مظہر نہیں ہے، بلکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام اور حفاظت کی ایک نئی دلیل پنہاں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جب اپنے جسم میں ان اعراض کا احساس ہوا تو آپ کثرت سے دعا کرنے لگے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سازش کی خبر دے دی جو لبید بن الاعصم نے کی تھی اور آپؐ کو اس کے ازالے کا طریقہ بھی بتادیا۔ پوری حدیث درج ذیل ہے:

بخاریؒ ومسلمؒ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں: "بنی زریق کے ایک شخص نے جس کا نام لبید بن الاعصم تھا، رسول اللہ ﷺ پر جادو کردیا۔ اس کا اثر آپ پر یہ ہوا تھا

۲۳ شرح الشفا، قاضی عیاض ۴/۲۷۸-۲۷۹، مزید دیکھئے شرح نووی بر صحیح مسلم ۱۴/۱۷۴

کہ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کرلیا ہے، حالانکہ اسے نہیں کیا ہوتا تھا۔ ایک روز جب آپ میرے یہاں تھے، آپؐ نے بار بار اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ پھر فرمایا: عائشہ! میں نے اپنے رب سے جو بات پوچھی تھی وہ اس نے مجھے بتادی ہے۔ دو آدمی (یعنی دو فرشتے آدمیوں کی صورت میں) میرے پاس آئے۔ ایک سرہانے کی طرف تھا اور دوسرا پائینتی کی طرف۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا: انہیں کیا ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا: ان پر جادو ہوا ہے۔ اس نے پوچھا: کس نے کیا ہے؟ جواب دیا: لبید بن الاعصم نے۔ پوچھا: کس چیز میں کیا ہے؟ جواب دیا: کنگھی اور بالوں میں، ایک نر کھجور کے خوشے کے غلاف کے اندر۔ پوچھا: وہ کہاں ہے؟ جواب دیا: بنی زریق کے کنویں ذروان میں۔ (نبی ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ وہاں پہنچے اور اس جادو کے توڑ کے لیے خواب میں جو طریقہ بتایا گیا تھا اس کے مطابق عمل کیا۔ آگے اسی حدیث میں ہے کہ) واپس آکر آپؐ نے فرمایا: عائشہ! اس کنویں کا پانی گویا مہندی سے رنگا ہوا تھا اور اس کے قریب کے کھجوروں کے اوپری حصے شیاطین کے سر معلوم ہوتے تھے!... میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے کیوں نہیں اسے نکال باہر کیا؟ فرمایا: مجھے اللہ نے شفا دے دی ہے۔ اب میں نہیں چاہتا کہ اس کے خلاف لوگوں کو بھڑکاؤں۔ آپؐ کے حکم سے وہ کنواں بند کردیا گیا۔"

یہ حدیث آں حضرت ﷺ کے مبتلائے مرض ہونے سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آپ کے اکرام واعزاز اور عصمت کی دلیل ہے۔

اب صرف ایک اشکال بچا جسے کوئی شخص پیش کرسکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر سحر کی بھی حقیقت ہوتی ہے تو اس میں اور معجزۂ الٰہی میں فرق کیسے ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نبی کے ذریعے جو معجزہ ظاہر ہوتا ہے وہ دعوئ نبوت کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا چیلنج دعوئ نبوت کی صداقت پر دلیل کے طور پر ہوتا ہے، جب کہ جادو کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ جادوگر نبوت کے دعوی کے ساتھ اپنے جادو کا مظاہرہ نہیں کرتا۔[24] دوسری بات یہ ہے کہ جادو کا اثر محدود ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے، لیکن وہ حقیقت متعین حدود سے تجاوز نہیں کرتی اور اس کے ذریعے حقائق کی قلبِ ماہیت اور اشیاء کے

٢٤ ملاحظہ کیجیے شرح نووی بر صحیح مسلم ١٤/١٧٥

جوہر کی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ساحرینِ فرعون کے سحر کے بارے میں فرمایا ہے:

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ۔٦٦)

موسیٰ نے کہا: "نہیں تم ہی پھینکو، یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

رسیاں جادو کے ذریعے حقیقت میں اژدہے نہیں بن گئی تھیں۔ بلکہ جادو، دیکھنے والوں کی نگاہوں پر ہوا تھا۔ اس کی وضاحت ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (الاعراف۔١١٦)

انہوں نے نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کردیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنالائے۔

ہم نے سحر کو ایک ثابت شدہ حقیقت کہا ہے اور سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیت میں اسے "خیال" کہا گیا ہے۔ دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ اس لیے کہ رسیوں کا دوڑتے ہوئے اژدہوں کی شکل اختیار کرلینا ایک خیال ہے، رہا آنکھوں کا اس خیال سے متاثر ہونا اور حقیقت کے مشاہدہ پر قادر نہ ہو پانا تو یہ سحر کی تاثیر اور اس کی حقیقت ہے۔ اس بحث سے واضح ہو جاتا ہے کہ جادو کا اثر ہمیشہ انسان کے جسم، حواس اور اعضاء وجوارح پر ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے بعض مرئیات یا محسوسات حقیقت کے برخلاف ظاہر ہوتی ہیں۔

۵۔ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کے بعض مظاہر:

آں حضرت ﷺ کے مرضِ وفات کی جو تفصیل ہم نے ذکر کی ہے اس میں حضرت ابوبکرؓ کے امتیاز اور فضیلت کے چار دلائل موجود ہیں:

اول: جب رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں فرمایا: "ایک بندے کو اللہ نے اختیار دیا کہ وہ دنیا کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا رہے یا اللہ کے اجر وانعام کو ترجیح دے، اس نے دنیا کے مقابلے میں اللہ کے اجر وانعام کو اختیار کرلیا" حضرت ابوبکرؓ آں حضرت کی مراد کو سمجھ گئے، اسی لیے

زور زور سے رونے لگے اور کہنے لگے: "ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں" ان کے علاوہ اور کوئی صحابی ارشادِ نبوی کے مدعا کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس حدیث کے بعض طرق میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر جب ابو بکرؓ رونے لگے تو میں نے اپنے جی میں کہا: "اللہ کے رسول ﷺ کسی شخص کے بارے میں خبر دے رہے ہیں۔ ان بزرگ کو کیا ہو گیا ہے کہ اس بات پر رونے لگے۔" بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خود اپنے بارے میں ہمیں خبر دے رہے تھے اور ابو بکرؓ سب سے پہلے اس بات کو سمجھ گئے تھے۔"

دوم: آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کے بارے میں فرمایا: "کوئی شخص ایسا نہیں جس نے اپنی جان اور مال سے مجھ پر اتنا احسان کیا ہو جتنا ابو بکر نے کیا ہے... الخ" یہ زندہ جاوید کلمات ہیں۔ ایسے کلماتَ آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کے علاوہ اور کسی صحابی کے لیے ارشاد نہیں فرمائے۔

سوم: پیچھے ہم نے صحیح مسلم کی یہ روایت ذکر کی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "اپنے باپ ابو بکر اور اپنے بھائی کو بلاؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھ دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ بعد میں کوئی شخص امید نہ قائم کرلے اور یہ نہ کہنے لگے کہ (خلافت کا) سب سے زیادہ مستحق میں ہوں۔ حالانکہ اللہ اور اہلِ ایمان ابو بکر کے علاوہ اور کسی کے لیے راضی نہ ہوں گے" یہ حدیث اس سلسلے میں بالکل صریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے بعد حضرت ابو بکرؓ کو ہی خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ آپ صحابہ سے اس کا عہد نہ لیں اور ان کے لیے کوئی تحریر چھوڑ کر نہ جائیں، تاکہ آپ کے بعد خلافت و حکومت کے لیے نام زدگی کا التزام نہ کیا جانے لگے۔ کیونکہ یہ چیز بالکل واضح ہے کہ ایسا کرنے سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ امارت کے لیے صالحیت کی شرائط کو ملحوظ نہ رکھا جائے اور حکمراں اپنے بعد اپنے کسی پسندیدہ شخص کو نام زد کر دیا کریں۔

چہارم: آں حضرت ﷺ نے امامت کے لیے حضرت ابو بکرؓ کو اپنا جانشین بنایا۔ اور جب حضرت عائشہؓ نے ان کے بارے میں یہ عذر پیش کیا کہ وہ رقیق القلب ہیں، اس لیے خود پر قابو نہیں رکھ سکیں گے تو آپ نے ان کی بات سختی سے رد کر دی اور زور دے کر فرمایا کہ ابو بکر ہی سے امامت کے لیے کہا جائے۔

حضرت ابو بکرؓ کے انہی امتیازات اور فضائل کی وجہ سے، جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں، مسلمانوں نے رسول اللہ کے بعد انہیں خلیفہ بنایا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اگر ہم یہ بات کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم دیگر صحابہ اور خلفاء اور خاص طور پر حضرت علی بن ابی طالبؓ کے خصائص اور امتیازات کو گھٹا رہے ہیں۔ غزوۂ خیبر کے ضمن میں ہم نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقعے پر فرمایا تھا: "میں کل یہ پرچم اس شخص کے ہاتھ میں دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول کا محبوب ہے" لوگ رات بھر قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ اس شرف کا مستحق کون بنتا ہے؟ اگلے دن صبح آپؐ نے حضرت علیؓ کو بلا کر پرچم ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

آں حضرت ﷺ کی وفات کے بعد مسلمانوں نے بحث و مباحثہ کے بعد، جو ضروری تھا، بغیر کسی انتشار اور اختلاف کے خلافت کا معاملہ نپٹا لیا اور اس کے سلسلے میں قطعی فیصلہ کر لیا کہ خلیفہ حضرت ابو بکرؓ ہوں گے۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ دونوں ایک دوسرے کی فضیلت کا اعتراف کرتے رہے۔ اب یہ پرلے درجے کی گھٹیا بات ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد ہم یہ فیصلہ کرنے میں اپنا وقت ضائع کریں کہ خلافت کے مستحق یہ تھے یا وہ؟ اور اس سلسلے میں بغض و نفرت کا طوفان برپا کر دیں، حالانکہ خود اصحابِ معاملہ کے درمیان اس قبیل کا کوئی اختلاف نہیں ہوا تھا، اور وہ زندگی کے آخری لمحے تک ایک جان دو قالب بنے رہے تھے۔

۶۔ قبروں پر عبادت گاہ بنانے کی ممانعت :

آں حضرت ﷺ نے فرمایا: "یہود و نصاریٰ پر لعنت ہو، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا" اس سے واضح ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایسا کرنے سے بہت سختی سے منع فرمایا ہے۔ علماء فرماتے ہیں: نبی ﷺ نے اپنی قبر یا کسی اور کی قبر کو سجدہ گاہ بنانے سے اس اندیشے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں اس کی انتہائی تعظیم نہ کی جانے لگے اور اس کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جانے کا قوی امکان ہو، اس لیے کہ بسا اوقات یہ چیز کفر تک پہنچا دیتی ہے، جیسا کہ بہت سی گذشتہ قوموں کے ساتھ ہوا ہے۔

قبر کو سجدہ گاہ بنانے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اس کے اوپر مسجد تعمیر کر دی جائے۔ اس طرح قبر کے اردگرد کی جگہ لوگوں کے لیے جائے نماز بن جائے گی۔ یا قبر کے پاس نماز پڑھی

جانے لگے۔ قبروں کے پاس نماز پڑھنے کو بعض علماء نے حرام اور بعض نے مکروہ کہا ہے۔ جو لوگ کراہت کے قائل ہیں وہ اس صورت میں ایسا کرنے سے سختی سے منع کرتے ہیں جب نماز قبر کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے، یعنی جائے نماز اور قبلہ کے درمیان قبر ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اس کی نماز ہو جائے گی، اس لیے کہ حرمت سے بطلان لازم نہیں آتا۔ چنانچہ اس کا حکم غصب کی ہوئی زمین میں نماز ادا کرنے کے حکم کے مثل ہوگا۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: "جب مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور صحابہ و تابعین کو مسجدِ نبوی میں توسیع کی ضرورت ہوئی تو انہوں نے امہات المومنین کے حجرے بھی مسجد میں شامل کر لیے۔ جب حجرۂ عائشہؓ (جس میں رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں رفقاء حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ساتھ مدفون ہیں) کو بھی مسجدِ نبوی میں شامل کیا جانے لگا تو قبر پر اونچی اور گول دیواریں کھڑی کر دی گئیں، تاکہ وہ نظر نہ آئے اور عوام اس کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھ سکیں۔ پھر قبر کے شمالی کونوں پر دو دیواریں کھڑی کی گئیں اور دونوں کو ملا دیا گیا، تاکہ کسی کا قبر سے سامنا نہ ہو سکے۔" [۲۵]

۷۔ جاں کنی کے عالم میں آں حضرت ﷺ کی فکر مندی:

پیچھے بیان کیا گیا ہے کہ دو شنبہ کے دن (جو حیاتِ نبوی کا آخری دن تھا) لوگ نمازِ فجر کے لیے صف بستہ تھے کہ اچانک حجرۂ عائشہ کا پردہ ہٹا اور رسول اللہ ﷺ نمودار ہوئے۔ آپ نے صحابہ کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا تو مسکرائے، پھر ہنس پڑے۔ حضرت ابو بکرؓ پیچھے ہٹ کر صف میں شامل ہوگئے۔ کیونکہ انہیں گمان ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ صحابہ کرام آپ کو دیکھ کر نماز ہی میں بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ آپ نے انہیں ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنی نماز پوری کریں۔ پھر حجرہ میں داخل ہو کر پردہ گرا دیا۔

اس واقعے سے ہم آں حضرت ﷺ کی شدتِ احساس اور آپ کی غایت درجہ فکر مندی کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس لمحہ آپ اپنی امت کے بارے میں فکر مند تھے کہ آپ کے بعد اس کا کیا حال ہوگا۔ انہیں بارگاہِ الٰہی میں خشوع و خضوع کے ساتھ کھڑا دیکھ کر آپ کے روئے

---

۲۵ شرح نووی بر صحیح مسلم ۵/ ۱۳-۱۴

انور پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ آپ کی پیار بھری نگاہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ کے دل میں ان سے کتنی زیادہ محبت پائی جاتی تھی۔ آپ کی مسکراہٹ سے اظہار ہو رہا تھا کہ آپ ان سے محبت کرتے ہیں، ان کے لیے بارگاہِ الٰہی میں محوِ دعا رہتے ہیں اور ان کے حالات کی خبر رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ــــ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں ــــ چاہا کہ اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں اپنے اصحاب پر آخری نگاہ ڈال لیں۔ اور جو حق ان کے سپرد کیا ہے اور جس دین کی طرف ان کی رہنمائی کی ہے اس پر انہیں عمل پیرا دیکھ کر اطمینان کی سانس لیں۔ جو منظر آپ نے دیکھا اس سے آپ کا جی خوش ہو گیا اور آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اس منظر سے آپ موت کی تکلیفیں بھول گئے اور خوشی و مسرت آپ کے روئے انور سے چھلکنے لگی۔ یہ دیکھ کر صحابہ کو گمان ہونے لگا کہ آپ کی تکلیف میں افاقہ ہو رہا ہے اور طبیعت بحال ہو رہی ہے۔

لیکن بعد میں انہیں علم ہوا کہ یہ آپ کی آخری نگاہ تھی۔ یہ آپ کے اصحاب بلکہ پوری امت کا آخری منظر تھا جو آپ کے ذہن پر نقش ہوا تھا۔ تاکہ یہ منظر ان لوگوں اور اللہ تعالیٰ کے درمیان باقی رہ جانے والا عہد قرار پائے اور دنیا میں اپنی امت سے الوداع کے لمحے اور آخرت میں حوضِ کوثر پر اس کے استقبال کے لمحے کے درمیان ہمزۂ وصل بن جائے۔

حکمتِ الٰہی کی مشیت یہ ہوئی کہ یہ آخری منظر نماز کا ہو اور وہ آخری عہد قرار پائے۔

اے میرے مسلمان بھائی! اس عہد کو لازم پکڑو جو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحے میں انجام پایا تھا اور اسے دیکھ کر آپؐ خوشی و مسرت کے ساتھ اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے۔

خاتمہ

۱۔ تکفین و تدفین:

رسول اللہ ﷺ کو تین کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ اس میں قمیص اور عمامہ نہیں تھا۔ کفن پہنانے کے بعد آپ کے تخت کو قبر کے کنارے رکھ دیا گیا۔ لوگوں نے جماعتوں کی شکل میں داخل ہو کر الگ الگ نماز جنازہ ادا کی۔ کسی نے امامت نہیں کی۔ سب سے پہلے حضرت عباسؓ نے نماز پڑھی، پھر بنوہاشم، پھر مہاجرین، پھر انصار اور اس کے بعد تمام لوگوں نے۔ آپ کو حجرۂ عائشہ میں اسی جگہ دفن کیا گیا جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی۔

۲۔ ازواج مطہرات:

آں حضرت ﷺ کی وفات کے وقت نو۹ ازواج مطہرات باحیات تھیں:

حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت جحشؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت صفیہؓ، اور حضرت میمونہؓ۔ ان میں حضرت عائشہؓ کے علاوہ سب شوہر دیدہ تھیں۔

۳۔ اولاد:

آپؐ کے تین صاحب زادے تھے۔ (۱) قاسم (انہی کے نام سے آں حضرت ﷺ کی کنیت ابوالقاسم تھی) ان کی ولادت نبوت سے قبل ہوئی تھی اور دو سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ (۲) عبداللہ۔ ان کے دو لقب تھے: طیب اور طاہر۔ ان کی ولادت نبوت کے بعد ہوئی تھی۔ (۳) ابراہیم۔ ان کی ولادت مدینہ میں ۸ھ میں اور وفات ۱۰ھ میں ہوئی۔

آپؐ کی چار صاحب زادیاں تھیں: زینب، فاطمہ، رقیہ اور ام کلثوم۔ حضرت رقیہؓ کی وفات غزوہ بدر کے موقعے پر رمضان ۲ھ میں ہوئی۔ اور حضرت ام کلثومؓ کی وفات شعبان ۹ھ میں ہوئی۔ دونوں کا نکاح یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفانؓ سے ہوا تھا۔

۴۔ اخلاق و شمائل:

آں حضرت ﷺ کی سخاوت بے پایاں تھی۔ اس کا مظاہرہ سب سے زیادہ رمضان میں ہوتا تھا۔ آپ کا پیکر سب سے زیادہ حسین اور آپ حسنِ اخلاق میں سب سے بڑھ کر تھے۔ آپ کے دستِ مبارک سے زیادہ نرم کوئی چیز نہ تھی اور آپ کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو نہ تھی، آپ کی معاشرت سب سے بہتر تھی اور آپ اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے، آپ کو اپنی ذات کے لیے نہ غصہ آتا نہ اس کے لیے انتقام لیتے، لیکن جب اللہ کی حرمتوں کو پامال کیا جاتا تو اس وقت آپ کے جلال کے آگے کوئی چیز نہ ٹھہر سکتی تھی، یہاں تک کہ آپ اس کا بدلہ لے لیتے۔ آپ کے اخلاق قرآن کا عملی نمونہ تھے۔ آپ لوگوں میں سب سے زیادہ متواضع تھے۔ گھر والوں کی ضروریات خود پوری کرتے۔ کمزوروں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے۔ آپ سب سے زیادہ حیادار تھے۔ آپ نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا۔ اگر پسند آیا تو کھالیا ورنہ چھوڑ دیا۔ آپ کھانا ٹیک لگا کر نہیں تناول فرماتے تھے اور نہ دستر خوان بچھاتے تھے۔ حلوا، شہد اور کدّو آپ کو بہت پسند تھا۔ ایک ایک مہینہ، دو دو مہینہ گزر جاتا لیکن آپ کے کسی گھر میں آگ نہ جلتی تھی۔ ہدیہ قبول کر لیتے لیکن صدقہ کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے جوتا ٹانک لیتے، کپڑے میں پیوند لگا لیتے، مریض کی عیادت کرتے، کوئی شخص دعوت دیتا تو خواہ وہ امیر ہوتا یا غریب، آپ اس کی دعوت قبول کر لیتے۔ آپ کا بستر چمڑے کا تھا جس میں پتیاں بھری ہوئی تھیں۔ آپ کے پاس دنیاوی سازو سامان بہت کم تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پوری روئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں آپ کے سامنے پیش کیں، لیکن آپ نے انہیں قبول نہیں کیا اور آخرت کو ترجیح دی۔ آپ کثرت سے ذکر کرتے، ہمیشہ غور و فکر کرتے رہتے، آپ کا ہنسنا زیادہ تر تبسّم تھا۔ آپ خوش طبعی بھی فرماتے تھے، لیکن اس میں بھی حق بات کہتے تھے۔ آپ اپنے اصحاب کی تالیفِ قلب فرماتے تھے۔ آپ ہر قبیلے کے سردار کی تکریم کرتے تھے اور اسے اہل قبیلہ کے

معاملات کا ذمہ دار بناتے تھے۔ ایک صحیح حدیث میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے، فرماتے ہیں: "میں نے حریر و دیبا کو بھی آپ کے دستِ مبارک سے زیادہ ملائم نہیں پایا اور نہ آپ کی خوشبو سے بہتر کوئی خوشبو سونگھی۔ میں نے دس سال تک آپ کی خدمت کی ہے۔ آپؐ نے کبھی مجھ سے اف نہیں کہا۔ میں نے کوئی کام کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا؟ اور کوئی کام نہیں کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ اسے کیوں نہیں کیا؟"

۵۔ قبر نبوی کی زیارت کی مشروعیت:

مسجد نبوی اور قبر نبوی کی زیارت تقرّبِ الٰہی کے کاموں میں سے ہے۔ اس پر صدرِ اول سے آج تک ہر زمانے میں جمہور مسلمانوں کا اجماع ہے۔ کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ سوائے ابن تیمیہؒ کے (اللہ ان کی مغفرت کرے) ان کی رائے ہے کہ آں حضرت ﷺ کی قبر کی زیارت غیر مشروع ہے۔ جمہور مسلمانوں کے مسلک کی متعدد دلیلیں ہیں:

۱۔ قبور کی زیارت عام طور پر مشروع اور مستحب ہے۔ پیچھے گزر چکا ہے کہ نبی ﷺ ہر رات بقیع تشریف لے جاتے تھے اور وہاں مدفون لوگوں کو سلام کرتے اور ان کے لیے دعا و استغفار کرتے تھے۔ بہت سی صحیح احادیث سے یہ چیز ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک بھی اس عموم میں داخل ہے، اس لیے اس کا بھی یہی حکم ہوگا۔

۲۔ تمام صحابہ، تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب بھی روضۂ شریفہ سے گزرا جائے، آپ کی قبر کی زیارت کی جائے اور آپ پر سلام پڑھا جائے۔ یہ چیز ائمہ اور جمہور علماء نے نقل کی ہے جن میں ابن تیمیہؒ بھی ہیں۔

۳۔ بہت سے صحابہ سے قبر نبوی کی زیارت ثابت ہے۔ مثلاً ابن عساکرؒ نے صحیح سند سے حضرت بلالؓ کے بارے میں، امام مالکؒ نے مؤطا میں حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں اور امام احمدؒ نے حضرت ابو ایوبؓ کے بارے میں روایت کیا ہے کہ انہوں نے قبر نبوی کی زیارت کی تھی۔ کسی صحابی سے اس کے بارے میں ناپسندیدگی یا اس پر تنقید منقول نہیں ہے۔

۴۔ امام احمدؒ نے صحیح سند سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجتے ہوئے انہیں رخصت کرنے کے لیے نکلے تو فرمایا: "اے معاذ! شاید آئندہ سال مجھ

سے تمہاری ملاقات نہ ہو اور شاید تم میری مسجد اور قبر کے پاس سے گزرو" اس اندازِ بیان سے اشارہ ملتا ہے کہ آں حضرت ﷺ حضرت معاذؓ کو ترغیب دے رہے تھے کہ جب وہ مدینہ واپس آئیں تو آپ کی مسجد اور قبر کے پاس آکر آپ کو سلام پیش کریں۔[1]

مذکورہ تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابن تیمیہؒ کا ان دلائل کو رد کرنا اور قبر نبوی کی زیارت کو غیر مشروع عمل قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

ابن تیمیہؒ نے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں تین احادیث سے استدلال کیا ہے:

اول: "تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی مسجد کی طرف رختِ سفر نہ باندھا جائے: مسجد حرام، میری مسجد، اور مسجد اقصیٰ"

دوم: "اللہ یہود پر لعنت کرے۔ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔"

سوم: "میری قبر کو میلہ نہ بنالو۔"

مذکورہ تینوں احادیث سے ابن تیمیہؒ کا استدلال کرنا صحیح نہیں۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلی حدیث میں استثناء مفرغ ہے اور مستثنیٰ منہ محذوف ہے۔ مستثنیٰ کو مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہونا چاہیے ورنہ استثناء منقطع ہو جائے گا جو استثناء مجازی ہے اور مجاز کو اسی وقت پوشیدہ ماننا جائز ہے جب وہاں حقیقت درست نہ ہوتی ہو۔ حدیث کا مطلب ہوگا "مساجد کی طرف رختِ سفر نہیں باندھا جائے گا سوائے تین مسجدوں کے ... الخ" گویا مستثنیٰ منہ "مساجد" ہے۔ یعنی ان تین مسجدوں کے علاوہ تمام مساجد کی فضیلت یکساں ہے، زیارت اور اعتکاف وغیرہ کے معاملے میں کسی مسجد کو دوسری مسجد کے مقابلے میں کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی شخص نے ان تین مساجد کے علاوہ کسی مخصوص مسجد میں اعتکاف کی نذر مانی تو اس نذر کو پورا کرنے کے لیے اس مسجد تک جانا ضروری نہیں، بلکہ کسی بھی مسجد میں اعتکاف کرلے تو نذر پوری ہو جائے گی۔

---

[1] آں حضرت ﷺ سے دیگر بہت سی احادیث مروی ہیں جن میں آپؐ کی قبر کی زیارت کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر ضعف سے خالی نہیں۔ اگرچہ وہ سب مل کر درجہ قوت تک پہنچ جاتی ہیں لیکن مذکورہ دلائل کے ساتھ ہم نے انہیں ذکر کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھا تاکہ مخالفین ان کے ضعف کو واضح کر کے ابن تیمیہؒ کی منفرد رائے کی حمایت کی گنجائش نہ نکال سکیں۔

ہماری گفتگو رسول اللہ ﷺ کی قبر کی زیارت کے بارے میں ہے اور یہ نہ مستثنیٰ میں داخل ہے نہ مستثنیٰ منہ میں۔ حدیث میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ جس طرح اس حدیث سے یہ استدلال صحیح نہیں کہ "رشتہ داروں سے ملاقات یا علماء سے کسبِ فیض کے لیے رختِ سفر باندھنا جائز نہیں" اسی طرح اس سے یہ استدلال بھی درست نہ ہوگا کہ قبر نبوی کی زیارت کے لیے سفر جائز نہیں۔

یہاں ہم یہ پوچھنا چاہیں گے کہ "شدِ رحال" (کجاوہ کسنا) سے ابن تیمیہؒ نے حقیقی معنیٰ مراد لیے ہیں یا مجازی معنی یعنی قصد کرنا؟

اگر ان کے نزدیک اس کے حقیقی معنی مراد ہیں تو ان تین مساجد کے علاوہ دیگر مساجد کی طرف سفر صرف اس صورت میں ناجائز ہوگا جب اونٹ پر کجاوہ میں بیٹھ کر ہو، خواہ مسافت کم ہو یا زیادہ۔ اگر کسی دوسرے ذریعے سے سفر کیا جائے تو وہ ناجائز نہ ہوگا۔ کیا یہ بات کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے؟

اور اگر انہوں نے اس کے مجازی معنی مراد لیے ہیں تو رسول اللہ ﷺ کے عمل سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ آپ ہر ہفتہ (اور ایک روایت کے مطابق ہر شنبہ کو) مسجد قبا تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور مسجد قبا مدینہ کے باہر تھی۔

خلاصہ یہ کہ حدیث میں مستثنیٰ منہ "مساجد" ہے۔ رشتہ داروں اور دیگر لوگوں سے ملاقات، قبروں کی زیارت اور تاریخی مقامات کی سیر اس میں داخل نہیں ہے۔ اس حدیث میں ان کے بارے میں کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مساجد میں صرف یہ تین مساجد اس چیز کی مستحق ہیں کہ دور دراز مسافتوں سے ان کا قصد کیا جائے۔

دوسری حدیث "اللہ یہود پر لعنت کرے، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا" کا بھی زیارت کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں انبیاء کی قبروں اور ان کے اردگرد کی جگہوں کو عبادت گاہ بنالینے سے منع کیا گیا ہے۔ اس بات کی وضاحت لفظ "مساجد" سے ہوتی ہے جس کے معنی ہیں "نماز پڑھنے کی جگہیں"۔ "اگر محض زیارتِ قبر کا مطلب اسے عبادت گاہ بنالینا ہے تو اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نبی ﷺ نے پورے بقیع کو عبادت گاہ بنالیا تھا، اس لیے کہ آپ ہمیشہ بقیع تشریف لے جایا کرتے تھے۔

رہا آں حضرت ﷺ کا یہ ارشاد کہ "میری قبر کو میلہ نہ بنالو" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میری قبر کی زیارت کے لیے کوئی وقت مخصوص نہ کرلو، جیسا کہ میلوں کا وقت متعین ہوتا ہے۔ حافظ منذریؒ اور دیگر علمائے حدیث نے اس کی یہی تشریح کی ہے۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے اپنی قبر کے ساتھ شور وشغب، لہو ولعب اور دیگر مظاہر زینت سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ میلوں میں ہوتا ہے۔ اس حدیث سے زیارتِ قبر کی ممانعت نہیں نکلتی ہے۔ نبی ﷺ کی شان یہ نہیں تھی کہ دوسروں کو تو اپنی قبر کی زیارت سے منع کردیں اور خود روزانہ زیارتِ قبور کے لیے بقیع تشریف لے جایا کریں۔

۶۔ قبر نبوی کی زیارت کے آداب :

قبر نبوی کی زیارت کے چند آداب ہیں جن کی رعایت ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو اس کی زیارت کا شرف بخشے تو پہلے آپ مسجد نبوی کی زیارت کا عزم کیجیے۔ پھر اس کے ساتھ قبر مبارک کی زیارت کی بھی نیت کیجیے۔ پھر مدینہ میں داخل ہونے سے قبل غسل کیجیے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنیے۔ اپنے دل میں مدینہ منورہ کے شرف وعظمت کا استحضار کیجیے اور سوچیے کہ آپ اس خطہ پاک میں ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے بہتر ہستی کے وجود سے مشرف فرمایا تھا۔ جب آپ مسجد نبوی میں داخل ہوں تو سب سے پہلے روضۂ مبارک کا قصد کیجیے اور قبر اور منبر کے درمیان دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کیجیے۔ اس کے بعد جب آپ قبر مبارک سے قریب ہوں تو اس پر بلند نہ بولیے یا اس کی کھڑکیوں سے مت چمٹیے اور انہیں مت چھوئیے، جیسا کہ بہت سے جاہل لوگ کرتے ہیں۔ یہ بدعت ہے جو حرام کے درجے تک پہنچی ہوئی ہے، بلکہ قبر سے چار گز دور کھڑے ہوئیے۔ اپنے سامنے قبر کی دیوار کے نچلے حصے کی طرف دیکھیے۔ ہیبت وتعظیم کی بنا پر نگاہیں نیچی رکھیے۔ پھر پست آواز میں رسول اللہ ﷺ کو سلام کیجیے اور کہیے: "میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ کے رسول! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے رب کا پیغام پہنچادیا، اپنی امت کی خیر خواہی کا حق ادا کردیا اور اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظتِ حسنہ کے ساتھ دعوت دی اور زندگی کے آخری لمحے تک اللہ کی عبادت

کرتے رہے۔ ہزارہا درود و سلام ہو آپ پر، آپ کی آل واولاد پر اور آپ کے اصحاب پر، جس طرح ہمارا رب چاہتا ہے۔"

پھر قبلے کی طرف رخ کیجئے اور تھوڑا سا دائیں جانب مڑ جائیے تاکہ آپ قبر اور اس کے کنارے والے ستون کے درمیان ہو جائیں۔ پھر اللہ عزوجل سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیے۔ آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہونے پائے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بے ادبی ہے اور یہ کہ دعا قبر کی جانب رخ کر کے مانگنی چاہیے۔ اس لیے کہ دعا اللہ عزّوجل سے مناجات کا نام ہے اور اس میں کسی اور کو شریک کرنا جائز نہیں۔ اللہ عزّوجل سے دعا قبلہ رخ ہو کر مانگنی بہتر ہے۔ بہت سے جاہل اور بدعتی اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی دعا کا آغاز اس طرح کیجئے: "اے اللہ تو نے فرمایا ہے اور تیرا ہی ارشاد برحق ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا. (النساء۔ ٦٤)

اگر انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو تمہارے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔

اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور تیرے رسول کو اپنا سفارشی بنا کر حاضر ہوا ہوں۔ اے اللہ! تو اپنے حبیب کے صدقے میری مغفرت کر دے جس طرح تو اس کی مغفرت کر دیتا جو آپؐ کی حیات میں آپ کو اپنا سفارشی بناتا" پھر اپنے دین اور دنیا کی بھلائی کے لیے اور اپنے بھائیوں اور عام مسلمانوں کے لیے آپ جو دعا کرنا چاہیں، کریں۔

اے میرے بھائی! اُس موقعے پر مجھے اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کیجئے۔ کہیے: "اے اللہ! اس دن جس کا آنا یقینی ہے، جب تو اولین و آخرین سب کو جمع کرے، تو اپنے گنہ گار بندے محمد سعید بن ملّا رمضان کی بھی پردہ پوشی فرما اور محض اپنے فضل و کرم سے اسے اپنے مغفور بندوں میں شامل کر لے اور اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے حوضِ کوثر سے ایک فرحت بخش جام پلا دے، اس دن جب آپؐ مسکراتے ہوئے وہاں رونق افروز ہوں گے اور اپنے ان اصحاب کا، جنہیں آپ پہلے دیکھ چکے تھے اور ان کا بھی جنہیں پہلے نہیں دیکھا تھا اور ان سے ملنے کے مشتاق تھے،

استقبال کریں گے۔ اور اسے دھتکارے ہوئے یا محروم لوگوں میں سے نہ بنا۔

اے میرے مسلمان بھائی! آپ کوئی بھی ہوں، وعدہ کیجئے کہ اس کتاب کو ختم کرتے وقت اپنے اس بھائی کے لیے ضرور دعا کریں گے۔ میں ایسی مخلص دعا کا بہت محتاج ہوں جو میرا کوئی بھائی غائبانہ طور پر کرے۔

میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس کتاب کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی۔ اور اس سے تضرع کے ساتھ دعا کرتا ہوں کہ اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے تھام لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس کتاب میں مجھ سے جو لغزشیں اور غلطیاں سرزد ہوئی ہوں ان سے درگزر فرمائے اور قصد و ارادہ کی پاکیزگی اور حتی الوسع کوشش کو اس معاملے میں سفارشی بنا دے۔ درود و سلام ہو نبی امی سیدنا محمد ﷺ، آپ کی آل و اولاد اور آپؐ کے تمام اصحاب پر۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

کتابیــات

١۔ قرآن کریم

٢۔ آثار الحرب فی الفقه الاسلامی — د. وهبه الزحیلی

٣۔ الاتجاهات الوطنیه فی الادب الحدیث — د. محمد محمد حسین

٤۔ اتمام الوفاء فی سیرة الخلفاء — محمد الخضری

٥۔ الاحکام — القرافی

٦۔ الاحکام السلطانیة — ماوردی

٧۔ احکام القرآن — ابن العربی

٨۔ اسد الغابة — ابن الاثیر الجزری

٩۔ الاصابة فی تمییز الصحابة — ابن حجر العسقلانی

١٠۔ اعلام الساجد فی احکام المساجد — زرکشی

١١۔ اعلام الموقعین — ابن قیم

١٢۔ الام — شافعی

١٣۔ الامة العربیة فی معرکة تحقیق الذات — محمد المبارک

١٤۔ بدایة المجتهد — ابن رشد

١٥۔ البدایة والنهایة (تاریخ ابن کثیر) — ابن کثیر

١٦۔ بنیة الفکر الهی (عربی ترجمه) — گب

١٧۔ تاریخ الرسل والملوک (تاریخ طبری) — محمد بن جریر طبری

١٨۔ تجربة التربیة الاسلامیة فی میزان البحث — سعید رمضان

۱۹۔ تفسیر القرآن العظیم (تفسیر ابن کثیر) — ابن کثیر
۲۰۔ تهذیب سیرة ابن هشام
۲۱۔ جامع الترمذی — ترمذی
۲۲۔ الجامع لاحکام القرآن (تفسیر قرطبی) — ابوعبدالله القرطبی
۲۳۔ جمع الفوائد
۲۴۔ حاضر العالم الاسلامی — شکیب ارسلان
۲۵۔ حیاة محمد — محمد حسین ہیکل
۲۶۔ حلیة الاولیاء — ابونعیم اصبہانی
۲۷۔ دلائل النبوة — بیہقی
۲۸۔ زاد المعاد — ابن قیم
۲۹۔ سبل السلام
۳۰۔ سنن ابن ماجہ
۳۱۔ سنن ابوداؤد
۳۲۔ سنن بیہقی
۳۳۔ سنن نسائی
۳۴۔ السیادة العربیة (عربی ترجمہ) — فان فلوتن
۳۵۔ سیرت ابن اسحاق
۳۶۔ سیرت ابن ہشام
۳۷۔ شرح المؤطا — زرقانی
۳۸۔ شرح الشفا — قاضی عیاض
۳۹۔ شرح اللمع — ابواسحاق شیرازی
۴۰۔ شرح المنهاج — الاسنوی
۴۱۔ شرح مسلم — نووی
۴۲۔ صحیح البخاری

۴۳۔ صحیح المسلم
۴۴۔ ضوابط المصلحة فی الشریعة الاسلامیة — سعید رمضان
۴۵۔ الطبقات الکبریٰ — ابن سعد
۴۶۔ طرح التثریب وشرحه — حافظ ولی الدین عراقی
۴۷۔ الظاهرة القرآنیه — مالک بن نبی
۴۸۔ عیون الاثر — ابن سید الناس
۴۹۔ فتاوی — ابن تیمیہ
۵۰۔ فتح الباری بشرح صحیح البخاری — ابن حجر عسقلانی
۵۱۔ الفتح الربانی فی ترتیب مسند الامام احمد — احمد عبدالرحمن البنا
۵۲۔ فقه السیرة — محمد الغزالی
۵۳۔ قواعد الاحکام فی مصالح الانام — عزبن عبدالسلام
۵۴۔ کبری الیقینیات الکونیة — سعید رمضان
۵۵۔ کتاب الاصنام — کلبی
۵۶۔ کف الرعاع علی هامش الزواجر — ابن حجر
۵۷۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین؟ — ابوالحسن علی ندوی
(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)
۵۸۔ المبسوط — سرخسی
۵۹۔ المحلی — ابن حزم
۶۰۔ مختصر سیرة الرسول — محمد بن عبدالوہاب
۶۱۔ المدوّنه — امام مالک
۶۲۔ مذکرات — لورڈ کرومر
۶۳۔ مروج الذهب — مسعودی
۶۴۔ مستدرک — حاکم
۶۵۔ مسند احمد

۶۶۔ معجم	بغوی
۶۷۔ المغنی	ابن قدامہ
۶۸۔ مغنی المحتاج	
۶۹۔ الملل والنحل	شہرستانی
۷۰۔ الموافقات	شاطبی
۷۱۔ الموطا	امام مالک
۷۲۔ النبأ العظیم	ڈ۔ محمد عبداللہ دراز
۷۳۔ نور الیقین	خضری
۷۴۔ النہایۃ فی غریب الحدیث	ابن الاثیر الجزری
۷۵۔ نہایۃ المحتاج	رملی
۷۶۔ نیل الاوطار	شوکانی
۷۷۔ وحی القلم	مصطفیٰ صادق رافعی
۷۸۔ وفیات الاعیان	ابن خلکان
۷۹۔ ہدایہ	مرغینانی